فروری

کتب خانہ جامعہ ملیہ
دہلی

نگار

قیمت
۸ر

DUE DATE

Cl No. Acc No. 12 5/ 6 4

Late Fine Ordinary Books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night Book Re. 1/- per day.

17/01/98

کتب خانہ جامعہ ملیہ
دہلی
DELHI.

نگار

قیمت
۸ر

[illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

[illegible]

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے ۱۹۳۲ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جن میں انشا نگاری اور سلاست بیان شگفتگی اور لطیفہ گوئی کے لحاظ سے فن انشا میں ایک نئی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل نئی طرز سے سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کا تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

۱۹۳۷ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ معہ س کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشاء و تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُس نے سارہ (مشہور ایکٹریس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشاء و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اسکا اندازہ آپ ان خطوں سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" از آزاد خیال سنی کے قلم سے۔ مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہمیشہ ہے جن سے عام بحث کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اس کے بعض عنوان یہ ہیں: مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ

صفحات ۱۴۴ - قیمت عہ علاوہ محصول

نگار

12.9.44
6.9.32

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد (۳۶)

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار (۱)	جولائی ۳۹ء	جلد (۳۶)

ملاحظات

ہمارے علماء کرام کے لئے ایک لمحۂ فکریہ

۳ جون ۳۹ء کا دن، جمعیتہ العلماء کی تاریخ میں غالباً بالکل پہلا دن تھا کہ اس کے سامنے بالکل نئی قسم کا خطبۂ صدارت پڑھا گیا اور اگر اس کو علماء کی جماعت نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا جس کا بڑی حد تک یقین ہے تو اس نوع کے تخاطب کا غالباً یہی آخری دن بھی ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے، جو اپنی عمر کا بڑا حصہ جلاوطنی میں بسر کر چکے ہیں اور جنھوں نے دنیا کی سیاسیات کا مطالعہ براہ راست انھیں ممالک میں جاکر کیا ہے جو مختلف تحریکات کا مرکز ہیں جس سادگی کے ساتھ اپنا مدعا علماء ہند کے سامنے پیش کیا ہے اور جو تدابیر انھوں نے ہندوستان کی آزادی و ترقی کے لئے ظاہر کی ہیں، وہ اصول کے لحاظ سے تقریباً وہی ہیں جسے یہاں کے بعض ملحد و بیدین عرصہ سے ظاہر کرتے چلے آرہے ہیں، اس لئے ہمیں امید نہیں کہ یہاں کے علماء کرام اسے نظر استحسان سے دیکھیں گے لیکن چونکہ مولانا عبید اللہ قال کے انسان نہیں بلکہ

حاصل کے ہیں اور انھوں نے اپنے وطن سندھ میں ان تدابیر کو عملی صورت میں لانے کا فیصلہ کر لیا ہے، بنا بریں ہمکو توقع ہے کہ صوبۂ بنگال میں علماء ہند کا یہ اجتماع بالکل رایگاں نہ جائے گا اور جو کچھ مولانا عبید اللہ نے کہا ہے اس کی اہمیت آج نہیں تو کل ہمارے علماء کی سمجھ میں آئے گی۔

مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک یوروپین اُصول پر نیشنلزم نہ پیدا کی جائے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جدوجہد کا آلۂ کار مذہب ہے

ان کی رائے میں اس مقصد کی تکمیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کو جملہ سیاسیات ہند کا مرکز بنا دیا جائے اور وہ فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بنیاد قرار دیکر مغربی اُصول پر قومیت کو یہاں رواج دے۔ قومیت کا مغربی اُصول کیا ہے، اس کی مثال میں انھوں نے ترکی قوم کو پیش کیا ہے، جہاں کا مزدور و کاشتکار بھی اپنے معیارِ زندگی میں کسی یوروپین باشندہ سے کم نہیں۔

مولانا کی رائے ہے کہ ہندوستان یوروپ کے بین الاقوامی اجتماع کی نگاہ میں اسی وقت عزت حاصل کر سکتا ہے جب وہ اپنی معاشرت میں انقلاب پیدا کر کے اسے یوروپ کی سطح تک لے آئے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک اقتصادی ترقی اور دوسرے عام تعلیم۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں حصولِ آزادی کے بعد حاصل ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ سے آزادی حاصل ہوتی ہے، مولانا نے اس سے بحث نہیں کی اور نہ ان کے خطبۂ صدارت میں غالباً اس بحث کا موقع تھا

تعلیم کو عام بنانے کے سلسلہ میں وہ رومن حروف کے رواج کے حامی ہیں اور لباس کے لئے کوٹ پتلون تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے وطن سندھ میں، انھوں نے اس تحریک کے عملی آغاز کا ارادہ کر لیا ہے۔

انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ سیاسیات کو مذہب سے علحدہ رکھنے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہم بیدین ہو جائیں لیکن یہ ضرور ہے کہ مذہب کا دایرہ اس قدر تنگ نہ ہونا چاہئے کہ سوائے مخصوص شکل وصورت رکھنے والے حضرات کے کسی اور کو اس میں اذن باریابی ہی نہ ملے۔ موصوف کے نزدیک مذہب کا تعلق صرف بعض متعین رسوم و قیود سے نہ ہونا چاہئے، بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ وہی لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکے، اور اس صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستان کے تمام مختلف مذاہب کسی ایک مرکز پر پہونچکر اشتراکِ عمل کر سکیں۔ مولانا نے فرمایا کہ مذہبی مراسم کو قومی تحریک کا جزو بنانا خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے ہو ملک کو تباہی سے نہیں بچاتا۔

فاضل صدر نے جس فلسفہ کو مسلمانوں کے لئے پسند کیا ہے اور جس کی ترویج کے لئے وہ ایک باقاعدہ درسگاہ جامعۂ ملیہ دہلی میں قایم کرنا چاہتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کا فلسفہ ہے۔ شاہ صاحب عہد آخر کے بہت بڑے امام تھے اور ہر چند مجھے اس سے اختلاف ہے کہ بجائے ایک نیا فلسفہ پیش کرنے کے جو ہماری موجودہ ضروریات پر حاوی ہو، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا اتباع کیا جائے جو یقیناً سب کے لئے تشفی بخش

نہیں ہوسکتا، تاہم یہ واقعہ ہے کہ مذہب کی موجودہ جکڑبندیوں سے آزاد ہونے کے بعد قریب ترین جائے پناہ ہمارے لئے وہی ہوسکتی ہے اور ممکن ہے کہ اس صورت میں چند علماء ایسے مل جائیں جو اس باب میں مولانا عبید اللہ کے ہم آہنگ ہوسکیں۔ جمعیتہ العلماء کو وہ دو گروہ میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں ایک وہ جو علوم دینیہ کا محافظ ہو اور دوسرا اسلامی فلاسفی کا۔ پہلا گروہ سیاسیات سے علحدہ رہیگا اور دوسرا کانگریس میں شریک ہوگا۔

علوم دینیہ کے سلسلہ میں انھوں نے بتایا ہے کہ کس قسم کی کتابیں پڑھانا چاہئے اور فلسفۂ اسلامی سے مراد ان کی وہ ہند و فلسفہ ہے جسے ہمارے یہاں کے صوفیہ نے اختیار کیا اور جو فلسفہ شاہ ولی اللہ کا اساس دین ہے انھوں نے مغربی سائنس و صنایع سیکھنے پر بھی زور دیا ہے لیکن انگریزی زبان میں، کیونکہ عربی زبان کو اس کا ذریعہ بنانا گویا نقل در نقل ہوگی اور ہندوستانی زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ مغربی علوم اس میں منتقل ہوسکیں۔

اس رسم خط کے متعلق بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی زبانیں عام طور پر عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں، کاروباری عوام کے لئے چونکہ اس کا سیکھنا آسان نہیں اس لئے خاص طور پر مقطع حروف کا رسم خط ایجاد کرنا ہوگا جو اعراب و علامات وقفہ کی اصلاح کے بعد افغانستان، ترکستان، ایران اور عربی ممالک میں بھی بہ آسانی رواج پذیر ہوسکتا ہے۔ لیکن جب وہ ایک جگہ رومن حروف کے رواج کی سفارش کر چکے ہیں تو پھر اس جدید رسم خط کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے۔ اگر اس خیال کا باعث یہ اندیشہ ہے کہ علوم دینیہ کی کتابوں خاصکر قرآن شریف کو رومن حروف میں لکھنا لوگ پسند نہ کریں گے تو رسم خط بدلنے کی صورت میں بھی یہی اندیشہ باقی رہتا ہے، کیونکہ جو مسلمان رومن حروف کو پسند نہ کریں گے وہ اس کے بھی مخالف ہوں گے کہ مروجہ رسم خط کے علاوہ (جو ان کے نزدیک الہامی رسم خط ہے) کسی اور رسم خط میں قرآن کو منتقل کیا جائے۔

انھوں نے قرآن مجید کی بھی ایسی حکیمانہ تفسیر کی ضرورت بتائی ہے جو غیر مسلموں کے سامنے پیش کیجا سکے اور دیگر علوم دینیہ کا بھی ایک اجمالی نصاب ایسا پیش کیا ہے جو نسبتاً زیادہ آسان زیادہ سمجھا ہوا اور برمحل ہے دارالعلوم دیوبند کو وہ علوم دینیہ کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور فلسفۂ اسلام کا درس دینے کے لئے انھوں نے جامعۂ ملیہ دہلی کو تجویز کیا ہے۔

یہ ہے اجمالی خاکہ ان تدابیر کا جو مولانائے موصوف نے ہمارے علماء کرام کے سامنے پیش کی ہیں اور جن کی وساطت سے ان کو انقلاب پسندی کی دعوت دی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس فرقۂ زہاد سے کوئی ایک بھی اُٹھنے والا نہیں اور وہ قیامت تک قدامت پسندی و روایات پرستی سے ہٹ کر کوئی نئی بات قبول نہیں کرسکتے۔ اور قبول کرنے کی صورت بھی کیا ہے جبکہ مولانا نے ان کے عمامہ و عبا پر حملہ کرکے کوٹ پتلون پہننے کا مشورہ دیا ہے اور ہیٹ کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے۔ ہیٹ اُتار کر ننگے سر بوٹ سمیت نماز پڑھ لینا،

افغانستان میں رائج ہو تو ہو، لیکن ہندوستان کا مولوی کبھی اس بدعت کو گوارا نہیں کر سکتا اور اگر عبدالماجد دریابادی کی سی ذہنیت رکھنے والے چوب خشک قسم کے مذہبی علمبرداروں نے یہ اعتراض کر دیا کہ کیا قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے کوٹ پتلون اور ہیٹ ہی پہن کر ترقی کی تھی اور کیا یہ تشبہ بالکفار نہیں ہے تو اس کا جواب مولانا عبید اللہ کے پاس کیا ہوگا۔

مولانا موصوف نے علوم دینیہ کے سلسلہ میں جو مشورہ دیا ہے وہ بھی اس لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ اس سے وہ مخصوص ذہنیت جو مسجد کے امام و موذن میں پائی جاتی ہے، پیدا ہوتی نظر نہیں آتی اور فلسفۂ شاہ ولی اللہ تو خیر گوارا ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں دوزخ و جنت کے مفہوم کو غیر مادی قرار دینے میں سخت ناروا جسارت سے کام لیا گیا ہے۔

رسم خط کے متعلق ان کی یہ تجویز کہ عام کتابیں رومن حروف میں لکھی جائیں، ممکن ہے ایک حد تک گوارا ہو جائے لیکن قرآن مجید کے لئے کوئی نیا رسم خط جاری کرنا کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی الہامی حیثیت صرف مفہوم یا الفاظ ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف ایک ایک نقطے ایک ایک دایرہ سے وابستہ ہے اور اس لئے اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا گویا خدا پر نکتہ چینی کرنا ہے اور خدا پر نکتہ چینی الحاد و کفر ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے اعتراضات ہیں جو مولانا عبید اللہ سندھی کی پیش کردہ تدابیر پر کئے جائیں گے اور مجھے امید نہیں کہ دارالعلوم دیوبند بھی جہاں خود انھوں نے تعلیم پائی ہے مولانا محمود الحسن مرحوم کی یادگار میں ایسی بدعات کی ترویج کو جایز قرار دیگا۔ لیکن مسلمان نام نہ مولویوں کا ہے اور نہ اُن مذہبی اجارہ داروں کا جو ہماری دینی تعلیم گاہوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، اس لئے مولانا کا خطاب گو بظاہر مولویوں سے ہے لیکن ان کا مقصود تمام مسلمانوں کو دعوت انقلاب دینا ہے اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جب کوئی مولوی ہی علم لیکر اُٹھے تو اس دعوت کو قبول کیا جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے علماء میں سے بعض کے دلوں میں ملک کو آزاد کرانے کی تڑپ پائی جاتی ہے، لیکن عام مسلم پبلک کو اس مقصود کی طرف لانے کی کوئی کوشش انھوں نے نہیں کی ہے اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ خود اپنے اندر صحیح انقلابی روح پیدا نہیں کر سکے جب کوئی قوم پستی کی انتہائی منزل پر پہونچ جاتی ہے تو اس کے اُبھارنے کے لئے جس ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، اسکے لئے جسم و روح، ظاہر و باطن دونوں میں تغیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ فلسفہ تھا جس کی بنا پر کمال اتاترک نے ترکی میں اور رضا شاہ پہلوی نے ایران میں معاشرت و لباس کو بالکل بدل دیا۔

ماحول کا اثر انسان پر بہت پڑتا ہے اور قریب تر ماحول انسان کا اس کی معاشرت ہے، اس کا لباس ہے

اور ان کا تغیر انسانی ذہن کا تغیر ہے۔ اس لئے مولانا عبید اللہ سندھی کا لباس و وضع، معاشرت و معیشت کی تبدیلی کا مشورہ دینا، سیاسیات کو مذہب سے علحدہ رکھنے کی سفارش کرنا، علوم دینیہ کو حد سے زیادہ اہمیت نہ دینا، نہ سمجھا سے مخفا نہ ہے، بلکہ ایسا فلسفہ پیش کرنے کی ہدایت کرنا جو تمام اقوام عالم کے لئے قابل قبول ہو، یکسر حکیمانہ تدبر و تفکر ہے اور اگر علمائے کرام اس کو قابل قبول نہیں سمجھتے تو ہم میں سے ہر ایک کا انفرادی فرض ہے کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے

گلاب چند صاحب کے ایک مقالہ کے متعلق

گزشتہ مئی کے نگار میں ایک مقالہ گلاب چند صاحب کا شایع ہوا تھا جس میں مسٹر عبدالوحید خاں بی۔ اے کی کتاب "جنگ آزادی اور مسلمان" پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے بعض ایسے مسایل پر بھی بحث کی تھی جو مابہ النزاع ہو سکتے ہیں اور جن سے مجھے بھی اختلاف ہے لیکن اڈیٹر کا کسی مسئلہ سے متفق الرائے نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ رسالہ میں شایع نہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اسے شایع کیا اور اس خیال سے کہ جن حضرات کو اختلاف ہوگا، وہ جواب دیں گے، لیکن اس وقت تک کسی طرف سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی، البتہ حیدرآباد کے ایک صاحب نے جن کا اسم گرامی غلام صدیقی ہے صرف ایک خط کے ذریعہ سے اختلافی مباحث کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن کوئی جوابی مقالہ انھوں نے سپرد قلم نہیں کیا۔

گلاب چند صاحب نے اپنے مضمون میں دو باتیں ایسی لکھی ہیں جو یقیناً توجہ طلب ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا کوئی مخصوص کلچر کبھی نہ تھا اور دوسرے یہ کہ مغلیہ حکومت کے زوال میں سلطنت دکن کے بانی و موسس نے بھی بڑا حصہ لیا۔ میری رائے میں یہ دونوں باتیں غلط ہیں

اسلامی کلچر کا مفہوم صرف عربی زبان، عربی لباس اور عربی عادات نہیں ہے بلکہ وہ مجموعہ ہے نہ صرف عرب و ایران دونوں کی تہذیب کا بلکہ بعض ہندوستانی اطوار و شمایل کا بھی اور اس لئے یقیناً یہاں کے خالص ہندو کلچر سے بالکل علحدہ تھا اور اب بھی ان دونوں قوموں کی معیشت و معاشرت کے مطالعہ سے دونوں کا فرق بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ "تہذیب و تمدن کی ذمہ داری مذہب نہیں لیا کرتا"۔ نفسیاتی غلطی ہے۔ آج تک ہندو مسلمانوں کا ایک دوسرے سے علحدہ رہنا، باہم گزشتہ ازدواج قایم نہ کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ کھانا نہ کھا سکنا، پہننے کے لئے علحدہ علحدہ لباس اختیار کرنا عام طور پر ہندوؤں کی سبھا میں صرف ہندوؤں کا اور مسلمانوں کی مجلس میں صرف مسلمانوں کا شریک ہونا، کیا یہ تمدن و تہذیب کا اختلاف نہیں ہے اور کیا مذہبی عصبیت کو اس کا ذمہ دار قرار نہ دیا جائے گا۔

اسی طرح دوسرے مسئلہ میں بھی گلاب چند صاحب نے صحت فکر سے کام نہیں لیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ

بنگال کے صوبہ داروں نے خود مختاری کا اعلان کرکے سلطانوں کی مرکزی حکومت کو نقصان پہونچایا لیکن اودھ اور دکن کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ جس زمانہ میں یہاں کے ناظموں نے خود مختاری کا اعلان کیا ہے وہ مغلیہ خاندان کا آخری زمانہ تھا اور مرکزی حکومت اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ اگر یہاں کے ناظم یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے تو دونوں صوبے غیروں کے پاس پہونچ جاتے خصوصیت کے ساتھ دکن کی حالت تو اس درجہ نازک تھی کہ اگر چین قلیچ خاں (آصف جاہ اول) ایسا نہ کرتے تو مغلیہ اقتدار کی آخری سانس کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ باوصف خود مختاری کے بھی فرمانروایان دکن نے اس مغلیہ خاندان کے آخری دور کے انتہائی کمزور بادشاہوں کا بھی وہی احترام کیا جو اکبر و اورنگ زیب کا کیا جاتا تھا اور کبھی غیر وفادارانہ جذبات ان کے دل میں پیدا نہ ہوئے۔ اگر قلیچ خاں یہ نہ کرتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ وہ دیدہ و دانستہ دکن کی حکومت مرہٹوں کے ہاتھ میں دیدیتا۔ قلیچ خاں کا یہ فیصلہ ایسا فیصلہ تھا جس نے مغلیہ حکومت کو بالکل مٹنے نہیں دیا اور جب تک خاندان آصف جاہی موجود ہے اس کی یادگار بدستور باقی رہے گی۔

بہرحال یہ دونوں مسئلے تاریخی و سیاسی حیثیت سے بحث کے قابل ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مسٹر عبدالوحید خاں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کے علاوہ ان مسائل کے اور بھی بعض مسلم لیگی مسائل کے متعلق گلاب چند صاحب کو جواب دینا ہے۔

حیدرآباد کا مسئلہ زیادہ نازک صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور اس کا ثبوت حال ہی کا وہ ہنگامہ ہے جو ایک سکھ کی موت پر آریہ سماجیوں نے وہاں برپا کیا اور جس کے فرو کرنے کے لئے پولیس کو مجبوراً سختی عمل میں لانا پڑی۔ قوم کی بیداری بری چیز نہیں، آزادی کی تمنا ہر شخص کا فطری حق ہے لیکن ہم دنیا کی ہر اچھی بات کو مکروہ بنا سکتے ہیں اگر اُسے بدتمیزی سے حاصل کریں اور یہی وہ ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل ہے جو آریہ سماجیوں نے آجکل اختیار کر رکھا ہے۔

خود حیدرآباد کے اندر اس وقت تک ہندو مسلمان جس اتحاد و امن کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں، اس کا حال خود اُن بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے جو وہاں کے بڑے بڑے ہندوؤں کی طرف سے شائع ہو رہے ہیں اور یقیناً وہاں کے ہندو بیرونی لوگوں کی اس مداخلت کو قطعاً پسند نہیں کرتے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہندوستان کی آریہ سماجی تحریک فی الحقیقت ایک سیاسی تحریک ہے جو مذہب کے نام سے چلائی جا رہی ہے اور جس کا اولین ہدف قدرتاً حیدرآباد ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ ہندوستان کے مسلم عہد حکومت کی تنہا یادگار ایک وہی باقی ہے۔

آریہ سماجیوں کا یہ الزام کہ انھیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں، ان کی اقتصادی حالت بہت

خراب ہے، ان کی تمدنی آزادی کو کچلا جا رہا ہے، اسوقت تک ثابت نہیں ہوسکا اور خود ہندوؤں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان الزامات کی کوئی اصلیت نہیں ہے، لیکن جتھوں کی روانگی بند نہیں ہوتی اور امن شکنی کے لئے اندرونی طور پر ریشہ دوانیاں بدستور جاری ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی اور موقعہ ہاتھ نہیں آتا تو سکھوں ہی کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور دخل درمعقولات پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

یہ علامتیں اچھی نہیں ہیں اور ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود حدود ریاست کے اندر اسکا ردّ عمل پوری قوت کے ساتھ شروع ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بدامنی بہرحال ہندوؤں کے لئے مفید ہی ثابت ہوگی۔

حال ہی میں ہم کو متعدد خطوط حیدرآباد سے موصول ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں اس کا کافی احساس پیدا ہوچلا ہے اور وہ آریہ سماجی تحریک کو براہ راست اپنے اوپر حملہ خیال کرکے، یکسر ان اصلاحات کے مخالف ہیں جن کا اعلان ریاست کی طرف سے ہونے والا ہے۔ ہرچند اصلاحات کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر آریہ سماجی تحریک نہ ہوتی، تو بھی وہاں کی حکومت کو اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے نظم ونسق میں تبدیلی کرنا پڑتی، لیکن چونکہ بدقسمتی سے ان اصلاحات کا اعلان اس شورش کے بعد ہونے والا ہے اس لئے مسلمان اس میں تھوڑی سی سبکی محسوس کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا انکے مفاد کو کوئی نقصان پہونچے۔

الغرض یہ ہیں وہ پیچیدگیاں جنھوں نے اسوقت نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو متفکر بنا رکھا ہے، اور عجب نہیں کہ آگے چلکر یہ مسئلہ ملک کا مستقل سیاسی سوال بن جائے۔ چنانچہ یہی کچھ سوچکر صوبۂ پنجاب نے جو آریہ سماجی تحریک کا مرکز ہے تحفظ ریاستہائے ہند کے قانون کے ماتحت جتھوں کی روانگی اور ہیجان انگیز تحریروں کی اشاعت کا سدّباب کرنا چاہا ہے، جس کا اتباع دوسرے صوبوں کو بھی کرنا چاہیے۔

نہایت ضروری اطلاع

ہمارے دفتر سے رسالہ نگار ہر خریدار کو نہایت احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے پرچہ آپ کو ۵ تک نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے، ورنہ مہینہ ختم ہونے کے بعد بیرنگ روانہ کیا جائے گا اور آپ کو ۱۰ ادا کرنا پڑیں گے، کیونکہ جدید قواعد ڈاک خانہ کی رو سے مہینہ گزرنے کے بعد پانچ گنا محصول ادا کرنا پڑتا ہے

منیجر نگار لکھنؤ

زبانی نزاع لسانیات کی روشنی میں

لسانیات یعنی زبانوں کا فلسفہ ایک علمی مشغلہ ہے جس کا کام الفاظ کے متعلق تحقیق و تفکر کرنا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک خشک مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً نہایت دلچسپ موضوعیت ہے۔ تحقیق الفاظ کا ذوق ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو اس چسکے سے زیادہ قوی ثابت ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:-

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

علمی نظر سے جب دیکھا جاتا ہے تو الفاظ کے وجود میں آنے اور مفہوم اختیار کرنے کا نقشہ قوموں کے اخلاقیات کا ایک چارٹ اور ان کی زندگی کی تاریخ کا ایک مرقع معلوم ہوتا ہے۔ اور الفاظ کے چولا بدلنے کا طریقہ اتنا پر فسوں اور جادو بھرا ہے کہ جسے اس کا مذاق ہو گیا پھر اس کے طلسم میں مبتلا رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

ہماری زبان میں فلسفۂ زبان کی طرف جتنی توجہ کی گئی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سخندانِ پارس کے بعد حمید اللہ خاں صاحب تمیری کی ایک تالیف ضرور جامع کتاب کہی جا سکتی ہے لیکن اب وہ بھی حالیہ نہیں رہی۔

اس موقع پر مجھے تحقیق الفاظ کے متعلق کوئی بحث مقصود نہیں، اور حقیقتاً میں لسانیات کا طالب علم بھی نہیں، لیکن طبیعت کو اس موضوع سے لگاؤ ضرور ہے۔ یہاں میں یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ لسانیات کے بعض بنیادی اصول کے تحت اردو ہندی کی موجودہ چپقلش کو سمجھا جائے۔ کیونکہ میرے خیال کے مطابق اس مسئلہ میں جو بحثیں کی جا رہی ہیں یکسر جذبات پر مبنی ہیں، ان کو علمی اصول سے کوئی واسطہ نہیں۔ بابائے اردو (معذرت کے ساتھ) ڈاکٹر عبدالحق کا ایک بسیط مضمون مدینہ کی ۱۳ مارچ سنہ ۳۹ء کی اشاعت میں نکلا ہے۔ آخر مضمون میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"یہ خیال بارہا سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیے گا۔
انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے یہ ہر مشکل پر غالب آجاتی ہے۔ وغیرہ"

اس وقت نفس مضمون سے محاکمہ مقصود نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے رتبۂ علم و فضل سے ہر شخص یہی توقع کرے گا کہ ان کی بحث منطقی اور علمی استدلال پیش کرے گی لیکن اس تحریر میں کسی استدلال کی تلاش حیرانی کی تلاش کے ہم معنی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے، لیکن اس کا تعلق جہاں تک ہماری زبان سے ہے، خود ڈاکٹر صاحب اپنی کوشش کو "بد بلا" نہ بنا سکے

اور "جہاز نادر قاتا" قسم کے مصادر کی اختراع خود انجمن ترقی اُردو کی تمام مطبوعات میں بھی روا رکھ دیئے۔ مجھ سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کو علم ہے کہ یورپ میں ایسپرانٹو اور والاپک جیسے ناموں سے بین الاقوامی زبان بنانے کی کوششیں ناکام رہ چکی ہیں اور یورپ والوں کو جو ذرائع حاصل ہیں ان کے باوجود وہ کبھی اپنی کوششوں کو "بارآور" نہ بنا سکے۔ آج ہمارے یہاں جو لوگ ایک نئی زبان بنا لینے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں یا وہ جو اس کوشش سے سہمے جا رہے ہیں، یورپ والوں کی ان کوششوں کی تاریخ میں بہت کچھ سامانِ فکر و افروزی پائیں گے۔ غرض، زبان کی بحث ایک خالص علمی بلکہ فلسفیانہ بحث ہے لیکن سیاسی مفاد کی خاطر میدانِ سیاست کا فٹ بال بنا دی گئی ہے۔

جس زمانے میں ہم آپ جی رہے ہیں وہ تحقیق و تلاش کا زمانہ کہلاتا ہے اور علمی ترقیوں کا یہ دور ہے کہ کوئی بات نہیں جو سائنس نہ بن گئی ہو یا آرٹ نہ کہی جاتی ہو۔ گھڑ دوڑ کا ایک سائنس مرتب ہے اور عورتوں کی آرائش آرٹ کہی جاتی ہیں۔ ایسے زمانے میں اگر ملک کے باشندوں کے درمیان زبان کے باب میں کوئی اختلاف رونما ہو یا نقطۂ نظر بدل جائے تو اُسے علمی حدود کے اندر ہی سمجھنا اور طے ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے عوض نظر آ رہا ہے کہ مذہب کی غلط تعبیر کر کے مسئلے کو تعصب سے رنگا جا رہا ہے۔ تحقیق سائنس کو پس پشت ڈال کر سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔

انسان اس زندگی کی گتھیاں ہلکی کرنے یا اس کی گتھیاں سلجھانے پر فطرتاً مامور و مجبور ہے کہ اسی میں اس کی راحت و مسرت پوشیدہ ہے اور راحت و مسرت کی تلاش انسانی زندگی کا راز ہے چنانچہ اس وقت تک وہ ان گتھیوں کو ہلکا کرنے یا ان گتھیوں کو سلجھانے کا ایک ہی نسخہ دریافت کر سکا ہے اور وہ حکمت و فلسفے کی نظر ہے۔ فلسفے کی روشنی میں آ کر ان گتھیوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ یہ گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ پھر کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ افلاطون و ارسطو کے فلسفے میں اصلاح دینے والے اور فلسفۂ دیرانت کے موجد اس مسئلہ میں تعصب سے کام لیں جو تعصب کو قبول نہ کرتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ارادہ کر کے ہم زندگی کے ہر شعبے میں تعصب کو داخل کر سکتے ہیں، لیکن علم کے باب میں ارادہ و کوشش کے باوجود ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان تعصب کی چھاؤں ہی نہیں دیتی اور کون اہل نظر ہے جو اعتراف نہ کرے گا کہ تعصب تو وہ بری شے ہے جو انسان سے اس کی دلکشی چھین لیتی ہے، جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

اس موقع پر غور و مطالعے کے لئے دو لفظ پیش کرتا ہوں۔ ڈاڑھی کا مسئلہ مسلمانوں میں مذہبی مسئلہ ہے اور ماتھے پر گٹّا کو کہا جاتا ہے پیشانی پر سجدے کے نشان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز چمکتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی معتقدات وابستہ ہیں۔ لیکن ان کے جو نام قبول کر لئے گئے وہ ٹھیٹ ہندی ہیں یعنی "ڈاڑھی" اور "گھٹّا" اور ان لفظوں میں ثقافت کے بھی تمام اجزا موجود ہیں۔ بلکہ شاید مزید دلچسپی کا باعث ہو کہ لفظ "ساڑھی" کو ہم نے اور خود ہندی والوں نے بھی ثقافت کو رد کر دیا ہے اور اب عام طور سے "ساری" بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن "ڈاڑھی" اور "گھٹّا" جوں کے توں چلے آتے ہیں۔ ان کی ثقالت دور کر دینے کا ابھی کسی کو خیال نہ آیا۔ زبان کے تقاضے سے بالا ہو کر

بہت سی شہادتیں مہیا ہو سکتی ہیں، لیکن اہلِ نظر کے لئے یہی ایک مثال کافی ہوگی۔

زبان کے موجودہ اختلاف کا سبب لیا ہے یہ ہے کہ حضرات اُردو کو خطرہ ہوگیا ہے کہ رائج اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ بھی نکالے جا رہے ہیں ان کی جگہ سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل لفظ ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت ہوگئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری نسلوں کی ذہنیت ہندوانہ ہو جائے گی اور ہمارا کلچر فنا ہو جائے گا۔ دوسری طرف پنڈت جی کہتے ہیں کہ دیش کو ایک راشٹر بننے کے لئے ایک راشٹر بھاشا یعنی قومی زبان کی ضرورت ہے اور اس میں عوام کی سمجھ کے مطابق دیسی الفاظ کی ضرورت ہے [illegible] سنسکرت کے الفاظ زیادہ شامل ہونے چاہئیں تاکہ دوسرے صوبے والوں کے لئے ہندوستانی زبان اور قابلِ فہم ہو۔

میں ان دلیلوں کے صحیح اور معقول ہونے یا نہ ہونے سے بحث نہ کروں گا، بلکہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آیا یہ خطرات اور نظریے لسانیات کی نظر میں بھی معقول و صحیح ہیں یا نہیں، اور علم و زبان کی میزان میں ان کا کتنا وزن اُترتا ہے؟ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان بننے کے نظریے کو سمجھا جائے۔

انگریزی ماہرینِ زبان میں ٹریننچ کا مطالعہ ہے۔ لسانیات کی بحثوں میں اس سے حوالہ اکثر دیا جاتا ہے اور کام نہیں چلتا۔ ٹرینچ سے پہلے لسانیات کی بنیاد اس نظریے پر تھی کہ دوسری ایجادوں اور صنعتوں کی طرح جو انسان نے اپنی زندگی کو بتدریج سہل اور اپنے معقول بنایا، زبان بھی ایک ایجاد اور صنعت ہے۔ اس کی شرح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انسان نے اس دنیا میں آکر اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں ایجاد کیں اور بنائیں اور پھر ان میں آہستہ آہستہ ترقی دیتا رہا، اسی طرح اس نے زبان ایجاد کی اور اس میں ترقی دیتا رہا، شروع میں وہ بے معنی آوازوں سے کام لیتا ہوگا، پھر خاص خاص چیزوں کے لئے خاص آوازیں مقرر ہوئی ہوں گی، کچھ اشاروں سے مدد لی گئی ہوگی (جو وہ آج بھی کرتا رہتا ہے) اور اس طرح ترقی پاتے پاتے زبان انسانی خیالات و محسوسات کے اظہار کا حیرت انگیز ذریعہ بن گئی۔

ٹرینچ کو اس نظریے میں یہ نقص نظر آیا کہ اس کا [illegible] ہونے کے بعد زبان انسانی زندگی کا ایک اتفاق (Accidental) قرار پاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایسی انسانی جماعتوں کا تو [illegible] ہے جو بہت سے اُن ایجادوں اور صنعتوں سے معرا اور محروم ہیں جو ہمارا زبان بہت کم درجے پر ٹھہری ہیں، لیکن ایسا کوئی گروہ انسانی نہیں پایا گیا جو تمدنی ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں ہونے کے باوجود کوئی زبان نہ رکھتا ہو اور اُسے استعمال نہ کرتا ہو۔

چنانچہ ٹرینچ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کے دورِ وحشت و حیوانیت میں بھی اس کے اندر حیوانیت سے نکل کر مدنیت کی منزل میں پہونچ جانے کا بیج موجود تھا۔ قدرت نے اگر اس کے اندر یہ استعداد نہ رکھی ہوتی تو یا تو وہ حیوانیت ہی کی منزل میں رہ جاتا یا اُس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا یعنی انسان انسان نہ بن پاتا۔ اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قدرت نے انسان کو زبان بالکل اسی طرح بخشی جس طرح اُسے عقل عطا کی۔ لفظ ہی عقل ہے اور لفظ [illegible] آئینہ ہیں عقلِ انسانی اپنی صورت دیکھتی ہے

لفظ اور عقل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یونانی زبان میں ان دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدا ہی میں انسان لغت اور قواعد کی کتابیں بغل میں دابے رونما نہیں ہوا لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ اس کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی قابلیت و صلاحیت موجود تھی اور اس قابلیت و استعداد کا موجود ہونا بھی ہرگز کارآمد نہ ہوتا اگر انسان کے اندر یہ فطرت بھی موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنی اُس استعداد کو بروئے عمل لے آئے۔

ان دلایل کے بعد ترجیح یہ فیصلہ کرتا ہے کہ زبان نہ تو تمام تر انسانی ایجاد اور اس کی کوشش کا نتیجہ ہے اور نہ بالکل ایک عطیۂ فطرت ہے۔ زبان کے وجود میں لانے کے اندر انسان اور قدرت، دونوں کی کارفرمائی کو دخل ہے اور یہ بات فہم عامہ کے بالکل مطابق ہے۔ معمولی عقل والا بھی جب زبان کے مسئلے پر سوچنے بیٹھے گا تو پہلے اُس کا خیال بچوں کی طرف جائے گا کہ بے معنی آوازوں سے کام لیتے ہیں، پھر شاید وہ بہرے گونگوں کا خیال کرے کہ اشارے ہی ان کی زبان ہیں اور بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہونچے گا کہ زبان آپ سے آپ بنتی ہے۔

"ڈاڑھی اور گھٹے" کی مثال سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ انسانی ضرورت کے سامنے نہ توان کا ہندی ہونا رکاوٹ ثابت ہوا اور نہ ان کی ثقالت مانع ہوئی۔ اور ترجیح کا نظریہ یہیں سے ثابت ہوجاتا ہے۔

مسئلے کی علمی صورت جب یہ ہو تو ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں کسی کا یہ کہنا کہ ہماری زبان مٹائی جارہی ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ تمھیں اپنی بھاشا کو پروان چڑھانے کا حق ہے، نہایت مہمل اور خلاف عقل بحثیں قرار پاتی ہیں۔ اس حقیقت کو نظرانداز نہ ہونا چاہئے کہ بعض علماء نے صرف دو ہی طاقتوں کو مطلق مانا ہے۔ اس میں ایک تو محبت کا جذبہ ہے جس سے اسوقت ہمیں واسطہ نہیں، دوسری علم کی طاقت ہے جو ہماری اس گفتگو کا محور ہے۔

ظاہر ہے کہ علم کا کوئی مذہب نہیں، ہرچند کہ مذہب کا علم اپنی جگہ پر ہے۔ علم اُس کا ہے جو اُسے حاصل کرے۔ زبان کا بھی ایک علم ہے، زبان ان کی ہے جو اُسے بولیں۔ آغاز میں جن لوگوں نے چہرے پر "اللہ کے نور" اور پیشانی پر "کوہ نور" کے لئے "ڈاڑھی اور گھٹا" کے لفظ قبول کرلئے وہ بہر حال آج کل کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے، اس لئے کہ قرنِ اول سے کئی سو سال قریب تر تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ذہن میں "ہماری تمھاری" زبان کا کوئی تخیل ہو سکتا تھا۔ اُن کے ذہنوں میں اگر اس خیال کا شائبہ بھی ہوتا تو ہندوستان کی لنگوا فرینکا وجود میں نہ آسکتی تھی۔ بلکہ پرانی کہاوت کے مطابق پانی کے ہوتے ہوئے "آب آب" کہتے مرجاتے۔

اب چونکہ زبان کے بننے میں انسان کا بھی ہاتھ ہے اس لئے زبان کا پھولنا پھلنا اس کے بولنے والوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ہوگا اور چونکہ زبان کے وجود پذیر ہونے میں قدرت کی کارفرمائی بھی شامل ہے اس لئے جب حالات و اسباب بدلیں گے زبان میں تبدیلی آجانا لازمی بات ہے اور چونکہ یہ کارخانۂ دنیا قایم ہی تغیر پر ہے تو زبان کی تبدیلی کو روک سکنا انسان کی قدرت میں بھی نہیں۔ علم زبان کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ماہرینِ لسانیات نے یہ کلیہ تسلیم کرلیا ہے کہ تیس سال کی

مدت میں زبان کے اندر تبدیلی ہو جاتی ہے۔ الفاظ کے مفاہیم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کچھ الفاظ ترک ہو جاتے اور کچھ داخل ہو جاتے ہیں۔

ضرورت اور تقاضے کی گفتگو میں یہ تاریخی حقیقت بصیرت افروز واقعہ ہے کہ سلطان محمود کے عہد کے کچھ سکے حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے برآمد کئے ہیں جن پر کلمۂ شریف کا سنسکرت ترجمہ دیوناگری حروف میں ٹھپہ کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی جا حیرت کا ہمالیہ ہے، لیکن اس ذکر میں حیرت کے لئے بڑی گنجایش باقی ہے بسم اللہ کا ترجمہ "آزکتیا نے" رسول کا "اوتار" اور محمد کا "جینا" کیا گیا ہے۔ بودھ اور جین متوں میں "جینا" معلم نہ دل کا لقب ہے۔ سلطان محمود کے بعد سے سولھویں صدی عیسوی تک مسلم بادشاہوں کے سکوں پر دیوناگری ٹھپہ ہوتی رہی۔ "تغلق عہد میں ایک سکے پر" شری سلطان غیاث الدین" ضرب ہوا۔ اور محمد تغلق کے روپئے پر ایک طرف لکشمی دیوی کی تصویر ضرب ہوئی تھی۔

میں واقعی متجسس ہوں کہ جنوری سنہ ۳۳ء کو جب محکمۂ آثار قدیمہ نے شملہ سے یہ بیان نکالا تو اسے پڑھکر بعض مسلمانوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ سلطان محمود کے ساتھ علیہ الرحمۃ کہا گیا ہوگا یا دیکھ، محمد تغلق کو کیا خطاب دیا گیا ہوگا؟ اگر اُس کے عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت وہ ہوتی جو آجکل ہے تو ان بادشاہوں کی لیاقت نہ ہوتی؟

ذہنیت کے ہندوانہ ہو جانے اور کلچر مٹ جانے کے متعلق ان چیزوں کے اجزائے ترکیبی کو سمجھ لینا ضروری ہے ورنہ کسی منطقی نتیجے تک نہیں پہونچا جا سکتا۔

اُردو زبان کا جایزہ لیا جاتا ہے تو اس میں تقریبًا اسی فیصدی الفاظ ہندی کے نظر آتے ہیں (افعال سو فیصدی ہیں) اور قواعد بھی کم و بیش یکساں ہیں۔ زبان اور الفاظ کے متعلق اس کے نکتے کو سمجھ لینا چاہیئے الفاظ داخل ہونے کے بعد ذہنیت کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ذہن کے اندر ان الفاظ کو قبول کرنے سے پہلے اتنی گنجایش پیدا ہو چکی ہے۔ مولانا حالی انگریزی ذہنیت کے انسان نہ تھے لیکن انھوں نے بعض انگریزی لفظ استعمال کئے جو آج بالکل غیر ضروری نظر آتے ہیں مگر اسوقت ان کی ذہنیت ان لفظوں کے قبول کے لئے طیار تھی اور اس وقت ان کی ضرورت بھی تھی۔ غرض، یہ اسی فیصدی ہندی الفاظ ہمارے اسلاف کی ضرورتوں اور تقاضوں نے اختیار کئے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہماری ذہنیت کو ہندوانہ نہ بنا سکی (یہ مفروضہ ہے ورنہ میرا خیال اس کے برعکس ہے)

ظاہر ہے کہ کلچر زبان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کلچر کی نمایش سب سے پہلے ہماری گفتگو میں ہوتی ہے۔ میں اگر "آپ" کی جگہ "تو" یا "تم" کہوں اور "جی" کے بدلے "ہو" یا "ہاں" بولوں تو یقینًا آپ مجھے شایستہ و مہذب انسان نہ کہیں گے پھر کیا اس صورت حال کو تعجب انگیز نہ کہا جائے گا کہ وہ دو لفظ جن کو میں ہر وقت استعمال کرتا اور اپنی شایستگی کا ثبوت دیتا ہوں ہندی الاصل ہیں؟ کلچر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تہوار اور تقریبوں پر نظر ڈالنا اور ان الفاظ کو دیکھنا چاہیئے جو اس وقت بولے جاتے ہیں۔

عام مسلمانوں میں شب برات جو خالص اسلامی تہوار ہے، جس طرح منائی جاتی ہے اس میں ہندوؤں کی دیوالی کی آتش بازی اور دیا جلانے کی رسم میں زیادہ فرق نہیں، پرکھوں کو پانی دونوں جگہ دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بیوی کی صحنک کی رسم بالکل وہی ہے جیسے ہندو عورتیں چوکھ جلاتی ہیں۔ تعزیہ داری کے اندر رام لیلا کی نقل کے بہت سے آثار ملتے ہیں۔ کالا دانہ اتارنا اور ٹوٹکے ٹونے ہندو مسلمانوں میں بالکل یکساں ہیں۔ ہندوؤں میں جس طرح مرض یا آسیب جھاڑا جاتا ہے مسلمان پیر اور سیانے بھی اسی طرح جھاڑتے ہیں۔ پیدائش سے پہلے، پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد کی رسمیں دونوں میں مشترک ہیں۔ بچے کا نال یکساں طور پر کاٹا جاتا ہے، دوران حمل میں ستواسا یعنی ساتویں مہینے کی رسم دونوں جگہ ایک ہے، گود بھرائی جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد چھوانی اور ستوڑا دونوں فرقوں میں تھا سے دونوں کے بچے کو چھٹی نہلائی جاتی ہیں اور یہ چیزیں اپنے ناموں سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ زچہ کو چھٹی یکساں طور پر نہلائی جاتی ہے اور تارے بھی ایک ہی طرح دکھائے جاتے ہیں۔ شادی کی رسموں میں نسبت یا منگنی، لگن پڑھنا یا تاریخ مقرر کرنا، دونوں میں ہے۔ شادی کے وقت سہرا اور کنگنا باندھنا، چیڑیاں اور ابٹن کے گوٹے اور رسے جاتے ہیں اور یہ رسمیں دونوں فرقوں کے عوام میں جاری ہیں۔ شادی کی رسمیں [illegible] دلہن بیٹی کو "بدائی" دی جاتی ہے۔ برات کی رخصت کے وقت "دودھ بھاتی" کی رسم عام ہے۔ [illegible] بیٹی کے گھر کھانے سے دیہاتی مسلمان ابھی تک پرہیز کرتا ہے۔ موت کی رسموں میں تیسرے دن کی قرآن خوانی کو پھول اور تیجہ بھی کہا جاتا ہے۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں [illegible] سب ہندوؤں کے ہیں۔ موتے کا کھانا مسکینوں کو اسی طرح کھلایا جاتا ہے جیسے برہمن جمائے جاتے ہیں۔ حاصل، پیدائش، شادی اور موت کی رسمیں سب مشترک ہیں۔ اب اور طرف بھی نظر ڈالئے۔

مسجد کے گنبد پر وہی کلس نظر آتا ہے جو قریب کے مندر پر دکھائی دیتا ہے۔ وضو کے برتن کو لوٹا یا بدھنا ہی کہا جاتا ہے اور یہ سب ہندی کے الفاظ ہیں۔ کلس تو خالص ہندوؤں کی ایجاد ہے۔ تعزیے کے اوپر کا حصہ چھتری کہلاتا ہے، حالانکہ ہندوؤں میں چھتری اس عمارت کو کہتے ہیں جو مردے کے پھولوں پر تعمیر کرائی جاتی ہے۔ الغرض یہ سب وہ چیزیں پیش کی گئیں جو مسلمانوں کے مذہبی یا نیم مذہبی معاملات سے متعلق ہیں اور تلاش سے اور بھی بہت گنوائی جاسکتی ہیں۔ کلچر کے ذکر میں یہ نکتہ سامنے آجانا اہم ہے کہ ایک قوم کے کلچر میں قدیم قوموں اور بعید ملکوں کے کلچر کی جھلکیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں مردے کے ساتھ توشے کی رسم اس حد تک ہے کہ ہم تعزیے کے ساتھ بھی توشہ دفن کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ پانچ ہزار سال پرانی رسم ہے اور قدیم مصریوں میں اس رسم کا وجود ملتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یوم حساب کو جب مردے اٹھیں گے تو انہیں بھوک لگے گی۔

ایک تاریخی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی ایک ہے اور یہ موسیقی مسلمانوں سے پہلے دھرپد اور الاپ تک محدود تھی اور عبادت کا ذریعہ تھی۔ مسلمانوں نے اسے سوسائٹی کی چیز بنایا اور اس میں خیال، ٹپہ، ٹھمری وغیرہ کا اضافہ کیا اور ہر زمانے میں مسلمانوں نے بڑے بڑے باکمال پیدا کئے ہیں۔ مسلمان اس موسیقی کو صدیوں سے سنتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی ان مسلمانوں کو نہیں گنتا جو جاز کی گت پر تھرکنے لگتے ہیں) وہ کلچر کے مدعی بھی اسی موسیقی سے انبساط حاصل کرتے اور

سر دھنتے ہیں۔ لہذا موسیقی کو اگر کلچر سے کوئی تعلق ہے اور اگر موسیقی کلچر کا کوئی جزو ہوسکتی ہے تو جو لوگ کلچر کے مٹنے کا اس کا کیا جواب رکھتے ہیں کہ ان کے اندر اس موسیقی کا پیدا کردہ جو کلچر ہے اسے کیونکر باطل قرار دیا جاسکے گا یا کس طرح نکال پھینکا جائے گا؟ ایک موسیقی کے ہوتے ہوئے دنیا کا کوئی ذی ہوش انسان تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے ہندو مسلم کا کلچر جدا ہے۔

ایک دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امیر تیمور کے پاس ہندوستان کے مسلم بادشاہوں پر حملہ کرنے کا شرعی حیلہ ان کا ہندوؤں سے مماثل ہو جانا ہی تھا اور تیمور کے زہد و تقدس مذہبی کو گوارا نہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں میں اس طرح گھل مل جائیں جس طرح وہ اس وقت شیر و شکر ہو گئے تھے۔

آج بھی جب جداگانہ کلچر کا اس قدر غوغا ہے انھیں جداگانہ کلچر کے مدعیوں کی بیگمات ماتھے پر بندیا لگا کر ان کو جھوٹا ثابت کر رہی ہیں اور اگر ان حضرات کے گھر میں "کفر" کی یہ تقلید نظر آتی نہیں ہوتی تو لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کے ہر گلی میں مسلم خواتین کے ماتھوں پر یہ سرخ ٹیکا دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض نفیس طبع حضرات اردو سنسکرت کے بعض ثقیل و نامانوس الفاظ سے چڑھ جاتے ہیں اور جو اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ شکر خند فرما کر ہی خوش کر لیتے ہیں۔ میں ثقیل و نامانوس الفاظ کا حامی نہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں کو علمی اور عملی طور سے اس معاملے کو سمجھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ ثقالت کا مدار الفاظ کی اجنبیت پر ہے اور مانوس ہو جانے کے بعد ثقالت از خود باقی نہیں رہتی۔ روزانہ یہ حضرات سیکڑوں الفاظ ایسے بولتے ہیں جو نہایت ثقیل ہیں مگر ان میں ان کو ثقالت دکھائی نہیں دیتی۔ چند الفاظ پیش کرتا ہوں جن کا کوئی صحیح مترادف بھی نہیں۔ رگڑا، گھٹا ٹوپ، نٹ کھٹ، جھٹ پٹا، الٹ پلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ ان لفظوں سے کم ثقیل نہیں جن کو آج ثبوت میں لایا جا رہا ہے۔ فرق صرف مانوس و نامانوس ہونے کا ہے۔

الفاظ کی ثقالت کے باب میں لسانیات کا یہ مسئلہ ان بزرگوں کے سامنے نہیں ہے کہ تحریری لفظ صرف ایک علامت ہے صوتی لفظ کی لیکن مشہور ماہر لسانیات سر ریچرڈ ٹیمپل کا قول ہے کہ اصل لفظ صوتی لفظ بھی نہیں آواز بھی اصل لفظ کی اشارات و علامت ہے اس لئے کہ اصل لفظ تو وہ حرکات ہیں جو ہمارے اعضائے نطق یا مخارج صادر کرتے ہیں اور ان مخارج کے حرکت کرنے کا نتیجہ ہمارے سانس لینے کا نتیجہ آواز ہے۔ مگر چونکہ ہمارے یہ نظر نہ آنے والے حرکات و اشارات اپنے ثانوی وصف یعنی آواز کے ذریعے سے ابلاغ یعنی (Communication) ہوتے ہیں اس لئے آواز کو ان حرکات کی علامت (Symbol) قرار دے لیا گیا ہے۔

اس اصول کے تحت جب دیکھا جاتا ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی خصوصیت کی مالک ہے کہ اس میں انسانی حلق سے نکلنے والی ہر آواز کے لئے حرف موجود ہے، اور ہمارے گلے کی ساخت ہر تلفظ کو ادا کر سکتی ہے تو پھر ثقالت پر ناک بھوں چڑھانا فطرت کا منھ چڑھانا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی ثقالت پسندیدہ شے نہیں لیکن فطرت نے ہمارے گلے کی اگر بناوٹ ایسی رکھی ہے تو اس سے شرمانا کونسی عقلمندی ہے؟ بلکہ اس خصوصیت سے کام نہ لینا کفران نعمت کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال ضرورت کے وقت ہی بزرگ

اس بات کو فخریہ بھی بیان کرتے ہیں جو میری ناچیز رائے میں بالکل بجا و درست ہے۔ اس ضمن میں "چیچر کھٹ" کا لفظ یاد دلا دینا کافی ہوگا یہ مرکب لفظ ہے اور چیچر اور کھاٹ، دو لفظوں سے بنا ہے۔ اس کے اندر اجزائے ثقل بھی ہیں لیکن اسکے مفہوم میں جو نزاکت و راحت، عشرت و تمول کے معنی پائے جاتے ہیں مفہوم ادا کرنے کے لئے دوسرا لفظ تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

کسی زبان میں ایک لفظ کے متعدد معنے اور ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ ہونا ہی اُس زبان کے تمول کی نشانی ہے اور اس حقیقت پر ہمارے شعراء بہتر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ بعض وقت کسی لفظ کا ایک رکن کم یا زیادہ ہونا کس ذہنی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور بالآخر یا تو خیال ناقص طور پر ادا ہوتا ہے یا اس کا خون ہی کر دینا پڑتا ہے، اور اس صورت میں خود شاعر کا دل خون ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بات زبان کی ضرورت میں داخل ہے کہ اس کے اندر ہم معنی اور قریب المفہوم الفاظ کی کثرت ہو۔ ہمارے موجودہ ذخیرے میں ایسے مترادفات ہیں اور ان سے خاطر خواہ نفع بھی پہونچتا ہے۔ شجر اور درخت کے ہوتے ہوئے پیڑ کا لفظ بھی ہے۔ بدررو کے ساتھ موری اور نالی کے الفاظ بھی ہیں، جو کبھی ہماری زحمت کا موجب نہیں ہوتے پھر اگر مضمون یا موضوع کے لئے منشے، وطن کے لئے جنم بھوم، ملک کے لئے راشٹر بھی ہوں تو عقلاً کسی قباحت کا امکان نظر نہیں آتا۔

ضرورت اور غیر ضروری کی دلیل بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ مگر یہی زبان کے یہ نادان دوست غور سے کام لینا پسند ہی نہیں کرتے۔ انگریزی میں (Wood or Forest) کے لفظ موجود تھے مگر آج نہیں بلکہ اُسوقت جب ہندوستانی کالا آدمی اور اس کی زبان غلاموں کی زبان سمجھی جاتی تھی، انگریزی میں "جنگل" کا لفظ لے لیا گیا اور کسی انگریز نے اعتراض نہیں کیا کہ بلا ضرورت "نیٹو" لفظ کیوں لیا گیا ہے۔ چینی زبان میں ایک لفظ ہے "کاؤٹاؤ" اور اُس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے "جی حضوریوں" کا فعل ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت اسلوب ہو سکتے تھے، لیکن یہ لفظ بھی لے لیا گیا اور کوئی معترض نہ ہوا کہ یہ ٹیڑھا بانکا تلفظ ہم سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔

پرانے ادب پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں اور ہر شخص معمولی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ زبان کے اندر رد و قبول کا فطری عمل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنے اس عمل کے لئے ہمارے کسی اکسانے یا ہماری کوشش کی ضرورت مطلق نہیں ہوتی۔

جہانگیر کو الفاظ میں اصلاح و تصرف کرنے یا نئے لفظ گھڑنے کا شوق تھا۔ اُس نے بہت سے لفظ بنائے۔ چہار شنبہ کو کم شنبہ اور پنجشنبہ کو مبارک شنبہ کہا مگر کسی نے نہ مانا۔ نور جہاں نے ایک خاص قسم کی چوڑیاں وضع کیں، ان کا نام جہانگیری رکھا آجتک جہانگیریاں کہلاتی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم نے کچھ انگریزی الفاظ کے ترجمے کئے اکثر نا مقبول ہوئے۔ سوسائٹی کے لئے ہم نے ہیئت اجتماعیہ جاری کرنا چاہا، معاشرہ تجویز کیا، مگر مخصوص تحریروں سے باہر کسی کی زبان پر نہ چڑھے اور ہمنے مطلق کوشش نہیں کی مگر اسی معنے میں سماج کا لفظ چند روز کے اندر عام ہوگیا۔ گارڈن پارٹی کو ہر کوئی سمجھتا ہے مگر عصرہ کا لفظ ان دعوتی کارڈوں ہی پر چھپا ہوا ملیگا۔ پبلک کے مفہوم میں ہم نے جمہور کو رواج دینا چاہا، اخباری صفحوں

سے باہر نہ جا سکا، پبلک نے اسے پبلک ہی کہا اور اب جنتا کو بھی پسند کیا جا رہا ہے۔ نیا کراچی کے مفہوم میں جمہوریت ہر وہ آدمی سمجھتا ہے جو پبلک جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ اب شاید اس کی جگہ جنتا رچ کر لی جائے۔ لا یعمل پڑھے لکھوں کی زبان سے بھی مشکل ادا ہوتا ہے لیکن پروگرام کا لفظ ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے۔ ایسٹ انڈین ریلوے نے ایک گاڑی چلائی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کا نام طوفان میل کس نے رکھا، مگر ہندوستان کے کونے کونے میں یہ نام پھیل گیا اسی نام کا ایک فلم بھی بن گیا عوام کے اندر ضرورت، مشین، پیٹینٹ، پٹیشن، قطعی، فیور یعنی طرفداری، پیشہ یعنی [illegible] پارٹی یعنی جتھہ داری، عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور بھی کچھ الفاظ حال میں داخل ہو گئے اور زبان نے ان کو اپنا لیا ہے۔ مثلاً [illegible]، سنگھٹن، نیتا، سامراج وغیرہ غرض زبان مسلسل طور پر ایک [illegible] جاندار چیز ہے۔ وہ ہر لفظ کو الٹ دیتی ہے جو اسے نامرغوب ہو اور ہر اس ثقیل اور بادی چیز کو بھی ہضم کر کے خون بنا لیتی ہے اس کی طاقت قبول کر لے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن میں جو زبانوں کے بننے، بدلنے اور بگڑ جانے کے اصول سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں وہ عام طور سے چالو زبان سمجھے جاتے [illegible] سک اور ہلکے لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے الفاظ ٹھونس رہے اور ایسی ہی بھاشا بنا لینے کی دھن میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان لوگوں نے جو فائدہ سوچا ہے وہ حاصل ہو جائے لیکن متحدہ قومیت جس کا وہ پرچار کر رہے ہیں ہرگز نہیں بنا سکتے۔ مصنوعی طور پر چند الفاظ لکھ لیں اور بھاشنوں میں استعمال کیے تو جا سکتے ہیں مگر ان کا چند روز بعد مر جانا ممکن ہے لیکن چل جانے کی صورت میں بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس کی جو قیمت دینا ہوتی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ ایک تو خود ان بھاشنوں کا مطلب پورا نہیں ہوتا کیونکہ ان الفاظ کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔ دوسرے اسی بنا پر باہمی اختلاف بڑھ جاتا ہے جو قومی نقصان ہے۔ کچھ زبان کے اندر مقبول ہو جانے کی صورت میں بھی [illegible] جہاں تک اس کا تعلق ہے وہ اسی خصوصی ہندی لفظ بولنے کے بعد بھی ہم یہی سوچیں جہاں تک یوپی کے ہندوؤں کا تعلق ہے آپ یہ تعصب مطلق نکال دیں [illegible] بنا رہا ہے اور جہاں تک دوسرے صوبوں کے لئے [illegible] بھاشا کا [illegible] کا تعلق ہے گجراتی، مرہٹی اور بنگالی جیسے سے عربی فارسی الفاظ کی کافی آمیزش ہے اور [illegible] آج ہی [illegible] زبان میں داخل ہونے سے اگر [illegible] ادبی نقصان متصور ہو سکتا ہے تو وہ نقصان تو پہنچ چکا اور سنسکرت یا [illegible] بڑھا دینے سے اگر [illegible] کوئی نقصان [illegible] ہو سکتا ہے تو وہ بھی پہنچ چکا تلاش اس کی ہونا چاہئے کہ آخر وہ نقد مداوا کیا؟

ان بحثوں کے ساتھ یہ بات بھی ہونا چاہیے کہ فارسی تو سنسکرت کی ماں جائی ہے۔ فارسی سے تعصب کر کے [illegible] چھینک پر اپنی ناک کاٹنا ہوگا۔ فارسی اردو تو آریائی نسل کی زبانیں ہیں، اب رہ گئی [illegible] زبانیں سو ان کو سنسکرت سے قریب لے آنا لغو دلیل ہے۔

"ہماری تمہاری زبان" کے قضیے میں اگر یورپ کی اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو یہ ایک مفید بات ثابت ہو۔ یورپ کے بین الاقوامی معاملات میں ایک مدت سے اور بالکل فطری طریق پر فرانسیسی زبان استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے

جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان پر انگریزی ... ہمارے ان پر نہ تو فرانسیسیوں نے ، ڈچ نے اور نہ انگریزوں نے کوشش کی تھی ہمارے ان پر چینی صحیفوں نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا ۔ سنسکرت صحیح معنی میں کسی وقت بھی عوام کی بول چال نہیں بنی اور وہ اس تاریخی حقیقت سے بھی آنکھیں چرا رہے ہیں کہ عوام کی ضرورت نے جب پالی کو رائج کرکے سنسکرت کو بار دیگر پھر پرے کر دیا تھا ۔ اس زمانے کو بیتے ہوئے ڈھائی ہزار برس ہو چکے ہیں اور پھر دیکھنا یہ ہے کہ سماج نہیں انسانی ترقی ایک منزل سے دو دفعہ نہیں گزرتا ۔ ہمارے یہ بھائی دنیا کے سامنے اپنے آپ کو تیا جوڑنے میں ممکن ہے کہ کامیاب ہو بھی جائیں ، کیونکہ یہ زمانہ ہی پروپگنڈے کا ہے ، لیکن وہ خود اپنے ساتھ سچے نہیں ہیں ۔ آج بھی وہ اپنے بیوی بچوں سے اسی بولی میں بات چیت کرتے ہیں ، وہ نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے لیکچر لکھتے اور دیا کرتے ہیں ۔ انھیں وچار نہیں کہ ان کے لیکچر اور دیا کھیان جنتا کو متاثر نہیں کرتے کیونکہ جنتا ان کو سمجھتی نہیں ہے ۔

علمِ زبان کے ماہروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ الفاظ قومی شاعری ، قومی نفسیات اور قومی تاریخ ہیں ۔ قومی ایک علمی اصطلاح ، بین الاقوامی لفظ ہے اور اس کا مفہوم ان ہزاروں آثارِ حیات سے ہے ، جو زمین کے پیٹ میں سے نکالے جاتے ہیں ۔ اب اگر یہ صحیح ہے کہ یہ پراچینی بھائی ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر یادگار کو مٹانے پر تل گئے ہیں تو ان بھائیوں کو پھر ایک دفعہ وچار کر لینا چاہئے کہ ان کا یہ خیال کہاں تک مستحسن ، کس حد تک ٹھیک اور کس طرح قابلِ عمل ہو سکتا ہے ۔ زبان کے بارے میں تو ان کی یہ کوشش غیر فطری ہے اس لئے ناکام رہنے والی ہے ۔ لیکن اگر بحث کی خاطر مان لیا جائے کہ کامیاب بھی ہو جائے گی تو کیا ان بھائیوں کے سامنے یہ حقیقت نہیں آئی کہ وہ خود اپنی کئی صدیوں کی تاریخ معاشرت کے خزانے اپنے ہاتھوں غارت کر بیٹھیں گے ؟ کیا اس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی رواداری اور بھائی چارے کی زندہ شہادتوں کو فنا کر دیں گے ؟ یہ مہاشے اس عظیم حقیقت کو نہیں دیکھ رہے کہ تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ نہیں کیا جا سکتا ، اور اگر وہ ایسا ایجرت دکھا بھی سکے تو آج کی دنیا کے نقشے میں اسے کیسے بٹھائیں گے ؟ یہ پنڈت جواہر لال کے لفظوں میں (Put the clock back) کیسے کریں گے ۔ یہ سچن ایک اور سچی بات سے بھی مونھ چھپا رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زبان اور کلچر کی محافظ اور رکھوالی عورت ہے ۔ اور آج ہندوستان کی عورت نئی سڑک پر چل پڑی ہے ۔ پچھلے پچاس برس میں یہ بھائی سنسکرت اور پراچینی سبھتا کا پرچار کرنے کے بعد کیا پھل پا سکے ؟ ہندو گھروں اور ہندو عورتوں کی بدلتی ہوئی حالت تو نئی روشنی کی طرف لئے جا رہی ہے ۔ یہ بھائی اگر آج کی حالت پر سے آئندہ وقت کا اندازہ لگا سکیں تو اپنی عورتوں کو دیکھ کر اس کا بدلتا ہوا تصور انھیں اپنی کوشش سے ہاتھ اٹھا لینے پر مجبور کر دے گا ، اور اگر گزرے زمانے کے حالات پر آئندہ زمانے کے بارے میں قیاس قایم کر سکتے ہیں تو سوشلزم یا سماج واد تحریک کو نیشنل کانگریس کی پچھلے پچیس برس کی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے سے اجاگر ہو جائے گا کہ دیش میں آگے چل کر سماج واد کے وچار پھیلیں گے اور سماج واد " پراچینتا پاگل پن " کو ایک منٹ کے لئے نہیں سہار سکتا اور اس کی ایک وجہ ہے ۔ وہ وجہ یہ ہے کہ

سماج واد کی تحریک عالمگیر تحریک ہے، غریب مزدور اور کسان کی تحریک ہے۔ ان بھائیوں نے اس بات کو کیوں نہیں دیکھا کہ یوپی میں بیٹھ کر جو ملک کو تین ہزار برس پیچھے لیجانا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ پنجاب جائے گا کہ مدراس؟ بمبئی جائے گا کہ بنگال؟ یوپی میں سے آخر یہ سارے ہندوؤں کو ساتھ لیجا سکیں گے؟ کشمیریوں اور کایستھوں یا سانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے لیں گے، بلکہ کسان اور مزدور اپنے حق کو سمجھنے اور مانگنے لگ گیا ہے۔ پراچین زمانے میں تو ان غریبوں کی مانگ تو کہاں، ان کو اپنے جینے کا بھی حق معلوم نہ تھا۔ یہ بھائی خود نہیں سمجھتے ہیں کہ ٹیلیفون اور ٹائپ رائٹر، ریل اور موٹر، ریڈیو اور ہوائی جہاز کے نئے پراچین زمانے میں بنگ کیسے نکلے گی؟ تعلیم کا انتظام بدلا جا رہا ہے، انڈسٹری پلاننگ ہو رہا ہے اور تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ کیا جا رہا ہے، اسی کو دنیا طرفہ تماشا کہتی ہے۔

الغرض، اگر ملک کی تاریخ میں ہزار آٹھ سو سال کا زمانہ سادہ اور خالی رکھنے کی ٹھان لی گئی ہے تو دنیا اس کو پاگل پن کے سوا دوسرا نام نہ دے گی۔ میں جتنا غور کرتا ہوں سمجھ تو یہ دھن اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی کہ کوئی آدمی سر کو پہاڑ سے ٹکرانے لگے۔ صرف ایک زبان کا مسئلہ اتنا بڑا ہمالیہ ہے جسے اٹھانا تو بڑی بات ہے، چکایا نہیں جا سکتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک مال کا قانون ایک ہی سا ہے اور مسلم عہد کی یادگار ہے۔ اس کی اصطلاحیں مسلم زمانہ ہی سے جاری ہیں اور جس طرح درخت جڑ پکڑ لیتا ہے زراعت پیشہ ہندوستان کے اندر جڑ پکڑ چکی ہیں۔ یہی ضابطہ فوجداری اور عدالت دیوانی کی تمام اصطلاحیں دیہات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ دکھنی ہندوستان میں نہیں بلکہ مدراس علاقے میں میراث دار وغیرہ قسم کے الفاظ رائج ہیں۔ بنگلہ میں آئین اور آدم شماری قسم کے ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ یہاں تک چھانٹے جائیں گے؟ اور ان کے قائم مقام لفظ آئیں گے کہاں سے؟ گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ سے اگر عربی فارسی چھانٹ دی جائے تو بولیاں رہ جائیں گی۔

ان بھائیوں نے خود ہندی کی پوری جانچ نہیں کی ورنہ ان کو دکھائی دیتا کہ عربی فارسی کے بہت سے لفظ ہیں جن کے ہم معنی لفظ اگر ہندی میں تھے تو اب ناپید ہیں۔ ان کو نکال کر سنسکرت کے الفاظ رائج کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا۔ یوپی کے شہروں میں ایسے بہت سے لفظ رائج ہیں۔ برات کی رخصت کو بدا کہا جاتا ہے، زچہ اور بچہ کے لئے ہندی لفظ نہیں ہے۔ جہیز یا دہیز گاؤں گاؤں میں بولا جاتا ہے۔ کانگریس کی تحریک سے پہلے چرخہ کل ہندی لفظ تھا۔ منگنی کے وقت جہیز ٹھیرانے کو کرار داد کہا جاتا ہے۔ دولہا نوشہ اور اس کے ساتھ شہ والا عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ دولہا جامہ ہی پہنتا ہے۔ شربت نوشی کی رسم کثرت سے ادا ہوتی ہے۔ پنجاب کے ہندوؤں میں "پلنگ اور چرخہ" جہیز کی خاص چیز ہے۔ برت کھولنے کے لئے برفی، قلاقند، خرما، بالوشاہی، گلاب جامن، اور حلوا ہی کھایا جاتا ہے۔

میری سمجھ کام نہیں کرتی کہ مٹھائیوں کے نام بدیسی ہیں مگر انھیں بدلا کیسے جائے گا اور کیا یہ بھائی ان تمام پھلوں کا کھانا چھوڑ دیں گے جو مسلمانوں کے ساتھ آئے؟ سیب، سردہ، خربوزہ، خوبانی، کشمش، بادام وغیرہ اپنے ناموں سے

فارسی ہونا بتا رہے ہیں کیا وہ گلاب کا دکھنا چھوڑ دیں گے۔ لحاف اور رضائی کا دوسرا نام کیا رکھیں گے۔ سید ایوانی تو یقیناً کریں گے مگر خرم شکھو لگنے کے لئے کونسا لفظ ایجاد کریں گے۔ آج کل کے اصولِ صحت نے بھی پیتل کے برتنوں میں اندر کی طرف قلعی ضروری قرار دیدی ہے، کیا یہ بھائی اب قلعی نہ کرایا کریں گے؟ ہندوستانی سنگیت کو مسلمانوں نے جس بلندی پر پہونچا دیا کیا یہ بھائی اس پورے حصہ کو سنگیت ودیا سے خارج کر دیں گے؟ کیا خیال کا گانا چھوڑ دیں گے؟ اچھا مسلمانوں کی تہذیب کے جو افراد صدیوں سے ان کی سرشت بن گئے، خون کے ذرے بن گئے ہیں، ان کو جدا کرنا کیونکر ممکن ہوگا؟

دیہاتیوں اور عوام کو سمجھانے کے لئے سنسکرت الفاظ کا استعمال بھی نامعقول دلیل ہے۔ گردن اور کمر کے لئے ہندی کا کونسا لفظ استعمال ہوگا۔ ان لفظوں کو ہر دیہاتی سمجھتا ہے اور کمر کے لفظ ہی سے اس نے ایک کپڑے کا نام کمری رکھ لیا جس کی لمبائی کمر تک ہوتی ہے۔ حسن اور حسین سندرتا اور سندر کے لئے ہوئی بولی کے دیہاتی بلوک کا لفظ بولتے ہیں جو صورت کے اعتبار سے عربی ہے۔ اس قسم کی مثالیں گنوانا مقصود نہیں ان سے تو کتابیں بھر جائیں گی۔ مقصد تو امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے

ان بھائیوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، انہیں نہیں معلوم کہ وہ ان کے لئے کیا ہے کبھی رامائن اور کبیر، سورداس کے دوہے اور سنتوں کی کانٹ چھانٹ کر سکیں گے؟ پدماوت کو جلا دینے اور رحیم اور دوسرے مسلمان کویوں کی کوتاؤں کو گنگا میں بہا دینے کے بعد ہندی بھاشا کی کیا صورت رہ جائے گی اور کیا اس جنون میں دہلی کی مسجد اور آگرے کے تاج کی بنیاد بھی اکھاڑ پھینکیں گے جو مسلمانوں کی نشانیاں ہیں؟

ان بھائیوں نے اگر اپنا طریقہ نہ بدلا اور ٹھونس ٹھانس جاری رکھی تو چند افعال کے سوا باقی زبان دوسری جماعت کی سمجھ سے باہر ہو جائے گی۔ پھر کیا ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کے لئے انگریزی ہی رکھی جائے گی؟ لیکن جب آج بھی مسلم صوبے اور ہندو صوبے ہیں تو کیا پچھتر فیصدی پچیس فیصدی حجازیوں کو سمجھنے سمجھانے پر مجبور نہ ہوں گے اور اس کے برعکس بھی؟

الحاصل میں ذاتی طور پر اسے نہیں مان سکتا کہ ہندو قومی اعتبار سے مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو اسی تعصب کا اظہار انگریز سے نہیں کرتا، حالانکہ قصور مسلمان اور انگریز کا ایک ہی ہے۔ البتہ مسلمانوں کی ایک خاص خطا بھی ہے یعنی اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر بھارت کو بہشت بھی کر دیا۔ اس کی سزا بے شک نفرت سے دی جا سکتی ہے اور نفرت ایک فطری جذبہ ہے گو کہ اعلیٰ و پسندیدہ نہیں۔ لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا ایسی نفرت کے متعلق یہی فیصلہ دے گی کہ وہ نفرت بھی کمینہ قسم کی نفرت ہے۔

بایں ہمہ چند سرپھرے دل کا خیال یا عمل ساری قوم کے سر نہیں تھوپا جا سکتا اور وہ وقت قریب ہے جب ہندوؤں میں اعلیٰ دماغ اور قوم پرست ہستیاں اس حرکت کی مذمت کریں گی۔ کیونکہ دیس میں اگر ایک آدمی بھی ایسے وچار رکھتا ہے تو وہ دیس کے لئے

کلنگ کا ٹیکا ہے۔

زبان کے بارے میں پھر یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو چیز غیر فطری ہے کبھی مروج نہ ہوگی اس لئے جتنی وہ کوشش احمقانہ ہے اتنا ہی اس سے ڈرنا بے معنی۔

اب حضراتِ اُردو ہوں یا پراچینی مہاشے، اس سے انکار نہ کر سکیں گے کہ زبان سے ادب اور ساہتیہ وجود میں آتا ہے اور ادب قومی زندگی کا آئینہ اور اُس زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ ہے۔ دونوں کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ ہمارا ادب اور ساہتیہ نہ تو نوے فیصدی ہندوستانیوں کی زندگی کا آئینہ ہے اور نہ اُس نے اس زندگی کے سنوار سدھار میں اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہ کیا جا سکیگا کہ دنیا ایک زبردست ہلچل میں مبتلا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ایک بہت بھاری انقلاب ہے جو تیزی سے ہمارے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

ان واقعات کو دیکھنے کے لئے نہ تو دوربین کی ضرورت ہے اور نہ خوردبین کی۔ جنگ عظیم کے بعد سے عوام کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی ہیں، طبقاتی تنظیم بہت سے ملکوں میں ہو چکی شروع ہے اور یہ وہ خواب نہیں جس کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہوں۔ ہم اگر اپنے ذہن و خیال کے پٹ بند بھی کر لیں تو آنے والے طوفان کی تیز و تند ہوائیں ان کی چولیں ہلا ڈالیں گی اور ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ انسانیت کے مظلوم طبقوں کی بیداری جو دنیا میں نوے پچانوے فیصدی ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا میں انہیں کا راج ہوگا۔ اسوقت عوام کی زبانیں پھیلیں گی، جنتا اپنی تہذیب اور سبھیتا خود بنائے گی۔ اس لئے چاہے وہ اُردو کا ادب ہو یا ہندی کا ساہتیہ اپنی بقا کے لئے ان کو چولا بدلنا ہی پڑے گا۔ اُردو میں ایسے بے شمار اسلوب در آئیں گے جن کو عوام سمجھتے ہونگے ہندی سے وہ شبد نکال پھینکے جائیں گے جن کو جنتا سمجھتی نہ ہوگی۔

زبان کی موجودہ چپقلش اصل میں زبان اور کلچر کی نزاع نہیں بلکہ مفاد اور اغراض کی چپقلش ہیں۔ مخصوص اور قابو یافتہ طبقے، ہندو اور مسلمان دونوں، اپنی اغراض اور اپنے تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے چالیں چل رہے ہیں۔ لیکن زبان اور کلچر کے بارے میں صرف فطری قانون کام کریں گے اور اُس فطری قوت کے سامنے نہ شیخ صاحب کی ضد قائم رہ سکے گی نہ مہاشے جی کی نفرت۔

فلسفۂ زبان کے ماہر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں وہ ہمارا باطن یعنی ہماری وچار آتما ہوتی ہے اور ہم الفاظ کے ذریعے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال، ہمارے جذبے، ہمارے احساس، ہمارے ارادے، اور ہماری خواہشیں الفاظ ہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور الفاظ ہی کے اندر چھپی رہتی ہیں۔ الفاظ اور ان کی ترتیب پر قادر ہو کر ہم اپنی دلی باتوں کو موثر طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں اور دوسروں کے الفاظ میں چھپے ہوئے معنی کو سمجھ لیتے ہیں، اور یہ قدرت ہمارے اندر ہی ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے ہم ہر چیز اور ہر بات کی جانچ کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور اُس جانچ کا جو نتیجہ ہوتا ہے اس کے اسباب و علل کا طویل سلسلہ ایک پل بھر کے اندر ہمارے خیال میں طے ہو جاتا ہے اور ہم نہیں سمجھتے

[illegible] ہو سکتی ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ [illegible] لینا انسانیت کا تقاضا ہے۔ پاسکل کے بقول، جس نے ہمیں اشرف بنا دیا ہو [illegible] فکر اور وچار ہے۔ انسانوں [illegible] دو جماعتیں جو ایک ہی خاک پاک سے بنی ہوں، ایک ہی زبان صدیوں سے [illegible] کے سوچنے کا طریقہ ایک ہو [illegible] دے وحقیر باتوں کے فرق کو قومیت اور کلچر کا اختلاف قرار دیں اور [illegible] ہوش و خرد کی بات تو نہ کہی جائے گی۔ دونوں جماعتوں کو عقل و خرد سے کام لینا ہی پڑے گا [illegible] اخلاق دیر تک زیادہ مدت نہیں جی سکتی۔

[illegible] مسلمانوں کا وجود ہے اور صدیوں سے ہے اور مسلمان ہندوستان کا قومی [illegible] ہیں [illegible] کی تعداد [illegible] تعداد نہیں جس کا [illegible] جس کو کہیں منتقل کر دینا ممکن، اور یہ بھی سوال ہے کہ [illegible] کی جائے۔

[illegible] کا دم بھرنا آجکل فیشن ہے، لیکن واقعاً دیکھئے تو اصلی [illegible] نسبتی ایک ہی ہے اور وہ ہندی کی یائے نسبتی ہے۔ عرب سے آنے والے بہت قلیل تھے۔ وہ عورتیں ساتھ نہیں لائے تھے۔ لہذا اس محدود یائے نسبتی میں کھوٹ تو یہیں سے ثابت ہو گیا۔ اب وہ مسلمان جو ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں انھیں [illegible] نسبتی یعنی "ہندی" کھری قرار پاتی ہے اور اُسی کی اکثریت بھی ہے یعنے مسلمانوں کا سواد اعظم ہندی ہے۔

چنانچہ محض عقیدے کی بنا پر اپنی قومیت جدا بنانا اور جدا کلچر کا دعوے کرنا لاطائل بحث ہے اور محض عقیدے کی بنا پر اپنے ہی گوشت و خون کو غیر سمجھنا اپنے اعضا کو کاٹ پھینکنے کی حماقت کے سوا دوسرا نام نہیں پا سکتا۔ جن انسانوں کا ملک و وطن ایک ہو، عادت و خصلت ایک ہوں، خیال و احساس کا طریقہ ایک ہو، خون و گوشت ایک مٹی سے بنے ہوں، غرض ہر لحاظ سے وہ معمولی و سطحی جماعتی فرق و اختلاف کے علاوہ ایک ہیں اور ایک قوم ہیں۔ جتنی کچھ غیریت تھی وہ خون کی آمیزش اور ہندوستان کی طویل وطنیت سے صدیاں ہوئیں کہ غائب ہو چکی ہے اور جن باتوں کا فرق گنوایا جاتا ہے وہ فرق تو ایک صوبہ کے ہندو اور دوسرے صوبہ کے ہندو میں، ایک صوبہ کے مسلمان اور دوسرے صوبہ کے مسلمان ہی میں نہیں بلکہ ایک شہر کے اور ایک گھر کے دو ہندوؤں یا دو مسلمانوں میں ملے گا۔ اس فرق و امتیاز کو جدا کلچر اور جدا قومیت کی وجہ قرار دینا عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔ اور یہ حقیقت جس قدر جلد محسوس کر لی جائے قوم و وطن کے لئے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔

علمائے زبان کا ایک اور فتوے بھی ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد الفاظ کی درآمد سے ڈرنا بے معنی معلوم ہوگا۔ الفاظ کے طبقے اور گروہ ہوتے ہیں، ان کے خاندان اور شجرے ہیں، ان میں اختلاط اور ہم جنسی ہوتی ہے، ان میں شریف اور رذیل ہوتے ہیں اور ان میں صحبت کے اثر سے اچھے بُرے ہو جاتے ہیں اور بُرے اچھے۔ چنانچہ جو لوگ زبان کے فلسفے سے واقف نہیں لیکن الفاظ کا استعمال کرنا جانتے ہیں وہ بھی بتا سکیں گے کہ ایک ہی مفہوم کے متعدد لفظ سامنے ہونے پر بھی ایک

مؤا ہے۔ لفظ کی تلاش کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا ہے اور کسی وقت ایک ہی [illegible] ہوتا ہے [illegible] ایک نیا تصور، نیا خیال، عبارت میں نیا زور پیدا کر دیتا ہے [illegible] والے کے ذہن و فہم میں ایک ایسے تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ وہ کبھی مصنف سے [illegible]

آج تک کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام الفاظ استعمال نہیں کر سکا۔ ایک مصنف انہیں الفاظ کو استعمال کرتا ہے جن کی روح معانی سے وہ آشنا ہو چکا ہے اور جن الفاظ کا ایک مصنف استعمال نہیں کرتا [illegible] کمال خوبی [illegible] کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک ہی مصنف مختلف موضوعات [illegible] مطالعہ سے [illegible] موضوع کے رتبے کے مطابق ہونا چاہئے۔ یعنی ایک ہی مصنف [illegible] ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں دور [illegible]۔ پھر ایک ہی سیاق و عبارت میں ایک لفظ [illegible] تصور پیش کر سکتا ہے اور لغت سے [illegible] لفظی جو حیثیت ہوتی ہے وہ عبارت میں [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] بھی ہوتے ہیں اور سخت و کرخت بھی، شیریں و تلخ بھی ہوتے ہیں اور نکیلے [illegible] ان کی یہ مختلف [illegible] ان تصورات کے مطابق ہوتی ہیں جو وہ ہمارے اندر پیدا کر دیتے ہیں۔

ان حقایق کو سمجھ لینے کے بعد مروجہ عربی فارسی الفاظ سے چڑھنا یا بعض سنسکرت الفاظ کے داخلے پر برافروختہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے اور زبان کے مذہب میں تو کیسر [illegible] الفاظ لغت کے اندر زیادہ سے زیادہ [illegible] لیکن ان کا استعمال تو میرے آپ کے ذوق و انتخاب پر ہے اور وہ ایک فطری طریقہ ہے۔ بولتے وقت میں آپ کو سمجھاتا ہوں، اور سنتے وقت آپ مجھے یعنی میرے معبود ذہنی کو سمجھنے کی کوشش پر مجبور ہیں۔ آپ اگر نہیں سمجھ سکے تو میرا کہنا بیکار گیا۔

ہماری زبان جسے خواہ اُردو کہئے یا ہندی، لیکن آئندہ وہ ہندوستانی کے نام سے جانی جائے گی اپنی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے [illegible] زبان ہے۔ تشریحات میں جانے بغیر میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان ضرورت انسانی کے تحت وجود میں آئی، فطری قاعدوں کے تحت پروان چڑھی۔ باہر سے آنے والی قوم کی ضرورت قوی تر تھی اس لئے ملک میں بسنے والی قوم کی زبان کے الفاظ زیادہ سیکھنا پڑے۔ مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو عربی، ترکی، فارسی بولتے ہوئے آئے ہوں گے، اور اپنے بدن کے اعضا اور رشتہ داروں کے نام ساتھ لائے ہونگے لیکن یہاں پہونچ کر انھوں نے خالص ہندی چیزوں ہی کے نام نہیں سیکھے بلکہ اپنے اعضا کے ناموں کے بدلے بھی ہندی اسما اختیار کر لئے۔ اعضائے جسمانی اور رشتوں کے نام دو چار کے سوا تمام ہندی ہیں۔

جہالت کے نتیجے میں [illegible] کر کے اگر کوئی قوم اپنی زبان کو محدود رکھنے میں بامراد ہو جائے تو اس کے لئے تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے وحشی و نامہذب ہونے کا اول ثبوت اس قوم کی زبان کا افلاس ہے اور اُسے پستی میں ڈالے رکھنے والی چیز بھی اس کی زبان کی [illegible] ہی ہے کیونکہ کسی [illegible] کو اتنا ہی علم ہو [illegible] جتنا ان لفظوں کے

رہتے تھیں، وہ سمجھتا ہے یعنی زبان کا دامن الفاظ بڑھے بغیر کوئی قوم ادبار کے گڑھے سے اُبھر نہیں سکتی - یہی بات اس رائے کی بنیاد بن گئی کہ جس طرح زبان خیال کے نئے نئے غذا بہم پہونچاتی ہے اُسی طرح ۔ اس کو محدود بھی رکھتی ہے۔ مسئلے کی علمی و منطقی صورت اگرچہ یہ ہے جو آپ نے دیکھی تو بھی ضرورت و غیر ضرورت کی غیر منطقی دلیل لاکر زبان میں الفاظ کے داخلے پر سنسر بٹھانا صرف زبان کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ اخلاقی خودکشی بھی ہے۔

جو لوگ منطقی طور پر سوچنے کے عادی ہیں وہ سبب و علت پر غور کرکے کسی نتیجے پر پہونچنا چاہتے ہیں۔ زبان کی موجودہ بحث و بحث میں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ آخر کیا اسباب ہو سکتے ہیں جو صدیوں سے ایک زبان بولتے بولتے ایک جماعت اس زبان سے بیزار ہو جائے جو باہمی رواداری، اور قومی یک رنگی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہو، جسے دو بڑی جماعتوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں نے پروان چڑھایا ہو

اس طرح پر غور کرنے سے سیاسی اسباب سب سے پہلے سامنے آتے ہیں اور غیر ملکی حکومت کے لئے ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی تکرار کو روکنے اور اپنا اقتدار برقرار اور جاری رکھنے کا آسان اور یقینی نسخہ یہی تھا کہ باہم پھوٹ ڈالدی جائے۔ یہ پالیسی کس قدر کامیاب ہوئی اس پر روشنی ڈالنا تحصیل حاصل ہے۔ سرکاری نوکری کی آپا دھاپی سے صدیوں کے جڑے دل پھٹتے گئے اور الیکشن کے ساتھ جداگانہ انتخاب نے اس پھوٹ کو پکا کر دیا۔ زبان کا شاخسانہ بھی سکوت کا کھڑا کیا ہوا ہے جس کی بنیاد ڈالنے کا کام سر انٹونی میکڈانل نے انجام دیا تھا۔ اختلاف کی اصل جڑ تو یہ تھی۔ لیکن قریبی اسباب میری ناچیز عقل کے مطابق یہ ہے کہ مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں احساس برتری بنکر رہ گیا تھا اور چونکہ اُردو کی ابتداء عوام کے میل جول کا نتیجہ تھی جو اس کے نام سے ظاہر ہے اور اسی وقت کی اسلامی سماج کا معیار شرافت مرتبہ اور دولت تھی، اس لئے جاگیرداری سماج عوام کو اجلاف یعنے رذیل کے نام پکارتی تھی۔ لہذا وہ زبان بھی شرفاء یعنے امراء کے نزدیک تحقیر کی نظر سے دیکھی گئی۔ اشراف جس میں ہندو و مسلمان دونوں شریک تھے اُردو لکھنا بولنا اپنی ذلت سمجھتے تھے۔ اس عندیے کا وجود غالب کے وقت تک تھا لیکن زبان انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ انسان زبان کے بس میں ہوتا ہے، اس لئے اس زمانہ کے شرفاء و امراء اسی اجلاف کی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور اُردو جس کا مفہوم ہی "سوقیت" تھا اب "اُردوئے معلّٰی" قرار پائی یہاں تک کہ وہ غالب جن کے لئے اردو تنگ تھی اُردو ہی میں ایک نشان راہ چھوڑ گئے۔

مسلمانوں کے اس احساس برتری میں بابر کا خیال کارفرما تھا جسے ہندو معاشرت میں ہر چیز قابل مضحکہ نظر آتی تھی اور اس لئے مسلمانوں سے یہ خیال کبھی ترک نہیں ہوا کہ وہ ہندوؤں سے برتر ہیں۔ چنانچہ ہندو ادبا و شعراء کے بہتر سے بہتر کلام میں بھی انھیں ہمیشہ "بوئے کچوری" آیا کی۔ اس خیال کا وجود شہر کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔

بظاہر یہ خاص وجوہ ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ہندو تعلیم یافتہ جماعت کو اُردو سے محبت کم ہوتی گئی اور دماغوں میں یہ بات جگہ بناتی رہی کہ اُردو ہی مسلمانوں کی زبان ہے

اس چیز کو ہماری ایک دوسری زبردست غلطی نے مدد پہونچائی اور وہ غلطی یہ تھی کہ برطانوی حکومت کی عیاری کو نہ سمجھ کر ہم ہندی کی تحریک کے مقابل بن بیٹھے اور زبان کے مشترک ورثے پر اپنے واحد حقدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ نواب محسن الملک کی لکھنؤ کی تقریر کے بعد ہندو ہندی کی تحریک پر مائل ہوگئے تو نواب محسن الملک گوشہ نشین کردئے گئے اور ہندی کی سرپرستی کی جانے لگی۔

اسوقت اگر مسئلے کو فریقانہ نظر سے نہ دیکھا جاتا تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ عدالتی سمنوں پر ایک طرف ناگری حروف میں بھی زبان چھپ جایا کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسے تبلیغ و تنظیم کے جواب میں شدھی سنگٹھن کی تحریکیں شد و مد سے چلیں، مگر جب ہم تھک کر بیٹھ گئے وہ بھی ٹھپ ہوگئیں۔

ان بنیادی غلطیوں کے ساتھ ہم نے ایک اور غلطی بھی کی، یعنی بیسویں صدی کے شروع میں ہم نے زبان کو مشکل اور کٹھن بنانا شروع کر دیا اور اس بات کو بھول گئے کہ اسے ہندو بھی پڑھتے ہیں۔ اب چونکہ اردو کی تعلیم حصول معاش کے لئے ضروری نہ تھی اور امتحان ہندی میں بہت آسانی سے پاس کئے جاسکتے تھے، ہندوؤں نے اپنے بچوں کے لئے اردو تعلیم کو بالکل غیر ضروری اور نقصان کا باعث سمجھ کر اس کا پڑھانا بند کر دیا۔

اسوقت بھی ہم ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسوقت ہماری ساری توجہ زبان کو آسان بنانے، کم سے کم قیمت پر کتابیں، اخبار اور رسالے چھاپنے اور اسکی تعلیم کو سہل بنانے میں صرف کرنا چاہئے، تعلیم بالغان پر انتہائی زور دینا چاہئے، مگر اس کے بدلے ہم بین وبکا اور شور و غوغا پر اتر آئے ہیں اور اس طرح تند اور جذبات کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔ یہ صورت اُردو کے حق میں خودکشی کے مترادف ہے۔

ہم شاید بھول گئے ہیں کہ دنیا دارالمکافات ہے اور کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا، ردعمل ضرور ہوتا ہے، یہ ایک فطری قانون ہے۔ زبان کی خود سرانہ فطرت ہماری متعصبانہ کارروائیوں کو تو چھپنے نہ دے گی لیکن جو ہندو آج اردو لکھ پڑھ لیتے ہیں کل وہ بھی اسے ترک کر دیں گے اور اردو کا حلقۂ اثر جتنا زیادہ محدود ہو جائے گا جو بالآخر نشر و اشاعت کی کمی کا باعث ہوگا۔ یہ حقیقت آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

آخر کلام پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لینا چاہئے اور ممکن ہے کہ یہ ہماری توجہ ہماری کوششوں کے دھارے کا رخ بھی بدل دے، کہ اس زبانی جھگڑے میں کس طبقے کے لوگ مبتلا ہیں؟ اس کا پتا چلانے کے لئے کسی گہرے سوچ اور غائر مطالعے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ دو مزدور یا دو دیہاتی زبان اور لپی کی بحث پر آپس میں لڑے ہوں یا انھوں نے کبھی ان چیزوں پر دھیان بھی دیا ہو۔ حقیقت میں ہندوستان کی پچانوے فیصدی آبادی ان چیزوں کے وجود سے بھی باخبر نہیں۔ ان کی سمجھ میں کبھی نہ آسکے گا کہ یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑے کی بات ہو سکتی ہے اور جسے قوم یا جنتا کہا جاتا ہے وہ انھیں پچانوے فیصدی مزدور کسانوں سے عبارت ہے۔ چنانچہ ایک حقیقت کا تلاشی

ایک بے لوث سوچنے والا یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ معناً یہ زرگری جنگ ہے۔

اس کے سامنے یہ تاریخی حقیقت آئے گی کہ جاگیرداری حکومت نے مسلمانوں سے پہلے اور مسلمانوں کے عہد میں بھی عوام کو یہ موقعہ ہی نہ ملنے دیا کہ وہ اپنی حالت پر سوچ سکیں اور بادشاہت کی اس اسکیم میں مولوی برہمنوں سے مدد لیگئی۔ چنانچہ ایک راجہ برہمن مشیر تو رکھتا تھا لیکن جوابدہ وہ کسی کے سامنے نہ تھا۔ ایک بادشاہ جب ظل اللہ ٹھیرا تو اسکی شکایت کیسی اور کس سے جائے؟ انتہا یہ ہے کہ خدا کے مہربان ہونے کی علامت شاہی عنایت و اکرام سمجھے گئے۔ حکومت کے اس ڈھنگ کو مضبوط بنانے میں ذاتوں کی تقسیم بہت کارآمد ثابت ہوئی اور اس سے مسلمان بھی اسی طرح متاثر ہوئے جتنے ہندو ہو چکے تھے دھرم کرم اور تقدیر کا سبق سنا سنا کر غریب عوام کو سنجیدگی سے محسوس کر لینے کے ساتھ ہی قناعت سکھادی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راج اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط بنتی گئیں انسانی مساوات اور اسلامی اخوۃ کے عنصر دفن کئے جا چکے تھے۔

سلطنت کے ساتھ خدا کے سایہ کا خیال بہت گہرا قایم ہو گیا تھا اور اس خیال کے مستحکم ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ اتم کا نیچ پر اشراف کا اجلاف پر سیاسی و اقتصادی غلبہ استمراری ہو جائے اور چونکہ اس سماجی و سیاسی اسکیم میں حد بندیاں سخت تھیں، اس لئے اتم اور نیچ دونوں سماجوں میں تنزل آنا لازمی چیز تھی اور اعلےٰ کو ادنے پر جو برائی مل چکی تھی اس کی وجہ سے اقتدار یافتہ سماج میں بیکار اور نکھٹو آدمیوں کی تعداد ملک میں بڑھتی رہی۔ مذہبی رہنما خیرات پر بسر کرنے لگا اور زمیندار معافی دار غریبوں کی محنت کا نتیجہ چھین کر کھانے لگا اور اس طرح بے شمار نکھٹو، موٹے اور دبیز ہوتے رہے۔ سماج کی یہ صورت مغلوں کے عہد میں نیم مذہبی بلکہ مذہبی عقیدے کی صورت میں ملک کے طول و عرض پر چھا گئی تھی۔

مغل حکومت کے زوال، اور ہندو ریاستوں کی باہمی رقابتوں نے انگریزوں کو تداخل کی دعوت دی، اور ہندو مسلمانوں کے یہی نکھٹو اور مراعات و حقوق یافتہ طبقے انگریز کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے ان کی پوری پوری سرپرستی کی۔ انگریزی عہد نے ان رعایتوں کی حقدار جماعتوں میں کچھ اضافہ ہی کیا۔ یعنی وکیلوں اور پنشن خواروں کی نئی جماعتیں بھی پیدا کر دیں اور یہ وہی پرانی جاگیرداری حکومت کے پس ماندہ اور سامراجی ذریات ہیں جو اپنی رعایتوں اور اقتدار کی خاطر پاؤں پیٹ رہے ہیں اور عوام کو ایسے بے بنیاد مسئلوں اور جھگڑوں میں پھنسائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقصد اور برتری کی طرف سے ہمیشہ کی طرح غافل رہیں اور ان کے تفوق اور فربہ ہونے کے ذرایع یعنی کونسلوں کی کرسیاں اور وزارتیں محفوظ رہیں، قانون سازی کی مشین پر ان کا قبضہ ہو تاکہ ان کے ہاتھ سے وہ نہ نکل سکے جسے یہ صدیوں سے غصب کئے چلے آرہے ہیں۔ برہمنی ذہنیت کا وہی پرانا سین پھر دیکھنے میں آرہا ہے کہ زبان مخصوص طبقے کی چیز بنی رہے علم و فن کی ٹھیکہ داری ان کے ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔

مگر چونکہ غریب کی اس مانگ کے سامنے کہ وہ بھوکا ہے، محنت کرکے بھی بھوکا رہتا ہے، کوئی طاقت ٹھہرنے والی نہیں اس لئے ان کنبوں اور تفضیلوں کی بنیادیں کمزور ہیں اور بالآخر ختم ہو جانے والی ہیں، یہ جھگڑے بغیر چکائے چک جانے والے ہیں، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ملک کی سیاسی الجھنیں صاف ہوں گی اور صحیح و واضح سیاسی تصورات قومی لیڈروں اور مختلف جماعتوں کے سامنے آجائیں گے۔ مگر جماعتوں کے سیاسی تصورات اسی وقت صاف و واضح ہو سکیں گے جب عوام کی تحریکیں زور پکڑ کر درمیانی طبقے کی لیڈری کو ختم کریں گی اور عوام کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہونے لگیں گے اس لئے کہ خاص طبقوں کی خاص رعایتیں ختم کرنے کا قانون درمیانی طبقوں کے نمائندے کبھی نہیں بنائیں گے۔ وہ تو مزدور نمائندے ہی بنا سکتے ہیں۔ بہر حال یہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اس زمانے میں وقت کی رفتار کی تیزی ہمارے خیال میں نہیں آسکتی۔ وہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ آنے والے انقلاب کی جھلک اس ادب میں دیکھی جا سکتی ہے جو آجکل پیدا ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ وقت اپنے وقت پر آئے گا۔

لیکن اگر "مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست" کی تعلیم صحیح ہے، اگر زمانے سے ساز کر لینے کے اصول غلط نہیں، اگر انسانی مساوات فطرت کا منشا ہے، اگر مسکین و افتادہ کی مدد مذہبی فریضہ ہے، تو ہندوستان کے ان "رعایت خود" طبقوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوامی تحریکوں سے وابستہ کر دیں، اقتدار اور استحصال سے ہاتھ اٹھالیں، اور انسانیت اور اپنے ملک کے لئے ایک معزز مقام حاصل کرنے میں لگ جائیں یعنی غلامی کی لعنت کو اپنی اور اپنے ملک کی پیشانی سے دھو ڈالیں۔ دوسرے ملکوں میں "رعایت خور طبقوں" کے اکثر افراد نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے۔

ل۔ احمد

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔ (۱۹۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۴ر۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) جنوری ۱۲ر، فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر۔ (۱۹۳۴ء) فروری ۵ر۔ (۱۹۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) جنوری ۸ر، فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون و ستمبر) ۶ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) جنوری ۸ر، مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

اشتراکیت اور اس کا مستقبل

غلامی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد افراد قوم کی قوت فکریہ بھی غلامانہ ذہنیت کی شکار ہو جاتی ہے۔ اجتہاد اور غور و فکر کا مادہ رخصت ہو جاتا ہے اور قوم کی قوم اندھی تقلید میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ بھی یہی ہوا جس کا آج سے نہیں تقریباً نصف صدی سے رونا رویا جا رہا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ وہی حضرات جو ہمیں پکار پکار کر اس دماغی غلامی سے باخبر کر رہے تھے، اب تک اس لعنت سے اپنی گلو خلاصی نہیں کر پائے ہیں۔

ان ہادیانِ قوم کے لئے کسی مسئلہ پر عقل و درایت سے غور کرنا قطعی ناممکن ہے۔ کسی مسئلہ کی خوبیوں کی دلیل ان کے پاس عموماً یہی ہوا کرتی ہے کہ "چونکہ یہ چیز اقوام دیگر ممالک میں کامیاب ثابت ہو چکی ہیں ہمارے یہاں بھی بامراد ہونگے انقلاب فرانس نے فرانس کو حیات نو بخشی۔ روس میں اشتراکیت ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی۔ جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور مسولینی کی مطلق العنانی نے سحر سامری کا کام کیا۔ ہندوستان میں بھی اگر وہی ماحول پیدا کر دئے جائیں تو یہاں بھی وہی نتیجے نکلیں گے جو دوسری جگہ ظاہر ہوئے"۔ لیکن ایسے حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ واقعاتِ عالم تکرار سے یکسر معرا اور مبرا ہیں اس رواں دواں دنیا میں ایک ہی چیز دو دفعہ نہیں ہوتی آواگون کا مسئلہ اب بہت فرسودہ ہو گیا۔ احباب کی صحبتوں میں اس پر خوش گپیاں تو بیشک ہو سکتی ہیں۔ لیکن قوم و ملک پر اس کا تجربہ ایک مہلک مشغلہ ہے۔

اس قسم کی کورانہ تقلید کی بین مثال موجودہ دور میں سوشلزم یا اشتراکیت کا تصور ہے۔ عوام کے لئے تقلید تو خیر ناگزیر ہے۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہمارے خواص بھی جب سوشلزم کا ذکر آتا ہے تو غیر تقلیدی انداز اختیار کئے بغیر نفس مسئلہ پر غور کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس سوشلزم بلکہ کمیونزم کی خوبیوں کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ روس ایسا تباہ حال ملک بھی اسی کی بدولت آج دنیا کے متمدن ممالک سے ہم سری کا دعویٰ کر رہا ہے اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ خود روس کے ارباب حل و عقد اپنی کامیابیوں پر حیرت زدہ ہو رہے ہیں یہی تقلیدی انداز گفتگو ہے جو حامیانِ اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج انقلاب روس کے قصیدوں کی صدا گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر پہلے اسی خواب خوش آیند کی تعبیر بیان کر دی جائے بعدہٗ نفس مسئلہ یعنی سوشلزم کی طرف

رجوع کیا جائے یہ دعوےٰ ایک حد تک صحیح ہے کہ روس میں جو کچھ ہوا وہاں کے لئے وہی مناسب تھا۔ بولشوزم نے ۲۰-۲۲ سال میں روس کے لئے وہ سب کچھ کر دیا جو صدیوں کی آمریت نہ کر سکی تھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو کچھ وہاں ہوا کیا اس کا امکان یہاں بھی ہے۔ کیا روس کی تقلید یہاں بھی کارگر ہو سکتی ہے؟

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ روس اور ہندوستان کے حالات میں بہت زیادہ مشارکت ہے۔ روس بھی ہندوستان ہی کی طرح ایک پست، فلاکت زدہ، جاہل، زراعتی ملک تھا۔ ہندوستان کی طرح وہاں بھی ساہوکار اور زمیندار جونک کی طرح کاشتکاروں اور مزدوروں کا خون چوس رہے تھے۔ وہاں کی حکومت بھی ہندوستان ہی جیسی ایک غیر ذمہ دار بیوروکریسی تھی۔ وہاں بھی حکام وقت زار سے لیکر ادنیٰ چپڑاسی تک اتنے ہی ظالم و جابر تھے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کمیونزم وہاں تو رحمت ثابت ہو اور یہاں کے لئے قہر ہو جائے؟" لیکن ایسی سطحی مشارکتوں کے فریب میں ہم نہیں آ سکتے ہیں۔ روس اور ہندوستان میں سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک غلام ملک ہے اور روس ایک آزاد ملک تھا۔ روس میں غیر ملکی سنگینوں کے بل پر زار کی حکومت نہیں قائم تھی بلکہ وہ روسیوں ہی کی تلواریں تھیں جو ابنائے وطن کو ذبح کر رہی تھیں۔

دوسری بات یہ کہ روس میں بولشوزم کی کامیابی محض لیڈروں کی اپیلوں اور اخبارات کے جوشیلے مضامین کی رہین منت نہیں ہے۔ وہاں جو کچھ ہوا ایک حد تک بزور شمشیر یعنی جبر سے ہوا۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے پورا ملک تباہ تھا۔ حکومت کی سختی نیز اشیائے خورد و نوش کی کمی سارے ملک کو مع افواج کے بغاوت پر آمادہ کئے ہوئے تھی۔ بالآخر ایک منظم جماعت اٹھی۔ فوج نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ خوب خانہ جنگیاں ہوئیں اور آخرکار خون کی ندیاں بہا کر بولشوک جماعت برسر اقتدار ہو گئی اور پھر ہر ممکن جبر و ظلم و تعدی کو بروئے کار لا کر پورے ملک میں اشتراکیت کا بول بالا ہو گیا۔

روس میں بولشوک جماعت کی کامیابی کا تیسرا سبب یہ ہوا کہ وہاں اشتراکیت کا اجرا اور اس کے لئے جد و جہد اس وقت شروع ہوئی جب جنگ عظیم نے دنیا کی تمام حکومتوں کو جنگ کی تکان نیز اس کی تباہ کاریوں کے ہاتھوں سے پریشان کر رکھا تھا اور خانہ جنگی کے زمانہ میں کسی کو دخل دینے کی ہمت نہ تھی۔

جب واقعات کا یہ عالم ہو تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں جگہ حالات تقریباً یکساں ہیں۔ اور جو طریقہ وہاں اختیار کیا گیا وہی یہاں کے لئے بھی مناسب ہوگا۔ ہندوستان کے لئے پہلا سوال حصول آزادی کا ہے اور تا وقتیکہ ہم خود مختار نہیں ہو جاتے ہیں، سوشلزم، کمیونزم یا بولشوزم کی باتیں محض شاعری ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ سوشلزم اگر ہمارا منزل مقصود ہو تو ہوا کرے لیکن مقصد اور ذریعہ میں تمیز نہ کرنا حد درجہ کی بد تمیزی ہے۔ یہ تو محض زبانی باتیں ہیں کہ سارے کا سارا ہندوستان صرف ہمارے لیڈروں کی ہیچ بازیوں سے اشتراکی بن جائے گا۔

انھیں یہاں بھی وہی کچھ کرنا پڑے گا جو روس میں کیا گیا اور تا وقتیکہ ہندوستان آزادی کامل نہ حاصل کرلے۔ روس کی بے باکانہ اور سفاکانہ روش نہیں اختیار کر سکتا ہے۔ مزید براں اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سبھاش بابو کی چھ مہینے والی دھمکی کارگر ہوگئی اور برٹش حکومت کا خاتمہ بھی ہوگیا تو کیا یہ قرین عقل ہے کہ اُس وقت ہندوستان بیرونی دشمنوں کا کچھ خیال کئے بغیر اشتراکیت کی ترویج شروع کر دے گا۔ جبکہ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جبر و تعدی ہی نہیں بلکہ خانہ جنگی کے بغیر یہاں اشتراکیت کے پانوں جمتے نہیں نظر آتے۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس خواب پریشاں کے پیچھے اتنی اہم چیزیں یعنی ملک کی آزادی اور آپس کی رواداری کیوں پس پشت ڈالی جا رہی ہیں۔ کیوں عوام کو دام فریب میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ اور کیوں ایک بے بنیاد افسانے کی خاطر ایک تباہ کن خانہ جنگی کی داغ و بیل ڈالی جا رہی ہے؟ میں پھر عرض کر دوں گا کہ اگر سوشلزم یا اور کوئی ازم ان کی غرض و غایت ہے تو اسی کو ذریعہ حصول سمجھ لینے کی غلطی نہ کریں اور مقصد اور ذریعہ حصول مقصد کا فرق سمجھیں۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہندوستان اور روس کے حالات اتنے مختلف ہیں کہ وہاں کی تقلید ہندوستان کے لئے کبھی بھی مناسب نہیں ہوگی۔

یوں تو اشتراکیت کی تعریف میں صفحے کے صفحے رنگے جا سکتے ہیں لیکن ایک جملہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت انفرادیت کی ضد ہے۔ انفرادیت میں شخص واحد ہی سب کچھ ہوتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان کے لئے وہ آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے اُس سے کوئی بازپرس کرنے والا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس کے حرکات و سکنات براہ راست دوسروں کے لئے مضرت رساں نہ ہوں۔ اس کے برعکس اشتراکیت مقتضی ہے کہ فرد واحد کی شخصیت جماعت میں جذب ہو جائے۔ افراد سے زیادہ جماعت کے نفع و نقصان کا خیال رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ اختیارات معاشرے کے ہاتھ میں دے دئے جائیں کہ یہ مجموعی طور پر افراد کی ضروریات کو بطریقہ احسن انجام دے سکے۔

سوشلزم یا اشتراکیت بہت وسیع معنی کا لفظ ہے اس کا اطلاق جس طرح روس کے محدود کمیونزم پر ہو سکتا ہے اُسی طرح جرمنی اور اٹلی کے ناززم اور فاسزم پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہی کیوں آسٹریلیا۔ کنیڈا۔ جنوبی افریقہ ہی نہیں بلکہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ تک کو غیر اشتراکی نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ زمانہ میں اشتراکیت سے پرہیز قطعی ناممکن ہے۔ تہذیب و تمدن اور اقوام عالم کے عروج و زوال کی تاریخ پر ایک بے لاگ اور عمیق نظر ڈالنے سے اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ دنیا تدریجی رفتار سے اشتراکیت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انفرادیت دن بہ دن روبہ انحطاط ہے۔ فطرت کے اولین انسان کی مہیب انفرادیت کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے ہزار دو ہزار بلکہ صدی دو صدی کے معاشرے کا موازنہ اگر آج کے معاشرے سے کیا جائے تب بھی انفرادیت پر اشتراکیت کا تصرف بین طور پر نمایاں ہو جائے گا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک ہی صدی کے اندر دنیا کی ریاستوں میں جو انقلابات ہو گئے ہیں انکا جائزہ لیجئے

یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ہماری روز کی زندگی پر غیر محسوس طور پر ریاست کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور تمام وہ امور جو کچھ دن قبل ہمارے ذاتی اختیار و اقتدار میں تھے ریاست کے تصرف میں آئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ ہی پر اس خیال کو دماغ میں رکھ کر ایک غیر متعصبانہ نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ ممالک بھی کتنے اشتراکی ہو گئے اور کس تیزی سے اشتراکیت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اس کے بعد حضرات سوشلسٹ کی صدائے بے ہنگام پر ماتم کیجئے کہ باوجود اپنے دعووں کے یہ نفس سوشلزم سے کس قدر دور ہیں۔ ان کے نزدیک ایک سوشلسٹ حکومت کا قیام ہی سب کچھ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ تاوقتیکہ تدریجی رفتار سے کسی چیز کی ترویج نہ ہو اس کے نتائج کتنے برے ہوتے ہیں قیام بولشوزم کے بعد روس کی اندرونی سازشوں، بغاوتوں، حکومت کی سخت گیریوں اور خون ناحق کی تہ تک یہ حضرات اب تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔ شاید ان کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بہ نسبت روس کے اشتراکیت نے فرانس، امریکہ و انگلستان میں ترقی کے منازل زیادہ طے کئے ہیں اور ان ممالک میں اس کا مستقبل زیادہ روشن ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا دن بدن اشتراکی ہوتی چلی جا رہی ہے اور انفرادیت کا میدان عمل کم ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا کوئی دن ایسا بھی آنے والا ہے جب انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور اسکی جگہ انتہائی درجہ کی اشتراکیت یعنے اشتمالیت لے لیگی اشتمالیت یہ ہے کہ فرد اپنے جملہ امور کو جو اس کے بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں ریاست کے حوالہ کر دے اور ریاست اپنے سر اس کے ضروریات زندگی کی کفالت کی ذمہ داری لے لے بہ الفاظ دیگر اشتمالیت ریاست اور فرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ جس کی رو سے فرد اپنی کل کائنات نیز ذاتی خدمات بھی ریاست کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اس کے بدلے ریاست ذمہ لیتی ہے کہ وہ افراد کی ضروریات زندگی کو پورا کرے گی فاقہ کشی کی نوبت نہ آنے دے گی۔ بے روزگاری کا خاتمہ کر دے گی۔ امیر و غریب، آقا و غلام کی تفریق مٹا دے گی۔ اور اب سوال یہ ہے کہ کیا رفتہ رفتہ اس قسم کی اشتمالیت انفرادیت کے کھنڈروں پر آباد ہو جائے گی؟ اس کا جواب تو وہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انفرادیت اشتراکیت کی ضد ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی چیز کے بقا و قیام کے لئے اجتماع ضدین بہت ضروری ہے۔ ایک ضد کا عدم دوسرے کے فنا کا بھی پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر قایم ہے۔ بغیر رات کے دن کا تصور بھی محال ہے کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اگر شیطان نہ ہوتا تو خدا تک اپنی خدائی کا اظہار نہ کر سکتا۔

اشتمالیت میں فرد واحد کی شخصیت بالکل محو ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک مشین کے پرزے سے کچھ زیادہ نہیں رہ جاتی نہ تو اس کا اپنا دماغ رہ جاتا ہے اور نہ اپنے اقوال و افعال۔ دوسرے کے سکھائے سیکھتا ہے اور دوسرے کے چلائے چلتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ نہ اپنا کوئی مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے جد و جہد کرے اور نہ کوئی منزل ہے جس کے لئے مردانہ وار قدم بڑھائے۔ جیتا ہے تو دوسروں کے لئے مرتا ہے تو غیروں کے لئے

غرض انسانیت اُس سے رخصت ہوجاتی ہے اور غریب وہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ معاشرہ ہے کہ اُس انجن کی طرح جس کا کوئی انجنیر نہیں حرکت کئے چلا جا رہا ہے۔ جس کے پاس بقائے حیات کے لئے نہ تو کوئی جد وجہد ہے اور نہ آیندہ ترقیوں کے لئے تدابیر و ذرایع۔ وجہ اس کی صرف اتنی ہے کہ معاشرہ کی شخصیت تو یہی ہے کہ وہ افراد پر مشتمل ہے اور جب افراد ہی سے احساس خودی رخصت ہوگئی تو معاشرہ میں کہاں سے آجائے گی؟ اور ظاہر ہے کہ جب افراد کے قوائے عقلی اس طرح معطل کر دئے جائیں تو اس کا اثر خود معاشرہ پر کیا نہیں پڑے گا؟ کیا پوری جماعت اس بربادی سے گھاٹے میں نہیں رہے گی اور کیا انسانیت کے لئے یہ پیام موت نہیں ہوگا؟

اشتمالیت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر فرد بشر اپنی خودی کو بالائے طاق رکھ کر خود کو دوسروں کا خادم بنا دے تصور یقیناً بہت پاکیزہ اور بلند ہے۔ اتنا بلند کہ خود انسان ابھی اس سے منزلوں نیچے ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہاں تک پہونچتے پہونچتے خود انسانیت ہی اس کا ساتھ چھوڑ دے۔

لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسان اس طرح بے خود ہوکر حضرت عیسیٰ یا مہاتما بودھ ہو بھی گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر خود معاشرے پر کیا ہوگا۔ جون سٹوارٹ مل نے اپنے شہرۂ آفاق مقالے آزادی میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اشتمالیت کے دلدادوں کو مارکس کے مطالعہ سے کب فرصت ہے کہ اس دنیا کی باتیں کریں یہی اور معاشیاتی پہلو سے قطع نظر ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آج تک زمانے نے جتنی ترقیاں کیں سب انفرادیت کے کرشمے ہیں۔ جتنے ایجادات و اختراعات ہوئے سب کے پس پردہ یہی قوت کارفرما تھی، اور انسان جو آج زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے سب انہی کی برکتوں کا فیض ہے اور اب کیسے یقین کر لیا جائے کہ ابتدائے آفرینش سے دنیا جس راستے پر گامزن ہی رہی یکایک اس کے بالکل برعکس چلنے لگے گی۔ یہ تو درست ہے کہ زمانہ ایک ہی رفتار پر برابر نہیں چلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی قطعی ہے کہ وہ کبھی بھی اتنا نہیں بہک سکتا کہ ماضی کو بالکل فراموش کردے۔ اگر معاشرے کو برقرار رکھنا ہے تو فرد کی علحدہ شخصیت بھی قایم رکھنی پڑے گی۔ اگر جماعت کی ترقیوں کو جاری رکھنا ہے تو فرد واحد کی ذاتی منفعت اور مضرت کی ذمہ داری ایک حد تک فرد ہی کے ہاتھوں چھوڑ دینی پڑے گی۔ بڑے لوگوں سے ہمیشہ یہی غلطی ہوتی آرہی ہے کہ اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر وہ ہر اہم مسئلہ کو انتہا تک لے آئے ہیں دوسرے علوم میں اس انتہا پسندی سے پہلے ہی چشم پوشی کی جائے۔ لیکن اجتماعیات میں اس سے انحراف ایک مہلک فروگزاشت ہے۔ انسان نہ تو ایک مشین ہے اور نہ ایک خودرو پودا اور میکانکی نظریوں کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ ان کے حامی جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں ورنہ دونوں نظریوں کی بنیاد صداقت و حقیقت پر مبنی ہے اور ایک حد تک دونوں فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔

یہی حال انفرادیت اور اشتراکیت کی بحث کا بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اشتراکیت کی طرف بڑھ رہے ہیں

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم کسی دن اتنے اشتراکی ہو جائیں کہ انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔

گلاب چند

(**نگار**) مقالہ نگار نے اس مضمون میں اشتراکیت کی مخالفت کی ہے اور میں نے اسے نگار میں صرف اس لئے شایع کیا ہے کہ جب تک کسی مسئلہ کے متعلق ہر مخالفانہ پہلو کو سامنے رکھ کر لوگوں کے دلوں سے ہر ممکن خدشہ کو دور نہ کر دیا جائے، ہم اسے مقبول عام نہیں بنا سکتے۔

میں اشتراکی ہوں، نگار کا مسلک اشتراکیت ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ انسانیت کی نجات اشتراکیت ہی میں پنہاں ہے اور وہ زمانہ آنے والا ہے، جب ساری دنیا اسی طرف کھنچ کر آ رہے گی، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کو یہ جبر کسی کے سر تھوپا نہیں جا سکتا اور تا وقتیکہ ہم لوگوں کے دلوں میں اس کی صداقت کی طرف سے یقین کی کیفیت نہ پیدا کر دیں، اس کی ترویج ممکن نہیں۔

اس وقت اشتراکیت کے مخالف تین گروہ ہیں، ایک سرمایہ دار دوسرے اہل مذاہب اور تیسرے وہ جو آمرانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور اپنے تقدم شخصی کو ہاتھ سے جانے دینا گوارا نہیں کر سکتے۔

سرمایہ دار کی مخالفت تو ظاہر ہے کہ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی جمع کی ہوئی دولت جس کا بڑا حصہ اس کے ناجائز عیش و تنعم میں صرف ہوتا ہے اور جس کے طفیل وہ غریب مزدوروں پر حکومت کرتا ہے ہاتھ سے نکل جائے، مذاہب نے اب جو صورت اختیار کر لی ہے، وہ بھی چونکہ ایک نوع کی سرمایہ داری ہے۔ انکی مخالفت بھی ظاہر ہے، رہے آمرانہ ذہنیت رکھنے والے سو اُن کو اختلاف کرنا ہی چاہئے کیونکہ استبداد و اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مخالفین اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل ایک یہ ہے کہ اشتراکیت، اصول فطرت کے خلاف ہے فرق مراتب قدرت کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور یہ دنیا سے محو نہیں ہو سکتی، لیکن یہ دلیل سراسر فریب ہے کیونکہ اشتراکیت فرق مراتب مٹانے کا نام نہیں ہے اور نہ ساری دنیا کی ذہنیت کو ایک کر دینے کا، بلکہ اشتراکیت کا مدعا دولت کو اس طرح بانٹ دینا ہے کہ دنیا سے فقر و فاقہ کی بلا دور ہو جائے میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کا مقصود اپنے بندوں کے پیدا کرنے سے یہ بھی ہو کہ ان میں سے بعض کو اسراف کی حد تک دولت دیدی جائے اور بعض کو گدائی کی حد تک مجبور کر دیا جائے۔ اگر دنیا کے اخلاقی قوانین الہامی چیز نہیں ہیں بلکہ سوسائٹی کے تجربات سے پیدا ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری معاشی و تمدنی دشواریاں آخر کار ہم کو کسی ایسے قانون کے بنانے پر مجبور نہ کریں۔

جن سے ان دشواریوں کا ازالہ ہو جائے اور اس بات کو تو اشتراکیت کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصود انہیں اقتصادی پیچیدگیوں کو دور کرنا ہے۔ لیکن اس کو وہ قابل عمل نہیں سمجھتے اور اس لئے فیصلہ کا انحصار اس پر رہجاتا ہے کہ اشتراکیت قابل عمل ہے یا نہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ہندوستان کو سامنے رکھکر زیادہ تر اس پہلو پر زور دیا ہے اور اُن کے نزدیک یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہیں۔ ایک حد تک میں بھی اس کا موید ہوں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ اس تحریک کو بند کر دیا جائے کیونکہ اس صورت میں ہم کسی وقت بھی حالات کو اس کے موافق نہ بنا سکیں گے اور ہندوستان ہمیشہ غیروں کی گرفت میں رہکر اسی طرح فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہے گا۔

یہ بالکل درست ہے کہ اگر آج انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر نکل جائے تو ہم کسی ملک کے حملہ کا جواب نہیں دے سکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی دوسرا اس پر قابض ہو جائے گا، لیکن اشتراکیت پسند جماعت شاید اس قدر احمق نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ اس کا مطالبۂ آزادی اگر اصول اشتراکیت پر مبنی ہے تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا اُن کو یہاں سے نکال دینا چاہتا ہے، بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ اصول حکومت اشتراکی قرار دیا جائے، یہاں کی دولت یہیں رہے اور یہاں کے انسان، یہاں کی پیداوار اور یہاں کی ذہنیت سے اس طرح کام لیا جائے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت آپ کر سکے۔ یہاں آدمیوں کی کمی نہیں، معدنیات کا فقدان نہیں، جسمانی و ذہنی قوت مفلوج نہیں۔ اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ ان سے کام نہیں لیا جاتا اور یہ کام نہ لیا جانا بدستور اسوقت تک قایم رہے گا جب تک ملک پوری طرح آزاد نہ ہو اور صنعت و حرفت تجارت و زراعت حکومت کے ہاتھ میں نہ آ جائے کہ دولت کی صحیح تقسیم کی صورت صرف یہی ہے۔

مقالہ نگار کا یہ اعتراض کہ اشتراکیت میں انفرادی خصوصیات مٹ جاتی ہیں اور اُن کے اُبھرنے کا موقعہ نہیں ملتا، صحیح نہیں۔ روس کو دیکھئے کہ وہاں کونسا شعبۂ علم و فن ایسا ہے جو ترقی نہ کر رہا ہو۔ دور اشتراکیت میں وہاں جتنے بڑے سائنس داں اور ماہرین فنون پیدا ہوئے ہیں، دور قیصریت میں ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اشتراکیت پر یہ الزام قایم کرنا بھی غلط ہے کہ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے، اشتراکیت کا مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کی اہلیت سے پوری طرح کام لیا جائے اور اس کی جملہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ایک معمولی مزدور اور ایک اچھے ڈاکٹر کی ضروریات زندگی میں کیا فرق ہے اور وہ اس کا پورا لحاظ رکھتی ہے، اگر وہ یہ دیکھتی ہے کہ ایک شخص بغیر موٹر لئے کام نہیں کر سکتا تو اسے پیدل چلنے پر مجبور نہیں کرتی، لیکن جذبۂ عیش و تنعم کو ضرور فنا کر دینا چاہتی ہے کہ اخلاق و انسانیت کے انحطاط و زوال کا تنہا سبب دنیا میں یہی ہے۔

یہ درست ہے کہ جمہوریت کی کیسی ہی وسیع صورت فرض کر لی جائے، آمریت بدستور قایم رہیگی، روس میں اگر

لینن نہیں رہا تو اسٹالین موجود ہے۔ لیکن سوال ہمیشہ اصول کا ہوا کرتا ہے اور اسی کی صحیح تعیین اشتراکیت کا نصب العین ہے۔ گو اسٹالین آمرانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ زار کبھی نہیں ہو سکتا۔ زار کے اور اس کے خاندان کا خرچ لاکھوں روپیہ تھا اور اسٹالین صرف ساٹھ روپیہ لیتا ہے۔ پھر اگر استبداد و آمریت کا یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے تو محض اصطلاح پر بڑا جھگڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت پر جو مظالم ہو رہے ہیں وہ کیونکر دور ہو سکتے ہیں۔ ملوکیت و استبداد کا تجربہ ہو چکا، مذہب و کلیسا کا دور بھی دیکھ لیا گیا، سرمایہ دارانہ حکومتوں اور ڈیماکریسی کے نام سے عیاشیاں کرنے والی سلطنتوں کا حال بھی ہمیں معلوم ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان سب سے علیحدہ ہو کر کوئی اور نئی صورت نہ سوچی جائے اور اس وقت وہ نئی صورت سوائے اشتراکیت و اشتمالیت کے اور کوئی نہیں ہے اگر تجربہ سے یہ بھی ناکام ثابت ہوئی تو کوئی اور راہ دیکھی جائے گی۔ زمانہ بدلتا جاتا ہے ہمارے داعیات بدلتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت وہ آئے جب اشتراکیت بھی ناکافی ثابت ہو اور کسی مدنیت کی طرف رجوع کیا جائے۔

جب ایک قوم میں انحطاط پیدا ہوتا ہے تو اس کی ذہنیت یہی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر اقدام سے ڈرنے لگتی ہے اور اپنے مستقبل کو وہ نہایت مایوسی کی نگاہ سے دیکھتی ہے حالانکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینا ہی ساحل تک پہونچنا ہے

در بلا بودن بہ از بیم بلاست

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ برین۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	**مکتوبات نیاز**	**اردو شاعری**	**ہندی شاعری**	**میزان کل**
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہم ہی ادا کریں گے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

عزیز لکھنوی کی غزل گوئی

اُردو غزلگوئی کی ترقی و ارتقا کی تاریخ میں عزیز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس مرکز پر وہ ہیں وہاں نہ صرف بہت سی راہیں ختم ہوتی ہیں بلکہ بعض نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس لئے عزیز اپنی جگہ صفِ اول کے غزل گو قرار دئے جا سکیں یا نہیں لیکن تاریخ نے ان کی حیثیت سنگ میل (Milestone) کی بنا دی ہے جسے سفر کرنے والے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور ادب کی دنیا کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں کوئی چیز ایک شہاب ثاقب (Meteor) کی طرح نظروں کے سامنے آکر اوجھل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس دُنیا کی ہر سحر میں ایک نئی شام اور ہر شام میں ایک نئی سحر کا انتظام ہوتا ہے۔ ورڈسورتھ، کیٹس، شیلے، بائرن حادثات زمانہ کا کوئی شعبدہ نہ تھے۔ بلکہ انکے لئے ایک راہ تیار کی گئی تھی اور اس راہ کے مکمل ہو جانے پر ہی ان کا وجود ممکن ہو سکا۔ یہ راہ تیار کرنے والے کون تھے؟ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ گرے۔ کولنس۔ برنس۔ بلیک معروف نام ہیں۔ اُردو غزل گوئی میں کچھ یہی مرتبہ عزیز کو حاصل ہے۔ ان کا کلام آئینہ ہے ان تمام خصوصیات تغزل کا جو قدیم غزل کے تصور میں شامل تھیں۔ ان کا کلام خاکہ ہے ان خطوں سے مرتب جو آگے بڑھکر جدید رنگ تغزل کی تصویر کہلائے اور ان کا کلام نمونہ ہے جدید تغزل کی ان گوناگوں دلچسپیوں کا جس پر آج ہم لوگ بجا طور پر نازاں ہیں۔

قدیم تغزل مژگاں کے تیر۔ دل و جگر کے ٹکڑے۔ رقیب کے شکوہ، محبوب کی سرد مہری، ہجر کے صدمے، وصل کی ہوس، موت کی بیماری اور اس کے باوجود آنے والے کے انتظار میں نہ مر سکنے کی نوع کے جزئیات سے مرتب تھا۔ میں نے اسوقت تک قدیم تغزل کے سلسلہ میں دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچا ہے۔ لیکن اسوقت یہ کہدینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جسوقت لکھنوی شعراء نے اپنے تغزل کی مصنوعیت (Artificiality) سے بیدار ہو کر جذباتی ضرورتوں کو محسوس کیا تو غزل کو اچھا خاصہ مرثیہ بنا دیا۔ ان کے نزدیک وہ غزل غزل ہی نہ رہی جس میں شاعر کے ایک بار دردِ دل نہ ہو یا وہ خون کے آنسو نہ روئے یا اس پر نزع کا عالم طاری نہ ہو یا چارہ گری نہ فرمائی جائے یا محبوب موت کا پیغام لیکر وارد نہ ہو۔ عزیز کے یہاں دہلی اسکول کی بیکسی اور لکھنؤ اسکول کا مرگھٹ یعنی دونوں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دیوانہ سازی و دیوانہ گری کے انداز بھی وہی ہیں اور آدابِ محبت اور ان کے

جزئیات میں بھی وہی ہمواری موجود ہے۔ سنئے :۔

یہ کہہ کے سرہانے سے وہ بیمار کے اُٹھے — صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آیا
نثار اس بچپنے کے اور اس نازک دماغی کے — سپاہیوں سے اپنے نیند میں خود آپ ڈر جانا
ذکر مزاج ناز کرو مشورہ یہ ہے — وقت اخیر نبض کی رفتار دیکھ کر
مانا کہ ہے حضور کی چٹکی منجی ہوئی — دل بے خطا ہے ہو گی خطا اس نشانے میں
ملے ہیں جبکہ دونوں دل تو آخر شرم سے حاصل — تکلف برطرف ہے جب تو پردہ درمیاں کیوں ہو
مریض غم کو اپنے ہاتھ سے تم زہر ہی دیدو — اک اسی دم سے عاجز اس قدر سارا جہاں کیوں ہو
قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل — تیغ دیکھو ذرا کمر دیکھو
دل میں پیوست ہے اک تیر نکالوں کیونکر — ڈر رہا ہوں کہ نگاہ غلط انداز نہ ہو
اے حنائے دست قاتل دیکھ کر قسمت تری — رشک سے کرنا پڑا آخر لہو پانی مجھے
کہیں وعدہ بھی کریں وہ کہ ذرا قرار آئے — کہیں ختم زندگی ہو شب انتظار آئے
ملنے کو تو میں حضرت ناصح سے ہاں ملا — لیکن ہنسی بھی وقت ملاقات آ گئی

لیکن مندرجۂ بالا اشعار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قدیم تغزل یکسر اسی اساس پر قائم تھا۔ یہ ضرور ہے کہ پیش منظر کے خط و خال اکثر یہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ عزیز کے کلام سے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ رنگ غالب کا درجہ نہیں رکھتے تاہم پس منظر (Back ground) میں افق کی سیاہی کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

ان سے زیادہ دلچسپ اور اہم وہ اشعار ہیں جو اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے اسی شاخ کے برگ و بار ہیں جس کا ابھی ابھی ذکر کیا جا چکا ہے لیکن عزیز نے ان میں وہ تراش و خراش پیش کی ہے جو اپنا نمونہ آپ ہے چنانچہ اس منزل پر آکر محبوب اچھا خاصہ انسان اور انسانی جذبات کا حامل ہو جاتا ہے اور بجائے اپنے مریض غم کو تغافل بیجا کا شکار بنانے کے وہی سلوک کرتا ہے جو ایک ہمدرد دوست کو کرنا چاہئے۔

ان کی اس کوشش بیجا کا پتہ دیتا ہے — چارہ سازوں کا مری لاش پہ گریاں ہونا

اس کے علاوہ زندگی میں عاشق کو پورا احساس تھا کہ اس کا محبوب پتھر کا ایک مجسمہ نہیں ہے۔ اس لئے اپنے معاملات میں احتیاط سے کام لیتا ہے

ڈرتا ہوں دل کا حال بیاں تم سے کیا کروں — تم ایسے زود رنج کا کسے اعتبار کیا

محبوب عاشق کی موت کے بعد قبر پر جانے سے نہیں چوکتا۔

مری قبر پہ وہ شاید کبھی آ گئے ہیں ورنہ — یہ ہجوم اہل دل کا نہ سر مزار ہوتا

رقیب ہمیشہ تکلیف دہ قوتوں کا مرکز سمجھا گیا۔ لیکن عزیز اسے بھی قدرے خوشگوار روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں وہ رقیب ہے سنتے افسانۂ کلیم — مجھ کو ہلاک حسرت دیدار دیکھ کر

اسی طرح ناصح کو شاعروں کی بزم کا مسخرہ (Clown) تصور کیا جاتا تھا۔ عزیز اس مخلوق کو بھی متانت کا حقدار سمجھتے ہیں۔

سب سے بڑا قدم سادہ لوحی کا نقش — غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے

انگریزی زبان کا ایک محاورہ ہے "To give the devil his due"۔ عزیز نے نادانستہ طور پر یہی فرض ادا کیا ہے۔

دور بار محبت میں "وعدہ" کے زور پر کیا کیا ہوائی قلعے نہیں بنتے۔ لیکن عزیز حقیقت کو سمجھ گئے اور وہ بھی کس انداز سے

ترے وعدہ کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں — وہ حریص زندگی ہے جسے اعتبار آئے

بارگاہ حسن میں "شہادت" عاشقی کی معراج ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر مر کٹنے کے شوق میں مقتل میں بھی ایک عالم جمع ہو جائے۔ لیکن عزیز نے ایک "نفسیاتی" بات درمیان میں لا کر بات کو کچھ اور کر دیا ہے۔

کہاں مقتل ہیں کہ ہیں یہ بھی مشتاق شہادت ہوں — یہاں سب خود غرض ہیں کون کس کے کام آتا ہے

"یہاں سب خود غرض ہیں" کی داد نہیں دی جا سکتی۔

پند و نصائح (Didacticism) بھی قدیم تغزل کی روایات میں ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں گو یہ چیز ہمیشہ تغزل سے خارج سمجھی گئی تاہم ہمارے اچھے اور برے شاعروں نے غزل میں نفس کی ہوسناکی، سخت کلامی، بے ثباتی عمر اور دردِ دل کے بے سود تنازعات پر اشارے کئے ہیں۔ عزیز نے یہاں بھی حق تقلید ادا کیا ہے لیکن یہ تقلید کسی انداز یہیں کہی جا سکتی۔ عزیز نے یہاں بھی ایک قسم کا نکھار پیدا کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عزیز اس باب میں ہمت حوصلہ کی حد تک جدید معیار حاصل نہ کر سکے۔ احساس کی پستی لکھنؤ اسکول کے اس دور کی خصوصیت رہی ہے جو (Emotional Renaissance) جذبات نوازی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ عزیز بھی اس دور سے باہر نہ آ سکے۔

پیدا ورباعگر کہ تجھے روئیں دوسرے — روتا خود اپنے حال پہ یہ زار زار کیا
اپنی ہی ذات میں خود اس کا نظارہ ہوتا — ہجر میں ہم نے اگر نفس کو مارا ہوتا
نازک دلوں کو سخت زبانوں سے ہے گریز — شبنم کو کب قرار رہا نوک خار پر
جاگنے سے فایدہ اسے عابد شب زندہ دار — کچھ نہیں ہے روح میں جب تک کہ بیداری نہیں

فرصتِ زیست کم ہے کام بہت
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

جو تقاضا ہے یہی ہستی کا اقتضا
حاصلِ جہاں سے یہی عبرت ہی ہوں [illegible]

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

لیکن جس حد تک بھی عزیز لکھنوی غالب دہلوی سے بگڑے ہوئے رہے خصوصاً غالب کی منفرد رنگ میں وہ بہت کا کام [illegible] معرفت ایک سمجھی ہوئی طبیعت، تربیت یافتہ دماغ اور مذاق رکھتا ہوا اس بات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عزیز نے سادہ جس منزل پہ ہم یہاں پہونچے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ مرقع ہر زاویۂ کیفیت سے پُر ہے جو ایک ملون خواب کا سماں ہے جس میں ہر سانس زندگی بنکر لٹتی ہے۔

آئیے، عزیز کے کلام سے اب وہ نمونے منتخب کریں جو اگرچہ قدیم رنگ کے حامل ہیں تاہم [illegible] لطافت کھلا ہوا اعلان ہیں۔

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا حال کسی پر عیاں نہیں ہوتا

اک ان کا دل ہے کہ دم بھر بھی نہیں رکتی
اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا

ہاتھ بڑھا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
پھر وہی مرحلۂ پاکیٔ گریباں نکلا

خودکشی سے بھی نہ ہوئی کار برآری اے عزیز
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

اسوقت عشق محو تھا اپنے ہی جلوے میں
جب حسن خود نمائیِ بزمِ وجود تھا

کون ہے تیرے سوا ردیفِ روانِ ہستی
تو نہ ہوتا تو کھیلا کون [illegible]

فصلِ بہار تیری اللہ رے معنویت
ذروں کا وہ نکھرنا مٹی کا وہ سنورنا

اعتبارِ عشق نے یکسو نگاہ ہوں کر لیا
وہ بھی حیراں ہو گئے ہیں مجھکو حیراں دیکھ کر

کچھ لوگ اجنبی سے رستہ بتا رہے ہیں
ناز سے میں چلا ہوں اجڑے ہوئے دیار میں

دو جہاں میں نہیں رہنا ہے ٹھکانا جن کا
ان اسیروں کو وہ آزاد کیا کرتے ہیں

ہم ہیں اور بالیں پہ تم ہو ہم ہیں اور اعضا شکن
اب وہ پہلی سی ہماری کوئی حالت نہیں

میں حقیقت کو سمجھ کر تیری دیوانہ بنا
یوں بھی عالم میں کسی کا راز داں کوئی نہ تھا

یہی اک پردۂ تصویر ہٹانے کے قابل تھا
کہ آنسو گرتے ہی دامن پہ تصویر کھنچ گئی دل کی

تمام روح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

ابھی پیوست ہے کافر نگاہ شوخ ادا ان کی
کسی دن دیکھنا بجلی گراؤں گا اسی دل سے

اللہ اللہ ذہنی ترقی و ارتقا بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے ان اشعار میں دنیا کا [illegible] بدلا ہوا ہے۔ پہلے

حلقہ ہائے زلف میں تحریک دیوانگی تھی اب گل و لالہ کی معنویت اس کی محرک ہے۔ پہلے شاعر زہر کی بھیک مانگتا تھا اب خودکشی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ پہلے لوگ سودائی تھے گوشت پوست کے ایک لوتھڑے کے۔ اب ان کی نظر "روح روان عالم" تک پہونچتی ہے۔ پہلے پتھر کے ٹکڑے آئینہ حیرت تھے، اب "اعتبار عشق" بھی ایک قوت بن گیا پہلے لوگ دیوانہ بنتے تھے، قیس و فرہاد کی پاسنگینی کے علمبردار بن کر لیکن اب دیوانہ بنتے ہیں اس لئے کہ رگ جاں پر کوئی نشتر زن ہو کر کہتا ہے کہ "تم میرے دیوانے بنو!" گویا یوں سمجھ لیجئے کہ پہلے شاعر کو واسطہ تھا جسم سے مگر اب روح کی قوت بھی اسے محسوس ہونے لگی ہے۔ پہلے شاعر کی نگاہ محدود تھی صرف روزمرہ کی زندگی اور اس کے عمومی جزئیات پر لیکن اب اس کی نظر زندگی کی حقیقتوں پر ٹھہرتی ہے۔ پہلے شاعر اس دنیا کے تجربوں پر قانع تھا جسے خلوت و جلوت کی چہار دیواری کہا جا سکتا ہے لیکن اب ایک پوری کائنات اس کی محفل ہے۔

کہا جاتا ہے عزیز کا یہ ذہنی ارتقا غالب کی تقلید کا مرہون منت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کو بھی بڑا اصرار ہے کہ عزیز کو غالب کا صحیح مقلد اور ہمصفیر مانا جائے۔ لیکن مجھے اس گمان میں حسن ظن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگر غالب کی تقلید کے یہ معنی ہیں کہ ہر بات کو ایک معمہ بنا کر پیش کیا جائے تو عزیز ایک حد تک غالب کے مقلد کہے جا سکتے ہیں۔

جفائے ناز بتقریب رسم الفت ہے　　یہی ہے خیر ابھی امتحاں نہیں ہوتا
ہے بہ ترجیح سودائے مژہ پر دو قدح　　ہر رگ دل دے رہی ہے نوک نشتر کا جواب
سلسلہ جوہر شمشیر کا تھا مانع دید　　ہر نظر تھی مری پابند سلاسل قاتل
مژگاں کو شغل ماتم ناکامی نگاہ　　آنکھیں جھپک رہی ہیں تری جلوہ زار میں

لیکن اس تقلید کی مثالیں استثنا کی حد تک کم ہیں۔ اب اگر غالب کی تقلید سے مراد ہے اس کے طرز بیان کی تقلید تو بھی یہ بات صحیح نہیں اترتی۔ غالب کا شعر ہے۔

رات اسکی ہے، دماغ اسکا ہے نیند اسکی ہے　　تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہوگئیں

عزیز کے یہاں اس اسلوب بیان کی تقلید صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔

خیال انکا ہے، آشفتہ سری انکی جنون انکا　　جو دیوانے قریب دامن کہسار بیٹھے ہیں
انتظار اسکا خیال اسکا، امید اسکی نہ پوچھ　　صبح سے شام ترے در پہ جو کر دیتا ہے

رہا غالب کی تخئیل اور اس کی تقلید کا سوال تو مجھے اس بات کی صحت میں بھی شبہ ہے۔

عرض مطلب بہ تمنائے سکون دل ہے　　وہ سنیں یا نہ سنیں ہم تو سنا جاتے ہیں
ابتک کچھ آشیاں کا ساماں سا نظر میں ہے　　گو میں قفس میں تازہ گرفتار بھی نہیں

اس قسم کے اشعار عزیز کے یہاں بس دو چار ہی ہیں اور غالب کا یہ رنگ۔

موت کا ایک دن معین ہے ۔۔۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی، ۔۔۔ اب کسی بات پر نہیں آتی

تو کسی حد تک بھی عزیز کی ہمت نہ ہوسکا۔ غالب کا شعر ہے:۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔۔۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

عزیز جس حد تک "گھر یاد آنے" کی تخئیل سے حاصل کر سکے ہیں وہ صرف یہ ہے

غمکدہ اپنا کیا پھر ویراں ۔۔۔ پھر مجھے آپ کا گھر یاد آیا

غالب کا ایک مشہور مقطع ہے:۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ۔۔۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب کا تیکھا پن عزیز سے پیدا نہ ہوسکا اور شعر بیچ مچ فقیر کی صدا بنکر رہ گیا۔ سنئے:۔

درِ منعم پہ ہے مقصود گدائی کس کو ۔۔۔ دلِ پر حوصلۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غالب کی تخئیل کو چھوڑئے۔ غالب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان میں وہ صحت اور چستی ہے جو الفاظ کو آدھی شاعری بنا دیتی ہے۔ اس کے خلاف عزیز نے جہاں غالب کی زبان کی تقلید کی ہے وہیں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

بقدرِ جوشِ جوانی بڑھا غرور ان کا ۔۔۔ کرے نہ نشہ باندازۂ خمار کیا
گویا شبِ فراق میں میں سر سے تا قدم ۔۔۔ آئینۂ تحملِ ایذائے درد تھا
گرہ دل کی کھلی اک ناخنِ رنگیں سے خوں ہوکر ۔۔۔ ہمیں یہ طرزِ حلِ عقدۂ مشکل پسند آیا
آنکھیں ہیں بند خواب جوانی میں مست ہیں ۔۔۔ پردہ کھنچا ہوا ہے حرمگاہِ ناز کا
مجھ کو اس صفحۂ ہستی سے ہوا یاد جسے ۔۔۔ جس کو تصویر خیالاتِ پریشاں سمجھا
تھی مری ہستی بھی جب اک قطرۂ دریا نما ۔۔۔ کیوں نہ ہم آغوش کرکے پھر مجھے دریا کیا
ہاں اے حریمِ قدس میں ہنگام گرم کن ۔۔۔ محفل کا رنگ دیکھ رہے ہیں یہیں سے ہم
خیال ان کا ہے آشفتہ سری ان کی بقول ان کا ۔۔۔ جو دیوانے قریبِ دامنِ کہسار بیٹھے ہیں
وارفتگانِ حسن پہ کیا جانے کیا بنے ۔۔۔ اٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے
اڑتی ہوئی یہ خاکِ پریشان یہ ہوا ۔۔۔ تشریح ہے عزیز کے حالِ تباہ کی

مجھے مندرجۂ بالا اشعار میں "نشہ باندازۂ خمار"، "ایذائے درد"، "طرزِ حلِ عقدۂ مشکل"، "حرمگاہِ ناز"، "تصویر

خیالات پریشاں"، "قطرۂ دریا نما"، "ہنگام گرم کن"، "قریب دامنِ کہسار"، "پردۂ حجاب" — ان تمام تراکیب کی صحت پر شک ہے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

لیکن اس بحث کا مدعا یہ نہیں کہ میں عزیز کی حیثیت پر داغ لگانا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرے نزدیک تو تقلید کا حامی ہونا اپنی انفرادی قوتوں اور اپنے فطری رجحانات کا خون کرنا ہے۔ اس طرح کسی شاعر کو غالب کا ہمنوا یا ہم رنگ یا مقلد کہہ دینا بھی کوئی امتیاز نہیں۔ عزیز، عزیز ہیں اس لئے کہ اُنھوں نے اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کیا نہ اس لئے کہ اُنھوں نے غالب کی تقلید کی۔ زبان و تخیل کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ عزیز کی تخیل غالب کا اسلوب بیان قبول کر سکتی ہے اور نہ عزیز کا طرز کلام غالب کی تخیل کو جگہ دے سکتا ہے۔ غالب کے کلام میں ایک "جرأت مردانہ" ہے عزیز کے کلام میں نسائیت کا لوچ ان کی شاعری کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ پھر غالب عزیز کے یا عزیز غالب کے ہم صف و ہم رنگ کیونکر ہو سکتے ہیں اور جب یہ بات حاصل نہیں تو عزیز کو غالب کا ہمنوا بنانا ایک سعیٔ لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔ عزیز کے تخیل کی نوعیت اور ان کے اسلوب بیان کی گنجایش ظاہر کرنے کے لئے ان کے یہ شعر کافی سمجھتا ہوں :-

ہر اک قدم ترے کوچے میں ایک عالم ہے — کہاں تک اب میں چلوں گا چلا نہیں جاتا
ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے — کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا
زبان دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی — کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا
کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع — رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

اس اسلوبِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے تخیل پرشکوہ الفاظ و تراکیب کی حامل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسکے خلاف عزیز نے اپنی سادگی میں وہ بناؤ پیدا کئے ہیں کہ جواب نہیں ہو سکتا۔ درجۂ اول کی شاعری کا ایک یہ بھی معیار سمجھا جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کے ذریعے "مصوری" میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس معیار پر عزیز صفِ اول میں بھی نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تصویریں بنائی ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ذہن کے سامنے مکمل تصویر پیش نہیں کی جاتی بلکہ محض بعض "خط" اور ذہن فوراً ان خطوط سے مکمل تصویریں پیدا کر لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر کہہ لیجئے کہ عزیز کے اصلی رنگ میں نسائیت (Feminine Grace) کے ساتھ ساتھ (Suggestibility) کا کافی حصہ ہے۔ اچھا تو اب کچھ مرقع دیکھئے :-

شیشۂ دل کو یوں نہ اُٹھاؤ — دیکھو، ہاتھ سے چھوٹا ہوتا
دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا
اک اُن کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی — اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا

نظروں نے دیکھی شرم کی اک قدرتی کشش — انگڑائی لیکے جب کوئی محفل میں رہ گیا
ہنس رہا ہے دیکھ کر یہ کون تجھ کو دید سے — سر اٹھا اے دل سے باتیں کرنے والے سر اٹھا
ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے — چمن میں کوئی نہیں آشنائے دردِ بہار

یہ محاکات ہے اور حد درجہ نازک قسم کی۔ بعض صاحب کمال مصور پوری تصویر نہیں بناتے صرف آنکھوں کا انداز پیشانی کی شکنیں یا ہاتھ کی انگلیاں بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان نقوش میں وہ صحت اور معنویت ہوتی ہے کہ دل و دماغ کسی اضافے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے۔ عزیز نے یہ مصوری اشعار میں کی ہے اور یہ ان کے کمال کا ایک بڑا دقار پہلو ہے جی چاہتا ہے کہ یہ خاکے ہیں۔ رنگ بھر کر مکمل کیا جائے اور ایک کے نیچے لکھا جائے " دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا ہے" دوسرے کے نیچے " وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا" تیسرے کے نیچے " دم بھر ہنسی نہیں رکتی" چوتھے کے نیچے " شرم کی اک قدرتی کشش" پانچویں کے نیچے " سر اٹھا دل سے باتیں کرنے والے سر اٹھا" اور آخری خاکے کے نیچے " ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے!"

لیکن یہ غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ عزیز کا شاعرانہ کمال صرف اسلوب بیان کی لطافت اور مصورانہ نزاکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ عہد حاضر کے ناقدوں نے تخئیل کو مخصوص اہمیت دے رکھی ہے کسی شاعر کا کلام سامنے آئے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی تخئیلی قوتیں کس حد تک صحیح اور بلند ہیں۔ عزیز اس معیار پر بھی پورے اترتے ہیں گے اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی ایک جگہ بھی تخئیل پرستی کے اصول سے مرعوب ہو کر اصل غزل سے اجتناب یا تغافل نہیں برتا ہے۔ چنانچہ ان کے چوٹی کے کلام میں تخئیل کی بلندی اور صحت کے ساتھ غزل کے تمام مستحسن عناصر مثلاً حسن و عشق، ذوق و شوق، جذب و اضطراب بدرجۂ کمال موجود ہیں اور ان خوبیوں میں نفسیاتی توازن نے اور چار چاند لگا دئے ہیں

اپنے مرکز کی طرف مایل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
دیکھ کر نظم دو عالم مجھے کہنا ہی پڑا — یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا
دل کو جو نہی سکوت ہوا جسم سرد تھا — وہ مدتِ حیات تھی جب تک کہ درد تھا
صرف اک خیال عشق تھا تکلیف دہ عزیز — تھا دل میں درد اور نہ کلیجے میں درد تھا
جان دی تو پھر ان کو درد آشنا پایا — روح ایک نالہ تھی آج اسے رسا پایا
شمعیں افسردہ جہاں، پھول ہیں پژمردہ جہاں — دل کو اس گورِ غریباں میں پکارا ہوتا
چمن پر اپنی طرف دیکھ کر وہ ہنستے ہیں — اب ان کے واسطے کہئے کہاں سے آئے بہار
اُس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات — جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

جو دی تھی حسن کو یہ دلفریبی — مجھے ہوش و حواس اتنے دئے کیوں
میں بوالہوس کے ساتھ نہ رکھوں گا قدرِ عشق — گو یہ خلافِ رسمِ محبت ہی کیوں نہ ہو
غمِ دوست کے لئے کوئی ہنگامہ چاہئے — وہ ماتمِ جنازۂ حسرت ہی کیوں نہ ہو
ہے ضبطِ گریہ میرے لئے اک محال بات — گو آنسوؤں میں دل کی حقیقت ہی کیوں نہ ہو
زمانے کے حوادث تو رہیں فطرت میں داخل ہیں — مصیبت دل کی کیا کم ہو، بلائے ناگہاں کیوں ہو
اے حسن وقتِ عشق تصور تو دے ذرا — پھر وہ تجھے دکھاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجۂ بالا اشعار نہ صرف عہد جدید کی غزل گوئی کا بلند ترین معیار پیش کرتے ہیں بلکہ مستقبل کی غزلگوئی کے لئے سنگ بنیاد ہیں۔ یہاں ہر جذبہ نہ صرف سورج کی کرن کی طرح لطیف اور روشن ہو گیا ہے بلکہ شکل ([illegible]) میں نکھر کر قوس قزح کی رنگینیوں کا حامل ہو چلا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ عزیز کا یہی رنگ پختگی کے درجے کو پہونچتا گیا ہے اور ہمارے لئے ان کے تغزل کا یہی پہلو طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھے شعر کی ایک یہ بھی پہچان ہے کہ اسے پڑھتے ہی یا سنتے ہی دل و دماغ میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شعر حافظہ میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ہزار بار کہیں گے کہ فلاں شعر اچھا ہے، لیکن آپ اس پر الفاظ و تخیل سے متعلق کوئی بحث ”کرا“ نہیں کر سکتے۔ یہی حال عزیز کے مندرجۂ بالا اشعار کا ہے۔ یہ اشعار بہت اچھے ہیں۔ آپ کہیں گے کیوں؟ میرا جواب ہے ”محسوس کر کے دیکھئے“۔

فضل الدین اثر ایم-اے

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزواً جزواً جنوری تا دسمبر ۳۸ء شایع ہو چکی ہے اس کے کچھ قائم زاید چھپے ہیں چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے۔ وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں لیکن فایل کے علاوہ تاریخ علیحدہ چاہتے ہیں، نیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۴۴ صفحے [illegible] اور قیمت مع محصول عہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

آیندہ جنگ میں کون کس کا ساتھ دیگا

جنگ ہونا لازم ہے اور وہ بھی مستقبل قریب میں اس سے انکار ممکن نہیں۔ جمعیت اقوام مردہ ہو چکی ہے، کیلاگ اور لوکارنو کے معاہدے پرزے پرزے ہو چکے ہیں، جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کے مقابلہ میں جھکتی جا رہی ہے، اسلحہ سازی اور جنگ کی طیاری دیوانگی کی حد تک بڑھ رہی ہے اور ہر ملک انتہائی خود غرضی کے ساتھ دوسرے ملک کا گلا گھونٹنے کے لئے طیار ہے۔

لوگ غلطی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ گزشتہ جنگ میں اتحادیین کا جرمنی کے مقابلہ میں آنا صرف ایک ہمسایہ ملک بلجیم کی آزادی قائم رکھنے کے لئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کا سبب محض تجارتی و بحری رقابت تھی اور مشرق و مراکش میں جرمن در خور کسی طرح برطانیہ کو گوارا نہ تھا۔ بلجیم تو صرف بہانہ تھا ورنہ یوں بھی انگلستان فرانس کو جرمن کے مقابلہ میں مغلوب نہ دیکھ سکتا تھا اور اب بھی انگلستان کے یہ مصالح بدستور قایم ہیں اگرچہ دوسرے حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔

اس وقت جرمنی دیوانہ وار اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اس کی آبادی جسمانی قوت میں ساری دنیا سے بڑھ جائے اور ساتھ ہی یہ کہ اس کی قوم ایک ممتاز جگہ حاصل کرلے۔ اٹلی اپنی دھن کا پکا ہے اپنی کھوئی ہوئی قدیم عظمت کو واپس لینا چاہتا ہے، روس آہستہ آہستہ ایک اژدھے کی طرح آگے سرکتا جا رہا ہے، فرانس خاموشی کے ساتھ انتہائی حد تک اپنے کو مسلح کرتا جاتا ہے۔ انگلستان جو اپنی بحری قوت کے گھمنڈ میں غافل سو رہا تھا آج چونک پڑا ہے تو حیران ہے کہ کیا کرے کیا نہ کرے اور اس کا احساس اول اول اسوقت ہوا جب حبشہ کے معاملے میں انگلستان نے دیکھا کہ مسولینی لندن پر گولہ باری کرنے کی حد تک آمادہ ہو گیا ہے۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلح کرنے لگا اور ۔۔ ملین پونڈ سالانہ کا اضافہ تا ہم یہ صرف کرنے کی منظوری دی۔ الغرض اسوقت یوروپ کی حالت ایک ایسے میگزین کی سی ہے کہ ذرا سی چنگاری سے دھماکا پیدا ہو سکتا ہے روس، جرمنی اور اٹلی میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی ہے جس نے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کو بھلا دیا ہے اور وہاں کے آرٹ، لٹریچر اور سائنس میں عسکری رجحان پایا جاتا ہے۔

ہر چند جرمنی عہد نامہ ورسائی کے پرزے پرزے کرچکا ہے لیکن وہ اس پر قانع نہیں بلکہ گزشتہ جنگ میں جو ذلت اسے نصیب ہوئی تھی اس کا انتقام بھی لینا چاہتا ہے۔

انگلستان کی پالیسی گزشتہ جنگ کے بعد بہت کچھ مائل بہ امن ہوگئی تھی، بحری جہازوں کی تعمیر بھی کم کردی گئی تھی، فوجی بھرتی بھی ختم ہوچکی تھی۔ وہاں کی آبادی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے جنگ نہ کرے گی لیکن افسوس ہے کہ یہ سب چیزیں خواب ثابت ہوا۔ جب تک جرمنی سیاسی، اقتصادی و عسکری حیثیت سے کمزور تھا اور اٹلی کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، انگریز مزہ میں تھا، چین سے ڈنر کھاتا تھا اور تمسکات کے بھاؤ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، لیکن جب جرمنی نے اپنی فوجی قوت بڑھا کر وادی رائن پر قبضہ کر لیا اور اٹلی جنگ حبشہ کے دوران میں بحر روم پر چھاگیا تو انگلستان کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے بھی اپنی بحری و ہوائی قوت کو بڑھانے کی فکریں شروع کردیں اور ... ملین پونڈ کا صرف اس کے لئے تجویز کیا گیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی جو بالکل یقینی ہے تو کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ یورپ کے وہ ممالک ہیں جن کے درمیان روم اور برلن کے اشتراک عمل نے خط فاصل کھینچ دیا ہے، مغرب کے تمام وہ ممالک جہاں اجتماعی یا جمہوری اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں یقیناً ہٹلر اور مسولینی کی آمریت کا مقابلہ کریں گے اور اگر روس نے بھی ساتھ دیا جو ایک حد تک یقینی ہے تو ہٹلر اور مسولینی کی مخالف قوتوں کا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔

زیکوسلوویکیا پر جرمنی کے قبضہ نے فرانس کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیا ہے اور مفاہمت میونخ نے تو پوری طرح ثابت کر دیا کہ جرمنی کے مقابلہ میں آنے سے سب جھجکتے ہیں اور یہ جھجک زیادہ تر اس لئے ہے کہ اس وقت کوئی قوم جنگ کے لئے اس قدر طیار نہیں ہے جتنی جرمن قوم۔

اب آس پاس کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو لیجئے تو ان میں سب سے زیادہ اہمیت پولینڈ کو حاصل ہے لیکن اس کی سیاست خارجہ میں اس قدر جلد جلد انقلاب ہوئے ہیں کہ آیندہ کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی کچھ دنوں پہلے تک فرانس کا اثر وہاں قوی تھا، لیکن بعد کو جرمنی نے اس سے معاہدہ کرکے اپنے اثرات وہاں پیدا کر لئے۔ ہر چند پولینڈ کی نجات اسی میں ہے کہ وہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ دے، لیکن روس کی طرف سے اسکی بدظنی بہت بڑھی ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ آخر میں جرمنی کا شریک ہو جائے۔

یوگوسلیویا میں بھی فرانس کے اثرات ختم ہوچکے ہیں اور اٹلی کے اثرات وہاں قائم ہو رہے ہیں اس لئے آیندہ جنگ میں وہ اٹلی کے خلاف تو لڑے گا نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بحر اڈریاٹک میں اٹلی کے دشمنوں کے جہازوں کو نہ آنے دے۔

رومانیا، فرانس کا دیرینہ دوست ہے، لیکن حال ہی میں وہاں فاسسٹ جماعت نے زور پکڑا ہے اور غالباً گوگا کی قیادت میں وہاں کی حکومت فاسسٹی جماعت کے ہاتھ میں چلی جاتی مگر اس کی موت سے ہوا کا رخ پھر بدل دیا ہے، لیکن اب بھی ہر وقت اس کا امکان ہے کہ گوگا کا آئرن گارڈ جو بہت ذی اثر ہے رومانیا کو جرمنی کی آغوش میں ڈالدے۔ دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے بھی رومانیا کو تجارتی مدد پہونچ رہی ہے اور اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آیندہ جنگ میں وہ کس کا ساتھ دے گا، تاہم ہٹلر کی نگاہیں اسکی معدنیات پٹرول پر لگی ہوئی ہیں اور زیکو سلاوکیا کے حشر نے اسے بہت متردد کر رکھا ہے اور شاہ کرول کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کی امانت پر بھروسہ کرے۔

بلغاریا اُن ملکوں میں سے ہے جن کو گزشتہ جنگ عظیم میں سب سے زیادہ نقصان پہونچا تھا اور بلقان کی حکومتوں نے مستقلاً اسے غیر مسلح رہنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن شاہ بورس (جو شاہ اطالیہ کا داماد ہے) اٹلی کی مدد سے اپنے ملک کو پھر مسلح کر رہا ہے اور آیندہ جنگ میں وہ یقیناً اٹلی کا ساتھ دے گا اگر حالات نے اسے غیر جانبدار رہنے پر مجبور نہ کیا۔ حال ہی میں جرمنی سے بھی ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے جس نے جرمنی اثرات بھی وہاں پیدا کر دئے ہیں اور ان تمام حالات کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُسے جرمنی و اٹلی کا ساتھ دینے سے یہ توقع قایم ہو گئی کہ جنگ عظیم کے بعد جو علاقہ اس سے چھین کر رومانیا کو دیا گیا تھا، اسے پھر واپس ملجائے گا۔

ہنگری پر جرمن اثرات ظاہر ہیں کیونکہ اس کی اقتصادی فلاح جرمنی کے رحم و کرم پر موقوف ہے اور آیندہ جنگ میں اٹلی و جرمنی کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد ترکی کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی صحیح رائے زنی کرنا مشکل تھا، کیونکہ اتاترک برطانیہ کی دوستی کو زیادہ عزیز رکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مجبوراً روس کے ساتھ بھی۔ شام کے مسئلہ میں ترکی کو فرانس سے ضرور مخالفت تھی اور ہے، لیکن برطانیہ کی وجہ سے وہ بروئے کار نہ آسکتی تھی۔

ترکی کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے اگر برطانیہ نے سولہ ملین پونڈ کا قرض اسے دیا تو جرمن نے بھی ساڑھے بارہ ملین پونڈ دئے، لیکن پلہ برطانیہ ہی کا بھاری رہا اور عصمت پاشا نے باوجود اس کے کہ وہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتا مصلحتاً انگریزوں ہی کا ساتھ دیا جیسا کہ حال کے ترکی انگریزی معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے

یونان کی پالیسی بہت مشتبہ ہے۔ ایک طرف وہاں انگریزوں کا بھی کافی اثر ہے اور دوسری طرف وہاں کا وزیر اعظم فاسسٹی اُصول پر حکومت کو چلانا چاہتا ہے۔

اسپین پر چونکہ جنرل فرانکو قابض ہو گیا ہے اس لئے نازی اور فاسسٹی اثرات وہاں کھلم کھلا موجود ہیں اور آیندہ جنگ میں انھیں کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے، پرتگال ہرچند اشتراکیت کا مخالف ہو

لیکن برطانیہ کے اثرات وہاں زیادہ ہیں اور دونوں میں فوجی اتحاد کا معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔

اب ایشیا کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ عراق میں انگریزوں کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور ایران، برطانیہ ک اُن زیادتیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو پیٹرول کمپنی کے سلسلہ میں اس نے ایران پر روا رکھی ہیں، افغانستان تعلقات برطانیہ سے بہت زیادہ دوستانہ نہیں ہیں اس لئے غیر عربی مسلم حکومتیں کبھی برطانیہ اور روس ساتھ نہ دیں گی بلکہ غیر جانبدار رہیں گی۔ رہگئی عربوں کی حکومتیں سو ان میں سے اکثر فرانس و برطانیہ سے نفرت کرتی ہیں جس کا ثبوت فلسطین، عراق اور شام کی بیچینیوں سے ملتا ہے۔

جنوری سنہ ۴۰ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے۔ وہ ا قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں، انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

اسوقت تک حسب ذیل عنوانات تقسیم ہو چکے ہیں:-

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔ اے
نظیر اور اُردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔ احمد اکبرآبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبرآبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق	=	جناب مخمور اکبرآبادی بی۔ اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	=	جناب مولانا سیماب اکبرآبادی

عنوانات ختم نہیں ہیں، ہر شخص اپنے لئے علاوہ عنوان تجویز کر سکتا ہے۔ اکتوبر تک مقالات کا پہونچ جانا ضروری ہے۔

عدالت

گرم بازار فوجداری ہے

حکومتوں میں فوجداری، ریاستوں میں فوجداری، تعلیم گاہوں میں فوجداری، کارخانوں میں فوجداری، تیوہاروں میں فوجداری، مسجد و مندر میں فوجداری، اُردو ہندی میں فوجداری —— یہاں فوجداری، وہاں فوجداری —— اور کہیں کہیں خدائی فوجداری!

لات مکے چل رہے ہیں، لاٹھیاں چل رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، تلواریں چل رہی ہیں، قلم چل رہا ہے، زبان چل رہی ہے، دماغ چل رہا ہے، جوتے چل رہے ہیں —— کہیں کہیں سے بیٹ چلنے کی بھی خبر آجاتی ہے۔

ان سب سے نپٹنے کے لئے عدالتیں، لنگرخانے، شفاخانے اور چندے کی فہرستیں کھلی ہوئی ہیں! غالب کے زمانہ میں فوجداری کے مقدمات عدالت ناز میں پیش ہوتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا۔

پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز   گرم بازار فوجداری ہے

لیکن جن فوجداریوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہاں شاعری کا دخل نہیں ہے۔ تعزیرات ہند و ضابطہ دیوانی کی کارفرمائی ہے۔ عدالت ناز کے بجائے فوجداری اور دیوانی کی عدالتیں ہیں۔ فوجداری اور دیوانی ہی کی نہیں فوجی عدالتیں بھی —— قومی عدالتیں، مذہبی عدالتیں، تجارتی عدالتیں، اخباری عدالتیں —— جا بجا اندھا دھند عدالتیں بھی ان میں کہیں فریقین مقدمہ ہیں، حاکم نہیں ہے۔ وکلا ہیں فریقین مقدمہ نہیں، حاکم ہیں قوانین نہیں —— ایسی بھی ہیں جہاں سزائیں ہیں اور کچھ نہیں! آج کی گفتگو میں عدالت کا مسئلہ زیر نظر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کس قسم کی عدالت پر گفتگو کی جائے آپ تو جانتے ہیں کہ جب کوئی معاملہ عدالت کے سامنے ہوتا ہے، اس وقت نفس معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ سمجھدار لوگ بہت تامل کرتے ہیں اس لئے کہ اکثر کوئی نہ کوئی بات زبان سے ایسی نکل جاتی ہے۔ جس سے آدمی توہین عدالت کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ پھر آج جب خود عدالت ہی پر براہ راست گفتگو ہونے والی ہے تو ظاہر ہے کہ ایک صاحب فہم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر کتنی کتنی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہوں گی۔

لیکن ایک بات ضرور۔ قابل اطمینان تو نہیں، قابل لحاظ ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکا عدالت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ لیکن وہ چاہیں تو سب کچھ بگاڑ دیں یعنی ظل اللہ۔ ان میں یقیناً نہیں ہوں۔ ممکن ہے آپ ہوں۔ بادشاہ پر خدا کا سایہ ہوتا ہے ہم آپ بادشاہ کے سایہ میں ہیں۔ اس لئے ہم آپ کا خدا ہی حافظ ہے! دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ عدالت کی زد میں عاقل و بالغ ہی آتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیجئے اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو آپ بھی عدالت سے پناہ میں ہیں اور بقیہ ہم سب آپ سے پناہ خواہ ہیں۔ پاگل اور نابالغ کو عدالت کے سپرد نہیں کرتے۔ اسے پاگل خانہ یا تعلیم گاہ میں بھیج دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پاگل خانہ بہ بچکے حواس میں آجانے کا بھی امکان ہے۔ تعلیم گاہوں میں امتحانات اور اسٹرائیک کی زد میں رہے سہے حواس بھی زایل ہو جاتے ہیں۔

عدالت کے سلسلہ میں پاگلوں کے رتبہ سے تو آپ واقف ہو ہی گئے۔ اب میں ایک اور بزرگ کا آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی سرکاری گواہ، یہ جتنے زیادہ قابل گردن زدنی ہوں گے اتنے ہی زیادہ عدالت کے مراعات خصوصی کے سزاوار! انھیں کے باب میں کہا گیا ہے۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ریڈیو سرکاری چیز ہے اور میں ریڈیو کا آوردہ ہوں۔ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے۔ زبان اور محاورہ کا پیچ نہ ہوتا تو میں یہ کہنے کے بجائے کہ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے یہ کہتا کہ آپ کس شمار وقطار میں۔ بہرحال اگر آجکی عدالت گفتاری میں، شیطان کے کان بہرے، کوئی نوع دیگر ہو، تو آپ یقین مانیے میں فی الفور سرکاری گواہ بننے کی درخواست کروں گا۔ شیطان کے کان بہرے کہنے کو تو میں کہہ گیا۔ لیکن اگر کوئی صاحب یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے شیطان کے ساتھ زیادتی کی۔ تو میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ عدالت میں میرا سابقہ شیطان یا اسکے کسی دوست سے ہو! عدالتوں میں فرشتوں کی یوں ہی کیا کمی ہوتی ہے کہ میں ان بزرگ کو دعوت عدالت آزمائی دوں!

"سرکاری گواہ" بننے کے جو حقوق مجھے حاصل تھے ان کا میں نے تذکرہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ریڈیو والوں کو سرکاری گواہ بننے کا زیادہ حق پہونچتا ہے۔ کیونکہ وہ مجھ سے آپ سے کہیں زیادہ سرکاری واقع ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اوروں کے مقابلہ میں ان کو سرکاری گواہ بننے کا حق شفع حاصل ہے۔ بہرحال موقع آنے پر دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم اونٹ یا عدالت کس کل بیٹھے!

اس کے ساتھ ایک اور دشواری بھی مدنظر ہے کسی بھلے مانس کے ساتھ پکڑے جانے سے مطلب یہ کہ ماخوذ ہوئے (اور ہندوستانی میں ہر لفظ یا فقرے کے ساتھ توضیحی عبارتوں کا دم چھلا روا رکھا گیا ہے) تو عدالت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے اور جس کھڑکی یا روشندان

سے چاہے نکل جائے اور بالفرض نکل بھی نہ پائے جو تا برداشت کچہری قیام میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن جب عدالت خود فریق مقدمہ ہو تو اس کے دروازے اکثر بند ہو جاتے ہیں۔ بند ہونے سے یہ مراد ہے کہ عدالت کے بند کمرہ میں آپ کا قانونی معائنہ کیا جائے گا! اس ضروری اعلان و اعتراف کے بعد مجھے نفس مضمون پر بے تکان گفتگو کرنے میں کوئی تامل نہیں۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ قانون کا سارا کھیل طاقت کا ہے، چاہے وہ طاقت حرب و ضرب کی ہو، یا ہے اخلاق و مذہب کی۔ اصولاً ہر معلوم ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ بات منوانے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دے گی۔ اگر یہ شخص کو اس امر کا احساس نہ ہو کہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ جرم کی بازپرس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور شدید سے شدید قوتیں برسرکار آسکتی ہیں، تو زندگی کا شیرازہ بہت جلد برہم ہو جائے۔

عدالتیں، کیوں اور کیونکر قائم ہوئیں۔ اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اور طول طویل بھی، جب سے دنیا میں لوگوں نے مل جل کر رہنا سہنا شروع کیا اسی وقت سے قانون کا بھی دور دورہ ہوا، جس نے مختلف زبانوں اور مختلف اقوام و ممالک میں مختلف صورتیں اختیار کیں اور اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ قانون سے ہمارا رواں رواں جکڑا ہوا ہے۔ ہم قانون سے باہر نہیں ہو سکتے۔ کوئی کام قانون کی مدد بغیر یا قانون سے سرتابی کر کے نہیں کر سکتے۔ قانون بھی دو ایک نہیں، ان گنت ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم جانتے ہیں بہتوں کو نہیں جانتے۔ کتنوں کا لحاظ کرتے ہیں، کتنوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ کبھی پکڑے جاتے ہیں۔ پھر یہی نہیں۔ بہت سے قوانین ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتے ہیں۔ ہمارا قانون دوسروں کے قانون سے ٹکراتا ہے۔ اسی لئے اکثر ہمارا سر بھی دوسرے کے سر سے ٹکرا جاتا ہے۔ جس کی مرہم پٹی ہسپتال میں اور کبھی کبھی تجہیز و تکفین گورستان میں ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی معلوم و نامعلوم معقول و نامعقول قوانین سے جکڑی ہوئی ہے جس سے صرف موت کا قانون آزادی دلاتا ہے وہ بھی کیا معلوم!

ہاں تو قوانین ان گنت ہیں۔ مذہب کا قانون اخلاق کا قانون، فطرت کا قانون، حکومت کا قانون، فطرت کا قانون معاشرت کا قانون، جماعت کا قانون، اداروں کا قانون، اسی طرح خاندان، دولت، افلاس کا قانون، نوجوانوں کا قانون بوڑھوں کا قانون، غرض زندگی کی مکڑی جتنے تانے بانے بنتی رہتی ہے ان سب کے قوانین علیحدہ ہیں اور علیحدہ علیحدہ انہیں بھی۔ اس بھول بھلیاں سے جو شخص سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ باہر نکل آئے اسی کو ہم سب سے بڑا آدمی کہتے ہیں!

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اکثر ایک قانون کی پابندی اسی حد تک کی جاتی ہے جس حد تک وہ کسی دوسرے بہتر قانون سے نہ ٹکرائے۔ انسان کسی ایسے قانون کا پابند نہیں رہ سکتا۔ جو اس کی مختلف حالتوں یا ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھتا ہو۔ انسان میں غصہ، لالچ، خوف، شہوت، گھمنڈ، خود غرضی کی صلاحیتیں موجود ہیں جو موقع موقع سے ضرور ابھرتی رہتی ہیں۔ انھیں کو ہموار رکھنے کے لئے قانون کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لئے

قانون کو کسی نہ کسی حد تک لچکیلا ہونا چاہئے۔

میں یہاں قانون کی ماہیت نفس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اچھا قانون وہی ہے جو انسانی مقتضیات کا لحاظ رکھتا ہو انھیں مقتضیات کی روشنی میں قانون کی تعبیر کی جانی چاہئے۔ اچھی دوا وہ ہے جو انسانی اعضا اور انسانی گوشت پوست سے میل کھا سکے اور اچھا طبیب وہ ہے جو مریض کی مخصوص طبیعت اور ترکیب جسمانی کے مناسب حال دوا تجویز کر سکے۔ میں ایسے علاج یا معالج کا قایل نہیں ہوں جس کے ہاں مرض اور مریض دونوں پر لیبل لگے ہوں اور وہ آنکھ بند کر کے دونوں کو یکجا کر دیتا ہو۔ ٹھیک اسی طرح کی نسبت قانون اور عدالت میں ہونی چاہئے بذاتہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی دو جرم مجرم کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے قانون کو بھی اسی طور پر تولنا پرکھنا چاہئے کہ وہ تولے اور پرکھے۔ مجرم پر عاید کیا جا سکے۔ عدالتوں کا یہی کام ہے اور میرا خیال ہے کہ نظائر اسی طریقۂ کار کے نتائج ہیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ ہماری عدالتوں میں جرم کی نوعیت پر اتنا غور نہیں کیا جاتا، جتنا کہ قانون کی بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ ہم قانون پر زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ملزم کی مخصوص نفسیات یا واقعہ کی مخصوص نوعیت پر بہت کم توجہ کرتے ہیں۔

"تمدن" کی ترقی نے دنیا کے کاروبار اتنے بڑھا دئے ہیں اور اس طور پر اُلجھا دئے ہیں کہ ہم ان پر غور کرنے کے بجائے ان کو جلد سے جلد کسی نہ کسی طرح طے کر دینے کے زیادہ کوشاں رہنے لگے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات کے فیصل کرنے میں اتنی احتیاط نہیں برتی جاتی جتنا کام ختم کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے ہمارے حاکم اور ہماری عدالتیں اکثر یہ فرض کر لیتی ہیں کہ قانون اس قسم کی مشین ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھاتی ہے بہت سی ایسی چیزیں ہیں جہاں مشین کی کارفرمائی مفید ہوتی ہے۔ لیکن عدالت اور تعلیم گاہوں کو مشین پر داختہ یا مشین آشنا کرنا بڑی غلطی ہے۔ ایک مشین لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔ لیکن لاکھوں مشین ایک آدمی کو سنوار یا سدھار نہیں سکتی۔ آدمی کو تو آدمی ہی چاہئے۔

آپ تو جانتے ہیں اسوقت ہماری گفتگو قانونی عدالتوں سے ہے ورنہ دنیا میں معلوم نہیں کتنی عدالتیں ہیں، یہی نہیں بلکہ بعض قوانین ایسے ہیں جن کے لئے کوئی عدالت نہیں۔ طبیعیات ہی کے قانون کو لے لیجئے۔ یہ قانون ہمارے آپ کے رونے دھونے، مارنے مرنے اور اس قسم کی ساری خرافاتوں سے آزاد ہے۔ سورج چمکے گا ستارے ٹمٹائیں گے۔ گرمی سے چیزیں بڑھیں گی۔ سردی سے سکڑیں گی۔ روزی میسر ہوتی ہو بھوک لگے گی ایسے اور قوانین ہیں جن کے ماتحت نفع نقصان رنج راحت کی دھندے چلتے رہیں گے۔ ان کی لیپ پوت ممکن ہے ان سے چھٹکارا ناممکن ہے۔

"قانون کی تاریخ" بڑی دلچسپ ہے غور تو کیجئے جب دنیا پہلے پہل آباد ہوئی ہوگی اسوقت کے قانون کیا

ہوں گے اور اب جبکہ دنیا کی آبادی کی کوئی حد نہیں، اس کے قوانین کیا ہیں۔ کچھ اور نہیں تو اسی پر غور فرمائیے کہ پہلے آبادی بڑھانے کے اُصول بڑھتے جاتے تھے اور اب آبادی گھٹانے کے لئے کیسے کیسے اصلاحات کام میں لائے جاتے ہیں یا اعتباری حالات دی۔پی ہوتے رہتے ہیں پہلے انسان فطرت کا غلام تھا، اب فطرت کو اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے، پہلے پیٹ بھرنے کے لئے شکار کرتا تھا، اب اقتدار بڑھانے کے لئے جنگ کرتا ہے پہلے طاقت کا نام قانون تھا؛ اب قانون کا نام طاقت بتاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے لیکن بات جہاں کی تہاں ہے طاقت کی کارفرمائی پہلے بھی تھی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کام بتیرے سے لیتے تھے اب وہی کام آداب تسلیمات سے لیتے ہیں۔ پہلے جس واقعہ کا اظہار "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ایسے بھدّے بھلے یا محاورہ سے ہوتا تھا، وہی اب شاد کے شعر سے ہوتا ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن جس طرح قانون اور عدالت کی زد میں محض مقدمات کا دوران بڑھتا رہتا ہے اور فیصلہ کی نوبت اسوقت آتی ہے، جب فریقین مقدمہ کا بجائے خود فیصلہ ہوچکا ہوتا ہے، اسی طرح آج کی تقریر میں محض قانون عدالت کا دوران بڑھتا رہا اور خلاصہ فریاد کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے میں تمہید کو چھوڑ اصل مقدمہ کی طرف رجوع کرتا ہوں

میرا عدالتوں سے تعلق رہا ہے "ہسپتال" میں بھی مدتوں رہا۔ اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے یونیورسٹی میں کیوں ہوں۔ لیکن اس سے آپ یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکال سکتے کہ میرا عدالت سے متعلق ہونا ہسپتال جانے کا باعث ہوا۔ جو عدالت کی زد میں آجاتا ہے اسے ہسپتال اور یونیورسٹی دونوں سے بہتر مقام پر بھیجتے ہیں۔

میں نے بنچ مجسٹریٹوں کے وہ زمانے بھی دیکھے جب نہ مجسٹریٹ قانون جانتے تھے اور نہ عورتیں بیا شک مختار وکیلوں کے پاس پشتینی بستے اور تانگے کی عینکیں ہوتی تھیں جب بائیسکلیں صرف کپتان قسم کے لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور وہ کہیں معائنہ کو آتے تھے تو تھانہ دار صاحب ان کی بائیسکل کے پاس اس طور پر کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی نیاز مند دہاتی کسی شریر اور منہ زور گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے جھکا سمٹا اس طور پر کھڑا ہوتا ہے کہ گھوڑا ذرا چمکا اور یہ باگ چھوڑ کر بھاگا۔

اسی زمانہ کے ایک سن رسیدہ بنچ مجسٹریٹ صاحب کا تذکرہ ہے جو ایک آنکھ دو ایک حواس اور دونوں پاؤں سے معذور تھے۔ معدہ کے مریض اور بنئے کے مقروض تھے۔ ڈاک بنگلہ میں اجلاس ہوتا۔ جہاں ایک تبدار پالکی پر لاد پھاند کر پہونچائے جاتے۔ پالکی ایسی تھی جس کی چار گھنٹے پہلے سے مرمت شروع ہوتی تو دو گھنٹہ کے لئے کام دیتی تھی۔ مدعی مدعا علیہ اور ان کے حوالی موالی کہار کا کام دیتے۔ مختار وکیل صاحبان جلو میں چلتے۔ مجسٹریٹ صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اور بگھوں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے وزراء

بس مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ بیٹھے تو پالکی کے بیچ ہی میں تھے لیکن جدھر مدعا علیہ ہوتا اسی طرف تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے۔ اس طور پر دور سے دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے کہ فریقین میں مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون۔ کچھ حاکم کا وزن کچھ زمین کی کشش کچھ پالکی کی بوسیدہ سیٹ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجسٹریٹ صاحب کا کولھوں سے اوپر تک کا بہت کچھ حصہ ایک لکھنوی کی دور سے پالکی کی پٹی سے نیچے نظر آتا یہاں تک کہ آپ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ پالکی کی سیٹ کو حاکم کے تھامنے کے لئے کن کن چیزوں سے مدد لی گئی تھی مثلاً انگوچھا، نواڑ، ادوائن کی رسی، برگد کے پتلے گدے وغیرہ۔ سے پالکی ایسی نظر آتی تھی جیسے کسی قبہ دار مزار کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔ پیچوان کا ایک سرا حاکم کے منہ میں ہوتا اور بقیہ متعلقان مقدمہ کے پاس۔ ڈاک بنگلہ دور تھا۔ حقہ پیتے خواب دیکھتے، وکلاء کی بحث سنتے چلے جاتے اور کچہری پہونچتے پہونچتے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیتے۔ واپسی میں اس کی اپیل بھی سن لیتے اور حسب مصلحت کبھی فیصلہ بحال رکھتے اور کبھی منسوخ کر دیتے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے واقعے آپ کو سنانا شروع کر دوں تو ممکن ہے آپ کی دلچسپی بڑھ جائے مگر میرا انحطاط میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے۔ امکان کو یقین پر ترجیح دینا بڑی "غیر عدالتی" بات ہے اس لئے میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ آج کل کی عدالتوں کی مثال آج ہی کل کے ڈاکٹروں یا مزاروں سے دیجا سکتی ہے۔ جس طرح آپ کسی مزار پر جائیں تو قدم قدم پر مجاور اور دربان آپ سے کچھ نہ کچھ "چراغی" وصول کرتے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً دعائیں اور گالیاں بھی دیتے جائیں گے یہاں تک کہ آپ کی جیب خالی اور حواس مختل ہو جائیں گے یا جس طرح ڈاکٹروں سے سابقہ ہو تو تمام اعضاء رئیسہ و رذیلہ کا امتحان یا ان میں سے بعضوں کی قطع برید یا قلع قمع کراتے کراتے آپ دیوالیہ ہو جائیں گے یا از کار رفتہ اسی طرح عدالتوں میں بھی چپراسی، کلرک اور وکلاء کی دارو گیر سے فریقین مقدمہ، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہاں سے کہاں پہونچ جاتے ہیں۔

مقدمات کی مثال بعض ایسے امراض سے دیجا سکتی ہے جن کا علاج بڑا قیمتی اور انجام ہمیشہ افسوسناک ہوتا ہے۔ وکلاء اور حکام دونوں واقعات سے اتنا سروکار نہیں رکھتے جتنا کہ دفعات سے بڑی سے بڑی اور آخری سے آخری عدالت تک صرف قانونی موشگافی ہوتی ہے اس طور پر فریقین مقدمہ کی دادرسی ہوتی ہو یا نہیں قانون کو تعبیر و تاویل کی چرخ دے دے کر تصوف یقیناً بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اب فی نفسہ عدالت، عدالت کا کام واقعہ کی تول پرکھ نہیں بلکہ دفعات قانون کی تول پرکھ رہ گیا ہے۔ ہم فریقین مقدمہ کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ دفعات قانون کے ساتھ قوت آزمائی کرتے ہیں اور بالکل ایسا ہے جیسے مریض کی جان بچانے یا تکلیف دور کرنے کے بجائے طبیب، تحقیق مرض پر پوری کوشش صرف کر دے۔ جس طرح "ریاضیات" ایسا نپا تلا علم بھی ترقی کی آخری منزلوں تک پہونچکر صرف تصوف بنکر رہجاتا ہے۔ اسی طرح عدالتوں کا کام دادرسی کے بجائے

قانون آزمائی رہ گیا ہے۔

چپراسی، محرر، وکیل، حاکم، فریقین مقدمہ، بیانات، جرح، بحث، سمن، وارنٹ، دوران مقدمہ انکی ترکیب استعمال تا ترتیب انجام مستقل عنوانات ہیں جن پر اس مختصر صحبت میں اظہار خیال ناممکن ہے۔

آخر آخر میں آپ اتنا البتہ سمجھ لیجئے کہ سزا اور قانون کے دو بنیادی اصول یہ ہیں۔ یعنی جو بات کہی جائے اسے کوئی نہ مانے یا جو بات منع کی جائے اسے کوئی کر گزرے۔ انھیں اصول کے ماتحت شیطان راندہ درگاہ ہوا اور حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے اسی دو پہیہ کی گاڑی کو لڑھکاتی رہے اسی گاڑی پر دنیا کے سارے کھیل کھلونے لدے ہوئے ہیں اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ گاڑیبان کا فرض راستہ کے نیچے اونچے دیکھتے ہوئے گاڑی کو ہانکتے رہنا ہے۔ گاڑی کہاں جائے گی گاڑی کے پہیے کیسے ہیں گاڑی کی ساخت کیا ہے، راستہ کی دشواریوں سے گاڑی کو کیونکر گزارا جاسکے گا۔ ان تمام باتوں کی ذمہ داری قانون بنانے والے اور منزل کے تعین کرنے پر ہے۔ گاڑیبان کو ان باتوں سے سروکار نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاڑی کے پہیئے اور اس کے متعلقات کاٹ کباڑ کی ہوتی ہیں لیکن اس میں طاقت اسٹیم یا بجلی یا منہ زور جانور کی پہونچا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں گاڑی پہلے ہی دھچکے میں پاش پاش ہو جائے گی۔ کبھی انجن کو اسٹیم یا بجلی کے بجائے بیل، گدھوں سے کھینچنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بیل گدھے تھک کر تباہ ہو جاتے ہیں اور انجن جہاں کا تہاں رہجاتا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز اور اسٹیم انجن کے چلانے والے کو چھکڑا اور بہیلی ہانکنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کس کا کیا انجام ہو گا۔

رشید احمد صدیقی

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۳۲ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا ستمبر، نومبر و دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء۔ فروری۔ دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں

منیجر نگار لکھنؤ

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔

اصل قیمت عہ۔ رعایتی ۱۲؍ علاوہ محصول

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مکرمی - یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ "گفت وشنید" غلط ہے۔ اگر شنودن اور شنیدن دونوں صحیح ہیں تو شنید وشنود کو بھی درست ہونا چاہئے، بیدل کہتا ہے:-

شنیدم کہ شیخ زماں بایزید شبے داشت باعشق گفت وشنید

اب غالباً آپ کو اطمینان ہوگیا ہوگا۔

آپ نے جس کامیابی پر مبارکباد دی ہے، اس کا شکریہ تو خیر مجھے ادا ہی کرنا ہے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

یہ میں انسانی تمناؤں کی نامعقول وسعت کے لحاظ سے نہیں کہہ رہا بلکہ بالکل ریاضی کے اُصول کے ماتحت دو اور دو چار کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ قسمت کا قایل نہیں کہ ہر تکلیف کو مصلحت خداوندی سمجھکر خاموش بیٹھ رہوں اور دماغی رجحان یہ کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنا کسی طرح گوارا نہیں۔

لیکن، لاحول ولاقوۃ، میں یہ کیا قصہ لیکر بیٹھ گیا، آپ نے ازراہ محبت میری مسرت کو مسرت مان کر اس میں حصہ لیا اور میں فلسفۂ لذت والم لے بیٹھا۔ باور کیجئے، میں آپ کے جذبۂ خلوص کی قدر کرتا ہوں اور آپ کی محبتوں کا از بس سپاسگزار ہوں۔

قبلہ میر صاحب - تسلیم - یقیناً یہاں کی شیعہ سُنّی نزاع حد درجہ تکلیف دہ ہے، لیکن میں اسے بھی ڈماکریسی کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔

والٹیر کہتا ہے:-

"یوں اگر تم کوئی بات میرے خلاف کہو تو شاید میں خاموش رہوں گا، لیکن اگر تم نے یہ کہدیا کہ تمھیں ایسا کہنے کا حق حاصل ہے تو میں اپنی جان دیدوں گا"

اس وقت سوال نہ ابوبکر و علی کا ہے، نہ خلافت و امامت کا بلکہ صرف اس بات کا کہ ایک فریق ایک بات کو اپنا حق کہہ کر تسلیم کرانا چاہتا ہے اور دوسرا اسے نہیں مانتا۔

میرے نزدیک یہ سب زندگی کی علامتیں ہیں۔ اگر تمام مسلمان من حیث القوم کچھ نہیں کر سکتے تو من حیث العقیدہ ہی کسی ایک کو تو اُبھرنے دیجئے۔ نہ اب مدحِ صحابہ کوئی وزن رکھتی ہے نہ تبرا۔ معنوی حیثیت سے دونوں لغو ہیں، لیکن اگر اس بہانے سے ان میں کوئی احساسِ زندگی پیدا ہوتا ہے، تو کیا حرج ہے۔ دونوں کو لڑنے دیجئے، اگر کوئی ایک بھی سنبھل گیا تو محنت وصول ہوگئی، ورنہ تباہ ہونا تو اس قوم کی قسمت میں لکھا ہی ہے، آج نہ سہی کل، سیاسی گمراہی سے نہ سہی، مذہبی گمراہی سے، ایک ہی بات ہے۔

صدیقی۔ خط ملا۔ میرزا صاحب نے بڑھاپے میں شادی کر لی تو کیا بُرا کیا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ انسان دوسرے حیوانات سے صرف اس لئے ممتاز ہے کہ وہ بغیر پیاس کے پانی پی لیتا ہے اور ہر موسم میں محبت کر سکتا ہے پھر کیا مرزا جی کو تم نے انسان نہیں سمجھا۔

میرا ارادہ ابھی کہیں باہر جانے کا نہیں ہے اور ہو بھی تو کیا ہوتا ہے۔ عزم و ارادہ میں وہ پختگی اب کہاں۔ دل کمزور، دماغ ضعیف، حوصلے پست، ولولے سرد۔ تفریح کی جگہ ضرورت نے لے لی اور لطف کی جگہ افادیت نے، بات بات میں چون و چرا ہے اور ہر ہر قدم پر عاقبت اندیشانہ پس و پیش۔ انگریزی کے دو فقرے سناتا ہوں ترجمہ ان کا نہیں ہو سکتا اس لئے اصل زبان میں سنو:

What is matter — never mind.
What is mind — it matters not.

یہ صرف الفاظ کا کھیل نہیں ہے، بلکہ فلسفہ ہے اس دورِ حیات کا جو اٹھارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰ سال کی عمر میں ختم۔ پھر تمھیں بتاؤ کہ مادہ و نفس دونوں کو بھلا دینے والا زمانہ اب کہاں مل سکتا ہے۔ اب تو یہی دو چیزیں سامنے ہیں اور انھیں کی باہمی جنگ نے بیکار کر دیا ہے۔ تمھیں بتاؤ کہ ان میں صلح و آشتی کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟

عزیزی۔ کل شفیع کا خط آیا ہے، تمھاری طرف سے وہ بہت بد دل ہیں، تفصیل تو کچھ لکھی نہیں، لیکن بعض فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید تم نے کوئی وعدہ اُن سے کیا تھا اور پورا نہ کیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟
ہر چند میں جانتا ہوں کہ تم نے ارادتاً کوئی بات ایسی نہ کی ہوگی جس سے انھیں تکلیف پہونچے، لیکن سوال

یہ ہے کہ تم کسی سے وعدہ ہی کیوں کرو کہ بعد کو ملال کی صورتیں پیدا ہوں۔
بہر حال مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے ان سے کیا کہا تھا اور انھیں کیوں شکایت پیدا ہوئی۔ تمھارا براہ راست ان کو لکھنا مناسب نہیں۔ مجھے لکھو، پھر میں سمجھ کر ان سے گفتگو کروں گا۔

یقیناً تم سے لڑنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے، لیکن اعترافِ شکست کی بھی کوئی صورت نہیں۔ تمھارے "نہیں" کے جواب میں اگر "ہاں" نہیں کہہ سکتا تو خاموش رہنے سے مجھے کوئی چیز باز رکھ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھیں راستی پر ہو، لیکن میں کیوں نہ ہوں، یہ بھی تمھارے ہی سوچنے کی بات ہے۔
میں جانتا ہوں کہ جن حالات سے تم گزر رہے ہو، وہ انسان کو اس کے سایہ سے بھی گریزاں بنا دیتے ہیں، لیکن جب تک اس دنیا میں جینا ہے، تم کیا ایک بادشاہ بھی، اور بادشاہ کیا بلکہ ایک گدائے گوشہ نشیں بھی، علایق تمدن کی گرفت و احتیاج سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا۔ جب تک سانس لینے کے لئے آکسیجن کی ضرورت ہے کاربن کے خطرات کا مقابلہ ضروری ہے۔
میں جانتا ہوں کہ تعلقات بڑھانا خوب نہیں، لیکن جو پیدا ہو چکے ہیں، ان کو دفعتاً قطع کر دینا بھی دانشمندی نہیں۔ تم ان سے ملنا ترک کر کے، انھیں تو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے، لیکن اپنے مفاد کو ضرور خطرہ میں ڈال سکتے ہو۔ بیت الخلا کونسی تفریح کی جگہ ہے، لیکن مجبوراً جاتے ہو اور بیٹھتے ہو۔ پھر اس میں کیا حرج ہے۔
تم کو ابھی غصہ ہے، اس کو فرو ہو جانے دو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا

عتاب نامہ پہونچا

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کسے

جلی کٹی کا لطف اسوقت ہے جب شاہد و مشہود دونوں یکجا ہوں۔ آپ نے کوئی الزام قایم کیا، میں نے اسے رد کیا، آپ کو اس پر غصہ آیا، میں خاموش ہوگیا۔ میری خاموشی پر آپ کی برہمی اور بڑھی، میں ہنس پڑا۔
اب آپ ہی بتائیے کہ سرکار کی آشفتگیِ مزاج کا کیا عالم ہوگا جب پورے چھ دن کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور میرے دل پر کیا گزرے گی جب میں یہ سوچوں گا کہ آپ مسلسل ہونٹ چبا رہی ہیں اور میں اس منظر سے دور ہوں!
ہاں، تو میں کیا ہوں؟ صاف صاف کہئے، چھپانے کی ضرورت نہیں...... تمھیں ڈرکس کا ہے؟

لیکن یہ ندرت ہے کہ باوصف ان تمام نقائص کے آپ کا "اداشناس" دنیا میں اگر کوئی ہے تو صرف میں! کیوں ہے نا یہی بات؟

اچھا تو فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ "سخن طرازی و دانش" کا دعویٰ میں ترک کرتا ہوں اور "نالۂ حزیں" قبول کرنے کا وعدہ آپ کیجئے۔ یعنی نہ میں یہ کہوں کہ صرف میں ہی آپ کا "گناہ گار" ہوں اور نہ آپ سوائے میرے کسی دوسرے کو "مستحقِ کرامت" ٹھیرائیں۔

وہ شخص جو انتظار ساغر میں زندگی بسر کر رہا ہو اس کے سامنے آپ خم کے خم لنڈھا دینے کی داستان بیان کریں! کس قدر ظلم ہے!

بیکس دلم غریب دمم بشنو از دلم!

یہ تو خیر جواب تھا صرف آپ کی شوخیوں کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود عد درجہ نادم ہوں اور اگر آپ کا خط نہ آتا تو آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت شاید اب بھی نہ کر سکتا۔

آپ کے شکوہ و شکایت نے جو اعتمادِ محبت میرے دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی بنا پر چندے اور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بشرطِ آنکہ آپ اس کی اجازت دیں۔ بولئے کیا ارشاد ہوتا ہے

دامانِ چاک چاک و گریبان دریدہ را

مکرمی۔ کئی سال ہوئے علی گڑھ کے ایک صاحب کوئی تذکرہ مرتب فرما رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے بھی حالات دریافت کئے تھے۔ جو کچھ میں نے انھیں لکھا تھا وہی آپ کو لکھتا ہوں، یعنی:-

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

میں کیا اور میرے حالات کیا؟ آپ اس کو انکسار کہیں گے لیکن حقیقت کے اظہار کی بھی تو کوئی صورت دنیا میں ہونا چاہئے۔ پھر آپ کیوں ایک شخص کو اس قدر مجبور کریں کہ جھوٹ بولنا اس کے لئے ناگزیر ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کو ایسی ہی شدید ضرورت ہو تو "حالی پبلشنگ ہاؤس" دہلی سے وہ مرقع طلب کر لیجئے، جس میں انھوں نے مصنفین اردو کے حالات مع اُن کی تصاویر کے شایع کئے ہیں۔ میرے پاس نہیں ہے ورنہ پیش کر دیتا۔

والسلام

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ میں اس بزم سے کیا لیکر آیا - آہ :

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی

نگاہ کی قسمیں اتنی ہیں کہ شمار مشکل ہے :- سرشار - سرکش - تلخ - نوشیں - غلط انداز - عالم آشوب - عافیت سوز تغافل پسند - گرم خو - عربدہ پرور وغیرہ وغیرہ اور فارسی شعراء نے عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔

ظہوری کہتا ہے :-

دیوانۂ زنجیر نگاہِ تو نگشتست

دیوانہ کہ دارند بزنجیر نگاہش

ملا جامی بیخود ایک جگہ لکھتا ہے :-

نگاہ محشرِ الفت کرشمہ ناز فروش

نگاہ کو "محشرِ الفت" کہنا کس قدر پیاری بات ہے -

اسی کی دوسری تعبیر سنئے :-

مہیا کرد اسباب جنوں را شوخی جنبش

تبسم سازِ بیہوشی، نگہ مضراب بیتابی

ظہوری کا ایک شعر قیامت کا سنئے :-

مے نخور دست غالبا ہرگز آنکہ گفت ست مے نگاہش را

لیکن غالب کی یہ نگاہ، جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، سب سے جدا ہے۔

اس میں بظاہر کی تخصیص نے جو خصوصیت پیدا کر دی ہے اس کو دیکھ کر بار بار عرفی کا یہ شعر یاد آتا ہے

ہجوم شوق تماشا و تیغ شرم ببیں

کہ دامنش ز نگاہِ چکیدہ لبریز ست

"نگاہِ چکیدہ"، صرف عرفی کہہ سکتا تھا یا بیدل - بہرحال وہ کچھ بھی ہو، اس کا صحیح مفہوم وہیں جا کر معلوم ہوا۔ میں جانتا ہوں آپ نے یہ سوال کیوں کیا ہے ؟ اچھا تو اب آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

مختار دلہن دلی کے مشہور ادیب مرزا صاحب کا ایک تازہ ادبی شاہکار جس میں آپ نے دلی کی سادہ نکھری ہوئی اور دلکش زبان میں ایک تعلیم یافتہ، مہذب گھرانہ کا قصہ بیان کیا ہے اور ہندوستانی عورتوں کی گھرستی زندگی کے بہت سے مسائل پر دلچسپ پیرایہ میں بحث کی ہے -

کاغذ لکھائی - چھپائی عمدہ، ٹائیٹل خوبصورت سہ رنگا - دس آنہ کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے طلب کیجئے -

منیجر حلقۂ اشاعت - زنبور خانہ - لکھنؤ

باب الاستفسار

حسن و محبت اور امرد پرستی

(جناب یاور حسین صاحب بخاری - رانی کھیت)

ایک اجنبی کا خط موصول کرکے آپ کو تعجب تو نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ آپ ایسی ہستیوں کے نام ایسے خطوط غیر متوقع نہیں کہے جا سکتے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اسی لئے تکلیف دے رہا ہوں اور اس امید کے ساتھ کہ آپ میری اس درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں بلکہ یقیناً مجھے مطمئن فرما دیں گے۔ میں تقریباً آپ کی تمام تحریریں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ رسالہ نگار میں باب الاستفسار کے عنوان کے ماتحت آپ کی سلجھی ہوئی باتوں کو میں نے بہت ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ آپ سے توقع کرتا ہوں کہ اسی عنوان کے ماتحت آپ اس سوال پر بھی جو میں پیش کرنے والا ہوں ایک محققانہ روشنی ڈالیں گے۔

میرے ایک دوست جو حال ہی میں الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کر تشریف لائے ہیں اور انگریزی لٹریچر کا بہت کافی مطالعہ کر چکے ہیں آج تقریباً ایک ماہ سے مجھ سے "فلسفۂ محبت" پر بحث فرما رہے ہیں۔ نہ خود مطمئن ہیں اور نہ میں۔ ہم دونوں کی نگاہیں اسوقت آپ ہی پر پڑ رہی ہیں کیونکہ میں اس امر کا خوب اندازہ کر چکا ہوں کہ آپ کو بھی انگریزی لٹریچر سے بہت زیادہ مس رہا ہے۔ اس بحث نے میرے اور بھی بہت سے احباب کو اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان سب کی طرف سے میں آپ کو آج یہ تکلیف دے رہا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ میں ان کے تمام دلائل کو پیش کر دوں مخالفت کے پہلو کا بیان کیا ضرور ہے۔

مثلاً فرماتے ہیں انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے سے خصوصاً شیکسپیر، کیٹس، شیلی وغیرہ کا کلام بنظر غائر دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا "مرکز محبت" یا میں یہ کہوں کہ "محبوب" جس کو مخاطب کیا گیا ہے زیادہ تر مرد رہا ہے اور جہاں "عورت" سے بھی تو وہ نظم جو اس سے متعلق لکھی گئی ہے مقابلۃً پست ہے مثال۔۔

طور پر شیکسپیر کی بھی دو نظمیں ہیں جیسے (To his Love) کے عنوان سے جو اس نے لکھا ہے اس میں بہت کامیاب ہوا ہے لیکن اسی کی دوسری نظم جس کا عنوان (Carpe Diem) ہے نسبتاً بہت پست نظر آتی ہے۔ کیٹس کے متعلق اسی کے ایک نقاد کی رائے ہے کہ اس کی شاعری کا موضوع جب کبھی کوئی عورت بن گئی ہے تو گویا اس کے کمال پر ایک سایہ پڑ گیا ہے۔ سر فلپ سڈنی کی ایک مشہور نظم (A Ditty) ملاحظہ فرمایئے جو اس طرح شروع ہوتی ہے My true love hath my heart — & I have his.

اس میں صاف طور پر شاعر کا محبوب ایک مرد ہے۔

غرضیکہ اس قسم کی تذکیر سے جو میں نے سنا ہے فارسی شاعری میں بھی بہت کافی موجود ہے اور اردو میں بھی نظر آتی ہے۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "معراج محبت" کے لئے محبوب کا مرد ہی ہونا ضروری ہے اور حقیقی محبت صرف ایک مرد اور دوسرے مرد کے ہی درمیان قایم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے فلسفہ کے ماتحت میں جن دلایل سے کام لیتا ہوں وہ یہ ہیں کہ عورت سے جو محبت قایم ہوتی ہے وہ حقیقتاً محبت نہیں بلکہ نفس پرستی یا شہوانیت ہے۔ مرد، عورت سے صرف اپنی شہوانیت کو تسکین پہونچانے کے لئے محبت کرتا ہے جو جھوٹی اور بے بنیاد ہوتی ہے، جس میں شہوت کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ برخلاف اس کے مرد اس کشش کا حامل نہیں ہوتا جو شہوانی جذبات کو مشتعل کر سکے اس لئے اس سے جو محبت ہوگی وہ یقیناً بے لوث اور دیرپا ہوگی۔ آسکر وائلڈ کا کلام دیکھنے سے اور خصوصاً اس کا ناول (The Picture of Dorian Gray) پڑھنے سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

"حسن" میں محبت کے سلسلہ میں حسن کو ضروری سمجھتا ہوں، جب تک کوئی چیز حسین نہ ہو اور جذبات کو متحرک نہ کر سکے اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں صرف حسن صورت پر ہی نظر رکھنا غلط ہے۔ چنانچہ عورت جذبات و ذہانت کے لحاظ سے بہت زیادہ پست ہوتی ہے۔ دوسرے حسن ظاہری کے اعتبار سے بھی "وہ حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی" اس کا حسن صرف نفسانیت کو برانگیختہ کر سکتا ہے، برخلاف اس کے مردانہ حسن صرف "جذبات لطیف" کو ابھارتا ہے۔

سب سے بڑا ثبوت اس امر کا یونانی صنمیات کے پڑھنے سے ملتا ہے۔ یونانی اپنے وقت کے بہترین صناع اور آرٹسٹ تھے جس کی تاریخ شاہد ہے۔ ان کا بہترین آرٹ اور حسن مردانہ کے مجسمہ اب تک پائے جاتے ہیں انھوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ "حقیقی حسن" ایک مردانہ جسم میں ہی پوشیدہ ہے چنانچہ انھوں نے اس حسن کی قدر کرنا اور اس سے محبت کرنا شروع کر دیا —— یہ دوسری بات ہے کہ حضرت لوط کے زمانہ میں یہی چیز بہت ہی ذلیل صورت میں نمودار ہوئی۔

کیا یہ واقعاً صحیح ہے کہ ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں مرد کا حسن عورت کے حسن پر فوقیت

رکھتا ہے ؛

(نگار) افسوس ہے کہ آپ نے حسن و محبت کا یہ افسانہ اس وقت چھیڑا جب میں

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

لیکن چونکہ انفعالی لذت حاصل کرنے کی اہلیت ہنوز باقی ہے اس لئے اگر چند لمحے اس "تماشا" میں بھی صرف ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔

حسن و محبت کے باب میں جب گفتگو کا موضوع یہ قرار پاتا ہے کہ حسن کیا ہے اور محبت کیا۔ یا یہ کہ جذبات عشق کے ابھارنے کی اہلیت کس میں ہے اور کس میں نہیں، تو بات جوانی کے حدود سے گزر کر عقل و ہوش کی اس دنیا کی ہو جاتی ہے جو جوانی کھونے کے بعد ہی میسر آتی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کے متعلق کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ محبت کا جذبہ تو فی الحال آپ میں سے کسی میں نہیں پایا جاتا، علی الخصوص آپ کے دوست جو یونیورسٹی کی زندگی بسر کر کے واپس آئے ہیں کہ ان میں تو خیر ہونا ہی نہیں چاہئے۔ اور اگر کوئی کیفیت ان میں باقی ہے تو یقیناً اس کا تعلق "محبت افلاطونی" (Platonic Love) ہی سے ہوگا۔

"حسن و محبت" کی بحث میں لوگ غلطی سے پہلے حسن کا مفہوم متعین کرنا چاہتے ہیں، درانحالیکہ سب سے پہلے ہمیں محبت کا تجزیہ کرنا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محبت کے لئے حسن کا ہونا ضروری ہے اور حسن میں آپ ظاہری و معنوی جمال، دونوں کو شامل کرتے ہیں، یہ درست ہے، لیکن اگر میں آپ سے پوچھوں کہ حسن سے آپ کی کیا مراد ہے۔ تو شاید آپ خد و خال کا ذکر شروع کر دیں گے درانحالیکہ یہ کوئی معیار نہیں۔ دو، ایک چیز ہے جو مجھے بری معلوم ہوتی ہے لیکن آپ اسے پسند کرتے ہیں، آپ کے لئے ناپسندیدہ ہے اور میرے لئے مرغوب آپ بڑی بڑی آنکھوں پر جان دیتے ہیں درانحالیکہ ایک حبشی اپنی معشوقہ کی آنکھ کی تعریف یوں کرتا ہے کہ:- "عینیہا کالسمسم والسمسم اکبر منہ" (اس کی آنکھ تل کی طرح ہے اور تل اس سے کچھ بڑا ہے) یورپ کا باشندہ گورے رنگ کی عورت پر جان دیتا ہے لیکن حبشہ والے مبروص سمجھ کر اس سے بھاگتے ہیں۔ اسے جانے دیجئے، آپ ایک ہی ملک، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم کے مختلف افراد کے ذوق کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حسن کے باب میں کوئی متفق علیہ نظریہ ایسا قایم نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اس کو معیار قرار دیکر ہر شخص کے حسین یا غیر حسین ہونے پر حکم لگا سکیں۔ اس لئے ہم کو حسن کا مفہوم اس شے سے ہٹ کر ڈھونڈھنا پڑے گا جسے حسین کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں محبت سے زیادہ رہبری کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

جیسا آپ نے فرمایا یہ بالکل صحیح ہے کہ جب تک کوئی شے حسین نہ معلوم ہوگی ہم کو اس سے محبت نہ ہوگی اور

یہیں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر وہ چیز میرے لئے حسین ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حسن کا خلاق خود ہمارا جذبۂ محبت ہے اور محبت سے قطع نظر کرنے کے بعد اس کا وجود کہیں نہیں پایا جا سکتا۔

لہذا سب سے پہلے ہمیں محبت کا مفہوم جان لینا چاہئے کہ اس کے بعد حسن کا مفہوم خود متعین ہو جائے گا۔ محبت کا مفہوم اگر زیادہ وسیع لیا جائے تو ہمارے پاس ایک لفظ اس سے بہتر موجود ہے۔ انجذاب ۔ یعنی کسی کی طرف کھنچنا اور اس صورت میں حسن کو ہم جذب کہیں گے، یعنی کسی کو اپنی طرف کھینچنا۔ گویا حسن و محبت کو ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں، کھنچنا اور کھینچنا، کہیں گے اور اس "کھینچا تانی" کا نام دنیائے حسن و عشق ہے۔

اس جگہ یہ بحث بالکل فضول ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے باعث کشش کیوں ہوتی ہے۔ ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ ہر شخص کے جسم سے برقی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور جب دو شخصوں کی شعاعیں منفی و مثبت ہونے کے لحاظ سے ٹھیک پڑ جاتی ہیں تو باہمدگر محبت ہو جاتی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ صرف ظن و قیاس ہے اور اگر اس میں کوئی اصلیت ہو بھی تو اس کا تعلق صرف شہوانی محبت سے ہو سکتا ہے، محبت کے مفہوم کلی پر اس کا انطباق نہیں ہو سکتا۔ بہرحال وہ برقی شعاعوں کا اثر ہو یا انیشٹین کے نظریۂ اضافت کا یا کسی اور کیمیاوی تغیر کا، محبت و حسن کی تعبیر "جذب و انجذاب" سے بہتر کسی اور لفظ سے نہیں ہو سکتی اور اسی کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جذب و کشش صرف انسانوں ہی کی دنیا کی چیز نہیں ہے، بلکہ نباتات و حیوانات کی دنیا میں بھی اسی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے اگر اپنے جامعہ میں Botany اور Zoology کا مطالعہ کیا ہوگا تو وہ اس کی تصدیق کر سکیں گے، لیکن خیر اس قدر زیادہ وسیع نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں، خود انسانوں میں دیکھئے کہ اس جذب و انجذاب کی کیفیت کتنی مختلف ہیں۔ پہلے اس کی دو بڑی تقسیمیں کرنا پڑیں گی، ایک انسان کی محبت انسان سے اور دوسرے ایک انسان کی محبت غیر انسان سے۔ ہم ایک پھول کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بے اختیارانہ ہمارا ہاتھ یا ہمارا شامہ اس کی طرف کھنچ جاتا ہے، ہم شام کو شفقی رنگینیاں دیکھتے ہیں اور ہماری نگاہ اس طرف کھنچ کر رہ جاتی ہے، ہم ایک جانور پالتے ہیں اور جب وہ ہمارے پاس آتا ہے تو بے اختیار اس پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی سب اسی کشش کے کرشمے ہیں لیکن اس کا تعلق ہمارے ذوق یا ہماری اس فطرت سے ہے جو ہمارے اندر نرمی و لطافت کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور جس کا سبب ہم کو کچھ نہیں معلوم۔

انسان کی محبت انسان سے۔ اس کی نوعیت بھی ایک نہیں ہوتی۔ ماں کی محبت بچے سے اور بچے کی محبت ماں باپ سے، بھائی کی بھائی سے، دوست کی دوست سے، یہ سب ایک دوسرے سے جداگانہ کیفیت رکھتی ہیں

اور ان میں سے کوئی ایسی نہیں جہاں جذبۂ شہوانی کام کر رہا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ محبت جہاں کہیں ہے اس جذبہ سے خالی نہیں، نادرست ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں اس کا بھی قایل نہیں کہ مرد کی محبت امرد کے ساتھ اس جذبہ سے خالی ہوتی ہے۔

اگر شکسپیر، کیٹس اور شیلی کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امرد پرست تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے وہ تھے واقعی ایسے ہی اور قدرتاً ان کی ایسی نظموں میں زیادہ جوش ہونا چاہئے جن کے مخاطب نوجوان لڑکے ہیں شعرائے انگلستان میں علاوہ ان کے مارلو، سوفٹ، جان فلیچر، بائرن اور ٹینی سن کا بھی یہی ذوق تھا۔ ٹینی سن کے کے محبوب کا نام بھی شاید آپ کو معلوم ہو کہ آرتھر ہیلم تھا۔

آسکر وائلڈ کا ذکر آپ نے پاک محبت کرنے والوں کے سلسلہ میں خوب کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے زیادہ امرد پرست ادیب شاید ہی اس زمانہ میں کوئی پیدا ہوا ہو۔ آپ نے اس کی کتاب پکچر آف ڈورین گرے کا ذکر کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس کی محبت پاک و بے لوث تھی۔ وائلڈ پر اس سے زیادہ ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو یہ نام ہی اس لئے رکھا تھا کہ اس کی بے لوثی کی طرف غلطی سے بھی کسی کا خیال نہ جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ڈورین ایک یونانی نسل کی قوم تھی جس میں یہ ذوق حد درجہ ترقی کر گیا تھا بلکہ محققین کی رائے تو یہ ہے کہ یونان میں سب سے پہلے اس قوم نے امرد پرستی کی بنیاد ڈالی ورنہ ہومر کے زمانہ میں یہ ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

شعراء کے علاوہ یورپ کے بعض نقاشوں میں بھی یہ ذوق پایا جاتا تھا۔ فرانس کا مشہور نقاش لیونارڈو اسی ذوق کی بدولت کئی بار قید کیا گیا اور میکائیل انجیلو کے خطوط و منظومات تو یکسر اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہیں ایک اور مشہور نقاش سلینی تھا وہ بھی اسی جرم میں مقید کیا گیا اور جیرڈم تو اسی کی بدولت قتل کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے وقت کے بڑے صناع تھے۔ لیکن وہ جتنے بڑے صناع تھے اتنے ہی بڑے امرد پرست بھی تھے۔

شہر سڈوم (Sodom) اس باب میں جتنا بدنام تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساڈومی (Sodomy) کے معنے ہی لواطت کے ہو گئے۔ میں اس قسم کے تاریخی واقعات کہاں تک بیان کروں اور کس کس ملک کا ذکر کروں، تقریباً ہر جگہ یہ ذوق پایا جاتا تھا اور اب بھی بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اس پر جان دیتے ہیں، لیکن اس ذوق کو معصومیت، بے لوثی، یا پاکیزگی کے ثبوت میں پیش کرنا اس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ کم از کم میری سمجھ میں تو آتی نہیں، ممکن ہے آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے کوئی صورت طہارت کی اس میں پیدا کر لی ہو۔

نوجوان لڑکوں کی طرف رغبت سوائے جذبۂ شہوانی کے اور کوئی معنی رکھتی ہی نہیں اور اگر اخلاقیات کے

نقطۂ نظر سے یہ کوئی ایسی بات ہے جس کو آزادی سے نہیں کیا جا سکتا، تو محض اس دلیل کی بنا پر کہ شیکسپیر یا شیلی کا بھی یہی ذوق تھا اس کو جذبۂ مقدس ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے جس فلسفیانہ جذبۂ محبت کا ذکر کیا ہے وہ دو پختہ عمر کے ہمسن مردوں میں تو بیشک پائی جا سکتی ہے لیکن نوجوان لڑکوں کے ساتھ قطعاً اس کا امکان نہیں اور جب کوئی شاعر کسی مرد کے ساتھ اپنے جذبات محبت کا ذکر کرے گا تو وہ یقیناً ڈوترین قسم کا مرد یا لڑکا ہوگا۔

آپ کا یہ کہنا کہ عورت حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی، کوئی معنی نہیں رکھتا، اول تو حسن ہی علحدہ کوئی چیز نہیں چہ جائیکہ حقیقی۔ مرد جب تک عورت کی طرف کھنچتا رہے گا وہ حسین رہے گی اور عورت جب تک مرد کی طرف کھنچتی رہے گی وہ حسین رہے گا۔

رہا یونانیوں کے آرٹ کا حسن مردانہ سے متعلق ہونا اس کا سبب وہی ذوق تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا اور اگر اس کی پوری داستان آپ کو دیکھنا ہے تو میری کتاب شہوانیات کا مطالعہ کیجئے، جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اس ذوق کے دلدادہ ہیں اس کی ایسی ہی تاویلیں کیا کرتے ہیں، لیکن میں اسکو حد درجہ کمزوری و فریب خیال کرتا ہوں۔ اگر آپ اسے واقعی مذموم نہیں سمجھتے تو پھر علی الاعلان اس کو اختیار کیجئے جس طرح آجکل جرمنی میں اس کی تبلیغ جاری ہے۔ اس سے کیا فایدہ کہ اس کی رکیک تاویلیں کی جائیں اور فلسفہ و تصوف کی آڑ پکڑ کر یہ شکار کھیلا جائے۔ دنیا کی کوئی بری چیز اس لئے اچھی نہیں ہو سکتی کہ اس کا ایک فلسفہ بیان کیا جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے فلسفہ کو ایک کھیل بنا رکھا ہے اور جب گفتگو کرتے ہیں تو دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور پیش کر دیا کرتے ہیں، درانحالیکہ وہ محض فریب نفس ہوتا ہے۔

یقیناً محبت کا فلسفہ ہے لیکن بالکل نفسیاتی اور اسدرجہ آسان کہ اس کو سمجھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہر چیز کا ایک سبب ہوا کرتا ہے اور ایک غایت، اسی طرح محبت کی بھی وجہ و غرض ہونا ضروری ہے۔ اب آپ محبت کی جتنی صورتیں ہیں ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعض فطری ہیں اور بعض اکتسابی۔ مثلاً ماں باپ بھائی بہن اور اولاد کی محبت کہ یہ تو بالکل فطری چیز ہے اور اس سے بحث کی ضرورت نہیں۔ رہی اکتسابی صورت سو اس کے یہ سبب ہو سکتے ہیں، مادی منفعت، عظمت و احترام، ہم آہنگی خیال اور جذبۂ شہوانی۔

امراء سے ہماری محبت مادی نفع کی بناء پر ہوتی ہے، پیروں فقیروں اُستادوں اور لیڈروں سے محبت کا سبب جذبۂ عظمت و احترام ہوتا ہے اور دوستوں سے ہم آہنگی خیال۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جذبۂ شہوانی ہے خواہ اس کا ہدف جنس لطیف ہو یا جنس کرخت۔ آپ اس کا مطالعہ دوسرے زاویہ سے بھی کیجئے، وہ یہ کہ

شیلی وغیرہ نے جو نظمیں ایسی لکھی ہیں ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ عورت کے ساتھ بھی پیدا ہو سکتے ہیں یا نہیں، یعنی اگر آپ مردانہ ضمایر کو بدل کر نسوانی ضمایر رکھ دیں تو مفہوم وہی رہتا ہے یا نہیں۔ اگر رہتا ہے تو یقیناً آپ اسے جذبۂ شہوانی کا نتیجہ کہیں گے اور اگر بدل جاتا ہے تو وہ نظم عاشقانہ نہیں ہے بلکہ جذبۂ عقیدت و احترام یا ہم آہنگیٔ ضمیر کی بنا پر لکھی گئی ہے اور اس کا اندازِ بیان بھی یقیناً بالکل مختلف ہوگا۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کے تخاطب میں بعض اوقات صنف غالب و لہجہ نسائی ہو جاتا ہے اور یہ نتیجہ ہے دو جنسیت (Bi-sexuality) ہونے کا۔ وہ بقول ہولاک ایلس اکثر ذہین افراد میں پایا جاتا ہے اور اسی نے جولیس قیصر کے متعلق عام طور پر یہ بات مشہور کر دی تھی کہ "وہ سب عورتوں کا شوہر اور سب مردوں کی جورو ہے۔"

بہر حال جو صاحب بھی اس ذوق کے حامی ہوں وہ اس میں فلسفۂ تقدس و پاکیزگی تو پیدا کریں نہیں، البتہ وہ اس کے جواز میں تاریخی حوالے ضرور پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ارسطو اور سقراط کے اقوال سے بھی ان کو مدد مل سکتی ہے اور وہ دنیا کی بعض اُن بڑی بڑی ہستیوں کو پیش کر سکتے ہیں جنھوں نے فن کی حیثیت سے اسے اختیار کیا اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے معیوب نہیں مانا۔

جرمنی، ہمیشہ سے فلسفہ کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے، لیکن وہاں سے زیادہ اس کا رواج کسی اور جگہ کم ہوا ہے۔ وہاں کا ایک مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ تھا اس نے اپنے محبوب ارنسٹ فان فیول کو ایک خط لکھا کہ:-

"تم نے میرے لئے یونانیوں کا دورِ قدیم پیدا کر دیا ہے، میری روح تمھارا احاطہ کئے ہوئے ہے، جب تم جھیل میں نہاتے تھے تو میں تمھارے خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا۔ آؤ، میرے ساتھ نسیاخ چلو اور عشق و محبت کے لطف اُٹھاؤ ـــ میں کبھی شادی نہ کروں گا۔"

وہاں اگر ایک طرف الگزنڈر فان ہمبولٹ ایسا صاحبِ فضل و کمال اس ذوق میں مبتلا نظر آتا ہے تو دوسری طرف کرپ ایسا صناع بھی (جس کے کارخانۂ آہن نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی) اس کا دلدادہ ہے۔ جرمن اہلِ قلم میں پلیٹن، مارٹنز، ایفلینڈ کو کون نہیں جانتا اور اس باب میں ان کی سند بھی پیش کی جا سکتی۔ علاوہ اس کے وہاں اب بھی یہ تحریک کھلم کھلا پائی جاتی ہے اور اس کے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شایع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شایع نہیں ہوئیں۔

بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہر فعل اسی فعل کی نوعیت سے دیکھنا چاہئے۔ اگر شیکسپیر یا شیلی وغیرہ امرد پرست تھے تو ان کو ایسا ہی ظاہر بھی کیجئے، آپ کیوں اُن کے اس ذوق کی وہ تاویل کریں جو شاید انھیں بھی پسند نہ آتی اگر آج وہ زندہ ہوتے۔

مطبوعات موصولہ

من کی دنیا مختصر سا مجموعہ ہے جناب رشید قریشی کے بائیس افسانوں کا جن میں سے بعض مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کا تعلق صرف دل کی دنیا سے ہے اور دل کی دنیا چونکہ بہ لحاظ تخیل بہت آزاد واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے بعض فسانے بڑی حد تک "کھل کھیلنے" کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

نوجوان فسانہ نگار نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ ان پر گزری ہے یا اپنے اوپر گزار دینا چاہتے ہیں وہی قلمبند کریں اس لئے فسانوں میں نہ تازگی و جدت کی کمی ہے اور نہ بیباکی و جرأت رندانہ انداز بیان میں ادبیت بھی ہے اور سلاست و روانی بھی۔ علاوہ اس کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسوقت حیدر آباد میں جس طرح کی اردو بولی جاتی ہے اس کے نمونے بھی اس میں اکثر جگہ ملتے ہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد۔

تمثیلی مشاعرہ نتیجہ ہے ہمارے فاضل دوست جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی جدتِ فکر کا۔ یہ ایک ڈرامہ ہے جس میں سودا، درد، میر، جرأت، مصحفی، انشاء، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن اور غالب کو ایک جگہ جمع کر کے بزم مشاعرہ قایم کی گئی ہے۔

ہرچند یہ تمام شعراء ہمعصر نہیں ہیں، لیکن چونکہ جناب کیفی نے ان سب کو عالم بالا سے طلب کر کے یہ محفل منعقد کی ہے اس لئے سوال تقدم و تاخر کا باقی نہیں رہا اور وہ اجتماع جسے قدرت بھی نہ کر سکی تھی، کیفی صاحب نے کر دکھایا

آداب مشاعرہ کی جتنی مادی وغیر مادی خصوصیات ہو سکتی ہیں، کیفی صاحب نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے، یہاں تک کہ دوران غزلخوانی میں بہ سلسلۂ مرحبا و آفریں جو انتقادی یا تحسینی فقرے سامعین و شعراء کے زبان سے نکل جاتے ہیں وہ بھی درج کر دئے گئے ہیں۔

یہ ڈرامہ جناب پروفیسر محمد عبد اللہ صاحب کاملؔ کے اہتمام سے لایل پور کالج میں پیش کیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بہت کامیاب رہا۔ بہرحال فن تمثیل کے لحاظ سے اس کی نوعیت جو کچھ بھی رہی ہو، لیکن ادبی و انتقادی حیثیت سے یہ کتاب ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اس نوع کی پہلی کوشش مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کی تھی، لیکن وہ ایک مخصوص زمانہ کے چند شعراء تک محدود تھی، کیفی صاحب نے اس خیال کو زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ڈرامہ آرٹ پیپر پر نہایت صاف طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور انجمن ارباب ذوق لاہور سے ایک روپیہ میں ملتا ہے۔

رازونیاز جناب اشعر دہوی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ خود شاعر نے دیباچہ میں اپنے کلام سے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "مناسب الفاظ" رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:-

> "مذکورۂ بالا خصوصیت کے علاوہ اگر دوکوئی معنوی خوبی میرے کلام میں نظر آئے تو اس کو میرے ملکۂ شاعری پر محمول نہ کیجئے گا بلکہ کسی شباب سے بھرپور مستی کی چشم سحر کار کی افسوں طرازی کا نتیجہ خیال کیجئے کہ کلام کی تمام رنگین بیانیاں اور نازک خیالیاں اسی کی رہین منت ہیں۔"

گویا یہ غزلیں جناب اشعر کی حیات عشقیہ کی داستانیں ہیں اور اس لئے یقیناً انھیں پُرکیف ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے کلام کا عنصر غالب رنگینی و نازک خیالی ہونا چاہئے، جس کے وہ مدعی ہیں یا مجزو قناعت جو ان میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعر صاحب نے جگر کا تتبع کیا ہے اور ان کے کلام میں ایک طرح کی سرمستی ضرور پائی جاتی ہے، کلام صاف ہے اور بعض جگہ مضمون آفرینی و ندرت بیان بھی پائی جاتی ہے، لیکن باوجود "مناسب الفاظ" کی تلاش کے وہ کہیں کہیں ناکام رہے ہیں مثلاً

دل ترے تیر کا منت کش احساں نکلا

منت کش کے بعد لفظ احساں بیکار ہے یا

یہاں سوخرمن حسرت وحکایت قلب سوزاں میں

حسرت وحکایت کے لئے خرمن موزوں لفظ نہیں ہے بلکہ دفتر ہونا چاہئے۔

بہرحال اشعر صاحب کی غزلیں بُری نہیں ہیں اور جگر کا رنگ پسند کرنے والوں کے لئے ان میں کافی سامان دلکشی موجود ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ :- دائرۃ الادب محلہ رودگراں دہلی۔

انشاء سلمیٰ جناب صاحبزادہ ولی احمد خانصاحب ام۔ اے نے زنانہ خط وکتابت سے متعلق یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور دفتر عصمت دہلی سے شایع ہوا ہے، خطوں کی زبان بہت صاف وسہل ہے اور تکلفات سے بری۔ آخر میں بعض مشکل الفاظ کے معنے بھی دیدئے ہیں اور ترتیب مدارج کے لحاظ سے القاب وآداب بھی۔ قیمت ۶ر ہے۔

دیہاتی گیت — یہ کتاب بھی عصمت بک ڈپو دہلی نے شایع کی ہے، اس میں جناب اعظم کریوی نے بہت سے گیت اکٹھا کر دئے ہیں جو گاؤں میں مختلف موسموں اور تقریبوں میں گائے جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کا مفہوم بھی دے دیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت تک کوئی مجموعہ اس موضوع پر ہماری زبان میں شایع نہ ہوا تھا حالانکہ (Folk Song) کتابیں ادب کے لئے ضروری ہیں۔

مفتاح العربیہ — قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے عربی زبان سکھانے کے لئے یہ سلسلۂ تالیف شروع کیا ہے جس کے پہلے دو حصے ریویو کے لئے ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ملک میں متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں جن میں سے بعض مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ سجاد صاحب نے جس انداز سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے وہ یقیناً مفید و کارآمد ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے معرفہ و نکرہ ترکیب اضافی و توصیفی اور افعال و اسمار کی مختلف اشتقاقی و ترکیبی صورتوں سے بحث کر کے مشق کرائی ہے اور دوسرے حصہ میں مختصر حکایات، مراسلات اور صحافت جدیدہ تک پہونچ گئے ہیں۔

ہر حصہ کے آخر میں ایک فرہنگ بہت سے قدیم و جدید الفاظ کا دیدی گئی ہے جو ایک مستقل افادہ کی چیز ہے جو حضرات عربی زبان جلد سیکھنے کے شایق ہیں ان کے لئے اس سلسلہ کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ ہر حصہ کی قیمت ۱۰/ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ علمیہ، میرٹھ۔

کلیات بحری — بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک دکنی شاعر بحری پائے جاتے تھے یہ زمانہ اورنگ زیب کی حکومت کا تھا۔ ڈاکٹر محمد حفیظ سید کو شولاپور میں ایک نسخہ ان کے کلیات کا ملگیا اور انھوں نے اس کو جدید اصول پر مرتب کر کے نولکشور پریس لکھنؤ سے شایع کرایا ہے۔

بحری، ولی سے پہلے گزرے ہیں اور ان کی زبان فارسی، ہندی اور دکنی ملی جلی ہے۔

ڈاکٹر حفیظ صاحب کا یہ ریسرچ ادب اردو کی تاریخ میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور ارباب ذوق کو اسکی قدر کرنا چاہئے۔ کتاب مجلد، دبیز کاغذ پر شایع کی گئی ہے اور ۲۱۲ صفحات پر محیط ہے۔ قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ہندوستانی — جناب دین محمد صاحب نے انگریزی زبان میں یہ پمفلٹ شایع کیا ہے اور لسانی و تاریخی حیثیت سے ہندوستانی زبان پر بحث کی ہے۔

اس وقت ملک کی عام زبان کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اردو ہندی نزاع نے اس میں چند در چند پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ ملک میں ایک نئی زبان ہندوستانی کے نام سے پیدا کی جا رہی ہے، لیکن وہ کیا ہے یا اسے کیا ہونا چاہئے ہنوز معرض بحث میں ہے۔ ہندؤں کا رجحان یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ

ہونا چاہئے اور مسلمان کہتے ہیں کہ جب اس سے عربی و فارسی الفاظ خارج کئے جارہے ہیں تو بجز سنسکرت الفاظ شمول اس میں کوئی معنی نہیں رکھتا - جناب دین محمد صاحب نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو لیکر نہایت فاضلانہ گفتگو کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جو آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی آیندہ ترقی بھی انھی باہمی مفاہمت و رواداری پر منحصر ہے۔ یہ پمفلٹ مطالعہ کے قابل ہے اور ۱ر میں مصنف سے ہال بازار امرتسر کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

رپورٹ ہندوستانی اکاڈیمی

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اس انگریزی رپورٹ میں قیام اکاڈیمی کے آغاز سے اسوقت تک کی کیفیت پیش کی ہے - یہ اکاڈیمی ۲۶ء میں حافظ ہدایت حسین مرحوم کی تحریک و کوشش سے قایم ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ ہندی اردو لٹریچر کی ترقی کے لئے کوشش کی جائے اور حکومت اس کی مالی مدد کرے۔

اکاڈیمی کی گزشتہ تاریخ اور اس کے کارناموں پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے لیکن بسلسلۂ ریویو ہم اسقدر ضرور عرض کریں گے کہ اسوقت جبکہ حکومت اس کی تنظیم کے مسئلہ پر غور کررہی ہے، اسکو زیادہ کارآمد و مفید بنانے کی ضرورت ہے، خصوصیت کے ساتھ ایسی حالت میں کہ زبان کا مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب

پروفیسر محمد عاقل ایم - اے نے مبادی سیاسیات پر یہ رسالہ لکھ کر بڑی برمحل خدمت انجام دی ہے - اب وقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو سمجھنا چاہئے کہ حکومت کس چیز کا نام ہے، اس کی کیا صورتیں دنیا میں پائی جاسکتی ہیں اور ہمارے لئے وہ کس صورت میں مفید ہوسکتی ہے۔

اس رسالہ کی زبان، اس کا انداز بیان نہایت سلیس و شگفتہ ہے اور مغز و معنی کے لحاظ سے کچھ کہنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ عاقل صاحب اسی چیز کی تلاش میں اب پوست ہی پوست رہ گئے ہیں - ضرورت ہے کہ اس کو ثانوی مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ابتدا ہی میں سیاسیات سے لگاؤ پیدا ہوجائے - یہ رسالہ مکتبۂ جامعہ دہلی سے ۴ر میں ملسکتا ہے۔

اجتماعی زندگی کی ابتدا

یہ رسالہ بھی پروفیسر محمد عاقل صاحب کا لکھا ہوا ہے - اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ انسان دنیا میں کیونکر آیا اور رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی - اس میں عہد حجری سے لیکر عہد ایجادات تک کا ذکر کرکے یہ بتایا ہے کہ اس کی انفرادی زندگی نے کس طرح رفتہ رفتہ اجتماعی حیثیت اختیار کی اور اس کی کن کن صورتوں کا تجربہ اس نے کیا - یہ کتاب مکتبۂ جامعہ سے ۸ر میں ملسکتی ہے۔

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ | اس رسالہ کو بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کیا ہے۔ اس کی اہمیت سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نہایت جامعیت سے نگاہ ڈالی ہے۔ قیمت ۴ ر

میری کہانی | جناب سید علی صاحب شاکر ام - اے کا لکھا ہوا ، نیم مزاحیہ افسانہ ہے جسے حمایت دکن پرس حیدر آباد نے شایع کیا ہے۔ شاکر صاحب کے مزاح میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے جس میں بہت کچھ امکانات ترقی پوشیدہ ہیں۔ غالباً شاکر صاحب کی یہ پہلی کوشش ہے۔ لیکن اپنے اندر وہ تمام علامتیں رکھتی ہے جو مشق و تجربہ کے بعد معیاری چیزیں ہو جاتی ہیں۔ زبان ٹکسالی ہے اور خیال میں جدت، لیکن تکلف سے خالی نہیں۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ بے ساختہ پن بھی پیدا ہو جائے گا اور شاکر صاحب ملک کے مشہور مزاحیہ نگاروں میں شمار کئے جائیں گے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ حمایت دکن پرس۔

محبت کا فسانہ | ملک کے مشہور ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی کا لکھا ہوا افسانہ ہے اور تمام اُن خصوصیات کا حامل ہے جو ان کی انشاء کی مقبولیت کا باعث ہیں۔ اس میں انھوں نے فلسفۂ ازدواج کو پیش نظر رکھ کر بیوی اور شوہر کی نفسیاتی تحلیل کی ہے اور ایسے لطیف انداز سے کہ کتاب نے بیک وقت فلسفہ و انشاء بدیع دونوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مکالمہ میں اگر انگریزی انداز اختیار نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے :- علیم اطہر، محلہ من ٹولہ۔ آگرہ۔

من کی بتیا | لطیف النساء بیگم بی۔ اے کے چند مقالات کا مجموعہ ہے جس میں متوسط طبقہ کی خواتین کو مخاطب کر کے ان کی معاشرتی و اخلاقی کمزوریوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مرقاۃ القرآن | عربی سکھانے کی پہلی کتاب ہے جس میں ۴۰ اسباق قرآن مجید کی آیات سے اخذ و اقتباس کر کے دئے گئے ہیں۔ اس کے مولف مولوی محمد عبداللہ صاحب کامل پروفیسر گورنمنٹ کالج لایل پور ہیں۔ یہ رسالہ ۶ ر میں انجمن ارباب ذوق لایل پور سے ملسکتا ہے۔

رباعیات عرش فاروقی | مجموعہ ہے جناب عرش بریلوی کی ستر رباعیوں کا جن میں ہر رباعی کی ردیف "جوانی میری" ہے۔ چونکہ عرش نے عین عالم شباب میں انتقال کیا تھا اس لئے ان کی یہ جوانی والی رباعیاں حقیقتاً ان کے شباب کا مرثیہ ہیں جو ایک خاص کیفیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔

سید الطاف علی صاحب بریلوی نے سلطان جہاں منزل علی گڈھ سے انھیں شایع کیا ہے اور چار آنہ قیمت مقرر کی ہے

مسلمان کیا کریں مدینہ میں ایک سلسلۂ مضامین اس عنوان سے شروع ہوا تھا جس پر مختلف حضرات نے اظہار خیال کیا تھا۔ انھیں میں سے چودہ حضرات کے مقالوں کا مجموعہ ہے جسے حلقۂ ادب لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔

اسوقت ہندوستان کے مسلمان جس دور سے گزر رہے ہیں وہ سیاسی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اور ہمارے یہاں صحیح الفکر مخلص لیڈروں کے فقدان نے اسے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر شخص اس مسئلہ پر غور کرے اور کسی نتیجہ تک پہنچے۔ یہ مجموعہ ایسے اشخاص کے لئے بہت مفید دکھائی دیتا ہے۔

مدراس میں اردو اس کتاب کے مصنف جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ہیں جنھوں نے ثابت کیا ہے کہ صوبۂ مدراس میں اردو زبان کی ترویج ابتدا سے رہی ہے اور وہاں بڑے بڑے شاعر و انشا پرداز پیدا ہو چکے ہیں۔

اس وقت جبکہ زبان کا مسئلہ تمام اہل ملک کے سامنے پیش ہے اس کتاب کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس میں سیکڑوں ایسے مصنفین کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کو اس وقت تک کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ کتاب تاریخی حیثیت سے بھی اور زبان اردو کے لئے بھی بڑا معقول اضافہ ہے۔ قیمت ۲ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

دفتر دیوانی سرکار عالی حیدرآباد دکن میں ایک خاص دفتر ہے جس کو دفتر دیوانی کہتے ہیں اور اس کا تعلق اس قسم کی دستاویزات سے ہے جو بادشاہوں کی طرف سے جاری ہوتی تھیں اور جن میں تمام وہ فرامین، توقیعات، پروانے اور اسناد وغیرہ محفوظ ہیں جو سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں شاہان مغلیہ یا سلاطین آصف جاہی کی طرف سے جاری ہوتے تھے۔

مولوی خورشید علی صاحب موجودہ ناظم دفتر دیوانی نے اپنی غیر معمولی کاوش و جستجو اور اعلیٰ درجہ کی خوش سلیقگی و حسن ذوق سے کام لیکر اس دفتر کو ایسے نوادر کدہ کی حیثیت دیدی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ دیکھنے ہی کے بعد ہو سکتا ہے۔ اس دفتر میں تاریخ عہد مغلیہ کے متعلق ایسے ایسے نادر کاغذات محفوظ ہیں جن کا علم ہی اس وقت تک کسی کو نہیں ہوا اور جن سے تاریخ کی بعض گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

زیر نظر جلد میں انھیں میں سے بعض فرامین و اسناد کی نقلیں پیش کی گئی ہیں جو آرٹ پیپر پر نہایت نفاست سے طبع کی گئی ہیں۔ اس مجلد کے شائع کرنے سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دفتر دیوانی کیا کام انجام دے رہا ہے اور جس وقت چھان بین کے بعد تمام قدیم اسناد و فرامین سلسلہ وار مرتب ہو جائیں گے تو تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے سامنے کتنا بڑا ذخیرۂ مواد تاریخی کا آجائے گا۔

مصنفین اردو حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس نام سے اردو کے تمام اگلے پچھلے شعرا و مصنفین کے

مختصر حالات معہ ان کی تصاویر کے شایع کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تالیفات کی بھی فہرست دی ہے۔ عہد حاضر کے بھی تمام مصنفین اس میں نظر آتے ہیں۔ پبلشر نے جس محنت سے اس فہرست کو مرتب کیا ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔

لالہ رخ

دوسرا اڈیشن ہے جسے کتب خانۂ علم و ادب دہلی نے شایع کیا ہے اور نہایت عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مصور و مجلد شایع کیا ہے۔

جناب لطیف الہ آبادی کی اس کتاب سے قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ قیمت دو روپیہ ہے۔

اتاترک

غازی مصطفیٰ کمال اتاترک کی سیرت پر اردو میں سب سے آخرین کتاب ہے جس میں عصمت انونو جانشین اتاترک کے بھی مختصر حالات درج کر دئے گئے ہیں۔ اتاترک دنیا کی ان مخصوص ہستیوں میں سے تھا جسپر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے گا اور دنیا مختلف حیثیتوں سے اسے یاد رکھے گی۔ یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی تالیف ہے اور باوجود مختصر ہونے کے بہت جامع ہے۔ اس بطل اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ترک کر دیا گیا ہو۔ فاضل مولف نے کافی محنت و کاوش سے اس کو مرتب کیا ہے اور زبان و انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔ متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اور طباعت و کتابت بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ اور ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

پھول والوں کی سیر

اس رسالہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے دکھایا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں "پھول والوں کی سیر" کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ دہلی کا مشہور میلہ ہے جو اب بھی شاید ہوتا ہے لیکن شاہان دہلی کے زمانہ میں تو وہ ایک مستقل رنگینی تھا، جس کے اظہار کے لئے مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کی ٹکسالی زبان کی ضرورت تھی۔ قیمت ۲ر

ہندوستان کی صنعت و تجارت

تصنیف ہے جناب منت اللہ صاحب رحمانی ام۔ ال۔ اے کی جس میں انھوں نے پہلے نہایت محنت و کاوش سے یہاں کی صنعت و تجارت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے اسے کتنا نقصان پہونچا یا اور انگریزوں نے کس کس طرح اس کو تباہ و برباد کیا۔

ہماری سیاسی تربیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور ملک کو فاضل مصنف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دیا۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ ۔ مونگیر (بہار)

بعض نئے رسائل و جرائد

اس دوران میں لکھنؤ کی شیعہ سنی نزاع نے اتنے اور ایسے عجیب و غریب

... اخبار یہاں کی سرزمین سے پیدا کئے گئے لاہور جو شکست کھا گیا لیکن حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے ... اخبار نظموں کی طرح فنا ہو گئے۔ لیکن اسی زمانہ میں بعض ایسے پرچے بھی رونما ہوئے جنکا ذکر ضروری ہے یہاں کے ہفتہ وار اخباروں میں صداقت، پرچم کافی نمایاں ہے۔ صداقت کی پالیسی وہی ہے جو حقیقت کی ... پرچم سوشلسٹ جماعت کا پرچہ ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شاید ہندوستان کا ایک ہی پرچہ ہو ... ایڈیٹر ... حسن صاحب ہیں اور ان کے دست و بازو جناب مجاز، علی سردار جعفری ہیں۔ ان تینوں پرجوش نوجوانوں نے جس ولولۂ عمل کے ساتھ اس کو جاری کیا وہ ہر طرح مستحق ستائش ہے اور ملک کو اس کی قدر کرنا چاہئے انہیں لوگوں نے نیا ادب کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا ہے جو ... ترقی پسند مصنفین کے بہترین افکار پیش کرتا رہتا ہے۔ پرچم اور نیا ادب میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ باوجود سادگی کے اپنے اندر خاص روح رکھتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ملک میں لٹریچر کا جو نیا دور شروع ہوا ہے وہ بہت جلد اپنی جگہ پیدا کرلے گا۔

یوپی کی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کیلئے ایک ماہانہ پرچہ "ہل" کے نام سے جاری ہوا ہے جو الٰہ آباد پریس الٰہ آباد سے شایع ہوتا ہے اور اپنی ترتیب، اپنے مضامین اور اپنی آرائش کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ نہ صرف کاشتکار بلکہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے۔ مفید و دلکش نظمیں، پر از معلومات مقالے، کارآمد افسانے، ... مسایل، صنعتی و تجارتی نسخے، سبھی کچھ اس میں ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے نہایت سلیقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

بالکل اسی قسم کا ایک رسالہ "ہونہار" پٹنہ سے بھی شایع ہوتا ہے اور گو اس کی ضخامت ہل سے کم ہوتی ہے، لیکن اور تمام حیثیتوں سے وہ کسی طرح اس سے کم نہیں ہے۔ اس قسم کے رسایل و جراید کا شایع ہونا ملک کی ذہنی ترقی کا ثبوت ہے اور اہل ملک کا فرض ہے کہ ان کی قدر کریں۔

ایک اور ہفتہ وار یہاں سے شایع ہوتا ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ یہ کانگرسی اصول کا حامی ہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرایض انجام دے رہا ہے۔

پیام نسواں لکھنؤ

ہندوستانی خواتین کا ایک ترقی پسند ماہوار رسالہ۔ جس میں ہندوستان کی مشہور خواتین اور اہل قلم کے اعلیٰ علمی و ادبی مقالے۔ اخلاقی و معاشرتی افسانے، اصلاحی مضامین روح نواز نظمیں۔ نجوم و قیافہ کی دلچسپیاں۔ طبی معلومات اور کشیدہ کاری کے خوبصورت نمونے اور گھرستی زندگی کے مسایل پر اہم بحثیں شایع ہوتی ہیں۔

پیام نسواں

رابعہ بیگم نگار اور شمیم آرا بیگم نجمہ کی ادارت میں ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو پابندی کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ کتابت خوبصورت۔ طباعت دلفریب کاغذ سفید چکنا۔ سالانہ چندہ دو روپیہ۔ نمونہ مفت

منیجر پیام نسواں۔ حلقۂ اشاعت لکھنؤ

شاعر اور پپیہا

خاموش او پپیہے، دل میرا جل رہا ہے
تیری رگوں میں تیرا نغمہ مچل رہا ہے

آواز تیری ایسی پُر درد ہو رہی ہے
جیسے کہ کوئی حسرت سینے میں رو رہی ہے

شاخیں لچک رہی ہیں، گلشن مہک رہے ہیں
پربت وادیوں میں جھونکے بہک رہے ہیں

اٹھلا رہے ہیں بادل سوئی ہوئی فضا میں
ہلکی سی راگنی کی آواز ہے ہوا میں

نوخیز پتیوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں
سرسبز ساحلوں کی آنکھیں جھپک رہی ہیں

کلیاں چٹک رہی ہیں، مدہوش ہیں ہوائیں
چبھتی ہیں درد بنکر دل میں تری صدائیں

بوندیں پہاڑیوں پہ چھاگل بجا رہی ہیں
کالی گھٹائیں تجھ پہ آنسو بہا رہی ہیں

تو "پی کہاں" کا نغمہ جس دم الاپتا ہے
ابر سیہ کے اندر خورشید کانپتا ہے

گلشن میں تیرا نغمہ اک ساز بن گیا ہے
یا دل کے ٹوٹنے کی آواز بن گیا ہے

باغوں میں زندگی تو اپنی گزارتا ہے
برکھا کے مست جوگی! کس کو پکارتا ہے؟

کیا نخلِ زندگانی تیرا اجڑ گیا ہے
کیا "پی" ترا پپیہے! تجھ سے بچھڑ گیا ہے؟

کیا سوزشِ محبت تجھ کو رلا رہی ہے
اپنے پیا کی تجھ کو کیا یاد آ رہی ہے؟

کیوں ہل گئے یکایک شاخوں پہ تیرے شہپر
کیا دیکھتا ہے مجھکو تو پتیوں سے جھک کر

مجھ غم نصیب کو کیا تو جانتا نہیں ہے
میں ہمنوا ہوں تیرا پہچانتا نہیں ہے؟

اُجڑے ہوئے دلوں میں اک سرد آہ بھر لیں
آ، دونوں اپنے اپنے پیتم کو یاد کر لیں

شرف احمد خاں سروش ملیح آبادی

آہنگ نشاط

روٹھی ہوئی خوشی کو منائے ہوئے ہوں میں
ظلمت کے چراغ دل میں جلائے ہوئے ہوں میں

حسرت، جو کل تھی، آج نگاہوں کا [illegible]
ہر [illegible] چمن سا کھلائے ہوئے ہوں میں

محوِ خرامِ ناز ہے [illegible] شہرِ حسن
فردوس رہ میں پلکیں بچھائے ہوئے ہوں میں

[illegible] تھا، آج نظارۂ حبیب
جی بھر کے آج پاس بٹھائے ہوئے ہوں میں

رہ رہ کے گھورتے تھے مجھے ماہ و [illegible]
پہلو میں [illegible] چھپائے ہوئے ہوں میں

ذوقِ نگاہ، آج سبک [illegible] تماشا ہے
آنکھیں تجلیوں سے لڑائے ہوئے ہوں میں

فصلِ بہار، خود مری حلقہ بگوش ہے
جنت کے پھول گھر میں کھلائے ہوئے ہوں میں

مہکا ہوا ہے ہر در و دیوار آج کل
خطِ وفا سے گھر کو سجائے ہوئے ہوں میں

رنگ پہ نظریں [illegible] دل [illegible]
سو حشر ایک ساتھ اٹھائے ہوئے ہوں میں

ہر دل مرے غموں کا اڑایا کرے [illegible]
اب سب حسینوں کی نیند اڑائے ہوئے ہوں میں

[illegible] دم [illegible]
وہ بوجھ جو دل کو [illegible] اٹھائے ہوئے ہوں میں

کس کی مجال ہے کہ [illegible]
بازیِ حسن و عشق [illegible] ہوئے ہوں میں

ہر نظم، ہر نظام ہے [illegible] عشق [illegible]
کتنا [illegible] دل کو [illegible] ہوئے ہوں میں

ٹھہرا ہوا ہے وقت، زمانہ رکا ہوا
مٹھی میں روز و شب کو دبائے ہوئے ہوں میں

سہما ہوا ہے ہوش بھی زعمِ نشاط سے
[illegible] عشق چھپائے ہوئے ہوں میں

بے محو دل سے، بے سر و سامانیِ حیات
لاکھوں غموں کو ہنس کے [illegible] ہوئے ہوں میں

ماضی کے غم [illegible] بہار، فطرت [illegible] حیثیت
اپنے فریب آپ ہی کھائے ہوئے ہوں میں

فطرت واسطی

طلسمِ خیال

(ایک بچہ کو "کھلونا محل" بناتے ہوئے دیکھکر)

بنتے ہیں کارگاہِ تخیل میں صبح و شام
آہن گدازِ عزم، فلک رس، پرو گرام

ہر جبرِ خروش کا خلاق ہے خیال
ہر اضطراب و جوش کا خلاق ہے فسوں

ہوش! ایک اصطلاح ہے فکرِ مآل کی
کیف! ایک شاہراہِ حسیں سہلِ خیال کی

مہتاب و کہکشاں کے معانی کا اعتبار
شب تابیٔ نجوم کا اندازِ زرنگار

حسنِ سکوں زبان کے اشارات کا فسوں
عشقِ بزم نواز کا ہیجانِ جستجو

پروانۂ تخیل کی جلتی ہوئی جبیں
شمعِ خموش لب کا افادۂ آتشیں

ہیں دائرے تمام طلسمِ خیال کے
حلقے ہیں اک حسین و دل آویز جال کے

ہے فلسفہ خیال کے چہرے کا اک حجاب
حیرت کا اک چمکتا ہوا سیم گوں سحاب

ذوقِ گناہ ایک شگفتہ خیال ہے
زہد اک جواں خیال کا رنگِ زوال ہے

یزدان و اہرمن کے جسد کی حرارتیں
ہیں شوخیِ خیال کی رنگیں جسارتیں

دیر و حرم ضعیف سے دو اعتبار ہیں
کون و مکاں گماں کی فضا کا غبار ہیں

تعمیر و ریخت ایک جنوں ہے حیات کا
نا مختتم ہے سلسلہ ان واقعات کا

ننھا سا تیرا ذہن ہے اور اُس میں یہ ابال
لے جائزہ خیال کا، اِک اور قصر ڈھال

لیکن تری حیات کے ایواں میں اے عزیز
موجود ہو ذرا سی مرے میکدہ کی چیز

ہو فلسفے کے قصر میں اک بابِ شعریت
اک عزمِ آہنی ہے مرا خوابِ شعریت

ہے شاعری خیال کا اِک سجدۂ نیاز
اس گیت نے سمیٹ لیا سب متاعِ ساز

دستِ عمل پہ شعر کا سایہ بھی چاہئے
تفضیل کی جبیں پہ کنایہ بھی چاہئے

عدم

جبریل و ابلیس کی جنگ

کہا ہے مجھ سے یہ ابلیس نے بزعم وقار
کہ اس نے توڑ دی جبریل کی کمند قرار

کہا تھا اس نے یہ جبریل سے کہ اے جبریل!
بلند تر ہے مرے پر دیں سے تیرے شہپر جبریل

ولے خبر نہیں تجھ کو ترا مقام ہے کیا
خودی کا راز ہے کیا؟ اس کا احترام ہے کیا

میں چاہتا ہوں کہوں تجھ سے ہست و بود کا راز
جہاں میں صرف خودی ہے کہ ہے وجود کا راز

اسی خودی سے ہوا ہوں میں صاحب اشراق
اسی خودی نے کیا مجھکو محرم اعماق

جہاں ذکر کے اندر ہے گم تری آواز
خدا سے راز کی ہمساز ہے مری آواز

مقام غور ہے ہستی کا درس لے جبریل
اسیر دام غلامی تری متاع جمیل!

یہ سن کے اٹھ گئی جبریل کی نگاہ کبود
لرز کے کانپتے اس نے کہا کہ اے "مردود!"

"خموش کردوں ابھی شمع گرمی افروز
سیاہ کردوں ابھی تیرا نطق عصمت سوز"

یہ سن کے ہوگیا ابلیس تند شعلہ تاب
ادھر سے نیزہ ادھر سے اٹھا عصائے شہاب

سر بہشت ہوئی ایسی جنگ آتش ناک
کہ عرش ہلنے لگا تھر تھرا گئے افلاک

کاوش حیدرآبادی

حسین کشیدہ کاری

عورتوں کا سلیقہ اور بچیوں کی ہنرمندی دیکھنا ہو تو ان کے گھروں میں جاکر کشیدہ کاری کے نمونے دیکھئے۔ خوشنما نمونے خوش مذاقی اور سلیقہ کی شہادت دیں گے اور بدنما نمونے بدمزاقی اور پھوہڑ پن کا پتہ دیں گے۔ آپ اپنی لڑکیوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ ہنرمند یا پھوہڑ؟ اگر ہنرمند بنانا ہے تو آج ہی نواب ذکیہ سلطانہ کی مشہور کتاب حسین کشیدہ کاری منگاکر گھر میں رکھئے اور اس سے فائدہ اٹھائیے۔

اس کتاب میں خوشنما کٹ ورک دار گریبان۔ گھر کٹ۔ میز پوش۔ پلنگ پوش۔ رومال۔ غلاف۔ دوپٹہ۔ کرتے اور سینکڑوں قسم کے حسین و خوبصورت پھول۔ ڈیزائن اور بیلیں تیار کرنے کے اعلیٰ نمونے درج ہیں۔

لکھنؤ کی سو خوش مذاق لڑکی حسین کشیدہ کاری کو پڑھ کر اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر رہی ہے۔ آپ بھی اسے خرید کر اپنی لڑکیوں اور بچیوں کو دیجئے۔

رعایتی قیمت بارہ آنہ (ڈاک خرچ کے) ہم سے فوراً منگا لیجئے ورنہ بعد میں کچھ آنہ زیادہ صرف ہوں گے۔

مینیجر حلقہ اشاعت ۔ ۔ ۔ ۔ لکھنؤ

غزلیات

فراقؔ گورکھپوری

یہ نہیں ہوتی تھی حالت جانبِ در دیکھ کر
آستانِ یار سے ہم آج اٹھ جائیں گے کیا

حسن بے پایاں سہی اے درد کیوں مایوس ہوں
عشق اک زنداں سہی اتنا بھی گھبرائیں گے کیا

اے صدائے تعلق کا انداز بھی مانوس ہے
لوگ کچھ ہم تک ہماری بھی خبر لائیں گے کیا

یہ تبسم یہ تکلم یہ اشاراتِ نہاں
ہم نگاہِ ناز کی باتوں میں آ جائیں گے کیا

چھوڑتا ہے اُن کا د[illegible] میں اک نگاہِ منتظر
ایسے میں بھی کچھ تامل سا وہ فرمائیں گے کیا

عشق کی باتیں سمجھنے کی [illegible] سمجھانے کی ہیں
سب بجا شرح و بیاں ہم ان کو سمجھائیں گے کیا

اب یہ تسلیم و رضا پر [illegible] سہی آسانے کی
ہم نیازِ عشق کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے کیا

[illegible] زمانے کی نگاہیں بھی [illegible]
دیکھنے والے تری آنکھوں کے شرمائیں گے کیا

[illegible] آ [illegible] بیاں میں عشق کی
اس جگہ بھی در بدر کی ٹھوکریں کھائیں گے کیا

[illegible] دوستاں در در فراقؔ
[illegible] گے کیا [illegible] گے کیا

[illegible] رضوانی

[illegible]
[illegible] دنیا کو لٹنے سے پہلے میں اُسکی [illegible]

[illegible] رضوانیؔ کی
ہر اک نظر کی جنبش میں برہم فضا کو دیکھتا ہوں

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافہ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

شمارہ ۳	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۳	ستمبر ۳۹ء	جلد ۳۶

ملاحظات

"رہبرِ دکن" کے ایک گمراہ مقالہ نگار سے

حیدرآباد کے دستوری اصلاحات سے متعلق میرا ایک مقالہ جو گزشتہ مہینے کے "نگار" میں شایع ہوا تھا اور جو بعد کو روزنامہ "پیام" حیدرآباد میں بھی شایع ہوا، اس پر ایک صاحب رشید ترابی نے رہبرِ دکن میں کافی برہمی کا اظہار کیا ہے ۔۔ ہرچند اس نوع کے غیر ذمہ دارانہ مقالوں کی طرف اعتنا، کرنا میرے اُصول کے خلاف ہے، لیکن چونکہ اسمیں بعض نہایت مکروہ و گمراہ کن اُصولی غلطیوں کا اظہار پایا جاتا ہے، اس لئے ان کا ازالہ ضروری ہے

رشید ترابی صاحب سے میں واقف نہیں ہوں، لیکن ان کی تحریر کی اُلجھن، مفہوم کے فقدان، مدعا کی نااستواری اور خیالات کی ژولیدگی سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ صحافت میں یہ اُن کا اولین قدم ہے اور انھوں نے یہ مضمون شاید اس لئے لکھا بھی نہیں کہ واقعی اس کی ضرورت تھی بلکہ صرف اس لئے کہ بسا اوقات موافقت سے زیادہ کسی کی مخالفت کرنا اپنی شہرت کا باعث ہو جاتا ہے

بہرحال میں ان کی برہمی سے خوش ہوا کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہی ہو گیا کہ میری آواز بیکار نہیں گئی اور بعض مخالفین کو اس کی طرف سے " اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہونے لگے ہیں

ذاتیات سے قطع نظر کرنے کے بعد ترابی صاحب کے مضمون کو دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ انھیں میری بعض باتیں بہت ناگوار گزری ہیں مثلاً ایک یہ کہ جن اصلاحات کی رپورٹ، انھیں کے الفاظ میں " دور رس عقلوں اور تجربہ کار ہستیوں" نے دو سال کی مسلسل محنت کے بعد مرتب کی ہے، ان پر مجھے رائے زنی کا کیا حق حاصل تھا علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ میں دکن کا باشندہ بھی نہیں، دوسرے یہ کہ میں نے شہر یار دکن کی غیر معمولی خصوصیات کا اعتراف غیر ملکی ہو کر کیوں کیا اور تیسری بات جس نے ان پر تیز " نشتر" کا کام کیا یہ ہے کہ میں نے مخالفین اصلاحات کو کیوں ناکارہ جماعت سے تعبیر کیا

امر اول کے متعلق مجھے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب ترابی صاحب نے خود اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اصلاحات نتیجہ ہیں " دور رس عقلوں اور تجربہ کار ہستیوں" کی مسلسل دو سالہ محنت کا، تو پھر ان کے بہتر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے اور اگر اس صورت میں میں نے بھی اصلاحات کی موافقت میں اظہار خیال کیا تو کیا غلطی کی ۔

ہاں، اگر وہ اصلاحات کو کم عقلوں اور ناتجربہ کار ہستیوں کی محنت کا نتیجہ بتاتے اور میری موافقت پر اظہار برہمی کرتے تو بیشک ایک بات تھی۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ خوف یا مصلحت سے ان " تجربہ کار ہستیوں" کی محنت کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں اور دوسری طرف اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دبی زبان سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اصلاحات قابل قبول نہیں اور بہانہ یہ ہے کہ اصلاحات سے اقتدار شاہانہ پر خراب اثر پڑتا ہے

دوسری بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ " حضرت کے اشارہ پر غیروں کی نہیں، ہماری زندگیاں صدقہ ہونے کو آمادہ ہیں اور مالک کی غلامی کے طوق کے واسطے نیاز کی نہیں ہماری گردنیں زیادہ زیب دیتی ہیں"۔

میں اُن کے اس جذبۂ انقیاد و اطاعت کی داد دیتا ہوں۔ اپنے مالک کی حمایت میں ان کو یقیناً یہی جذبۂ فدویت و ایثار پیدا کرنا چاہئے، لیکن ترابی صاحب معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس جذبہ کے اظہار سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے واقعی شہر یار دکن کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا ہے

ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اہل دکن کے وہ ہندوستان کے کسی باشندہ کو اس کا مستحق نہیں جانتے کہ وہ بارگاہ اعلیٰحضرت کے ساتھ اظہار عقیدت کرے، گویا بہ الفاظ دیگر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اعلیٰحضرت کے فیوض و برکات صرف دکن ہی تک محدود ہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ بیرون دکن کے مسلمانوں نے آج تک اعلیٰحضرت کے لئے، جذبۂ ایثار و قربانی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تو یہ اور زیادہ لغو و مہمل دعوےٰ ہوگا

دکن کے تخت و تاج کے ساتھ جمہور مسلمین کے تعلقات اتنے دیرینہ و مستحکم ہیں کہ ترابی صاحب کا ان سے انکار کرنا مسلّمہ حقیقت سے روگردانی کرنا ہے ۔ سلطنتِ دکن چونکہ مغلیہ حکومت کی دوسری شکل ہے اس لئے انقراض دولتِ مغلیہ سے پہلے ہی شمالی ہند کے اکابر و اعاظم دامنِ آصفجاہی سے وابستہ ہوکر دکن پہونچ گئے تھے اور اُسوقت سے لیکر تا ایندم تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ حیدرآباد، شمالی ہند کے منتخب دماغوں کا مرکز نہ رہا ہو اور شاہانِ دکن نے اپنی خسروانہ روایات سے کام لیکر ان کے فضل و کمال کی قدر نہ کی ہو

شاہانِ دکن نے ہندوستان کی مسلم جماعت کے کبھی دو ٹکڑے نہیں کئے، انھوں نے اِس تحمّل کے ساتھ کر کے کبھی جماعت اسلامی میں تفریق پیدا نہیں کی، اور مسلم جماعت کا مفہوم انھوں نے دکنی و غیر دکنی نقطۂ نظر سے کبھی متعین نہیں کیا ۔ ملازمتوں کے لئے ملکی و غیر ملکی تحریک بالکل دوسری چیز ہے جس کا تعلق صرف مقامی اقتصاد سے ہے نہ کہ عام اخلاق و سیاست سے ۔۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو وابستگی شاہان دکن سے ہے اس کا تعلق صرف ان کے مسلم فرمانروا ہونے کی حیثیت سے ہے اور شاہانِ دکن کو جو تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے وہ بھی اسی بنا پر ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہیں ایک ہیں اور سرزمین کا اختلاف اس رشتۂ اتحاد کو کسی طرح نہیں توڑ سکتا

چنانچہ یہی وہ تعلقات ہیں جن کی بنا پر ہندوستان کے اکثر تعلیمی و روحانی ادارے بلا امتیاز ملت و مسلک فرمانروایانِ دکن کے رشحاتِ کرم سے سیراب نظر آتے ہیں اور یہی وہ روحانی وابستگی ہے جس کے زیر اثر ہندوستان کے ہر مسلمان کا دل "حیدرآباد" اور "نظام" کا نام سنکر اپنے اندر فخر و غرور کا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے

حیران ہوں کہ تراب صاحب نے کیونکر یہ بے سر و پا بات لکھدی کہ " اعلیٰحضرت کے اشارہ پر غیروں کی نہ ہماری زندگیاں صدقہ ہونے کو آمادہ ہیں " معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کو شمالی ہند کی طرف سفر کرنے کا موقعہ نہیں ملا، ورنہ وہ دیکھتے کہ حیدرآباد کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اس جوار کے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز نہ قرار پاتا ہو اور تمام مسلم پریس پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس پر اظہار خیال نہ کرتا ہو ۔ اور واقعات کو جانے دیجئے صرف کی آریہ سماجی تحریک ہی کو لے لیجئے کہ پشاور سے لیکر بنگال کے بعید ترین گوشہ تک اور کشمیر سے لیکر انتہائی نقطۂ جنوب تک کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر نہ دوڑ گئی ہو، اگر تراب صاحب اس زمانہ میں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ مسلمانوں کے جوش کا وہ عالم تھا کہ حکومت کو قیام امن کے لئے مجبوراً یہ احکام نافذ کرنا پڑے کہ جلوس میں کوئی ایک لفظ منھ سے ایسا نہ نکالا جائے جس کا حضور نظام کی ذات سے ادنیٰ سا تعلق ہو یہاں کے مسلمانوں نے عظیم الشان مظاہرے کئے، جوابی جلوس نکالے، بڑے بڑے اجتماعات

اس تحریک کی مخالفت کی، انجمنیں قایم کرکے سماجی جتھوں کی قوت کو ضعیف کیا۔ مسلم اخبارات نے مسلسل مقالات لکھ کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ اس تحریک کی حقیقت کیا ہے اور یہ ظاہر کرنا غالبًا قرینِ مصلحت نہ ہوگا کہ نگار ہی کے ایک مقالہ سے متاثر ہوکر صوبۂ سرحد کے ایک مقام میں آریاؤں نے اپنا جلوس نکالنا ملتوی کر دیا

اب اس کے مقابلہ میں اگر تراب صاحب سے میں یہ مطالبہ کروں کہ وہ اپنی قربانیوں کی فہرست پیش کریں تو غالبًا بے محل نہ ہوگا۔ یقینًا وہ اس کے جواب میں جمعیت اتحاد المسلمین کا حوالہ دیں گے۔ لیکن کیا میں ان سے دریافت کر سکتا ہوں کہ انھوں نے اس باب میں سر سکندر حیثیت صدر مسلم لیگ ہونے کے مشورہ و استصواب نہیں کیا اور کیا مسلم لیگ شمالی ہند اور خصوصیت کے ساتھ یو۔پی کے مسلمانوں کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے۔ پھر سوال اس وقت نہ احسان جتانے کا ہے نہ احسان فراموشی پر باز پرس کرنے کا بلکہ صرف اس بات کا کہ کیا تراب صاحب حقیقت پر خاک ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مجھے اس کا اقرار ہے کہ اہلِ دکن کو اپنے فرمانروا سے محبت ہے، لیکن ہماری عقیدت سے کیوں انکار کیا جاتا ہے؟ بیشک ہم اور وہ دونوں فرمانروائے دکن کو "ظلِ سبحانی" کہتے ہیں، لیکن تعبیر کی نوعیت اور مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ وہ شاہِ دکن سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ ان کا ان داتا ہے، ہمارے دلوں میں ذاتِ شاہانہ کی عظمت اس لئے ہے کہ وہ ایک مسلم فرمانروا ہے۔ وہ ذاتِ شاہانہ کے اقتدار کا مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ سوائے ایک مخصوص جماعت کے کسی اور کے لئے اسے بذل و کرم سے کام لینا ہی نہیں چاہئے اور ہمارے نزدیک اس کا اقتدار اس صحیح اسلامی تعلیم میں پنہاں ہے جو ساری دنیا کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا چاہتی ہے۔ وہ شاہِ دکن کو صرف مسلمانانِ دکن ہی کا بادشاہ قرار دیتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی فرمانروائی کا اصل جوہر یہ ہے کہ وہاں کی غیر مسلم جماعتیں بھی ان کو اپنا ماویٰ و ملجا قرار دیتی ہیں۔ وہ سلطنتِ آصفجاہی کے اثرات کو صرف دکن کی چند لاکھ مسلم آبادی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اس کے حلقہ میں ہندوستان کی نو کرور مسلم آبادی کو گھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ بیرونِ حیدرآباد کے مسلمانوں سے اظہارِ عقیدت کا حق چھین کر شاہانِ دکن کی ان روایاتِ بذل و کرم کو محو کر دینا چاہتے ہیں جو دکن سے باہر بھی ہزاروں علمی و اجتماعی اداروں کی زندگی کا سرچشمہ ہیں اور ہم اپنے اظہارِ عقیدت کا حق تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو اس بنا پر کہ شاہِ دکن ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے تنہا نمایندہ ہیں۔ الختصر یہ کہ ان کے جذبۂ اطاعت کی بنیاد صرف "نمک خواری نظام" پر قایم ہوتی ہے اور ہماری عقیدت "پاسداریِ اسلام" پر، اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے

تراب صاحب نے ظاہر کیا ہے کہ "سیاسی نقطۂ نظر" سے میرے مضمون پر تنقید کرنے کا وقت نہیں لیکن اس کا اخلاقی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یعنی دستوری اصلاحات سے متعلق، میرے مقالہ پر کوئی رائے زنی

تو نہیں کرنا چاہتے لیکن اخلاقی حیثیت سے اسے ایک جرم سمجھتے ہیں اور دلیل صرف یہ ہے کہ حیدر آباد سے باہر رہکر وہاں کی سیاسیات پر کچھ لکھنا مضحکہ خیز بات ہے

اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں اخلاق کا تنبیہی پہلو کیا تھا، انھوں نے تو سہ پھر کر وہی سیاسیات کا ذکر چھیڑ دیا جس پر رائے زنی وہ مناسب نہ سمجھتے تھے۔ دوسرا کلیہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے یعنی جو شخص حیدر آباد کا باشندہ نہ ہو وہ نہ وہاں کی سیاسیات کو سمجھ سکتا ہے نہ وہاں کے مسایل پر اسے رائے زنی کا حق حاصل ہے۔ اگر یہ نظریہ تراب صاحب کا صحیح ہے تو مجھے بُرا ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ پھر تو مجھ سے زیادہ نامعقول ولایت کے اخبارات ہیں جو حیدر آباد سے گیارہ ہزار میل کے فاصلہ پر رہکر وہاں کے معاملات پر گفتگو کرتے ہیں، میں تو صرف گیارہ سو میل دور رہتا ہوں !

معلوم ہوتا ہے صحافت کا معیار تراب صاحب نے اپنی ہی تنگ و محدود معلومات کو سامنے رکھکر قایم کیا ہے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جدید ذرایع مخابرات نے زمین کی تنابیں کھینچکر فاصلہ کا مفہوم ہی بدل دیا ہے اور حیدر آباد تراب صاحب سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا ہم سے ہے

انھوں نے ایک جگہ میرے اس قول کو نقل کیا ہے کہ "ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے اور ہر قوم کی سیاست کا مخصوص اقتضاء" اور اس قول پر تفریع کر کے وہ اصلاحات پر میری رائے زنی کو غلط ٹھیراتے ہیں۔ یہاں بھی تراب صاحب نے انتہائی تنگ نظری سے کام لیا۔ میں نے ملک کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں حیدر آباد بھی شامل ہے اور قوم کا لفظ لکھا ہے جس میں ہندوستان کے تمام مسلمان داخل ہیں۔ ممکن ہے وہ حیدر آبادی مسلمانوں کو کسی اور قوم میں شمار کرتے ہوں، لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ہم میں اُن میں کوئی فرق نہیں اور حیدر آباد کا کوئی سیاسی یا اجتماعی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو روحانی تعلق حاصل نہ ہو

تراب صاحب نے تعریضاً میرے اس فقرہ کو بھی نقل کیا ہے کہ "اسلام، نازیت و فسطائیت نہیں کہ ذاتی خود غرضی پر ساری دنیا کی قربانی چڑھا دے" لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے یہ کہکر کس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا تراب صاحب کے نزدیک اسلام واقعی نازیت ہے، اور کیا حیدر آباد کی جماعت اتحاد المسلمین میں یہی روح کام کر رہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ عثمان کے دورِ اسلامی میں نام نہاد اتحاد المسلمین کے صدر کو ہٹلر بننے کی فرصت کبھی نہیں مل سکتی اور تراب صاحب کا خوابِ نازیت کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا

ایک جگہ انھوں نے میرا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ "اسلام نے اکاسرۂ عجم کی سلطنتیں اس لئے نہیں مٹائی تھیں کہ پھر کسریٰ پیدا ہوں" اور اس فقرہ کا مفہوم شاید وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ میں اعلیٰحضرت کے شخصی اقتدار کا مخالف ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مضمون نگار اپنی ذہنی بے مایگی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کوئی پیش نہ کر سکتا تھا

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ شخص جس نے حیدرآباد میں پرورش پائی ہو، جس کی رگ رگ میں فرمانروائے دکن کا نمک دوڑ رہا ہو، اور جس کو اس قدر قریب سے تمام حالات کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہو، وہی شاہ عثمان کی خصوصیات سے اتنا بے خبر ہو۔ یقیناً اس نے ابتک یہی نہیں سمجھا کہ دکن کا موجودہ فرمانروا کن اکابر اسلام کی یادگار ہے اور کونسا آئین سلطنت اس کی حکومت کا مدار ہے ۔۔۔ اقتدار کا مفہوم ذات شاہانہ کے نزدیک وہ ہیبت خوف نہیں ہے جو چنگیز و ہلاکو نے پیدا کیا تھا، سطوت و جبروت کی تعبیر اعلحضرت نے کبھی وہ نہیں سمجھی، جو نیرو اور کالیگولا نے سمجھی تھی اور شوکت و مرتبت کی وہ غلط تاویل کبھی ذات شاہانہ نے نہیں کی جو دنیا کے استبداد پسند بادشاہوں کا دستور رہا ہے

اعلحضرت نے اپنے اخلاق کی تعمیر میں ہمیشہ سیرت نبوی کو سامنے رکھا ہے اور آئین حکومت میں اس جادۂ مستقیم کو جسے بانی اسلام متعین کر چکا ہے، اس لئے میں ان کو یادگار نغفور و کسریٰ سمجھنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہمارے لئے فخر و غرور کی بات اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اخلاقِ اسلامی کے زندہ کرنے والے ہیں اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وہ سب کچھ قربان کر دینے والے جس کا غرض نفسانی سے ذرا سا بھی تعلق ہو سکتا ہے

میری نگاہ میں اس وقت صرف شاہِ عثمان ہی کی وہ ذات ہے جس نے " رعایت الاصلح فی الشرع " کے اسلامی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور جو زمانہ کی ضرورت، رعایا کی احتیاج، اور فلاح عامہ کی خاطر ہمیشہ اپنے قانون اور اپنے آئینِ حکومت میں تبدیلی کے لئے طیار ہو سکتی ہے

تراب صاحب نے یہ بات خوب لکھی کہ " سلطان العلوم کی بارگاہ بے نیاز ہے اور وہاں نیاز کا کام نہیں " اگر سلطان العلوم کی بارگاہ میں نیاز کا کام نہیں تو کیا اس سرتابی و سرکشی کا کام ہے جو حیدرآباد کے بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے اور جس کے ایک حقیر ترین فرد شاید وہ خود بھی ہیں

دوسری عالمگیر جنگ

آج یکم ستمبر تک جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ حد درجہ وحشت انگیز ہیں۔ جرمنی نہ صرف ڈینزگ لینے پر تلا ہوا ہے بلکہ کاریڈور کا مطالبہ بھی اس نے پیش کر دیا ہے۔ پولینڈ سمجھتا ہے کہ ڈینزگ کا جرمنی کے قبضہ میں چلا جانا، پولینڈ کے اقتصادی، دفاعی اور سیاسی اقتدار کو خاک میں ملا دے گا۔ جرمنی کا خیال ہے (اور غالباً بالکل صحیح) کہ ڈینزگ ۱۹۱۲ء سے پہلے اس کے قبضہ میں تھا اور اب پھر اس کے پاس واپس آنا چاہئے

کیونکہ وہاں کی جرمن آبادی، وہاں کا جرمن کلچر دونوں اس کے مقتضی ہیں۔ علاوہ اس کے جب وہ میمل پر قابض ہوچکا ہے تو ڈینزگ کو چھوڑ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ بحیرۂ بالٹک کے یہی دو بندرگاہ ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے قریب اور براہ راست خط اتصال رکھنے کی وجہ سے ایک ہی زنجیر کی دو کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

برطانیہ اور فرانس ابتک پولینڈ کی امداد پر آمادہ ہیں اور تمام جنگی تدابیر دونوں جگہ عمل میں آرہی ہیں، لیکن روس کے علحدہ ہوجانے اور جرمنی کے ساتھ اس کے ساز باز کر لینے کی وجہ سے برطانیہ کا وہ پوزیشن نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا

اب سے کئی مہینہ قبل میں نے پیشین گوئی کردی تھی کہ ہر چند جرمنی اور روس کے درمیان نظریۂ حکومت کے لحاظ سے زمین و آسمان کا بُعد ہے، لیکن پولینڈ کے باب میں اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ دونوں ملکر اس کو آپس میں بانٹ لیں، چنانچہ اس کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، کیونکہ باوجود اس کے کہ روس اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کرچکا ہے، ساتھ ہی ساتھ غیر معمولی فوجی بھرتی بھی کر رہا ہے، جو جاپان کے مقابلہ کے لئے بتائی جاتی ہو لیکن "روئے سخن" حقیقتاً پولینڈ ہی کی طرف ہے

لندن اور پیرس کی غیر مصافی آبادی ہٹائی جارہی ہے، بحری راستے فوج کی نگرانی میں دیدئے گئے ہیں، مال کی درآمد برآمد کے لئے حکومت نئے نئے قوانین جاری کر رہی ہے، اسلحہ سازی کے کارخانوں میں رات دن کام ہو رہا ہے، الغرض لڑائی کی مشین کو گردش میں لانے کے لئے صرف برقی بٹن دبانے کی دیر ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برطانیہ آخر وقت تک قیام امن کی کوشش کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ ہٹلر کو پھر ایک آدھ لقمہ دیکر کچھ دنوں کے لئے اس کا منھ بند کردیا جائے، لیکن کبتک ؟ آج نہیں تو کل جنگ ہونا لازم ہے اور اس لئے ہندوستان کو آخری بار ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر لینا چاہئے کہ بصورتِ جنگ اس کی پالیسی کیا ہوگی ۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور گاندھی جی کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشورہ کسی طرح حکومت برطانیہ و حکومت ہند کے لئے اندیشہ کا باعث نہیں ہوسکتا۔ سر سکندر حیات خاں نے جو اعلان اس باب میں کیا ہے اگر وہ مسلم لیگ کی زبان نہیں ہے تو کم از کم اُن مسلمانانِ پنجاب کی زبان ضرور ہے، جو ہر راہبر و کو رہبر سمجھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے

بہرحال اگر جنگ ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے لئے یہ عہد آفریں وقت ہوگا، اور اگر اس نے اس نازک وقت میں دانشمندانہ ڈپلومیسی سے کام نہ لیا تو اس کو ہمیشہ کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

مشرقِ ادنیٰ کی سیاسیات پر برطانوی اثر

بظاہر اس وقت مشرقِ ادنیٰ میں دو جنگیں جاری ہیں، ایک برطانیہ اور عربوں کے درمیان، دوسری یہود و عرب کے درمیان، لیکن اندرونی طور پر ایک اور جنگ جاری ہے، اور وہ یہ کہ اس وقت وہاں کئی آدمی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک عربی ریاستوں کی سیادت کا خواب دیکھ رہا ہے اور جس کا انجام برطانیہ و ہند کے تعلقات پر بڑی حد تک اثر انداز ہونے والا ہے۔ یہ آدمی کون ہیں؟

۱۔ ہز ہائنس امیر عبد اللہ فرمانروائے یردن (Trans Jordania) جن کے مسرور چہرہ اور مطمئن انداز سے کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ گزشتہ ۲۰ سال سے وہ سیادت عرب حاصل کرنے کی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے ہیں۔

اپنی نوجوانی میں شریف مکہ کے فرزند ہونے کی حیثیت سے ان کا عسکری مستقبل بہت شاندار تھا، لیکن جب پہلی ہی جنگ میں اپنے باپ کی فوجوں سے ان کو شکست حاصل ہوئی تو ان کا یہ خوشگوار خواب ختم ہو گیا۔ کیونکہ عرب میں ایک شکست خوردہ افسر کی حیثیت بہت ذلیل ہو جاتی ہے۔

جس زمانہ میں کرنل لارنس ریگستان عرب میں بغاوت کے بیج بو رہا تھا اس وقت بھی امیر عبداللہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی گو اس کے ساتھیوں نے اس کو ابھارنے کی بہت کوشش کی۔ اس کے بھائی جنگوں میں مصروف تھے اور یہ غیر محاربانہ شہری زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا لیکن اسے یہ توقع ضرور تھی کہ سلطنت ترکی کے ٹکڑے کر کے برطانیہ نے جو متعدد حکومتیں عربستان میں قایم کی ہیں، ان میں سے کسی نہ کسی حکومت کی امارت ضرور اس کے سپرد کی جائے گی۔

جب جنگِ عظیم ختم ہوئی تو اس کا باپ (حسین) مکہ و حجاز کا فرمانروا بنایا گیا، اس کا بڑا بھائی جدہ کا اور چھوٹا بھائی (فیصل) شام کا اور بعد کو عراق کا۔ صرف عبد اللہ رہ گیا تھا لیکن بڑی بحث و گفتگو کے بعد شرقِ یردن کی امارت اس کو مل گئی۔

اس کی حکومت کا رقبہ آئرلینڈ کے برابر ہے۔ یہاں تقریباً تین لاکھ عرب آباد ہیں جن میں سے دو تہائی

ابتک بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ عبداللہ انھیں پر حکومت کر رہا ہے اور دمشق و بغداد میں فاتحانہ داخلہ کی تمنا ہنوز اس کے دل میں باقی ہے۔

وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہود و عرب ایک جگہ امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے، وہ اس سے بھی واقف ہے کہ برطانیہ خود اس جھگڑے کو ایسے نہج سے طے کرے گی جو اس کے مصالح کے منافی نہ ہو اور اس دوران میں اسکے ساتھیوں اور خصوصیت کے ساتھ اس کے بڑے بیٹے نے کئی بار اسے آمادہ کیا کہ وہ فلسطین پر لشکر کشی کر دے، لیکن اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ امن سے بیٹھے رہنے کی قیمت ضرور اسے برطانیہ سے ملیگی، چنانچہ ماہرین کا خیال ہے کہ برطانیہ، فلسطین کا ایک حصہ شرق یردن میں ملاکر اس کے حوالہ کر دے گا تاکہ مشرق ادنیٰ میں ایک اور زبردست دوست و ہمدرد اس کا پیدا ہو جائے۔

۲۔ حاجی امین الحسینی سے اس وقت ہر وہ شخص واقف ہے جس نے فلسطین کی موجودہ نزاع کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نہایت ذہین، ہوشیار اور مدبر شخص ہے۔ عرب آبادی پر ان کو بڑا اقتدار حاصل ہے اور اسی اقتدار سے کام لیکر انھوں نے یہود و عرب کے مسئلہ کو برطانیہ کے لئے تشویشناک بنا دیا ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ ان تدابیر سے ان کا مقصود خود اپنی سیادت قائم کرنا ہے۔

جب جنگ کے بعد سر رونالڈ اسٹورس، فلسطین کا ہائی کمشنر مقرر ہوا، تو اس نے امین الحسینی کو خفیہ پولیس میں انسپکٹری کی جگہ دیدی، لیکن جب بعد کو معلوم ہوا کہ یہ برطانیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں تو علحدہ کر دیا۔ یہ فلسطین چھوڑ کر جامعۂ ازہر چلے گئے اور چونکہ ان کے باپ بھائی فلسطین کے مفتی رہ چکے تھے، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خود بھی مفتی ہونے کی توقع نہ رکھتے۔ جب وہ جامعۂ ازہر سے واپس آئے تو انقلابی تحریک کے لیڈر ہو گئے اور سر ہربرٹ سموئیل (ہائی کمشنر) نے اُن کو قابو میں کرنے کے لئے یروشلم کا مفتی اعظم بنا دیا۔ لیکن چونکہ یہ ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے انھوں نے در پردہ دوسری حکومتوں سے ساز باز شروع کر دی اور یہ اس عہدہ سے برطرف کر کے مسجد عمر میں مقید کر دئے گئے۔ یہاں سے پوشیدہ طور پر نکل کر یہ شام چلے گئے اور یہیں سے وہ برطانیہ کے خلاف پروپاگنڈا کر رہے ہیں۔

امین الحسینی بہت آزاد خیال آدمی ہیں لیکن اگر فلسطین کے مسئلہ کا فیصلہ یوں کر دیا جائے کہ وہ یہاں کے امیر یا حاکم بنا دئے جائیں تو غالباً ان کی یہ تگ و دو ختم ہو جائے، کیونکہ ان کی ذہنیت جذبۂ حکومت سے خالی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ فرمانروائے فلسطین بننے ہی کے لئے کر رہے ہوں۔

(۳) عربی ریاستوں میں جتنی قوت ابن سعود کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔ ان کے پاس ملک بھی وسیع ہے، فوج بھی زیادہ ہے، اسلحہ کی بھی افراط ہے اور محافظ حرمین ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر اقتدار بھی کافی حاصل ہے

اور اسی لئے مشرقِ ادنیٰ کے مسایل میں ہر فریق یا تو ابن سعود کو اپنا طرفدار بنانا چاہتا ہے یا کم از کم غیر جانبدار۔

ابن سعود اس قدر گہرا انسان ہے کہ اس کے خاص احباب کو بھی علم نہیں کہ اس کے اندر نپولین کی روح کام کر رہی ہے اور وہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر قابض ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی تربیت کے لحاظ سے نہایت سخت وہابی قسم کا مسلمان ہے اور اسی طرح کی حکومت وہ کر رہا ہے۔ نہ وہ تمباکو کا استعمال کرتا ہے، نہ شراب کا اور صوم و صلوٰۃ کا سخت پابند ہے۔ اپنے قد و قامت اور صورت و شکل کے لحاظ سے بھی بہت شاندار انسان ہے اور سوائے اس ایک نقص کے کہ کسی بیماری کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی ہے، وہ بہت صحیح و تندرست شخص ہے۔ وہ طویل گفتگو پسند نہیں کرتا اور بہت جلد فیصلہ کر لینے کا عادی ہے۔

ان کا اصل نام عبدالعزیز ہے اور عمر ۵۸ سال کی ہے۔ یہ ابن سعود اعظم کی اولاد میں سے ہیں جو اٹھارویں صدی کے اخیر میں تمام عرب پر قابض ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز ابھی بہت کمسن تھے، والیٔ ریاض نے ان کو مع انکے باپ کے کویت جلاوطن کر دیا۔ ان کی عمر بیس سال کی تھی کہ انھوں نے بدوؤں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ ریاض پر حملہ کیا اور قلعہ پر قابض ہو گئے۔ اس طرح گویا آدھا نجد ان کے قبضہ میں آ گیا اور اسوقت سے لیکر اسوقت تک ان کی عسکری و سیاسی اہمیت برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ عربستان کی سب سے زیادہ قوی حکومت انھیں کی سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے لوٹ مار کا استیصال کیا، مالی حالت کو درست کیا اور نہایت منظم فوج مرتب کی۔ اسوقت سعودی حکومت بحر احمر سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف شام و عراق تک وسیع ہے۔

ابن سعود ۳۰ لاکھ نفوس پر حکمراں ہے اور ریاض ان کا دار السلطنت ہے جو اینٹوں کی فصیل سے محصور ہے اور درمیان میں ایک بڑا میدان ہے جو بدوؤں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں ابن سعود سے مشورہ و حکم لینے کے لئے آتے ہیں اور تین دن تک انھیں اس میدان میں قیام کرنے کی اجازت ہے۔ ابن سعود کا محل اسی میدان کے ایک جانب واقع ہے جو بہت سادہ ہے۔

جنگ عظیم میں ابن سعود کو غیر جانبدار رہنے کا معاوضہ برطانوی حکومت سے ۶۰ ہزار پونڈ سالانہ ملتا تھا۔ جنگ ختم ہونے پر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اپنے ملک کو بہت وسیع کر لیا یہاں تک کہ وہ نجد و حجاز کے بادشاہ کہلانے لگے۔ ان میں ایک بڑے فرمانروا ہونے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ۶ فٹ ۴ انچ کا دیو پیکر انسان جس میں جرأت و ہمت کے علاوہ سیاست دانی بھی پائی جائے یقیناً ایک بہترین فرمانروا بننے کی اہلیت رکھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ان میں مذہبی غلو بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ ملک کے اندر گراموفون کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ عملی انسان بھی ہیں اور نجد و حجاز کے ریگستانی حصوں کو شاداب و کارآمد

بنانے میں وہ تمام جدید ذرایع سے کام لے رہے ہیں۔ ریاض میں ریڈیو اسٹیشن بھی موجود ہے اور ٹیلی فون بھی۔

۴۔ برطانوی ہائی کمشنر سے لیکر اُن ننھے لڑکوں تک جو یروشلم کے ڈاک خانہ کے سامنے اخبار بیچا کرتے ہیں، کوئی ایسا نہیں جو فوزی کے نام سے واقف نہ ہو اور شاید ہی کوئی عرب، یہودی یا انگریز ایسا ہو جو فوزی کے کارناموں سے آگاہ نہ ہو۔

شام میں سُولی اس کے لئے طیار ہے، فلسطین کا جلاد اس کی ملاقات کا منتظر ہے، اور سعودی عرب میں تو یہ حال ہے کہ اگر یہاں گرفتار ہو جائے تو ابن سعود خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

فوزی کے پاس تین چار ہزار عربوں کی جمعیت ہے اور اس کی مدد سے اس نے فلسطین کے صحراؤں اور پہاڑوں کو ناقابل گزر بنا رکھا ہے۔ اس کے تمام ساتھی پہاڑوں کے رہنے والے نہایت خونخوار ہیں جو سوائے جان لے لینے یا جان دیدینے کے کچھ نہیں جانتے۔ لیکن وہ برطانوی سپاہ سے باقاعدہ جنگ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی شکست ظاہر ہے۔ وہ صرف اس موقعہ کا منتظر ہے کہ فلسطین میں بڑی بغاوت رونما ہو اور وہ اس میں حصہ لیکر کسی حصۂ زمین پر قابض ہو جائے۔ فلسطین میں شبخون مارنے کی ابتدا اسی نے کی۔ یہ چپکے چپکے رات کے وقت اپنے ساتھیوں کو لیکر پہونچ جاتا ہے، اور گاؤں میں آگ لگا کر کھیتیاں تباہ کر کے صبح ہونے سے پہلے ہی واپس آجاتا ہے اور پہاڑوں میں چھپ رہتا ہے۔

یہ اوسط قد، گٹھا ہوا جسم رکھتا ہے اور اپنی شہرت کا بڑا شایق ہے، چنانچہ یروشلم کی خفیہ پولیس کے پاس اس کے متعدد فوٹو مختلف حالتوں کے موجود ہیں۔ کہیں فوج کے ریویو میں مشغول ہے، کہیں اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا ہے اور کسی تصویر میں سو رہا ہے یا کسی اور مشغلہ میں مصروف ہے۔ یہ انگریزی لباس کا بہت شایق ہے، اس کا عہد طفلی، شام میں بسر ہوا تھا اور فوجی تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجدیا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں اس نے کیا کیا، اس کا حال نہیں معلوم۔ بعض کا خیال ہے کہ ترکی فوج میں کپتان تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کرنل لارنس سے مل گیا تھا، بہرحال جنگ عظیم میں اس نے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن جنگ کے بعد اس نے ایک انقلابی سردار کی حیثیت ضرور اختیار کر لی۔ فرانسیسی حکومت نے اس کو ایک بار گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم صادر کر دیا تھا، لیکن قتل ہونے سے چند گھنٹے قبل کسی تدبیر سے یہ بھاگ نکلا۔ اس کے بعد اس نے شاہ فیصل کی ملازمت اختیار کی اور عراقی فوج میں اس کو ایک عہدہ مل گیا، لیکن بعد کو وہ (Pan Arabian) سازش میں شریک ہو گیا اور یہاں سے بھی اسے بھاگنا پڑا۔

چونکہ عربستان میں بہت سے شیوخ و امراء ہیں اور ان میں سے ہر ایک ترکی فوج کے تجربہ کار افسر کو لینا پسند کرتا ہے اس لئے ابن سعود نے اسے اپنی فوج کی تنظیم پر مامور کیا۔ اس نے کئی سال تک

یہاں کام کیا لیکن بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مخالف قبایل سے بھی ساز باز رکھتا ہے تو یہاں سے بھی بھاگا اور امیر عبداللہ کے پاس پہونچا۔ امیر نے اسے ملازم تو رکھا نہیں لیکن ایک گاؤں میں سر چھپانے کی جگہ دیدی۔

اس کے بعد جب فلسطین میں بے چینی شروع ہوئی تو یہ پھر باہر نکلا اور اس نے ان تمام عربوں کو یکجا کرنا شروع کیا جنھیں برطانوی فوج نے منتشر کرکے جلاوطن کردیا تھا اور اب انھیں کو وہ باقاعدہ فوجی تعلیم دیکر اپنی سپاہ مرتب کر رہا ہے۔ اس کی نگاہ اب صرف فلسطین پر ہے اور اس میں شک نہیں کہ فلسطین کا مسئلہ اس سے جنگ کئے بغیر ختم نہیں ہو سکتا۔

(۵)۔ برطانوی پالیسی اب نہ فلسطین میں بلکہ ہر جگہ بدل گئی ہے۔ وارن ہسٹنگز اور لارڈ کلایو کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب وہ "حکومت بالواسطہ" ([illegible]) پر عامل ہے، گویا یوں سمجھئے کہ آہنی دستانے پر نرم چمڑے کا خول چڑھا لیا گیا ہے، چنانچہ جس وقت فلسطین میں بے چینی شروع ہوئی تو برطانیہ نے صرف ہوائی جہاز ٹینک اور مشین گن سے کام نہیں لیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ چند آدمی اس اہلیت کے بھی روانہ کئے جو کرنل لارنس کی سی حرکتیں کر سکیں۔

بظاہر ان لوگوں کا کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت بہت مشکل ہے۔ ایک طرف امراء عربستان سے ساز باز کرنا، دوسری طرف وحشی بدوؤں کی ہمدردی حاصل کرنا اور پھر ان سب کے اندرونی رازوں اور تدبیروں پر آگاہی پانا معمولی بات نہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا عربستان کے مستقبل میں تین آدمیوں کے ہاتھ شامل ہونا ضروری ہے۔ ابن سعود امیر عبداللہ اور رفوزی۔ اس لئے تین برطانوی ایجنٹ انھیں تین کے حالات معلوم کرنے کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک "فریڈرک جرارڈ پیک" ہے یہ کرنل لارنس کا دست راست رہا ہے اور نہایت ہوش و گوش کا انسان ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جب ترکی حکومت کو عربستان سے ختم کیا گیا تو یہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے عرب ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کیا تھا۔ کچھ دنوں اس نے امیر فیصل کے پاس کام کیا، پھر ابن سعود کے پاس پہونچا اور قبایل نجد کے شیوخ سے بھی ملتا رہا۔ اس کے بعد یہ امیر عبداللہ کا مشیر خاص بن گیا اور شریف مکہ پر زبردست اقتدار حاصل کر لیا۔ امیر عبداللہ کے یہاں یہ حفاظت عامہ کا ڈائرکٹر تھا اور پیک پاشا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ۲۱ء میں کچھ عربی دستے نیم فوجی ایسے طیار کئے جو بظاہر پولیس کی خدمات انجام دیتے، لیکن فی الحقیقت ان کا کام اندرون ملک کے لوگوں کی نبض شناسی تھی۔ چنانچہ اس نے قبایل پر اثر ڈالنے کے لئے صحرا میں متعدد قلعے بھی تعمیر کرائے اور ریڈیو ٹرانسمٹر بھی وہاں نصب کئے۔

دوسرا برطانوی ایجنٹ "میجر جان بیگٹ گلب" ہے۔ اس کے فرائض خانہ بدوش عربی قبایل سے میل جول بڑھانا ہے۔ اہل عرب اس کو اپنا بڑا دوست سمجھتے ہیں اور ابوالحنق کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ اسکی ٹھوڑی پر زخم کا نشان ہے۔ یہ صحرائی راستوں اور وہاں کے قبایل سے اتنا واقف ہے کہ ہوائی جہاز اسے صحرا میں کسی جگہ چھوڑ دیتا ہے اور وہ قریب ترین عربی قبیلہ تک پہونچکر مہینوں کے لئے غائب ہوجاتا ہے۔ وہ تمام قبایل کی عربی زبان نہایت مہارت سے بولتا ہے اور ان کے عادات و خصایل سے اتنا واقف ہو کہ اسکو وہیں کا باشندہ کہنا زیادہ موزوں ہو۔ وہاں کے وحشی قبایل کو اس پر بہت اعتماد ہو، چنانچہ فلسطین کی بےچینی میں بدوؤں کا بالکل علحدہ رہنا اسی کی کوشش کا نتیجہ ہو۔ تیسرا برطانوی ایجنٹ جان فلبی ہے، جو ابن سعود کا گہرا دوست ہے۔ اور یہ دوستی اس وقت سے قایم ہو جب ابن سعود ترکوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا اور فلبی بغداد میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمان بھی ہوگیا۔

یہ کرنل لارنس کی اس تحریک کا مخالف تھا کہ شاہ حسین اور اس کے لڑکوں کی سیادت میں عربی فیڈریشن قایم کیا جائے۔ فلبی کے نزدیک لارنس کی یہ تحریک عرب کے اندرونی حالات اور ابن سعود کی قوت سے بیخبری کی بنا پر تھی اور فلبی کا یہ خیال بالکل صحیح نکلا کیونکہ ترکوں کے ختم ہونے کے بعد ہی ابن سعود نے حسین کو مغلوب کرکے نجد و حجاز میں اپنی حکومت قایم کرلی۔

اس میں شک نہیں کہ ابن سعود کی وفاداری برطانیہ کے ساتھ محض فلبی کی وجہ سے ہے اور جب تک برطانیہ کے پاس بیک پاشا۔ گلب اور فلبی ایسے کام کرنے والے موجود ہیں اس وقت تک عربستان کی حکومتوں کا فیصلہ کبھی برطانوی مفاد کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں، قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۲۷ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۴ء) فروری ۵ر۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون و ستمبر) ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ --- منیجر نگار۔ لکھنؤ

کیا ناسخ نے واقعی اُردو زبان کی اصلاح کی؟

جب دہلی کی طوائف الملوکی نے دہلی کے کاملینِ فن کو پراگندہ دل کرکے اطراف ہندوستان میں سرگرداں اور آوارہ بنادیا تو شاعروں کو کہیں چین نہ ملا۔ اور کہیں تو اس فن کی قدر بہت ہی دشوار تھی، مگر دہلی کے قدرداں جو لکھنؤ میں موجود تھے، انھوں نے اس ذوقِ نو کو اپنایا اور ان مصنفوں، شاعروں اور زباں دانوں کو اپنے ذیل عاطفت میں پناہ دی۔ ان خانماں خرابوں کو جو دم لینے اور پاؤں ٹیکنے کا موقع ملا، تو بھولی ہوئی رنگ رلیاں یاد آگئیں، زبان اور شاعری کا چرچا ہونے لگا، پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ اسی گمشدہ خوابِ عیش کا گہوارہ بن گیا۔ اس سرے سے اس سرے تک شاعری کا روز افزوں سیلاب موجیں مارتا دکھائی دینے لگا، زبان کی بحثیں، شاعری کے چرچے، شعرخوانی کی مجلسیں غرض کیا کچھ تھا جو نہ تھا۔ وہی لکھنؤ جس میں اُردو شاعری کا نام و نشان بھی نہ تھا، اب مخزن الشعراء بن کر رہ گیا اور یہ رنگ مصحفی کے دور تک قایم رہا۔ جتنے یہاں کے خوشگو تھے سب دہلی کے رنگ شاعری کے متبع اور دہلی کی زبان کے مقلد رہے اور اسی تقلید و اتباع کی برکت نے بہت سے خوشگو پیدا کئے، چنانچہ خالص لکھنوی شاعروں میں نوازش نے قریب قریب میر سوز کے رنگ کو ایسا نبایا کہ اگر اس کا کلام استاد کے کلام میں ملا دیا جائے تو شاید بڑے بڑے نقاد بھی یہ نہ پہچان سکیں کہ یہ میر سوز ہیں یا نوازش، اسی طرح زمانہ گزرتا رہا۔

ناسخ پیدا ہوئے اور اُن کی شاعری کا دور آیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ رہنے والے تو یہاں کے نہ تھے مگر بچپن، جوانی، بڑھاپا سب یہیں گزرا۔ خیر اس سے کوئی بحث نہیں، کہیں کے بھی ہوں۔ بہرحال خالص لکھنویت کا اتنا کوئی حریص ہوا نہ مدعی جتنے یہ تھے۔ اول اول انھیں بھی زمانہ کی روش پر چلنا پڑا اور اسی میخانۂ فیض کے متمنی رہے، جس کے سب متوالے تھے، یعنی رنگِ زبان و طرزِ شاعری دہلی ہی سے وابستہ رہا۔ اس اجمال کی تفصیل سن لیجئے:۔

آبحیات میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا مولانا زعمی فرماتے ہیں:۔ مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغاز شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے

جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا، انھوں نے اصلاح نہ دی تو میں شکستہ دل ہو کر چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ تو نہیں، اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا" اس کے بعد شیخ صاحب نے بقول خود یہی سلسلہ جاری رکھا، خود کہا اور خود اصلاح دی اور جو کچھ ہوئے وہ ہوئے۔ مگر ذرا اس پر مولانا آزاد کا نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں " ان کی طبیعت اور زبان دونوں سے میل کھانے والی نہ تھیں اور بے دماغی اس پر طرہ، افسوس میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے ہوں گے سننے کے قابل ہوں گے مگر شیخ صاحب نے وہ کسی کو کب سنائے ہوں گے" ذرا دیکھئے باتوں باتوں میں مولانا آزاد کیا کہہ گئے۔ مولانا رغمی نے جو کچھ مولانا آزاد سے فرمایا میں اس کو صحیح جانتا ہوں اور اسی بنا پر مولانا آزاد کا یہ لکھنا بھی غلط نہیں ہے کہ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ یہ دونوں سچے۔ مگر سنئے:-

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا"۔ شیخ صاحب نے حقیقت کو مجاز کی حد میں بھی نہ رہنے دیا صاف اُڑا گئے اور ایک اُستاد کے حقِ خدمت کو بالکل بھلا دیا۔ دل کا حال تو خدا جانے مگر سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ دلی سے یہ کسی طرح اپنی نسبت ثابت کرنا نہ چاہتے تھے۔ اب سنئے واقعہ حضرت (ناسخ) نے بذاتِ خود تو مولانا رغمی سے میر صاحب کا واقعہ فرما دیا مگر مولانا عبدالحی مرحوم نے اپنے تذکرہ گلِ رعنا میں صاف لکھ دیا ہے کہ محمد عیسیٰ تنہا سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے۔ اس پر مولانا نے حسرت موہانی کا ایک فقرہ جو انھوں نے مصحفی کے دیوان ششم سے نقل کر کے اُردوئے معلیٰ میں لکھا تھا۔ سنداً نقل کر دیا ہے۔ جس سے اس قول کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ پیرِ مغاں سخن یعنی مصحفی کی وہ عبارت یہ ہے" حصہ ایوان ایں خواں بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستاں محمد عیسیٰ تنہاست و بہ فقیر نیز رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت" اس کے صاف صاف یہ معنے ہیں کہ شیخ ناسخ بالواسطہ مصحفی ہی کے جامِ سخن سے سیراب ہوئے۔ خود مصحفی کے نہیں تو ان کے شاگرد کے شاگرد ضرور تھے۔

شیخ ناسخ نے "کس نیاموخت علمِ تیر از من" پر ضرور عمل کیا ہوگا ورنہ اس قدر تغیرات کیوں رونما ہوتے۔ (۱) دلی کی شاعری جو داخلی رنگ میں کی جاتی تھی ان کے یہاں آکر خارجی رنگ میں رنگ گئی اور اثر و درد کو خیر باد کہہ گئی (۲) دہلی کے قدیم طرز سخنگوئی کو جسے شاعران دہلی متروک کر چکے تھے کیوں زندہ کرتے اور ایہام و تناسب کے پھیر میں کیوں پڑ جاتے۔ (۳) دہلی کی زبان میں اصلاحیں کیوں دیتے اور اس سے لکھنؤ کی زبان کو علٰحدہ کیوں کر دیتے۔ (۴) محاورات قدیم میں تصرف کر کے اُن کی جگہ اپنے سُنے ہوئے محاوروں کو کیوں استعمال کرتے۔

غرض یہ مسلمہ بات ہے کہ انھوں نے دلی کی تمام باتوں سے اعراض کیا اور زبان سے اعراض ہی اگر ہوتا تو خیر انھوں نے اس میں تراش و خراش اور کتر بیونت شروع کر دی۔ "ناسخ نے زبان کی اصلاح کی، ناسخ نے زبان کی اصلاح کی" کا غل مچا۔ اسے لیجئے یہ محسن زبان قرار پا گئے اور اپنے پندار میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان کو ایک

نئی زبان بنا دیا لوگوں میں دھوم مچ گئی کہ شیخ ناسخ نے زبان وشعر کی اصلاح کی۔

یہ دل خوش کن فقرہ اگر لکھنؤ کا لکھنؤ ہی میں رہتا تو کچھ ایسی بات نہ تھی غضب تو یہ ہوا کہ لکھنؤ سے نکل کر دلی پہونچا اور مرزا غالب ایسے نقاد کو بھی دھوکہ ہوگیا چنانچہ میر مہدی کو لکھتے ہیں:-

"او میاں سید زادے، آزادے، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش، نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی، ہائے دلی، وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی" اسی طرح ایک دوسرے رقعہ میں میر مہدی کو چشم نمائی کی ہے اور دلی کے مقابلہ پر لکھنؤ کی زبان کو بہتر بتایا ہے خط کی ابتدا اس فقرے سے کی ہے "میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی" جس کو پڑھکر میر مہدی نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا ہے اور لکھا ہے "قبلہ و کعبہ آداب بجالاتا ہوں۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے۔ اگر شرم آئے تو جب علی بیگ سرور کو آئے، جس نے وہ لاف و گزاف کیا کہ جیسا لکھنؤ ہے دنیا کوئی شہر نہیں۔ اُن سے کہنا چاہئے کہ اے مرد خدا، خدا سے ڈر، لکھنؤ کسی بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے کونسی تاریخ میں وہاں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے، ماہیت تو اُس کی یہی ہے کہ مضافات صوبہ اودھ کا ایک شہر ہے یہ دلی کا مقابلہ کیونکر کرے گا۔ اگر پانسو برس کی تصنیفات دیکھو گے اُس میں بھی یہی لکھا پاؤ گے ؎

حضرت دہلی کنف عدل و داد جنت عدن است کہ آباد باد

اسی طرح آخر خط تک دلی کی زبان اور طرز معاشرت کو سراہا گیا ہے۔ غالب کے اس قسم کے خطوط سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ زبان دہلی کے قایل نہ تھے۔ مگر اصل یہ ہے کہ مرزا اکبرآبادی الاصل تھے اور دلی کی زبان سے نہیں بلکہ دلی والوں سے اس لئے کبیدہ خاطر تھے کہ دلی والوں نے کبھی ان کی زبان اور ان کی اُردو شاعری کو نہیں مانا، جس کی شہادتیں اُن کے کلام سے بھی ملتی ہیں، اور تذکروں سے بھی۔ یہ سب جھگڑا اس بات کی تھی اس بات کی کہ دلی والے ان کو غیر ملکی سمجھ کر زبان میں اپنا ہم پلہ نہ جانتے تھے اور اکثر کہہ گزرتے تھے کہ

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور غالب جواب میں یہ کہتے ہیں :-

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

یہ سب شہادتیں ہیں جو صاف صاف بتاتی ہیں کہ دہلی والے اُن کو زبان و بیان دونوں میں مستند نہ جانتے تھے۔ اور اسی باعث سے مرزا کو وہ کچھ کہنا پڑتا تھا جو نہ کہنا چاہئے تھا۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اُن لوگوں کو جو زبان لکھنؤ کے طرفدار تھے اُن کو ایک موقع مل گیا اور اس بنا پر عبارتیں بنالی گئیں۔ چنانچہ صفیر بلگرامی جو ناسخ کے بھی شاگرد تھے اور مرزا غالب سے بھی آخر میں استفادہ فرماتے تھے انھوں نے ایک عجیب واقعہ پیش کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں دہلی میں مرزا سے ملنے گیا تو مرزا نے مجھ سے یہ فرمایا کہ "میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے، اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش رفو کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اُس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رکھا، مگر یا درہے دلی کی برابری اس مضمون میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ اس زبان پر اس کے سوا ہوتا کیا۔ میں نے بھی اک طرز خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر مضمون کو نشو ونما ہو سکتا تھا۔ مگر یاروں نے اُس کو چلنے نہ دیا۔" صفیر مرحوم کی اگر یہ گواہی سچی ہے تو اس میں بھی مرزا کی دلی چوٹ زبان تک آپہونچی ہے۔ بہرحال اگر صفیر مرزا کے اس قول ہی پر اس قصہ کو ختم کرتے تو یہ بھی غنیمت تھا۔ مگر انھوں نے ایک اور بھی عبارت بنائی ہے کہ اپنے تذکرہ میں بڑے شد و مد سے اصلاحات ناسخ کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اصل تذکرہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، اس لئے میں شعر الہند مولانا عبد السلام ندوی سے اُس کے تلخص پر کچھ گفتگو کروں گا۔ بہرحال صفیر بلگرامی کی اس سعی و کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے بعد کے تذکرہ نویسوں اور نقادوں کو بھی ایک مشغلہ مل گیا۔ چنانچہ مولانا عبد السلام نے اپنی کتاب شعر الہند میں ناسخ کی اصلاحات کا ایک باب قائم کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تاریخ نویسوں کو بھی کافی شبہات ناسخ کی اصلاح کے متعلق ہیں۔ جن کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اب ناسخ کے احسانات اور ان کی حقیقت ملاحظہ ہو:-

کہا جاتا ہے کہ پہلے زبان اُردو کو ریختہ کہتے تھے لیکن ناسخ کے وقت سے اس کا نام اردو رکھا گیا اور دلی میں غدر کے زمانے تک یہ لفظ باقی رہا، جیسا مرزا غالب لکھتے ہیں :-

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب ۔۔۔ کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ میرے خیال میں مصحفی کے یہاں پہلے اس معنی میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ تذکرہ ہندی میں حضور کے حال میں لکھتے ہیں "در شاہجہاں آباد بخانہ لطف علیخاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف اور معنی طرف تقرر داشت وازیں جہت بعضے از فصحی او خلاف اُردو شمردہ پیرویش نکردند" اسی طرح نثار کے حال میں درج کیا ہے "ادائے زبان اُردو چنانکہ

"باید از زبان عبارت بیافتن مے شود" اسی طرح مجبور کے حال میں لکھا ہے کہ "نسخہ کتاب در زبان اردوے ریختہ شکر آمیختہ از خامہ نگارش رونق سواد پذیرفتہ" میرزا غالب کا شعر جو پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چونکہ وہ میر کا ذکر کر رہے ہیں اس لئے اُن کو اس جگہ بجائے اردو کے ریختہ ہی کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ میر کے زمانہ میں اس کو ریختہ ہی کہتے تھے۔ ورنہ غالب کے یہاں کئی رقعات میں اُردو کا لفظ موجود ہے جہاں انھوں نے اردو کو بہ تذکیر استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں فارسی کے اس شعر میں بھی اُردو کا لفظ موجود ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

اگر زبان دہلی اسوقت تک ریختہ ہی بولتے تھے تو خود ناسخ بھی اس سے مبرا نہ تھے چنانچہ اُن کا یہ شعر اس کا گواہ ہے ؎

سب زمینیں ہیں نئی تیسیر ہیں اے یار نئی — رو نہیاں ریختہ کی اُٹھتی ہے دیوار نئی

ناسخ نے بھی یہاں ریختہ بہ ضرورت صنعت استعمال کیا ہے۔

ناسخ کا دوسرا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ پہلے غزل کو بھی ریختہ کہتے تھے، ناسخ نے غزل کا لفظ رائج کیا اور اس لفظ کو متروک قرار دیا۔

لیکن مجھے یقین نہیں کہ کبھی کبھی غزل کو بھی ریختہ کہہ جاتے تھے اور یہ تک اسوقت اور کبھی ریختہ ہو جاتا ہے جب میں میر حسن مرحوم کا یہ شعر دیکھتا ہوں البتہ میں انھوں نے اصناف سخن میں سے ایک ایک کے نام علحدہ علحدہ گنا دیئے ہیں ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اس کے علاوہ ناسخ سے بہت پہلے قائم کہہ چکا ہے کہ :-

قائم یہ فیض حضرت سودا ہے ورنہ میں — طرحی غزل سے میر کی آتا تھا بر کہیں،

اس لئے یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے اس کی ابتدا کی۔

تیسرا احسان یہ ہے کہ ناسخ نے غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور ردیف کی بنا حروف روابط، یعنی، کا، کے، کو، سے، نے، تک اور حروف اثبات و نفی یعنی (ہے) اور (نہیں) پر رکھی۔

اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ناسخ کو وہ لمبی لمبی ردیفیں جو پہلے کہی جاتی تھیں پسند نہ آئیں یا یہ کہ ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے اسواسطے اُس قسم کی ردیفیں نہ رکھیں، رہیں حروف روابط کی ردیفیں سو یہ دیگر قدما کے یہاں پائی جاتی تھیں۔ تاباں کی زمینیں دیکھئے:-

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا — جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا

اے عندلیب باغ سے کچھ کام تو نہیں — چھوڑ دے بہشت توکل کا یہ ہنگام ہی نہیں

اے شمع رو مرے گا جو کوئی تری لگن میں — وہ حشر تک رہے گا جلتا ہوا کفن میں،

کب پہونچتا ہے سنبل اس زلف پر شکن کو جس پر نثار کرئے سو نافۂ ختن کو
گلے لگ رات کو وہ گلبدن جب ساتھ سوتا ہے ہمارا صبح کا جامہ بسا پھولوں میں ہوتا ہے

دعوے کیا جاتا ہے کہ ناسخ نے افعال میں یہ اہتمام کیا کہ جو افعال اُصولاً صحیح تھے انھیں پر ردیف وقافیہ کی بنیاد رکھی - اس کا جواب یہ ہے کہ اگر احیاناً قدیم شعراء کے یہاں کچھ افعال ایسے پائے جاتے تھے تو اسکی دو صورتیں ہوسکتی ہیں - یا وہ الفاظ اسوقت صحیح اور مجوزالاستعمال تھے یا نہ تھے، اگر تھے تو ناسخ نے اُن کو چھوڑ کر زبان کو محدود کیا - مثلاً کہلانا بہ معنی کاہلی کرنا جس میں مجبور کا یہ شعر ؎

باتیں دیکھ زمانے کی جی بات میں بھی کہلاتا ہے خاطر سے سب یار دل کی مجبور غزل کہلاتا ہے

گہنانا بہ معنی چاند کا گہن میں آنا، یا برمانا، برمے سے سوراخ کرنا اور اسی قسم کے ترکیبی اور وضعی مصنوعی مصدر ان میں یا سب کو چھوڑنا تھا، یا بالکل نہ چھوڑنا چاہئے تھا - ناسخ کے یہاں اس قسم کے افعال موجود ہیں، تو یہ اُن کی متروکات خاص ہیں اور اس قسم کے متروکات اختیاری قریب قریب ہر شاعر کے یہاں ہیں ناسخ اس میں مخصوص نہیں ہیں - مگر یہ چیز ہر فصیح نے صرف اپنے لئے مخصوص رکھی ہے دوسروں پر اس کو روا نہیں رکھا، لہذا اس کو صفائی زبان کہنا ایک بے معنی سی بات ہے - رہی دوسری شق اگر وہ مصادر غلط تھے تو اسوقت بھی غلط تھے اور اب بھی غلط ہیں اُن کو سند میں نہ لانا چاہئے - آپ دیکھیں گے تو ناسخ کے یہاں بھی آپ کو ایسی غلطیاں ملیں گی - جائے ہے، آئے ہے وغیرہ افعال میں اہل دہلی کی غزلیں موجود ہیں - مگر متاخرین مثلاً غالب، ذوق، مومن کے یہاں اسی قسم کی ردیفیں دیکھ کر یہ سمجھنا کہ وہ اس کو صحیح اور فصیح اور جایز جانتے تھے ایک خطرناک غلطی ہے اسواسطے کہ انھیں افعال میں صحت کے ساتھ بھی اُن کے یہاں غزلیں موجود ہیں مثال کے طور پر غالب کی اس غزل کو لیجئے :-

دیکھئے قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

جائے ہے اور آئے ہے کی بجائے جاتا ہے اور آتا ہے جب اُن کی سب غزلوں میں ہے تو ہم ان ایک یا دو غزلوں کو سوائے تفنن طبع کے اور کوئی درجہ نہ دیں گے، جیسا کہ آج بھی ہمارے معاصر اس قسم کی زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں - غالب کے یہاں آتا ہے، جاتا ہے ملاحظہ ہو :-

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

اسی کے قیاس پر پوری غزل دیکھکر اور اس دعوے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی عدم واقفیت یا کثرت [illegible] سبب تھا ورنہ تفنن [illegible] اور غلط غزلوں کے [illegible] کچھ معنے نہیں ہیں -

بہرحال مختصراً یہ بتانا مقصود ہے کہ ناسخ نے [illegible] [illegible]

ے الفاظ سے زبان کو پاک کرکے اس کو مہذب اور شائستہ بنا دیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کا نکالنا زبان کو تنگ کرنا ہے۔ ہاں اگر غزل سے اس قسم کے خیالات کو نکال دیا تو بیشک یہ ان کی پاکیزگی خیال کی دلیل ہے۔ زبان پر اس احسان کا بار نہیں پڑتا۔ اس پر بھی اگر خود ان کے یہاں اور ان کے معاصرین کے یہاں ڈھونڈے جائیں تو کچھ نہ کچھ شعر ایسے مل ہی جائیں گے مثلاً آتش سے

اکیلا پا کے نہیں چھوڑنے کا میں تم کو

زال دنیا تنگ کرتی ہے نہایت ہی مجھے — ہے مگر مرد بیوہ کا کیا بدن فولاد کا — وغیرہ وغیرہ

کہنا یہ ہے کہ فحاشی کے لئے صرف رکیک الفاظ ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ پاکیزہ الفاظ میں بھی خراب جذبات کو ادا کیا جا سکتا ہے اور اس میں شاید ناسخ بھی ولی ثابت ہو سکیں۔ مولف شعر الہند نے بتایا ہے کہ جلوۂ خضر میں اس قسم کی تمام اصلاحات کی تفصیل ہے۔ افسوس کہ وہ میرے پیش نظر نہیں۔ اگر اس قسم کے الفاظ ہی زبان سے نکل جائیں تو زبان کا فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناسخ نے جہاں تک ممکن ہوا فارسی عربی زبان کے الفاظ استعمال کئے اور بھاکا کے الفاظ کو چھوڑ دیا۔

معلوم نہیں کہ یہ فعل مستحسن تھا یا نہیں بہرحال شاہ حاتم نے بھی یہی کیا تھا۔ جیسا کہ وہ خود اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ دارند منظور داشتہ و زبان ہندی کہ آں را بھاکا گویند موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود مختصر کہ لفظے غیر فصیح ان شاء اللہ نخواہد بود" شاہ حاتم نے جو شرائط الفاظ کے بدلنے کی لگائی ہیں کہ قریب الفہم، کثیر الاستعمال، عام فہم، خاص پسند، روزمرہ میرزایان ہند و فصیحان رند، محاورات۔ ان قیود کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو کو اردو بنایا اور محض ہندی بھاکا کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی ٹھونس نہیں دئے جو ہرگز قابل تعریف نہیں جیسا کا منظر ناسخ کے اس قسم کے شعروں میں نظر آتا ہے

دیکھنا ناسخ سر شیخ معمم کی طرف — کیا کلس سواک کا ہے گنبد دستار پر

بہرحال یہ نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ ناسخ کے لئے قابل فخر۔ اسی وجہ سے نقادوں نے ناسخ کے یہاں سے سیکڑوں شعر اس قسم کے نکالے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربی فارسی اور ہندی کے جو الفاظ مستعمل تھے ان کی تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا، لیکن ناسخ نے ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قاعدے بھی بنائے۔

مگر میری نگاہ سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو قواعد کے بارے میں ناسخ نے لکھی ہو اور ابھی ابھی میرزا غالب

کا بیان آپ نے پڑھا تھا کہ قواعد مرتب نہیں ہوئے۔ اب رہا تذکیر و تانیث الفاظ کا معاملہ، یہ نظری دھوکا اکثر نقادوں کو ہوا ہے کہ تذکیر و تانیث کے قواعد مرتب نہ تھے۔ مگر یہ غلطی ہے۔ ولی اور ولی کے معاصرین میر اور میر کے معاصرین کے دیوانوں کو ملا لیجئے۔ شاذ و نادر ہی تذکیر و تانیث میں فرق نظر آئے گا ورنہ وہی ایک سی صورت ہے۔ اگر قواعد مرتب نہ تھے تو یہ یکسانی کہاں سے آگئی۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اس قسم کی کتاب بقید تحریر اُسوقت تک نہ پائی جاتی ہو۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قواعد کے رسالے میں بھی تذکیر و تانیث کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت میں بھی اچھی خاصی تشریح موجود ہے۔ پھر یہ ادعا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تذکیر و تانیث کے علمبردار اول ناسخ مرحوم ہیں۔

ناسخ کا ایک احسان یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بندش کی طرز فارسی کے طرز پر قایم کی جس سے مضامین میں وسعت پیدا ہوگئی اور شعر کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ ہوگیا۔

میرے نزدیک اردو کی بنیاد ہی فارسی طرز پر رکھی گئی ہے اور میر و سودا سے پہلے ولی اور سراج دکھنی سب اسی پر چلتے رہے ہیں اور اس سے ناسخ کا کوئی احسان اردو کے سر تھوپنا مقصود ہے۔ قایم نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا ہے ؎

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مضامین عاشقانہ کو کم کرکے ناسخ نے ہر قسم کے مضامین کو شامل غزل کیا جس سے غزل گوئی کے دائرے میں نہایت وسعت پیدا ہوگئی۔

درانحالیکہ یہ خدمت درد، میر و سودا انجام دے چکے تھے، ناسخ نے چوٹی، شانہ اور انگیا وغیرہ کے مضامین یا زیوروں کی فہرست ضرور غزل میں شامل کردی۔

کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کی اصلاح کا دور اگرچہ شاہ حاتم ہی کے زمانے سے شروع ہوگیا تھا اور اس کے بعد ہر زمانے میں تبدیلیاں ہوتی رہیں تاہم ناسخ نے اس ضرورت کو بڑی جامعیت کے ساتھ پورا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ کے اکثر پسند کردہ الفاظ پہلے بھی مستعمل تھے۔ جیسے کبھو کی بجائے کبھی، کسو کی بجائے کسی، بیچ کے بجائے بغل میں، لاگا کے بجائے لگا، دوانہ کی بجائے دیوانہ وغیرہ وغیرہ۔

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ گو ناسخ نے متروکات کا کام شد و مد سے کیا مگر وہ کتنا خود بھی اس سے بری نہیں ہو سکے چنانچہ ذیل کے اشعار ایسے نمونے ہیں لیکن اس خیال سے کہ غلطی کتابت یا زمانہ متروکات کو دخل نہ دیا جائے بعض جگہ دو دو شعر سنداً پیش کروں گا۔

اتنے لئے بجائے اتنے کے لئے ؎ نقد جاں لائی ہے ... اس واسطے — مشتری رکھا ہے نام اتنے لئے برجیس کا

تو بھی مجھ پہ نہیں وہ جیتا اتنے لئے — جانتا ہے بوسہ لوں گا لب سوفار کا

زور - بجائے بہت -	عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتے ہیں شراب	اب تو ناسخ زور رند لاابالی ہو گیا
"	میکشی مجھ سے تو چھوٹا آپ ہے پر زور ہے	سے لایا زاہد بھی کیا ہی زور ہے
نقارا - بجائے نقارہ مشدد -	کیا ہوا اس چوفا کے نے کہ نوبت پائی	دم ہیں مانند حباب اس پہ نقارا اترا
"	ہمیشہ دشمن کی نوبت رحلت ہو	جلد ہو پھول کر اٹھتا ہے حباب
مولد - بجائے مولود یا میلاد -	آج مولد ہے جناب احمد مختار کا	خانہ زاد دہر میں عالم ہوا گلزار کا
" " "	ہے عجب یہ شادی دل سے حیدر کرار کا	ہو مبارک اس کو مولد احمد مختار کا
اضافت ہندی لفظ پر -	فیروزہ جو ہے نام مبارک تو بجا ہے	لاریب نگینِ مہرِ سلیماں ہے یہ گھوڑا
آواز کرنا - بجائے آواز دینا -	سنسان ہے کیا بجرس کا شانہ تیرے	بولا نہ کوئی میں نے کئی بار کی آواز
"	صبح جب صحنِ مسجد میں اذاں ہونے لگی	ہم نے بھی میخانہ کے دروازے پر آواز کی
"	فوجِ غم بھاگ چلی شیشۂ مے لا ساقی	لشکر ابر نے کی طبلِ ظفر کی آواز
دولت - بجائے بدولت -	تیرے ہونٹوں کی دولت مثلِ شربت	ہوا ہے بادۂ گلفام شیریں
انگریز بہ اعلان نون -	دل ناک انگریز میں بیٹھے سے تنگ ہے	رہنا بدن میں روح کو قیدِ فرنگ ہے
فک اضافت	ہے بجائے ناسخ وظیفہ خلق کا	یہ غزل کیا ہے قصیدہ بُردہ ہے
تعیّن - بجائے متعیّن -	پاسبانِ حسن ہے خال اس رُخِ پرنور پر	کرتے ہیں فلفل حفاظت کو تعیّن کافور پر
آشیاں باندھنا - بجائے بنانا -	جا رہا ہے کوئے جاناں میں رقیب رو سیاہ	زاغ نے باندھا ہے اپنا آشیاں گلزار میں
غش لانا - بجائے غش ہونا -	محفل سے اُٹھانے کا جب قصد کیا اُس نے	دالان میں غش لایا تزویر اسے کہتے ہیں
ردیف کو - بجائے کی -	وقفِ بادہ خواری تک یہاں بنیاد ہستی ہے	مرمت ہوتی ہے سیلاب سے کاشانۂ تن کو
اکتفا - بجائے کافی -	ایک تمغۂ جوانمردی ہے ناسخ ترکِ حرص	عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو
نسیم خلد سی - بجائے خلد کی سی -	بنجائیں عطر داں نہ کیوں گوش سامعیں	خوشبو نسیم خلد سی تیرے سخن میں ہے
آپی - بجائے آپ ہی -	اُٹھ گئی جب سے دوئی ناسخ کو کہتا ہے یہی	آپ ہی شاہد ہے آپی رندِ شاہد باز ہے
دوسرا مصرع	نام خدا لیا جو نکیرین کے عوض	مر کر بھی اے صنم مجھے اخفائے راز ہے
زنجیر کرنا - بجائے زنجیر لگانا -	اے وعدہ خلاف ایسی ہی منظور ہے تیری	دروازے کو میں سرِ شب زنجیر نہیں کرتا
مع کارواں	عالم کو تیرے چاہِ زنخداں سے عشق ہے	یوسف بھی اس کنوئیں میں مع کارواں گرا

شیخ ناسخ نے جو متروکات کئے تھے ان کا کوئی پابند نہیں ہوا تھا بلکہ جیسے اہل دہلی میں خال خال قدیم الفاظ نظم ہوتے تھے اُسی طرح لکھنؤ میں۔ اگرچہ یہ سلسلہ مجھے شاہ اختر کے کلام تک نظر آتا ہے مگر کم از کم انکے حریف آتش

کے دو چار شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

میں - بجائے میں نے ۔ بیاباں کو بھی ہنگامِ جنوں میں سیر کر دیکھا — سرِ شوریدہ کو پائے غزالاں پر بھی دھر دیکھا
زور - بجائے عجب بہت ۔ زورِ مردانہ اکھاڑا ہے اکھاڑا عشق کا — چار دن کشتی لڑا جو اس میں وہ رستم ہوا
بھاریاں - بجائے بھاری عہدِ طفلی میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج — بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں
عزیزاں اُس کی رسوائی بھلا مدنظر کیونکر کریں — میرے ماتم میں عزیزاں چشمِ تر کیونکر کریں
مہندی بندھنا ۔ عاجز نہ ہو تصورِ حسن و جمال میں — مہندی بندھی نہیں ترے پائے خیال میں

اسی طرح ان کے تمام معاصرین کے یہاں اس قسم کے اشعار موجود ہیں ۔

اب ذرا دیکھئے کہ ناسخ کی بعض اصلاحات کا کیا اثر ہوا ۔ دہلی میں فعل کو اسم کا تابع مانکر فعل کو بھی اسم کے مطابق بنا لیتے ہیں ۔ مثلاً روٹی ۔ اسم مونث ہے ۔ جب کھانے کا مصدر اسکے ساتھ استعمال کریں گے تو یوں بولیں گے مجھے روٹی کھانی ہے لیکن ناسخ مرحوم نے اس کلیہ کو توڑا اور یہ سوچا کہ مصدر کو ہمیشہ یکساں حالت میں رہنا چاہئے خواہ اسم مونث ہو ۔ انھوں نے دہلی کی تقلید سے آزاد ہوکر کہنا شروع کیا ۔ مجھے روٹی کھانا ہے ۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے وغیرہ وغیرہ قاعدہ تو جاری ہوگیا ۔ مگر اس سے ایک زبردست خرابی یہ پیدا ہوگئی کہ مستورات بھی تذکیر کے صیغے استعمال کرنے لگیں اور واحد کے بجائے جمع بولی جانے لگی ۔ مثلاً ایک عورت کہتی ہے کہ ہم آئے تھے ۔ اُس کی بجائے میں آئی تھی ۔ لکھنؤ میں بہت کم بولا جاتا ہے ۔ دہلی میں صرف جمع کی صورت میں ہم آئیں تھیں بولتے ہیں ۔

اُنھوں نے اُن تمام الفاظ کو جس سے نسائیت پر کوئی ضرب لگتی تھی قریب قریب ترک کر دیا اور اُن الفاظ کی بجائے غیر فصیح اور پوربی الفاظ کو جگہ دے کر زبان کو غیر فصیح بنا دیا ۔

دلی سے آنے والے الفاظ کو چھوڑ کر یا بھولکر ان جگہ پوربی یا نہ معلوم کہاں کے الفاظ رکھدئے ۔ مثال کے طور پر چند الفاظ ملاحظہ ہوں :-

لکھنؤ	دلی	لکھنؤ	دلی
کنکوا	پتنگ - گڈی	سیند	پہتوا
تیمت	پچول	چڈا	چیڑا
بھیڑیا	دریائی	کھٹیا	ریوڑی
لوکی	دراز گھیا - گھیا	گرچ	گلو
تبوڑی	بسول	ٹیا	شیٹھا
کلھنے	نقشے	ریتی	پٹھا

لکھنؤ	دلی	لکھنؤ	دلی
ہنسیا	درانتی	سبتیا	سوجھتا
کچالو	چاٹ	گُھلنا	پگھلنا
کنورو	کنڈوری	چٹکی	بُرکی
گڑھنا	گھڑنا	کڑواہٹ	تیزی مرچ کی
بھل	بل	کیل	لونگ
چھچھوندر	چھچوندر	بُھراہا	بُھیرا
گوہانجنی	انجنہاری		

...ی طرح ہزاروں الفاظ بدل کر نہ معلوم کیا سے کیا ہوگئے۔ اہل لکھنؤ عام طور سے کہتے ہیں کہ اب مرکز زبان لکھنؤ ہے اور اس کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ ناسخ نے زبان میں تراش وخراش کرکے اس کو صاف کردیا۔ اس کی حقیقت تو ظاہر ہوچکی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دلی میں کچھ باقی نہ تھا بلکہ وہاں کے تمام اہل زبان یہاں آگئے تھے لیکن یہ وجہ بھی درست نہیں۔ میر، سودا، جرأت، انشا، مصحفی، میر سوز وغیرہ یقیناً دلی سے یہاں آگئے تھے مگر پھر بھی بہت سے شعراء ایسے ملیں گے جو وہیں رہے اور کسی طرح انھوں نے دہلی کا چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ صرف شعراء ہی تمام زبان کے ذمہ دار یا محافظ نہیں ہوتے۔ ہزاروں اہل فن ایسے تھے جو وہیں رہے اور اُن میں کا کوئی فرد یہاں نہیں آیا۔ لکھنؤ کی زبان جب تک دہلی کے نقش قدم پر چلی ترقی کرتی رہی۔ مگر جب وہ ناسخ کے اختراع وتصنع کے جال میں آئی اُس کی ترقی بند ہوگئی۔

مفتش

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت
کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری تا دسمبر ۳۸ء شایع ہوچکی ہے اُس کے کچھ فارم زاید چھپوا لئے گئے تھے۔ چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں، لیکن فایل کے علاوہ تاریخ علحدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، و نیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کرسکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مع محصول عہ/ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اشتمالیت جمہوریت کی روشنی میں

پرستاران اشتمالیت مصر ہیں کہ تاوقتیکہ نظام معاشرت سے بلند و پست، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق نہ مٹا دی جائے جمہوری نظام قطعی ناممکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "ریاست کے اندر متضاد طبقوں کے وجود کے یہ معنے ہوں گے کہ ان میں سے ایک ہی طبقہ برسر اقتدار ہوگا اور دوسرے کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ وہ محکوم رہے اور اس طرح جمہوریت کا یہ دعوے کہ وہ عوام کے ذریعہ سے، عوام کے لئے، عوام کی حکومت ہے بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تاوقتیکہ جمہوری حکومت کے ساتھ معاشرت کا نظام بھی اشتمالی نہ ہو حقیقی معنوں میں جمہوریت ناممکن ہے۔" ظاہرا معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں اکثریت ہی برسر اقتدار رہا کرتی ہے اور اقلیتیں سوا خاموش بیٹھے رہنے یا لایعنی باتیں بنانے کے اور کچھ نہیں کر سکتیں۔

برخلاف اس کے اشتمالیت کا نصب العین اکثریت اور اقلیت کے سوال کو بالکل فنا کر دیتا ہے۔ کیونکہ ریاست سے حاکم و محکوم کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ پوری ریاست میں فقط ایک ہی جماعت رہ جاتی ہے اور کل افراد ریاست کا مطمح نظر ایک ہی ہو جاتا ہے۔

لیکن فطرت انسانی پر نظر رکھتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ طبایع انسانی میں اتنی یکجہتی پیدا ہو جائے قرین عقل نہیں معلوم ہوتا اور جمہوریت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جمہوریت و اشتمالیت ایک دوسرے کی معاون ہی نہیں بلکہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہے صداقت سے عاری نظر آتا ہے۔

اس لئے مناسب ہے کہ پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ جمہوریت کے کیا معنی ہیں اور آیا جمہوریت و اشتمالیت دونوں ایک ہی ہیں یا درحقیقت اشتمالیت جمہوریت کے لئے پیام موت ہے۔

جمہوریت دنیا کے لئے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ افلاطون اور ارسطو سے لیکر اسوقت تک جمہوریت پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ریاستوں پر اس کے عملی تجربے بھی اسی وقت سے جاری ہیں۔ ارسطو ہی کے زمانہ میں یونان کی شہری ریاستوں میں جمہوری حکومتیں موجود تھیں۔ لیکن اس کے بعد ایک زمانہ تک انسان جمہوریت کی طرف کوئی عملی قدم نہ بڑھا سکا۔ بڑی بڑی ملوکانہ حکومتیں قایم ہوئیں اور

صدیوں تک یہی سلسلہ جاری رہا - حتیٰ کہ روم اور فارس کی سامراجی ریاستوں کے کھنڈروں پر اسلام نے اپنی جمہوریت کی بنیاد رکھی - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جمہوریت اسلامی تعلیمات کا اثر تھی، بلکہ یہ نتیجہ تھی ایامِ جاہلیت کے عرب روایات کا - چنانچہ جوں جوں اسلامی فتوحات وسیع ہوتی گئیں مسلمان جمہوریت سے دور ہوتے گئے - عباسی حکومت تو تمام و کمال روم اور فارس کی حکومتوں کے انداز پر تھی - لیکن جہاں تک نظامِ معاشرت کا تعلق ہے جمہوریت برابر ترقی کرتی جا رہی تھی اور اس لحاظ سے بیشک اسلامی خدمات بہت نمایاں ہیں -

موجودہ دور کی جمہوریت کا تعلق براہ راست انگلستان سے ہے - تقریباً ہزار صدی تک بیرونی حملہ سے محفوظ رہکر تدریجی رفتار سے انگلستان نے پایدار ترقی کی جو مثال پیش کی ہے اس کی نظیر دوسری جگہ ملنی محال ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگلستان کی خاک میں کوئی ایسا اثر تھا یا وہاں جو لوگ آباد ہیں ان میں کوئی خاص خوبی ہے - جمہوریت ہو یا دوسری کوئی چیز کچھ نہ کچھ ہر قوم اور ہر فرد میں اس کا شائبہ موجود رہتا ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو مناسب موقع مل گیا اور کسی کو نہیں - انگلستان کی جغرافیائی حالت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک جزیرہ ہونے کی وجہ سے بیرونی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ کر بھی دنیا سے بالکل علحدہ نہ رہ سکا اور نئے نئے خیالات اور نئی نئی تحریکات سے ہمیشہ اثر پذیر ہوتا رہا اور چونکہ ملک کی اندرونی حالت بھی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں غیر متموج رہی ملک تدریجی رفتار کے ساتھ ترقی کرتا رہا -

جمہوریت جس کا ایک ہلکا سا عکس انگلستان کے قدیم (Village & Parish moots) میں موجود تھا زمانہ کے ساتھ رنگ پکڑتا گیا - اگرچہ اس کی رفتار ہمیشہ ہموار نہیں رہی اور مد و جزر برابر ہوتے رہے لیکن اتنا ضرور تھا کہ دن بہ دن اس کا زور بڑھتا گیا - ۱۶۴۲ء کی خانہ جنگی اور ۱۶۸۸ء کے پرامن انقلاب کے بعد انگلستان میں جمہوریت کے قدم اچھی طرح جم گئے اور مطلق العنانی کا ایک طرح سے خاتمہ ہوگیا - اٹھارویں صدی میں جمہوریت انگلستان سے نکل کر امریکہ اور فرانس میں پہونچ اور صرف اتنے ہی پر حد نہیں ہوئی بلکہ پورا یورپ جمہوریت کے لئے بیقرار نظر آنے لگا - ۱۸۴۸ء کے انقلاب کو صحیح معنوں میں جمہوریت اور ملوکیت کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ کہا جا سکتا ہے - اگرچہ اس کے بعد بھی یورپ سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں ہوا پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ متمدن دنیا سے ملوکیت کے کوچ کا نقارہ بج گیا اور حکومتوں پر عوام برسر اقتدار نظر آنے لگے جنگ عظیم کو بھی جمہوریت و ملوکیت کی جنگ کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم کے بعد دنیا کی تمام بڑی بڑی ریاستوں میں ملوکیت نام کو بھی نہیں رہ گئی - لیکن اس کے بعد ہی ایک دوسری چیز جمہوریت کی حریف بن کر آکھڑی ہوئی اور اسوقت تک اتنی تیزی سے زور پکڑتی جا رہی ہے کہ اکثر جمہوریت کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے - اس نئی قوت کے نام مختلف ممالک میں مختلف ہیں - لیکن درحقیقت ہر جگہ اس کی غرض و غایت ایک

ہی ہے۔یعنی عوام کی آزادی سلب کرکے ایک شخص یا ایک پارٹی کا برسرِ اقتدار ہوجانا۔کہیں اسے فاسزم کہتے ہیں، کہیں ناززم اور کہیں بولشوزم اور ہر جگہ اس کا آلۂ کار بھی ایک ہی ہے۔یعنی شخصِ واحد یا ایک منظم جماعت کی مطلق العنانی۔

جمہوریت کے معنی ہیں کہ عنانِ حکومت عوام کے ہاتھ میں آجائے اور حکومت کا ہر کام عوام کے مشورہ سے، عوام کے ہاتھوں اور عوام کے فایدہ کے لئے کیا جائے۔

یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کا یہ قاعدہ تھا کہ ریاست کے تمام اُمور براہ راست عوام ہی کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔جب ضرورت ہوتی سارے شہر میں منادی کرا دیجاتی اور کل شہری جمع ہوکر بحث و مباحثہ کے بعد اتفاق رائے سے کچھ فیصلہ کردیتے۔جس پر عمل کیا جاتا۔یہ ضرور تھا کہ اُمور سلطنت کی انجام دہی کے لئے کچھ مستقل ملازمین ہوا کرتے تھے۔لیکن ان کا تقرر بھی جمہوریت ہی کرتی تھی۔اس طرح کی جمہوریت کا امکان آجکل کی ریاستوں میں نہیں ہے کیونکہ اب ریاست اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ سارے کے سارے افراد کا ایک جگہ پر مجتمع ہوجانا ناممکن ہے۔موجودہ زمانہ میں اس طرح کی صرف چار ہی حکومتیں موجود ہیں۔جو سوئیزرلینڈ میں واقع ہیں اور رقبہ کے لحاظ سے بھی قدیم یونانی ریاستوں سے زیادہ نہ ہوں گی۔

اس قسم کی جمہوریت (Direct Democracy) کہی جاتی ہے۔مروجہ جمہوریت کو (Representative Government) کہتے ہیں اس کا قاعدہ یہ ہے کہ عوام اپنے نمایندے منتخب کرلیتے ہیں جن کا کام ملک کے لئے قوانین وضع کرنا ہوتا ہے۔انھیں نمایندوں میں سے نظم و نسق سلطنت کے لئے بھی کچھ لوگ چنے جاتے ہیں جنھیں کابینہ کہتے ہیں۔عام دستور یہ ہے کہ پہلے کابینہ کا صدر منتخب کرلیا جاتا ہے۔جو اپنی مرضی کے مطابق نمایندوں میں سے اپنی کابینہ منتخب کرتا ہے۔صدر کا انتخاب انگلستان میں بادشاہ اور فرانس میں صدر جمہوریہ کرتا ہے عموماً صدر وہی ہوتا ہے جس پر اکثریت والی جماعت کو اعتماد ہو۔(امریکہ کا قاعدہ اس سے کچھ مختلف ہے۔وہاں صدر جمہوریہ ہی کابینہ کے صدر کی خدمت بھی انجام دیتا ہے اور اس کی کابینہ کے ارکان عوام کے نمایندوں میں سے نہیں لئے جاتے بلکہ صدر اپنی مرضی کے مطابق ان کا انتخاب کرتا ہے۔

انتظام ملک کی ذمہ داری کابینہ ہی کے سپرد ہوتی ہے اور اس کا تقریباً ہر رکن حکومت کے کسی نہ کسی شعبے کا صدر ہوا کرتا ہے۔لیکن ارکانِ کابینہ یا تو فرداً فرداً یا اجمالاً مجلسِ نمایندگان کے سامنے اپنے اقوال و افعال کے لئے جواب دہ ہوتے ہیں اور اسی مجلس کو ہر وقت اختیار رہتا ہے کہ ارکانِ کابینہ سے بازپرس کرے اور اگر ضرورت سمجھے تو انھیں برطرف بھی کردے۔یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ جس طرح ارکانِ کابینہ مجلس نمایندگان کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اسی طرح مجلسِ نمایندگان بھی عوام کے سامنے جواب دہ ہے

ان کو اپنے ہر قول و فعل کے لئے عوام کی خوشنودی درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام ناخوش ہو گئے تو آیندہ کے لئے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ قوم کی نظروں میں وہ ذلیل ہو جائیں گے اور پھر ان کے ذمہ کوئی ملکی کام نہیں کیا جائے گا۔ یہاں پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ امریکہ میں ارکان کابینہ مجلس نمایندگان کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے ان کا تعلق براہ راست صدر سے ہوتا ہے۔ صدر ہی ان سے باز پرس کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو انھیں برطرف بھی کر سکتا ہے) چونکہ اس قسم کی جمہوریت پر عوام کا قبضہ براہ راست نہیں ہوتا اور عوام نمایندوں کے وسیلے سے حاکم ہوتے ہیں اسے (Indirect Democracy) بھی کہتے ہیں۔

جمہوریت کے اس ڈھانچہ کو پیش نظر رکھ کر آئیے اب اس کے دعوؤں پر غور کریں اور دیکھیں کہ افراد جو توقعات اس سے رکھتے ہیں اور شخصی آزادی کی امیدیں جو اس سے بندھ گئی ہیں، در حقیقت انسان کے لئے فایدہ بخش بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر مفید ہیں تو کسی دوسری حکومت میں بھی ان کا امکان ہے یا نہیں؟ اشتمالیت کے ساتھ بھی ان کا نباہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

پہلی چیز جس کا وعدہ جمہوریت کرتی ہے وہ آزادی ہے۔ ایک جمہوری حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد کو گفتار، کردار، تخیلات کی کامل آزادی دے۔ عوام کو اختیار ہو کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں کریں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان کی آزادی دوسروں کی آزادی کے ساتھ متصادم نہ ہو جائے اور اگر ایسا نہیں ہے تو جمہوریت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ محض قیام امن اور ملک و قوم کی ترقی تو ہر حکومت کی غرض ہوتی ہے۔ جمہوریت کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام الناس کو اس طرح کی تعلیم دے، کہ ان کی ذہنی اور دماغی ترقی معراج کمال تک پہنچ جائے اور ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ رموز سلطنت تک پیش پا افتادہ چیزیں معلوم ہونے لگیں۔ لیکن تاوقتیکہ عوام کو کامل آزادی میسر نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ اس آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں بہت سی پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ انسانی طبایع کا اختلاف ہے۔ انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ مشکل سے دو آدمیوں کی رائیں آپس میں متفق ہوتی ہیں اور اگر انھیں من مانی کرنے کا موقع دیا جائے تو نظم و نسق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس برائی سے بچنے کا دوسری حکومتوں میں صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ شخصی آزادی پر کافی حد تک پابندیاں عاید کر دی جائیں، لیکن جمہوریت اس کی بجائے خود عوام کے ہاتھوں میں حکومت کی ذمہ داری دے کر اس خامی کو خوبی میں بدل دینے کا ذمہ لیتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فرد کو آزادی اسی حد تک ملتی ہے کہ دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہو۔ مزید براں حکومت میں اپنا پلہ بھاری کرنے کے لئے ہر شخص ان اشخاص کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے جن کے خیالات زیادہ سے زیادہ اس کے جیسے ہوتے ہیں۔ اس طرح شخصی آزادی کافی

حد تک جماعتی آزادی میں مبدل ہو جاتی ہے۔ پوری قوم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور کئی منظم پارٹیاں قایم ہو جاتی ہیں کامیاب جمہوریت کے لئے ان مختلف اور متضاد پارٹیوں کا وجود از بس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک جماعت جو منظم اور برسرِ اقتدار ہوگی (افراد کا تو ذکر ہی فضول ہے) دوسری جماعت کو فنا کر دیگی کیونکہ بہر حال ملک میں مختلف الخیال لوگ تو رہیں گے ہی۔ ہاں حکومت انھیں منظم ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ مثال کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں روس، اٹلی اور جرمنی کی اندرونی حالت کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ان ممالک میں حاکم جماعت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ وہ افراد اور جماعتیں جن کے خیالات ان سے مختلف ہیں عالمِ جانکنی میں سسکیاں لے رہی ہیں، اور ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن جمہوریت میں چونکہ ہر شخص اپنے جیسا کرنے کے لئے مختار ہوتا ہے آسانی سے بہت سی منظم پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ اسی لئے حکومت کسی خاص جماعت کی ملکیت نہیں ہو جاتی اور حکومت پر ہر جماعت کا تقریبًا مساوی اثر رہتا ہے۔ حکومت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جو کچھ کرے کثرتِ آرا سے کرے اور سبھوں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے۔

یہ ضرور ہے کہ مطلق العنانی یا اشرافیت (ارسٹاکریسی) کے مقابلہ میں جمہوریت نہ تو اپنے اقدام میں کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ اُس حسن و خوبی سے انھیں انجام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے یہاں کارآزمودہ لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت نہیں ہوتی اور نہ یکجہتی و استقلال کا امکان ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جمہوریت کی یہ غرض بھی نہیں ہے، جمہوریت یہ قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہے کہ حکومت کا مقصد محض نظم و نسق کی آراستگی اور پیراستگی ہے۔ اس کا مقصد تو عوام الناس کو آراستہ و پیراستہ بنانا ہے، انھیں اس طرح کی تعلیم دینا ہے کہ یہ حقیقی معنی میں انسان بن جائیں اور بیشک اس لحاظ سے جمہوریت کا مقابلہ کوئی دوسری حکومت نہیں کر سکتی ہے۔ فی نفسہٖ حکومت انسان کا مقصودِ حیات نہیں ہے بلکہ یہ بھی کسی منزل تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے

جمہوریت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ اشتمالیت کی طرح کل افرادِ قوم کو ایک ہی درجہ پر لا کر کھڑا کر دینے کی کوشش نہیں کرتی۔ بلکہ ہر فرد کو ترقی کے لئے مساویانہ موقع دیتی ہے۔ کسی پر محض اس لئے کہ وہ کسی مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے کوئی راستہ بند نہیں کرتی۔ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ حکومت اس کی مدد کے لئے ہمیشہ حاضر رہتی ہے۔ یہ بڑھے ہوؤں کو گھٹانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کی کوشش گھٹے ہوؤں کو بڑھانا ہے اور تا وقتیکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کا یہ مساویانہ حق حکومت نہ تسلیم کرلے صحیح معنوں میں جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی ہے اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آئیں گے۔ امریکہ میں اگر آج دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات اور

خاندانی شرافت کا بُت لوگوں سے ابتک سجدۂ عبودیت وصول کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ اجتماعیت کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قائم ہو جائے جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے، گارنر (Garner) کا یہ قول بہت درست ہے کہ "جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام۔ معاشرتی حالت اور ذہنی تخیل ہے"۔

اشتمالیت اور جمہوریت کی بحث میں عموماً لوگ اس ذہنی مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چونکہ جمہوریت ایک سیاسی نظام ہے اور اشتمالیت ایک معاشرتی حالت ہے دونوں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہو سکتے اشتمالیت جس طرح ایک جمہوری حکومت میں ممکن ہے، اسی طرح ایک مطلق العنان حکومت میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ اشتمالی معاشرت میں جمہوری حکومت نوزائیدہ نہ کہی جائے گی، لیکن جمہوریت کے شرائط پر نظر غایر ڈالنے کے بعد یہ مغالطہ بآسانی دفع ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کے لئے افراد کی آزادی سب سے ضروری شرط ہے، برخلاف اس کے اشتمالیت میں افراد کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ اشتمالی معاشرت کا پہلا کام یہی ہوتا ہے کہ فرد کی آزادی کو ختم کر دے اور یہ محض اسلئے کہ جمیع افراد معاشرت مساوی درجہ پر آجائیں، کیونکہ اشتمالی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انسانی طبائع کی فطرت، یکساں نہیں ہوتی اور تاوقتیکہ انھیں ایک راستے پر نہ لگایا جائے مساوات ہو بھی نہیں سکتی ہے۔ جمہوریت کے لئے بھی مساوات ضروری چیز ہے۔ لیکن یہاں برابری کے وہ معنی نہیں لئے جاتے جو اشتمالی لیتے ہیں۔ جمہوریت مساوات کی قایل ہے تو بس اسی حد تک کہ افراد معاشرت ایک نگاہ سے دیکھے جائیں اور سبھوں کے حقوق مساوی طور پر تسلیم کئے جائیں، قوی وضعیف، امیر و غریب کا توازن برابر کرنے کے لئے یہ کسی ایک کو گھٹانے یا بڑھانے کی قایل نہیں ہے۔ بلکہ فطرتِ انسانی کے فرق کو موزوں و مناسب گردانتے ہوئے اگر ایک طرف یہ ضعیف کے ترقی کے راستے کو صاف کرتی ہے تو دوسری طرف قوی کو بھی قوی تر ہونے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ لیکن اشتمالیت میں مساوات کے معنی اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہ مساوی حقوق دینے کی قایل نہیں ہے بلکہ اس کا مسلک عوام کی حق تلفی کر کے کسی کو کچھ زیادہ اور کسی کو کچھ کم دیکر سبھوں کو ایک مساوی سطح پر لاکر کھڑا کر دینا ہے۔ اشتمالیت میں مساوات مساوات کی چیخ صرف عوام کو فریب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ ورنہ یہاں نہ آزادی ہے اور نہ مساوات اگر ہے تو صرف یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو معاشرت سے مختلف اور متضاد طبقوں کا خاتمہ کر دیا جائے محض معاشرت ہی معاشرت رہ جائے اور ہوبس (Hobes) کا عینی لویاتھن (Levayathan) عالم تخیلات سے نکل کر عالم موجودات میں آجائے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ مساوات کے وہی معنی صحیح ہیں جو اشتمالی لیتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ آزادی جو جمہوریت کی روح ہے مساوات کی ضد ہے اور دونوں دوش بہ دوش نہیں چل سکتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اشتمالیت جمہوریت کے بالکل برعکس ہے۔ لیکن اشتمالی خوب جانتے ہیں کہ اگر وہ اس حقیقت کو قبول کر لیں تو یہ اپنے ہاتھ سے اپنے موت کے فیصلہ پر دستخط کرنے کے مصداق ہوگا۔ کیونکہ ایک System کی حیثیت سے دنیا ابتک جمہوریت کا بدل نہیں پیش کر سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو مساوات کے معنی میں توڑ مروڑ کی حاجت پیش آتی ہے اور کبھی یہ کہکر دھوکہ دیا جاتا ہے کہ "متضاد طبقوں کا وجود جمہوریت کے منافی ہے اور چونکہ اشتمالیت معاشرہ سے مختلف طبقوں کو فنا کر دینے کا ذمہ لیتی ہے یہ اور جمہوریت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں"

لیکن ان سے کون کہے کہ جمہوریت کے لئے آزادی جتنی ضروری ہے اتنا ہی اہم مختلف پارٹیوں کا وجود بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کو پارٹی گورنمنٹ بھی کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں مخالف جماعت کے صدر کو حکومت مشاہرہ تک دیتی ہے اور یہ سمجھ کر دیتی ہے کہ جمہوری حکومت کے لئے مخالف جماعت ازبس ضروری ہے۔

گلاب چند

خواب کی دُنیا

از

عبدالمالک آروی

آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص، خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر بہترین تصنیف مغربی اور مشرقی ادبیات کا دلچسپ اور مفید مجموعہ، زبان شگفتہ، انداز بیان محققانہ، اس کے پڑھنے کے بعد آپ خواب کے بہت سے معمے حل کر سکیں گے، اس میں ڈاکٹر فرائڈ کی تصویر و حالات زندگی اور پیش لفظ حضرت نیاز مدظلہ بھی شامل ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ - مجلد عاہ - اراکین ادارہ سے صرف عہ اور عہ -

پتہ :- معتمد اعزازی طاق بستاں آرہ

اُردو نثر سو سال میں کیا سے کیا ہوگئی

کس طرح سے مانئے یار دکہ یہ عاشق نہیں رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا،
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

میر کا زمانہ اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے تھا اور انشا کا سوا سو برس پہلے۔ دہلی اور لکھنؤ میں دونوں رہ چکے تھے اور دونوں میں ملاقات اور بات چیت بھی ہوئی تھی۔ اسوقت دنیا میں نہ گراموفون ایجاد ہوا تھا نہ ریڈیو نہیں تو آج آپ میر اور انشا کی بولیاں بھی ریڈیو سے سُن لیتے۔ اب سے ڈیڑھ سو برس بعد کے لوگ آج کی ہندستانی زبان اُن ریکارڈوں کے ذریعہ سے سُن سکیں گے جو آج بن گئے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے اُن کے زمانہ کی اور ہمارے آپ کے زمانہ کی بھی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں ہوں گی۔ سائنس کی ایجادوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ انگلستان، اور آئس لینڈ سے جاپان اور فارموسا کے جزیروں کو اور ناروے ڈنمارک سے لیکر آسٹریلیا اور افریقہ تک اتنی لمبی چوڑی دھرتی کو جیت کر اپنی مٹھی میں کر لیا بلکہ وقت اور زمانہ گزرنے کے باوجود بھی زندہ رکھ سکیں گی اور ایک صدی کو دوسری صدی سے ایک جُگ کو دوسرے جُگ سے ملا دیں گی۔

نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ یہی موت ہے یہی زندگی جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہے وہ بقا بھی ہے

میں اپنے بچپن میں یہ تو دیکھتا تھا اور اس لئے سمجھتا بھی تھا کہ ایک دیس سے دوسرے دیس میں جاکر یا ہمارے لمبے چوڑے دیس میں ایک صوبے سے دوسرے صوبہ میں جاکر بولی بدل جاتی ہے اور ہر جگہ کی الگ بولی ہوتی ہے اور ہر بولی زبان۔ بھاشا میں نثر اور نظم ہوتی ہے اور کہیں کہیں ایک ہی بولی کی کئی بولیاں بن جاتی ہیں جیسے اودھ کے لوگوں کی ہندستانی، پورب میں غازیپور، بلیا اور بہار کے لوگوں کی ہندستانی یا پوربی ہندی اور کانپور، اٹاوہ، آگرہ میرٹھ، سہارنپور اور دہلی کے لوگوں کی ہندستانی یا پچھمی ہندی، برج بھاشا اور راجپوتانہ کی ہندستانی۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو لوگوں نے مجھسے کہا کہ ہر پانچ میل پر بولی بدل جاتی ہے۔ میرا دھیان بعد کو اس طرف بھی گیا کہ جہاں ایک جگہ کے رہنے والے عام طور سے ایک بولی بولتے ہیں وہاں بھی ہر ذات اور ہر پیشے کے لوگوں کی بولی میں کچھ نرالا پن ہوتا ہے، ان کے کچھ خاص محاورے ہوتے ہیں اور کچھ اپنے لفظ ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کچھ گھرانوں اور کچھ لوگوں

کی اپنی بولی بھی ہوتی ہے پتا ہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہو چکا ہے گزرے ہوئے زمانہ کی بولی کی یادگار ہو یا ممکن ہو کسی اور بھاشا کی پرچھائیں ان کی بولی پر پڑ رہی ہو۔ ابھی ایسے لوگ ہمارے صوبے میں موجود ہیں جو بھانجے کو بہن بیٹیا، ہمارے پاس کو ہم پاس اور ہمارے کنے کہتے ہیں کبھی کو کبھو کہتے ہیں پانی پینے اور سگریٹ پینے کو جل کھانا یا سگریٹ کھانا اور منہ چومنے کو چُمّا کھانا بولتے ہیں۔ گھوڑوں کو گھوڑا لوگ پیڑوں کو پیڑ لوگ اور ہاتھی کے بچے کو ہاتھی کا بلا بولتے ہیں۔ حالی کا ایک شعر ہے :۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس کے دوسرے مصرع کا مطلب ایک صاحب نے یوں فرمایا کہ ابھی بڑا بڑا لوگ پڑا ہے۔ میر انیس نے بارہا مجلس پڑھتے ہوئے کہا کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے۔ آزاد نے مصحفی کی زبان کے امروہہ پن کا ذکر کیا ہے۔ حفیظ جونپوری کہتے ہیں :۔

تقلید لکھنؤ کی جو کرتا ہوں میں حفیظ، غیرت پکارتی ہے کہ اپنی زباں رہے

اخبار کو کاغذ کہتے ہیں۔ لفظوں کے چناؤ میں لفظوں کے مطلب میں لفظوں کی آواز میں بھی لوگوں کی بولیوں میں بڑا بھید ہے۔ بہار میں بولتے ہیں آپ کے شامل بڑھنا ہے کسی اور جگہ کے لوگوں میں شامل کا یہ استعمال نہ دیکھا نہ سنا۔ مجھ سے اصغر گونڈوی نے کہا کہ ایک شعر میں انھوں نے پنپنے کا لفظ لکھا تھا ان کے اُستاد تسلیم لکھنوی نے فرمایا کہ پنپنا ہماری زبان کا لفظ ہی نہیں ہے اس کی جگہ پر انھوں نے لہلہانا تجویز کیا مگر اقبال کا مصرع ہے :۔

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہ سب دیکھتے سنتے ہوئے بھی میں اپنے لڑکپن میں ایک بات نہیں سمجھا تھا یا کم سمجھا تھا وہ یہ کہ جگہ کے ساتھ ساتھ زمانہ بھی ہماری بولی ٹھولی کو بدل دیتا ہے ہاں ہر پانچ میل کی طرح ہر پانچ برس میں تو یہ اُلٹ پھیر پیدا نہیں ہوتی لیکن سو برس تک مشکل ہی سے کوئی زبان بے کچھ بدلے ہوئے رہ سکتی ہے۔ اور خاصکر اُردو ایسی ملی جلی ہوئی زبان جس کی رنگا رنگی شروع ہی سے مشہور تھی جو اپنے جنم دن سے انقلاب کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی اور جس نے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں آنکھیں کھولی تھیں وہ اُردو جو نہ صرف بادشاہوں، راجاؤں مہاراجاؤں کی بولی تھی نہ پنڈتوں یا عالم فاضل لوگوں کی، نہ صرف امیروں کی نہ صرف غریبوں کی بلکہ سب کی بولی تھی۔ سیکڑوں طرح کے پیشہ والوں سیکڑوں طرح کے مزاج والوں سیکڑوں ہزاروں طرح کے خیال اور بچار رکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن اور آواز کی لوچ سے بنائی رچائی اور سجائی جانے والی اُردو اور زمانہ کی طرح رنگ بدلنے والی اُردو۔

پچھلے سو برسوں کے اندر گنگا جمنا اور گومتی کے پلوں کے نیچے سے بہت کچھ پانی بہ چکا اور اس عرصے میں

یہ پرانا ہندوستان کیا سے کیا ہو گیا۔ اور ہماری اردو بولی اور اردو نثر بھی کیا سے کیا ہو گئی۔ میں نے لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پہلے کا کہا ہوا ایک شعر میر کا اور ایک شعر انشاء کا آپ کو سنانا تھا۔ ان کو سن کر ہمارے کانوں کو یہ وشواش ہوتا ہے کہ جو اردو بولی آج ہے وہی اردو بولی تب بھی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے جیسے آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے ولی کا یہ شعر ہے۔—

مفلسی سب بہار کھوتی ہے   مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اسے سنکر تو یہ دھوکا اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اردو زبان اور بولی ہمیشہ ایک ہی سی رہی ہے۔ لیکن یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اگر آپ انشا کی لکھی ہوئی رانی کیتکی کی کہانی نثر میں پڑھیں۔ غزل میں ہزاروں جگہ پر انشاء وہی بولی بولتا ہے جو آج کی ہے لیکن اس کہانی میں دوسری بولی ملتی ہے اور یہاں انشا کی آواز ہماری آواز سے نہیں ملتی۔ شاعری کی زبان میں وہ کس بل اور وہ سدا بہار اور سدا سہاگ نکھار ہوتا ہے کہ عام طور پر نثر کی زبان سے وہ زیادہ پرانی اور زیادہ نئی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی بولی میں دو حصے ہوتے ہیں ایک حصہ وہ ہے جو نہیں بدلتا یا بہت کم بدلتا ہے دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جاتا ہے۔ جیسے میر کے شعر کے اس ٹکڑے میں "ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا"۔ "ٹک" کا لفظ بعد کو ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ ذرا کا لفظ آ گیا۔ میر اور انشا اور ان سے پہلے کی بھی اردو شاعری میں اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جسے آج کی زبان کہہ سکتے ہیں لیکن اس وقت کی نثر میں بہت ہی کم حصہ ایسا ہے جسے آج کی زبان کہہ سکیں۔ کسی زمانہ کی نثر میں اس زمانہ کی بولی کے وہ حصے زیادہ کام میں لائے جاتے ہیں جو بدل جانے والے ہیں۔ نثر زیادہ تر ایک زمانہ کی چیز ہوتی ہے اور شاعری ہر جگ کی چیز ہوتی ہے۔ کسی نثر لکھنے والے کو بڑی تقدیر سے ایسی زبان نصیب ہوتی ہے جس کے پھول جلد نہ کمہلا جائیں اور جن کی بو باس اور جن کا رنگ روپ سدا بہار ہو۔ سعدی کی گلستاں ایسی ہی چیز ہے اور غالب کے اردو خط جن کی نثر سو برس پرانی ہو چکی ہے ان میں بھی آج ہی کی بولی تھوڑی سنائی پڑتی ہے۔ شعر کی زبان کا دور تک پہونچنے کا بھید اس کی پابندیوں میں ہے:-

اہل جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں   دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

اور نثر کی زبان کا بظاہر وسیع تر ہونے کے باوجود بھی دور تک نہ پہونچنے کا بھید اس کی آزادیوں میں ہے:-

رک گئی راہ جنوں راہ کی آسانی سے   ہائے وہ وسعت صحرا بھی جو زنداں ہو جائے

قریب ڈیڑھ دو سو برس تک امیر غریب سب نے اردو شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا بادشاہوں اور رئیسوں کے درباروں سے دل کھول کر شاعروں اور شاعری کی سرپرستی ہوتی رہی۔ نثر کی قدر و قیمت کو پہچاننا دنیا کی ہر قوم نے بعد کو سیکھا۔ یوں تو جب پہلے پہل انسان کچھ بولا ہوگا تو نثر ہی میں بولا ہوگا لیکن اس فطری عمل کو جب

انسان نے آرٹ کے سانچے میں ڈھالنا چاہا تو کلام موزوں یعنی شاعری کا سہارا لیا۔ اس لئے زندگی کی تاریخ میں تو پہلے نثر آئی لیکن آرٹ کی تاریخ میں پہلے نظم آئی۔ یوں سمجھئے کہ انسان کو کھڑا ہونا اور چلنا تو پہلے آیا لیکن اس فعل کو جب اس نے آرٹ بنانا چاہا تو پہلے اس نے ناچنا سیکھا۔ ناچنے کے بعد کہیں شوخی رفتار اور سبک رفتاری کی نوبت آتی ہے۔ انگلستان میں تو بیکن اور ڈاکٹر جانسن انگریزی نثر نگاری کے بادشاہ ہوتے ہوئے بھی لاطینی نثر پر مٹے ہوئے تھے انھیں خود اپنی تحریروں کی قدر و قیمت نہیں معلوم تھی۔

اُردو نثر کو کسی لائق بنانے کا سہرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے سر ہے۔ جناب رام بابو سکسینہ نے اُردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کو اُردو کا ابوالنثر (Father of Urdu Prose) کہا ہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اب سے قریب ایک سو چالیس برس پہلے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی نثر کی داغ بیل ڈالی گئی اور ایک ہی وقت میں میر امن دہلوی، میر شیر علی جعفری افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی دہلوی، سید حیدر بخش دہلوی، کاظم علی جوان، نہال چند، مرزا لطف علی، حفیظ الدین احمد، اکرام علی خاں، للو لال جی، مرزا علی لطف، بینی نراین جی، مولوی امانت اللہ، سید بخش علی رواں لکھنوی، افتخار الدین علی خاں شہرت، عبدالکریم خاں کریم، مرزا ہاشم علی عیاں، مرزا قاسم علی ممتاز، مرزا جان طپش، مولوی خلیل اللہ اشک، مرزا محمد فطرت وغیرہ نے ہندوستانی نثر کے لٹریچر کی بنیادیں ڈال دیں۔ لیکن ابھی اُردو نثر یا تو بالکل بناوٹ اور دکھاوٹ کی چیز ہوتی تھی یا جب رنگینی چھوڑ کر سادگی اختیار کرتی تھی تو بے رنگ اور بے نمک ہو جاتی تھی۔ ابھی اس کی زبان میں ذرا لڑکھڑاہٹ تھی۔ لیکن کام شروع ہو گیا تھا۔

لگ بھگ سو برس کے اندر اس داغ بیل کو پروان چڑھنے کے لئے تیرہ ہوائیں تو نہ ملیں جو یورپ کی نثر کو ملیں پھر بھی کچھ ایسے جھونکے مل ہی گئے جن سے یہ بیل پنپ اٹھی اور لہلہا اٹھی۔ چھاپہ خانوں کا رواج ملک میں عام ہوتا گیا۔ ریلوں اور موٹروں نے صرف خط و کتابت کی نہیں بلکہ اخباروں اور رسالوں کے پرچار کی آسانی پیدا کر دی۔ شاعری تو بغیر چھاپہ خانوں کے بھی اپنے سر اٹھا سکتی ہے لیکن عام طور پر گھر گھر نثر کی کتابوں اور اخباروں کا پرچار چھاپہ خانوں کے بغیر دھیان میں آ ہی نہیں سکتا۔ رفتہ رفتہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی ایک کونے میں اُردو اور ہندی کی جگہ مل گئی پھر ملک کی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے بھی ہندوستانی نثر میں نئی جان ڈال دی۔

اس سو برس کے اندر پہلا آدمی جس نے اُردو نثر کو اپنے قلم کی جنبش سے کہاں سے کہاں پہونچا دیا وہ محمد حسین آزاد ہے جس کی سات آٹھ ہزار صفحوں میں بکھری تصنیفوں کو ہم صرف جادو نگاری کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی ایک بے لاگ اور بے تکلف انداز بیان سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سر سید کی نثر میں ادبیت نہ سہی ایک بیدار مغز شخص کے دل اور دماغ کی دھڑکنیں سنائی دیجاتی ہیں۔ حالی نے بھی سنجیدگی متانت اور سلامت روی

کا اور ماتھے پر بغیر بل ڈالے ہوئے لکھنے کا وہ انداز اختیار کیا جو ان کی نثر اور نظم دونوں کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کے بعد اردو کے سب سے زبردست اہل قلم شبلی نعمانی کا نام آتا ہے جن کا کارنامہ اس دور کی سب سے اہم چیز ہے۔ جس طرح میر، سودا، درد، اور سوز اردو شاعری کے چار رکن ہیں اسی طرح آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی اردو نثر کے چار رکن ہیں۔

پھر دوسرا دور آتا ہے، جس میں داغ و سرشار کی نثر دہراتا ہوا آئینہ ہے جس میں ہم اودھ کی تہذیب اور زندگی اور اس زمانہ کی بولی ٹھولی، اس کے تکلف اور اس کے مشغول سب دیکھ سکتے ہیں۔ اسی زمانہ میں شرر کی بھی اس نثر سے ہمارے کان آشنا ہوتے ہیں جو نہایت رچی ہوئی اور خوشگوار ہے۔ سجاد حسین اور اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کے حلقہ نے نثر میں وہی کیا جو سودا، انشا، رنگین اور ریاض صاحب نے نظم میں پہلے کیا تھا اور جو اکبر الٰہ آبادی اسی زمانہ میں کر رہے تھے۔ ان کے بعد پریم چند کے کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں اور جدید افسانہ نگاری اور ناول نگاری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پھر ہمیں ابوالکلام آزاد کی نثر کے نمونے ملتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ نیاز فتحپوری نے مختلف عنوانوں پر اپنی نثر کے نمونے پیش کرکے دور حاضر میں پہلے پہل اسلوب (اسٹائل) کی ایسی مثالیں پیش کیں جس میں طرز بیان اور مفہوم دونوں الگ الگ اپنی دلکشی دکھاتے ہیں اور دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بھی نظر آتا ہے۔ صحافت نگاری میں ظفر علی کی نثر بانکپن کی مثال ہے۔ لئے مہدی افادی کی نثر، مضمون نگاری میں خواجہ حسن نظامی کی وہ نثر جس کا چلبلا پن اور البیلاپن اردو میں ایک نئی چیز تھی اور دور حاضر میں پطرس اور رشید احمد صدیقی اور عظیم بیگ چغتائی کی پرتنز اور مزاحیہ نثر جو اودھ پنچ اور اس کے حلقہ کی نثر سے زیادہ لطیف بھی ہے اور زیادہ سنجیدہ بھی۔ مجنوں گورکھپوری کی نثر جسے ہم شبلی نعمانی کی نثر کا دوسرا جنم کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن کا ذکر اس مختصر سی تقریر میں ممکن ہے۔ اردو نثر نے صرف اب جاکر نثر کے اس بھید کو کچھ کچھ سمجھنا شروع کیا ہے جسے راز اسلوب (The Secret of Style) کہتے ہیں۔ سو برس کے اندر اردو نثر کیا سے کیا ہوگئی لیکن ابھی اس کو بہت کچھ ہونا ہے، گو ہم اردو نثر کے مستقبل سے مایوس ہیں، اور اس کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ

کار جہاں دراز ہے کچھ میرا انتظار کر

فراق گورکھپوری

ذہن نشین کر لیجئے کہ نگار کا پرچہ اگر آپ کو نہ ملے تو اُسی مہینہ کے اندر دفتر کو اطلاع دیجئے۔ مہینہ گزر جانے کے بعد اور اس سے زیادہ دیر میں اطلاع آنے پر ۸ر کے ٹکٹ پیشگی موصول ہونے کے بعد دفتر تعمیل کا ذمہ دار ہوگا۔ ورنہ نہیں۔　منیجر نگار

آئندہ جنگ اور ہماری صنعت و تجارت

دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود محض اعتباری ہوتا ہے لیکن ہم اپنی عمریں اُن کے حصول کی کوشش میں صرف کر دیتے ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک ناگزیر حقیقت ہیں لیکن ہم ہمیشہ اُن سے بچنا چاہتے ہیں، پہلی چیز کی مثال امن و سکون ہے جو بالکل اعتباری چیز ہے اور دوسری کی جنگ و جدال۔

اسوقت دنیا میں دو اسکول ہیں جو جنگ کی بابت دو مختلف نظرئے رکھتے ہیں، ایک برن ہارڈی اور نیٹشے کا اسکول ہے جو دنیاوی ترقی کا سرچشمہ اسی جذبۂ جنگ و مسابقت کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا برائٹس، نارمن، برٹرانڈ رسل وغیرہ کا جو جنگ کو بدترین لعنت سمجھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امن و سکون کی خواہش فطری ہے، لیکن دنیا کی ترقی نام ہے صرف اضطراب کا اور اگر انسان ایک جگہ چین سے خاموش بیٹھ جائے تو پھر اس کے بعد دوسری منزل موت ہی ہے۔ کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ دنیا کے بہت سے علمی انکشافات، اور صنعتی اقدامات کا سبب صرف یہی بین الاقوامی مغایرت ہے اور امن و سکون کے زمانہ میں علوم و فنون کی تحقیق پر اتنا روپیہ صرف نہیں کیا جاتا، جتنا جنگ کے زمانہ میں۔

دنیا میں بہت سی علمی و صناعی ترقیاں صرف اس وجہ سے ہوئیں کہ ایک ملک جنگ سے تباہ ہو گیا اور پھر اسے اپنے نقصانات کی تلافی اور حصولِ دولت و اقتدار کے لئے نئی راہیں ڈھونڈھنا پڑیں۔ مرکبات نائٹریٹ طیار کرنے کی صنعت میں جو ترقی جرمنی نے کی ہے اور Chemicals کی تجارت میں فرانس نے جو کچھ کمایا ہے وہ جنگ عظیم ہی کا نتیجہ ہے۔ جاپان کی مختلف صنعتوں کی ترقی ۱۹۰۵ء کی لڑائی کا نتیجہ ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے جن علوم و فنون میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ان میں سے ایک فن پرواز ہے اور دوسرا زیر آب جہاز رانی، علاوہ ان کے سمعیات (Sound Ranging) اور لاسلکی مخابرات کے متعلق جو ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی جنگ کی ممنونِ کرم ہیں۔ سر رابرٹ جونس کا بیان ہے کہ سرجری کا جسمانی نقائص دور کرنا اور بدصورتی کو حسن میں تبدیل کر دینا، یہ بھی جنگ کی پیداوار ہے الغرض طبیعیات اور کیمیا کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کی از سرِ نو چھان بین نہ کی گئی ہو، اور نئے نئے انکشافات و اختراعات سے علوم و فنون کو ترقی نہ ہوئی ہو۔

پھر طیاری جنگ کے سلسلہ میں یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ کتنے بیروزگار کام سے لگ جاتے ہیں۔ برطانیہ نے حال ہی میں ۱۵۰۰ ملین پونڈ اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے منظور کئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی صنعت جو اس وقت تنزل کی حالت میں ہے ترقی کر جائے گی اور لاکھوں کام کرنے والے جو فاقہ کر رہے ہیں برسرکار ہو جائیں گے۔

جرمنی میں بھی طیاری جنگ نے بیروزگاری کا خاتمہ کر دیا ہے اور اب ہر شخص وہاں مصروف کار نظر آتا ہے۔

اس لئے سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی مدافعت کے لئے یہاں کی افواج کا اکثر حصہ ہندوستانیوں کے لئے وقف کر دیا جائے اور اُن کی میکانکی آراستگی کے لئے جس قدر آلات حرب [illegible] یہیں تیار کئے جائیں تو کیا یہاں کی اقتصادی مشکلات اور بیروزگاری پر اس کا اثر نہ پڑے گا؟

ہندوستان کی آبادی بہ لحاظ دولت دو حصوں میں منقسم ہے ایک غریب دوسرا مالدار، متوسط الحال طبقہ یہاں مفقود ہے۔ غریب طبقہ میں [illegible] بالکل نکمّے بیٹھے رہتے ہیں اور مالدار طبقہ کی حالت یہ ہے کہ اس کی دولت [illegible] ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا اگر مغربی صناعت کو یہاں رائج کیا جائے تو [illegible] دولت بھی ٹھکانے لگ سکتی ہے۔

اس وقت ہندوستان کی سوشلسٹ جماعت کئی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ اُن چند افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے ملک کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور جن کو ملک کی بڑی آبادی کا اعتماد حاصل ہے۔ ان کے بعد دوسری قسم ڈرائنگ روم بالشیوکوں کی ہے جو قیمتی کاروں میں بیٹھ کر آتے ہیں اور سرمایہ داری کے خلاف نہایت پرجوش تقریریں کرتے ہیں، لیکن خود ان کی زندگی سرمایہ دارانہ ہے۔ ایک جماعت ان چھٹ بھیوں ([illegible]) کی ہے جو سرمایہ دار طبقہ کی مخالفت صرف اس لئے کرتی ہے کہ سیاست کے میدان میں وہ آگے آ جائے۔ یونیورسٹی سے نکلی ہوئی نوجوان جماعت زیادہ تر کارل مارکس کے نظریہ کی شیدا ہے، لیکن عملاً وہ کچھ نہیں ہے۔

ایک اور جماعت ہے جو اپنے نصب العین کے لحاظ سے صرف روحانیت کی پرستار ہے، وہ اہنسا کا پرچار کرتی ہے اور مشینوں کے ذریعہ سے زرعی و صنعتی ترقی کو ہندوستان کے لئے مفید نہیں سمجھتی وہ چھوٹی چھوٹی خانگی صنعتوں کو بڑی بڑی مشینوں سے چلائی جانے والی صنعتوں پر ترجیح دیتی ہے کیونکہ اس کے نزدیک ہندوستان کی کثیر آبادی اس طرح بیکار ہو جائے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال صحیح نہیں، ہندوستان کی دستی صنعتوں کے زوال کا سبب صرف یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزوں سے ہمارے بازار بھرے پڑے ہیں اور خود ہمارے ملک میں کوئی صنعت وسیع پیمانہ پر ایسی نہیں ہے جو ملک کی ضروریات کو پورا کرے۔ بڑے بڑے صنعتی اداروں نے کبھی خانگی صنعتوں کو برباد نہیں کیا، بلکہ ان کو اور ترقی دی ہے، جس کا ثبوت جاپان سے مل سکتا ہے۔

ہندوستان اس کرۂ زمین کا ایک حصہ ہے اور وہ اس اُصول سے ہٹ کر کامیاب نہیں ہو سکتا جس پر اس وقت ساری دنیا کاربند ہے۔ انحوت عامہ یا انسانیت پرستی کا وہ دور ابھی نہیں آیا ہے اور نہ شاید کبھی آئیگا جب کرۂ ارض کی تمام سلطنتیں آپس میں ایک دوسرے کے جذبۂ عداوت کو ختم کر دیں گی۔ یہ زمانہ وہ ہے جب ہر ملک دوسرے ملک کو فنا کر دینا چاہتا ہے اور واقعی فنا کر دیتا ہے اگر کسی میں مقابلہ کی تاب نہیں ہوتی، پھر دیکھئے کہ مقاومت کی کامیابی کا انحصار کس چیز پر ہے، صرف صنعت و تجارت کی ترقی پر اور خود ملک کی پیداوار سے ملک کی ضروریات فراہم کرنے پر۔

اس سے قبل ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ فوجی نقطۂ نظر سے ہندوستان بالکل غیر محفوظ ملک ہے، یعنی اگر برطانوی فوجیں یہاں سے چلی جائیں تو پھر ہم چھوٹے سے چھوٹے حملہ آور ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جبریہ فوجی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور یہاں کی فوجوں کی تنظیم یہیں کی آبادی سے کی جائے اور تمام آلاتِ حرب یہیں طیار کئے جائیں، اس سے ایک فایدہ ہوگا کہ ملک کی مختلف صنعتیں غیر معمولی ترقی کر جائینگی بے روزگاری بڑی حد تک دور ہو جائے گی اور چند سال میں ہندوستان اپنی حفاظت کے لئے انگریزوں کی مدد سے بے نیاز ہو جائے گا۔

ضروریاتِ جنگ میں سب سے پہلی چیز پٹرول ہے، جو ہوا، پانی اور خشکی میں ہر جگہ بہ کثرت استعمال ہوتا ہے جاپان کو موجودہ جنگ میں اتنا پٹرول صرف کرنا پڑا ہے کہ وہاں اس کا قحط ہو گیا ہے اور تقریباً تمام کرایہ کی موٹروں ٹراموں گاڑیوں اور ذاتی موٹروں کو کوئلہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ پٹرول کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کے سیاسیات کے بہت سے اہم مسایل اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امریکہ کی ڈالر پالیسی اور یورپ میں توازنِ قوت کا مسئلہ انھیں لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے، جو پٹرول کی تجارت کے ناخدا ہیں۔ ایران میں بیجا مداخلت کرنا، برما پر قبضہ کر لینا محض پٹرول کی وجہ سے تھا۔ اتحادیین کی نگاہ میں ترکی اس لئے خار تھا کہ موصل و عراق کے پٹرولی چشمے اس کے پاس تھے۔ امریکہ کا مکسیکو اور وسط امریکہ پر اپنا اقتدار قایم کرنا اسی پٹرول کی طمع سے تھا اور جاپان کا علاقۂ بورنیو اور جزیرۂ سخالین پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا بھی پٹرول ہی کی وجہ سے ہے، الغرض پٹرول کی اہمیت اس زمانہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ بغیر اس کے نہ جنگ ہو سکتی ہے نہ کوئی صنعت ترقی کر سکتی ہے چنانچہ جرمنی نے حال ہی میں مکسیکو سے پندرہ ملین پیپے اور رومانیا سے پانچ ملین پیپے اپنی مصنوعات کے تبادلہ میں حاصل کئے۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے پٹرول بہت کم پیدا ہوتا ہے اور برما و ہندوستان دونوں جگہ کی پیداوار صرف ۵۰ ملین گیلن ہے جو امن کی حالت میں بھی ہندوستان کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی اور باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ علاوہ پٹرول کے دوسرے معدنی تیلوں پر بھی ۲ کرور سالانہ صرف ہوتا ہے۔ خیر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں پٹرول کے چشمے نہیں ہیں بلکہ

اس طرف توجہ نہیں کی جاتی - ماہرین طبقات الارض کا اندازہ ہے کہ کشمیر، نیپال اور ہمالیہ کی ترائی میں پٹرول کے چشمے بکثرت مل سکتے ہیں اگر جستجو کی جائے، اسی کے ساتھ کوئلہ کی گیس بنانے کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے جس کے مصارف بہ نسبت پٹرول کے بہت کم ہوتے ہیں، اور ایک لاری ایک روپیہ کے کوئلہ میں اتنا ہی سفر کر سکتی ہے جتنا پانچ روپیہ کے پٹرول میں - الغرض ہندوستان میں پٹرول اور کوئلہ کی گیس کی طرف توجہ کی جائے تو اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوگا کہ یہاں کا بہت سا روپیہ باہر نہ جائے گا بلکہ جنگ کے وقت ہم دوسرے ملکوں کے محتاج نہ رہیں گے اور ہمارے لاکھوں آدمی جو اس وقت بیروزگار ہیں کام سے لگ جائیں گے -

دوسری چیز لاکھ ہے جو ہندوستان کی خاص چیز ہے اور کروڑوں من یہاں سے یورپ و جاپان کو جاتی ہے جہاں اس سے رنگ، پالش، گراموفون ریکارڈ، لیتھو روشنائی اور بجلی کے (insulation material) اس سے طیار ہوتے ہیں - گزشتہ جنگ کے زمانہ میں لاکھ کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ دوسرے ملکوں میں اس کی برآمد روک دینی پڑی اور انگلستان نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا - اگر ہندوستان میں لاکھ کو صاف کر کے انھیں مصنوعات کو یہاں طیار کیا جائے جو دوسرے ملکوں میں طیار کی جاتی ہیں تو ملک کی خوشحالی کتنی وسیع ہو سکتی ہے -

نباتاتی تیل (جو فوجی آلات حرب اور میکانکی نقل و حرکت میں بکثرت استعمال ہوتا ہے) زیادہ تر باہر سے آتا ہے حالانکہ جن تمام چیزوں سے یہ تیل نکالا جاتا ہے ان کا بڑا حصہ تخمیناً دس گیارہ کروڑ سالانہ کا ہندوستان ہی سے باہر جاتا ہے - اگر ان درختوں کی کاشت یہاں زیادہ وسیع پیمانہ پر کی جائے اور تیل بھی یہیں نکالا جائے تو ہماری آمدنی کئی گنا بڑھ سکتی ہے اور جنگ کے وقت نباتاتی تیل کے لئے ہم دوسرے ملکوں کے دست نگر نہیں رہیں گے -

آیندہ جنگ کی طیاری کے لئے علاوہ ان چیزوں کے اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ موٹر سازی کی صنعت کو یہاں ترقی دی جائے جو اسباب تجارت کے نقل و حرکت کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے جس سے ہم اپنی فوجوں کو بھی میکانکی اصول پر آراستہ کر سکتے ہیں - فرض کیجئے اگر دشمن کے حملہ سے ہماری ریلوے سروس بیکار ہو جائے تو پھر سوائے اس کے کہ موٹروں سے کام لیا جائے اور کیا ہو سکتا ہے - چین نے اس جنگ میں جتنا قرض لیا اسکی بڑی مقدار صرف موٹروں کی خریداری پر صرف ہوئی کیونکہ بغیر ان کے سامان حرب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہو سکتا تھا، نہ رسد رسانی آسانی سے ممکن تھی انھیں موٹروں کے کارخانوں میں تمام ہوائی جہازوں کے انجن بھی طیار ہونا چاہئے خواہ وہ مصافی ضرورتوں کے لئے درکار ہوں یا غیر مصافی ضرورتوں کے لئے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انگلستان آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ سے تو انجن طلب کرتا ہے لیکن ہندوستان کی طرف اس کا خیال بھی نہیں جاتا جہاں خام پیداوار کی کثرت اور سستی مزدوری کی وجہ سے اس صنعت کی ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں - ملک کی مدافعت کے لئے مسلح کاروں اور منتقل ہونے والی توپوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور

ان کی طیاری بھی ہندوستان میں ممکن و آسان ہے ۔مثالاً ہمیں روس کو دیکھنا چاہئے جواب سے چند سال قبل ہر مشینری باہر سے طلب کرتا تھا، لیکن اب یہ حال ہے کہ موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک، مسلح گاڑیاں وہ خود چین، ترکی، افغانستان، ایران، اسپین اور میگزیکو کو فراہم کرتا ہے ۔ اس وقت ہندوستان اقتصادی حیثیت سے بیس سال قبل کے روس سے کہیں زیادہ مضبوط ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ روس تو اتنی گری ہوئی حالت سے اس قدر ترقی کر جائے اور ہمارے لئے ممکن نہ ہو۔

یوروپ و امریکہ کے مصنوعات جنگ پر ہندوستان کو بھروسہ کرکے بیٹھ جانا انتہائی حماقت ہے کیونکہ اول تو وہاں کی گراں مزدوری اور خام پیداوار کی کمی کی وجہ سے یہ صنعتیں خود غیر یقینی کیفیت رکھتی ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی مدافعت کی طرف سے اس قدر فکرمند رہتے ہیں کہ ہندوستان ان کی مدد پر بھروسہ نہیں کر سکتا خصوصیت کے ساتھ جنگ کے وقت کہ نقل و حرکت کے ذرایع محدود و خطرناک ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس وقت ریلوں کی کثرت اتنی ہے کہ کسی ملک میں نہیں اور یہاں تین چار بڑے بڑے ورکشاپ بھی موجود ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ انجن وغیرہ سب باہر ہی سے آتے ہیں اور اس وقت تک دو ارب روپیہ اس سلسلہ میں انگلستان پہونچ چکا ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں انجن طیار نہیں ہو سکتے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ چھوٹی لائن کے انجن ایک انجینئر نے یہیں اجمیر میں طیار کرکے دکھا دئے جن کی قیمت دس ہزار روپیہ ولایتی انجن سے کم ہوتی ہے۔

اگر ریلوے کے کارخانوں کو وسعت دیکر یہیں انجن بھی بنائے جائیں تو بڑی آسانیاں ممکن ہیں کیونکہ لوہے کی یہاں کمی نہیں اور مزدوری کی ارزانی ظاہر ہے، علاوہ اس کے جنگ کے زمانہ میں باہر سے انجن بھی فراہم نہیں ہو سکتے اور دشمن سب سے پہلے انجنوں ہی پر قبضہ کرتا ہے ۔ حال ہی میں جاپان نے ۸۴ انجن چین کے چھین لئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرصہ تک فوجوں کی نقل و حرکت نہ ہو سکی۔

اگر یہاں ریل کے کارخانوں میں انجن بھی طیار ہونے لگے تو ٹینک، بھاری بھاری توپیں، توپخانوں کی گاڑیاں بھی یہیں بننے لگیں گی جن کی جنگ کے وقت سخت ضرورت ہوتی ہے ۔ گزشتہ جنگ عظیم میں یوروپ کے تمام ریلوے ورکشاپ سے یہی کام لیا جاتا تھا کیونکہ باہر سے ان چیزوں کی فراہمی ممکن نہ تھی۔

یہ یقینی ہے کہ ہندوستان اقتصادی حیثیت سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک مشینری اور اوزار بنانے کی صنعت کو یہاں ترقی نہ دیجائے ۔ اس وقت ہم تمام اوزار یا مشینیں جو بھاری صنعت کے لئے درکار ہوتی ہیں باہر سے طلب کرتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا پمپ بھی باہر سے آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دو کارخانے جو یہاں ہیں بھی وہ حکومت کی مدد نہ ملنے سے ترقی نہیں کر سکتے ۔ ٹاٹا کمپنی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ

لوہے کی ہر طرح کی مصنوعات یہاں طیار ہو سکتی ہیں اور دنیا کی کوئی مشینری ایسی نہیں ہے جو یہاں نہ بن سکتی ہو۔ ہندوستان لوہے کی پیداوار میں امریکہ کے بعد دوسرے درجہ کا ملک سمجھا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے خود ہندوستان کو کوئی خاص فایدہ نہیں پہونچتا اور دہی خام لوہا جو یہاں سے کوڑیوں کے مول جاتا ہے مشینری کی صورت میں ہم اس کی قیمت ہزاروں لاکھوں ادا کرتے ہیں۔ یہی حال اُن کیمیاوی چیزوں کا ہے جو دواسازی یا دوسری صنعتوں کے لئے درکار ہوتی ہیں، تین کروڑ سالانہ سے زیادہ کے تو مرکبات نوسادر اور سوڈا طلب کئے جاتے ہیں اور دو کروڑ کے وہ مرکبات کیمیاوی جو دواسازی کے کام آتے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی ایسا نہیں جو یہاں طیار نہ ہو سکے۔ تانبہ، نکل، الومنیم، ٹین وغیرہ بھی سامان جنگ کی طیاری میں بہت کام آتا ہے اور یہ سب چیزیں ہندوستان میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ربڑ بھی جنگ میں درکار ہوتا ہے اور چمڑا بھی، لیکن نہ ربڑ کی کاشت کو یہاں وسیع کیا جاتا ہے اور نہ چمڑے کی کھپت کا انتظام ہوتا ہے۔

الغرض ہندوستان کی اقتصادی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں صنعت کی ترقی کی راہ میں موانع حایل کئے جاتے ہیں اور اس کی خام پیداوار سے سفید اقوام کو فایدہ اُٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے جس کا حقیقی احساس اسوقت ہوگا جب دنیا میں آتش جنگ مشتعل ہوگی اور ہم انگلستان کی مدد پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

قوم کی آواز:۔ مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریروں کا مجموعہ اور سفر یورپ کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قیمت عہ

آزادی:۔ یہ جان اسٹورٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے قیمت عہ

تلاش حق:۔ (جدید ایڈیشن) مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جلد اول عہ جلد دوم عہ

میری کہانی:۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زوربیان ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت مجلد دو حصے للعہ

عربوں کا تمدن:۔ جوزف ہیل کی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے، مسلمانوں کے قدیم اور علمی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب بی، اے (جامعہ) قیمت صرف عہ

تاریخ فلسفۂ اسلام:۔ مشہور جرمن فلسفی ٹ، ج دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اُردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (طبع ثانی) قیمت عہ

جاپان:۔ جاپان کے حالات پر سیر حاصل بحث۔ مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

شاہجہاں کی بیٹیاں

(ایک انگریز کی نظر میں)

مسٹر ایف۔ جے۔ مورگن کا طویل سلسلۂ مضامین "تاریخ ہند کی مشہور خواتین" کے عنوان سے "الٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کی متعدد اشاعتوں میں شایع ہوچکا ہے۔ اس سلسلہ کی وہ کڑی جو شاہجہاں کی لڑکیوں سے متعلق ہے، اخلاق سوز اور دلآزار ہونے کے علاوہ تاریخی اعتبار سے بھی بے حد گری ہوئی ہے۔ مسٹر مورگن کا ماخذ صرف برنیر ہے ہے اور اس کی لغو غیر ذمہ دارانہ تحریروں کا علم ہر اس شخص کو ہے جس نے تاریخ ہند کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے۔

فرانکوئس جے۔ برنیر ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ وہ مغلیہ دربار کے ایک امیر دانشمند خاں کے ہاں ملازم تھا اور حرم شاہی میں، جہاں اطبا بھی آنکھوں پر پٹی باندھکر اور برقعہ اوڑھکر صرف ضرورتاً بلوائے جاتے تھے، اسے بالکل رسائی حاصل نہ تھی۔ اس لئے حرم شاہی کے متعلق اس کی تمام معلومات دہلی کی بازاری گپوں اور افواہوں کی پیداوار تھیں۔

مسٹر مارگن اگر فارسی کی تاریخوں سے استفادہ کرنے کے اہل نہ تھے تو کم از کم نکولاؤ مانکی کی تصنیف اسٹوریا ڈو موگو کو دیکھتے جو زوائد اور لغویات سے تو بری نہیں تاہم ایک حد تک قابل لحاظ ہے کیونکہ اس سیاح کا قیام ہندوستان میں برنیر کی مدت قیام سے کہیں زیادہ رہا۔

مانکی نے برنیر کو دہلی میں دیکھا بھی تھا اور اکثر و بیشتر جبکہ وہ اپنی شہرۂ آفاق اسٹوریا کی ترتیب میں مصروف تھا اس نے برنیر کی متعدد تاریخی غلطیوں کو درست بھی کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"میں نے اکثر اس کو تنبیہ کیا کہ عوام کی باتوں پر یقین نہ کرے"

یہاں پر یہ ظاہر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جہاں آرا کے فرضی عاشق کے جلا دئے جانے کا قصہ جو[1]

---

[1] برنیر کا سفرنامہ از کانسٹیبل ص ۱۳

مسٹر مورگن نے بیان کیا ہے وہ سوائے برنیر کے اور کسی تاریخ میں نہیں ملتا اور مانکی نے اس قصہ کی کھلے الفاظ میں تردید بھی کر دی ہے، وہ لکھتا ہے :-

"اس نے (جہاں آرا بیگم نے) اپنے بھائی کے لئے تاج حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی کیونکہ دارا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ ہوجانے کے بعد وہ اسے عقد کی اجازت دیدے گا، اس مقصد کو نظر رکھتے ہوئے جہاں آرا نے اپنی تمام قوت اپنے باپ (شاہجہاں) کو خوش کرنے کے لئے استعمال کر دی اور ان کی خدمت گزاری انتہائی محبت اور محنت سے کی تاکہ وہ بھی اس کی درخواستوں کو قبول کرلیں، اس وجہ سے عوام میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ شاہجہاں کو اس سے جنسی تعلق ہے اور برنیر نے ان کو صحیح سمجھ کر لکھ مارا، حالانکہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ معلوم کرکے کہ شہزادی کا ایک چاہنے والا محل میں موجود ہے شاہجہاں اس کی گرفتاری کے لئے روانہ ہوگیا۔ شاہزادی نے اس شخص کو ایک دیگ میں چھپا دیا اور بادشاہ نے اس کو آگ پر رکھوا دیا۔

کیا شاہجہاں ایسی شاندار سلطنت میں جہاں سفراء دول کثرت سے موجود ہوں اپنی بیٹی سے ایسا سلوک کر سکتا تھا"

گو یہ اقتباس برنیر اور اس کے محروم البصیرت متبعین کی تردید و تکذیب کے لئے کافی ہے، مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ خود مانکی جو اپنے آپ کو برنیر سے بہتر مورخ ثابت کرنا چاہتا ہے، قابل اعتبار تھا۔ کہیں کہیں وہ اخلاقی دناءت میں برنیر سے کئی قدم آگے نظر آتا ہے، اس نے اپنا اقتدار ظاہر کرنے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ جہاں آرا خود اپنے پینے کی خاص شراب اسے بھیجا کرتی تھی۔ اور دوسری جگہ یہ راسے زنی کرتا ہے کہ :-

"یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس شہزادی نے اپنے باپ کی خدمت گزاری کرنے سے گریز نہیں کیا اور صرف اپنے عشاق سے لطف اندوزی پر اکتفا کیا"۔

قبل اس کے کہ مانکی کی مورخانہ حیثیت پر تفصیل سے تنقیدی نظر ڈالی جائے یہ واضح کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ اگر مسٹر مورگن صرف سرکار ہی کی تصانیف کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو حقیقت کا علم ہوجاتا۔ سرکار لکھتے ہیں :-

"جہاں آرا، شاہجہاں کی عزیز ترین اولاد تھی اور اس کی محبت کی ہر طرح مستحق تھی۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد اس کی دیکھ بھال اور عاقبت اندیشی نے شاہجہاں کو خانگی تفکرات سے نجات دیدی تھی۔ اس کی شیریں مزاجی اور دلی شرافت نے اس کے دماغی کمالات سے کہیں زیادہ، داماندگی اور پریشانی میں بادشاہ کو سکون بخشا تھا۔ اسکی مشفقانہ محبت نے تمام خاندانی تلخیوں کا علاج کر دیا تھا اور خود اس کے اپنے اعزہ و اقربا کے تنگ دائرے سے باہر بھی اسے

۱؎ "اسٹوریا"، جلد اول ص ۲۱۷-۲۱۶ - ۲؎ اسٹوریا جلد دوئم ص ۱۱۵، جلد اول ص ۲۲۰ - ۳؎ اسٹوریا جلد اول ص ۲۱۹ - ۴؎ جلد دوم ص ۲۱۹

۵؎ انندرام مخلص اپنی کتاب چمنستان ص ۲۵ پر لکھتا ہے کہ جہاں آرا بعض مذہبی رسایل کی مصنفہ بھی تھی، اسٹوریا جلد اول ص ۲۱۷ - ولیم اروِن کا نوٹ ۲۱۷

یتامیٰ، بیوگان اور غربا و مساکین کے لئے شاہانہ فیاضیوں کا ذریعہ بنا دیا تھا، کامیابی و نصرت کے درخشاں ایام میں اسکا
نام تمام ملک میں صرف فیاضی و سخاوت کے لئے روشن تھا مصیبت کے زمانہ میں اس کے فضایل اور بھی زیادہ عالیشان
بلندیوں پر پہونچ چکے تھے"۔

یہاں تک تو مسٹر مورگن کی تالیف قلب کے لئے "گزارشِ احوالِ واقعی" ہو چکی۔ اب شہنشاہی حرم کے دوسرے "محرمِ راز" مانکی کے باخبر دماغ کا تجزیہ بھی خود اس کے بیان کردہ عجائبات کی روشنی میں کرلینا ضروری ہے۔ لاف وگزاف، شیخی، نفرت، سریع الاعتقادی، ذہنی رعونت وانانیت، عدم تحقیق اور عامیانہ آوارگیِ طبع کو اس کی نامور تصنیف میں عام امتیازی رتبہ حاصل ہے۔ ولیم اروِن کہتے ہیں کہ اس نے عالمگیر کی ملازمت قبول کرنے سے صرف اس لئے انکار کر دیا تھا کہ اسے اُس سے سخت نفرت تھی[1]۔ اور شاید اسی وجہ سے اس نے عالمگیر کی عزیز بہن روشن آرا کو اخلاق سوز مطاعن کا ہدف بنانے کی شرمناک کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور اسی کوشش کو معتبر اور مستند بنانے کے لئے اس نے فنِ طب میں اپنی مزعومہ "لقمانیت" کو شاہی محلسرا میں رسائی اور اپنے راز دانِ حرم ہونے کا بہترین ذریعہ بتلاتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ "خاص خاص بیگمات اور خواجہ سراؤں کو اس سے بڑی عقیدت تھی[2]"۔ حالانکہ روشن آرا بیگم کے متعلق اس کی تمام معلومات کا ماخذ صرف ایک پرتگیز لونڈی تھی، جس کا نام وہ تھوماز یا مارٹنس بتلاتا ہے، جس سے اسے محبت تھی، وہ لکھتا ہے کہ:-

"بوجہ اس محبت کے جو اسے (یعنی تھوماز یا ماٹنس کو) میرے ساتھ تھی .... اندرونِ محلسرا کے تمام واقعات سے مجھے مطلع کرتی رہتی تھی[3]"۔

اور اس کے بیانات پر ایمان لاتے ہوئے اُس نے تمام اُن فرضی نصائح کو جو اورنگ زیب نے روشن آرا بیگم کو قلعہ سے باہر سکونت اختیار کرنے کے موہوم ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کی تھیں، نقل کر دیا ہے اور اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ روشن آرا بیگم بدکردار تھی اور اسی لئے اُس کی تمام نقل وحرکت پر سختی سے نگہداشت کی جاتی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ بیگم کی سکونت گاہ پر بہت مضبوط پہرا بیٹھانے کی ضرورت بھی لاحق ہوئی تھی، کیونکہ

"اطلاع موصول ہوئی تھی کہ دو آدمی وہاں داخل ہوگئے تھے[4]"۔

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ:-

"وہاں روشن آرا بیگم نے اپنی تفریح کے لئے نو نفر جوانِ رعنا کو خفیہ طور پر رکھ چھوڑا تھا۔ فخر النسا بیگم، اورنگ زیب کی بیٹی نے اپنی پھوپھی سے درخواست کی کہ ان میں سے کم ازکم ایک ہی جوان اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ روشن آرا

---

[1] اروِن کا دیباچہ اسٹوریا۔ [2] اسٹوریا جلد اول صفحہ ۲۲۔ [3] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۳۳۔ [4] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۳۳

نے اپنی بھتیجی کی درخواست کو نامنظور کردیا تو اس نے اپنے باپ سے سارا حال کہدیا چنانچہ اورنگ زیب نے ان نوجوانوں کو بھی ہلاک کرادیا اور زہر دیکر روشن آرا کی بھی زندگی ختم کردی۔"

اب آیئے "استوریا" کے اس بیان کو تنقید صحیح کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے جانچ لیں تاکہ قارئین پر بخوبی ع ہوجائے کہ مغربی مورخین کو اسلامی تاریخ مند لکھنے میں کن ماخذوں سے بالعموم واسطہ پڑتا ہے۔

مانُکی جنوری ۱۶۵۶ء میں پہلی بار بندرگاہ سورت پر اترا اور اسوقت سے ۱۶۶۲ء تک اس کی حالت ایک بنان حال پناہ گزیں کی سی تھی۔ دارا کی فوج میں وہ بحیثیت ایک توپچی کے ملازم ہوا اور ۱۶۵۸ء میں معرکۂ ساموگڑھ شریک رہا۔ اس کے بعد اس نے اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کرلی اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے فرار ہوکر لاہور راہ لی اور دارا سے جاملا۔ وہاں سے وہ ملتان اور ملتان سے بھکر گیا، جہاں اس کو سنت نامی ایک خواجہ سرا ماتحت جو وہاں کا کمان افسر تھا توپ خانہ میں رکھا گیا۔ دارا کی شکست کے بعد وہ لاہور واپس آیا اور وہاں سے ں اور یو، وہیں تو کچھ کے ہمراہ دہلی آیا۔ ۸ دسمبر ۱۶۶۲ء ں نے اورنگ زیب کو کشمیر کی جانب روانہ ہوتے جا اور کچھ عرصہ ہونے ہوئے ڈھاکہ اور راج محل گیا جہاں سندھی کی راہ سے بنگال پہونچا۔ اس کے بعد غالباً ۱۶۶۱ء میں قاسم بازار سے ہوتے ہوئے آگرہ پہونچا طبابت کا پیشہ اختیار کرلیا یہاں کنور کرت سنگھ کی معرفت بجے سنگھ سے اس کا تعارف ہوگیا اور دس روپیہ یومیہ پر فوج میں کپتان بنا دیا گیا پھر ۱۶۶۴ء میں راجہ جے سنگھ ہمراہ دکن گیا اور جولائی ۱۶۶۹ء میں مستعفی ہونے کے بعد براہ کلیانی اور بیجاپور مئی ۱۶۶۷ء میں گوا پہونچا، ہاں سے آگرہ اور دہلی کو اگست ۱۶۶۸ء میں واپس آیا اور کرت سنگھ کے رسالہ میں ۵ روپیہ یومیہ پر ملازم ہوگیا ب ۱۶۶۹ء میں کرت سنگھ کابل گیا تو مانُکی لاہور میں رہ گیا اور یہاں ۱۶۷۶ء تک طبابت کرتا رہا اور اسی سال روبین نوآبادیات میں مستقل سکونت کا ارادہ کرلینے کے بعد دَم دَم روانہ ہوگیا۔ مگر پھر ۳۰ جنوری ۱۶۷۸ء کے بعد لی واپس آیا اور اس مرتبہ ولی عہد سلطنت شاہ عالم کا طبیب مقرر ہوا اور اس کے ہمراہ ۶ ستمبر ۱۶۷۹ء کو اورنگ آباد لاگیا۔ پھر کبھی وہ آگرہ یا دہلی واپس نہیں آیا۔[1]

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک ۱ر کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر ـــ منیجر نگار

مذکورۂ بالا واقعات سے یہ قطعی طور پر واضح ہوگیا کہ شاہجہاں کی وفات کے وقت (۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء)

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اَروِن کا دیباچہ استوریا۔

نا دہلی یا آگرہ میں موجود ہی نہ تھا اور ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۶ء تک اس کی کوئی خدمت حرم شاہی کے کسی شعبہ سے تعلق نہ تھی۔ اس لئے اس عرصہ میں اندرون حرم کے کسی واقعہ کی بابت اس کا کوئی بیان قابل تسلیم نہیں ہوسکتا ں ظاہر ہے کہ روشن آرا بیگم کے انتقال کے وقت (۲۰ ستمبر ۱۶۷۱ء) وہ آگرہ یا دہلی میں موجود نہ تھا بلکہ وہ ار جنوری ۱۶۷۸ء کے بعد دہلی واپس ہوا تھا۔

مانکی نے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اورنگ زیب کی ایک بیٹی کا نام فخر النسا بیگم بھی بتلایا ہے جس نے بقول ں کے روشن آرا بیگم کو اس کی "سیاہ کاری" کے حالات فاش کرکے زہر سے ہلاک کروادیا تھا۔ یہ مورخ چونکہ عالمگیر کا معاصر ہونے کے علاوہ شاہ عالم کا طبیب اور یورپین بھی تھا اس لئے غیر ملکی اور غیر مسلم مورخین کے نزدیک لسے عتبار کا مخصوص رتبہ حاصل ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم خود اسی کی زبانی اورنگ زیب کی اولاد کے حالات علوم کریں۔ وہ کہتا ہے کہ "زبیت نکسا بیگوم" (زیب النسا بیگم) سلطان محمد اور سلطان معظم کی سگی بہن اور ایک پیوت ماں کی بیٹی تھی اور شہنشاہ کی دوسری بیٹیاں "زینت نکسا بیگوم" (زینت النسا بیگم) اور "بڈرکسا بیگوم" بدر النسا بیگم) سلطان اعظم اور سلطان اکبر کی سگی بہنیں تھیں اور ان کی ماں "کس نواس کان" (شاہ نواز خاں نامی ایک رانی امیر کبیر کی بیٹی تھی۔ ان دونوں لڑکیوں کی شادی مراد بخش اور داراشکوہ کے لڑکوں سے ہوئی تھی "فکرو نکسا بیگوم" ، "جو ایک دوسری خاص بیوی سے تھی" ساری عمر شادی نہیں کی[1]

مگر اس کا یہ بیان واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ اورنگ زیب کی ایک بیوی دلرس بانو بیگم بنت شاہ نواز خاں کے بطن سے زیب النسا بیگم، زینت النسا بیگم، زبدۃ النسا بیگم، سلطان اعظم اور سلطان اکبر تھے، ان میں سے اول الذکر دونوں شہزادیوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ شہنشاہ کی دوسری بیوی نواب بائی نادر الزمانی تھی جو کاشمیر کے راجہ کی لڑکی تھی۔ اس کے بطن سے سلطان محمد، سلطان معظم، بدر النسا بیگم اور مہر النسا بیگم پیدا ہوئے۔ مہر النسا کی شادی سلطان مراد بخش کے لڑکے ایزد بخش سے ہوئی تھی اور بدر النسا ساری عمر دوشیزہ رہی۔

شہنشاہ کے اودیپوری محل سے صرف کام بخش پیدا ہوا تھا۔ مانکی جو حرم شاہی کے متعلق اپنی معلومات کو کل یقینی ظاہر کرتا ہے۔ اورنگ زیب کی اولاد میں زبدۃ النسا، مہر النسا اور کام بخش کا نام تک نہیں لیتا!!

اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کرلیں کہ شاید صوتی مشابہت کی وجہ سے مانکی کو بدر النسا، مہر النسا اور فخر النسا ں امتیاز کرنا دشوار ہوا ہوگا تب بھی اس کے ادعائے فارسی دانی سے قطع نظر کرتے ہوئے، فخر النسا کا (جس نے بقول اس کے ساری عمر شادی نہیں کی تھی) بدر النسا سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ خود کہتا ہے کہ

---

[1] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۵۸ - ۵۷ -

"بدر کسا بیگوم"، کی شادی مراد بخش کے لڑکے سے ہوئی تھی، جو واقعہ کے خلاف ہے۔ زبدۃ النسا (جس کا بہت طویل عمر پانے کے باوجود بھی اس نے کوئی ذکر نہیں کیا) اور فخر النسا میں صوتی اعتبار سے کوئی مشابہت اور مناسبت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے صرف مہر النسا ہی کو وہ فخر النسا کہہ سکتا تھا۔ مگر مہر النسا، کی شادی مراد بخش کے لڑکے ایزد بخش سے گیارہ سال، دو ماہ اور نو دن کی عمر میں ہو چکی تھی اور اس کمسنی میں اس کا اپنی پھوپھی کی "عیاشی" سے دلچسپی رکھنا عجیب بات ہے۔ علاوہ اس کے تاریخ کی اس ناقابلِ تردید صداقت کا انکار کیونکر کیا جا سکے گا کہ مہر النسا، کی شادی روشن آرا بیگم کی وفات کے کامل ایک سال اور ایک ماہ بعد ۲۷ نومبر ۱۶۷۲ء کو ہوئی تھی !!!

شہنشاہی حرم سرا سے "تقرب" کی بنا پر منوچی نے جہاں تاریخ ہند پر اپنے مخصوص مشاہدات و تجربات کی اتنی کچھ "نور" افشانی کی ہے وہاں اس نے حرم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے سال و ماہ کا تعین تو کیا اشارہ تک نہیں کیا۔

تاہم اگر "فلکر ونکسا بیگوم" کے ایماء پر اورنگ زیب نے اپنی عزیز ترین محسنہ اور ہمشیرہ کو زہر سے ہلاک کرا دیا تھا تو ایسا کرنے سے کم از کم ایک ہفتہ قبل اسے تمام اسباب کا علم ہو جانا لازمی تھا، کیونکہ ایک ایسا شاہنشاہ جو مذہبی تعصب اور پابندیِ شرع کی خاطر اس حد تک بدنام ہو کہ بقول سرجادو ناتھ سرکار "اسے کسی نوع کے مادی نقصان کا خوف یا کسی چیز کا اثر..... شریعت کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا"، خود اپنی اوباش بہن کا کام تمام کرنے میں تاخیر سے کیوں کام لیتا؟ بڑی تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ منوچی کے خبر رساں ذرائع نے اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا کہ روشن آرا بیگم کی وفات ۵۶ سال کی عمر میں ہوئی جبکہ بلاشبہ شباب کے ہیجانی جذبات کا بہت کچھ خاتمہ ہو چکتا ہے !!

اگر محض بحث کی خاطر منوچی کی کذب بیانی سے قطع نظر "فلکر ونکسا" اور "بدر کسا" کو ایک سمجھ بھی لیا جائے تب بھی تاریخی حقایق و واقعات مذکورۂ بالا الزامات کی پرزور تردید کریں گے۔ اگر اورنگ زیب کے زمانہ کی مذہبی فضا میں شریف مسلمان خاندانوں کی تہذیب و شائستگی، آداب و اخلاق، اور اعلیٰ طبقہ کی مسلم خواتین کی اخلاقی اور مذہبی تربیت و تعلیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی کیا منوچی کو یہ نہ جاننا چاہیئے تھا کہ بدر النسا بیگم حسن سیرت و صورت کی ایک کمیاب مثال تھی۔ اس کی طبیعت فطرتاً مذہب کی طرف مائل تھی، وہ حافظۂ قرآن تھی اور محاسن اخلاق اور شرافتِ اطوار کی ایک مضبوط چٹان تھی اور ابھی یہ کلی پھول کی طرح کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ دستِ اجل کے پنجہ نے اسے باغ ہستی سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا !! اس کی وفات روشن آرا بیگم کی تاریخ وفات سے ایک سال ۵ ماہ قبل واقع ہو چکی تھی !! پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بدر النسا بیگم اپنی پھوپھی کو ہلاک کرا دینے کے بعد یہ عجیب کہانی سنانے کے لئے کیسے زندہ رہ گئی !!!

اس تنقید و تبصرہ کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کی مروجہ درسی کتب تواریخ کے تیار کردہ نوادر کے باوجود کہ اورنگ زیب نے ۱۱ سنہ جلوس (۱۶۶۸ء ۔ ۱۶۶۹ء) میں "ایک احمقانہ حکم"[۱] کے ذریعہ تاریخ نویسی کو ممنوع قرار دیدیا تھا، یہ یاد رکھنا غیر مفید نہ ہوگا کہ اس امتناعی حکم سے صرف سرکاری محکمۂ تاریخ نویسی کا بند کر دینا مقصود تھا نہ کہ عام طور پر تاریخ نویسی کی ہر انفرادی سعی و کوشش جرم قرار دیدی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود ۱۱ سنہ جلوس کے بعد کی لکھی ہوئی تاریخیں آج بھی بکثرت موجود ہیں۔ اگر امیر خاں کی "واقعات عالمگیری"، ملا محمد کی "تنقیحات الاخبار"، "عالمگیر نامہ" اور دیگر مستند کتابیں مسلمانوں کی تصنیفات ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول بھی خیال کر لی جائیں تب بھی یوروپین سیاحوں کے بیانات کو ہندو مورخین کے مقابلہ میں جو اورنگ زیب کے ہمعصر ہونے کے علاوہ اپنے مسلمان ہم وطنوں کے تمدن، معاشرت، تہذیب و اخلاق اور رسم و رواج کے بہت بڑے واقف کار تھے، سنجیدہ تاریخ داں یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

ہندو مصنفین کی تاریخی تصنیفات کی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے :۔

(۱) فتوحات عالمگیری، مصنفہ ایشر داس ناگر ۱۶۹۲ - ۹۳ء کے حالات کی تفصیل ہے۔

(۲) نسخۂ دلکشا۔ از بھیم سین ولد رگھونندن داس، شاہ عالم کی تخت نشینی تک کے حالات پر مشتمل ہے[۲]۔

(۳) منتخب التواریخ مصنفہ جگ جیون داس ولد منوہر داس، یہ کتاب برٹش میوزیم میں ہے اور ۱۷۰۹ء میں مکمل ہوئی تھی۔

(۴) لب التواریخ ہند، مصنفہ رائے بندرا بن ولد رائے بہارامل، یہ تاریخ عالمگیر کے نام معنون ہے اور اسکا اصل نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔

(۵) خلاصۃ التواریخ، مصنفہ سبحان رائے (سجان رائے یا سبحان رائے ؟؟) عالمگیر کی عہد حکومت کے چالیسویں سال تک کی تاریخ ہے عالمگیر کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی اور اسی کے نام معنون کی گئی[۳]۔

سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مستند کتب تاریخ میں کسی ایک سے بھی مانچی اور برنیر کی بیان کردہ حکایات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ خود سر جدو ناتھ سرکار مانچی کی مذکورۂ بالا روایات کو بازاری گپوں اور اس کی سریع الاعتقادی پر محمول کرتے ہوئے مآثر عالمگیری صفحہ ۱۱ کے حوالہ سے روشن آرا بیگم کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اس میں شریفانہ اوصاف اور قابل ستائش خصوصیات پائی جاتی تھیں اور اسے اپنے بھائی سے بڑی محبت تھی۔ عالمگیر نے اس کی وفات پر ایصال ثواب کے لئے بڑی رقمیں خیرات کیں اور اس کے زیردستوں اور ملازموں پر عنایات صرف کیں[۴]۔"

---

[۱] ونسنٹ اسمتھ کی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا جلد دوم صفحہ ۴۴۴۔ [۲] سر سرکار کو ایشر داس اور بھیم سین کے علاوہ دیگر مورخین کا علم نہیں!! وہ انھیں دو کا حوالہ دیتے ہیں۔ [۳] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے معارف (اعظم گڑھ) نمبر ۵ جلد ۲۹ صفحہ ۳۲۵ بابت مئی ۱۹۳۲ء۔ [۴] سرکار تاریخ اورنگ زیب جلد سوم صفحہ ۶۰۔

کیا عالمگیر ایک بدکردار بہن کے لئے یہ سب کچھ کر سکتا تھا؟

الغرض اسی قماش کی بازاری گپوں اور فرضی افسانوں کی صدہا مثالیں برنیئر اور مانکی کے صفحات میں ہمیں جابجا ملیں گی اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مصنف اُن پر بلا چون و چرا اعتماد کرنے کے بعد معقول پسند حلقوں میں کبھی بھی عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی نہیں کہ "اسٹوریا" مانکی کی ذہنی پستی کی مکمل آئینہ دار ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی بقول پروفیسر اسٹینلی لین پول :-

"غلطیوں سے بھری پڑی ہے اور اخبار الفواحش کی گندگیوں سے آلودہ ہے اور ایک حاسد نامراد اور مفلس متکبر کی ذہنی پیداوار ہے"[1]

باوجود ان تمام کمزوریوں کے دونوں یوروپین سیاحوں کے بیانات باشندگان ہند کے عام حالات، تجارت[2]، جغرافیات اور مسیحی کلیساؤں کے متعلق خاص توجہ کے مستحق ہیں، مگر ان کے علاوہ بجز اُن کے ذاتی مشاہدہ میں آئے ہوئے واقعات کے اُن کی تمام تر معلومات یا توہمی وقیاسی ہیں یا محض بازاری گپوں پر ان کا دار و مدار ہے۔ اس لئے دیگر معاصر تاریخی شہادتوں اور فارسی خطوط کے مقابلہ میں اُن کی کوئی وقعت[3] نہیں نکلتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے پہلے کے واقعات کو مانکی نے ایک مضحکہ انگیز چیستان بنا دیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ستی کے رواج کی ابتدا شہر دہلی کے بانی "کنگ بکرماجیت" کے زمانہ میں اس لئے ہوئی تھی کہ "راجپوت عورتیں اپنے شوہروں کو قتل کر دیا کرتی تھیں[4] اپنے "واقف حالات" ہونے کی بنا پر وہ اپنے قارئین کو یہ بتلا کر محو حیرت کر دیتا ہے کہ جے مل چتوڑ کا راجہ تھا اور اکبر بادشاہ[5] نے پدمنی کی خاطر جو کہ "اس کی بہت سی پری جمال بیویوں میں سے ایک تھی" چتوڑ پر حملہ کیا تھا[6] وہ ہمیں مطلع کرتا ہے کہ اکبر ایران میں پیدا ہوا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ آگرہ کو تانبہ کا بنا دے[7] اس کے نزدیک اوزان اور آلات پیمائش اور دیگر ہندوستان میں سب سے پہلے "شیرا" یا شیر شاہ نے جاری کئے تھے[8]۔ عہد اکبر شاہی کے مشہور جیسوٹ سیاح فادر مانسریٹ کی طرح جس نے قبل از اسلام ہندوستان کے مسیحی بادشاہوں کی یادگار "جنھیں ہمارے اسلاف و اجداد مذہبی پیشوا جانس کہا کرتے تھے" اور جنھیں مسلمانوں نے اس طرح برباد کر دیا کہ اب مسیحیت کی یاد بھی لوگوں کے دماغوں سے کافور ہو گئی"[9]۔ اپنی نامور تصنیف کامنٹری میں چھوڑی تھی۔ مانکی بھی ہمیں ایک "جہاندیدہ" سیاح کی حیثیت سے کم مجبوشی سے یقین دلانا چاہتا ہے کہ "زمانۂ قدیم میں ہندوستان میں چینیوں کی حکومت تھی اور آجتک انکی عمارات کے آثار الورہ، سالسٹ اور دنی میں دیکھے جا سکتے ہیں"[9]۔ یہ ہیں معلومات اُس شخص کی جو کہتا ہے کہ :-

"بہت سے مصنفین سنی سنائی باتوں کو بلا تحقیق لکھ دیا کرتے ہیں"

محمد یعقوب (بی-اے-ایل ایل بی) چھاؤنی مئو

---

[1] اورنگ زیب از لین پول رولرز آف انڈیا سیریز ۱۸۹۳ء ۔ [2] سرسرکار، دیباچہ تاریخ اورنگ زیب جلد اول صفحہ ۱۵ ۔ [3] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۱۳۱ ۔ [4] ایضاً صفحہ ۱۳۱-۱۳۳ ۔ [5] صفحہ ۱۲۰ ۔ [6] صفحہ ۱۳۵ ۔ [7] صفحہ ۱۱۶ ۔ [8] کامنٹری از مانسریٹ مترجمہ ایس ہائی لینڈ ۔ [9] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۱۱۵

مکتوبات نیاز

قبلۂ محترم - بڑی مشکل آ پڑتی ہے جب کسی سے دل کی بات چھپائے نہ بنے اور وہ پوچھ بیٹھے۔ آپ کا
ود تو میرے لئے "دیوارِ حرم" ہے کہ کہیں پناہ نہ ملے تو آخر کار وہیں جا کر سر چھپانا ہے، لیکن ابھی تو تیرے بدل
ل کر وار خالی دے رہا ہوں اور خیال ہے کہ یونہی لڑتا بھڑتا نکل جاؤں گا، پھر آپ کیوں اس قدر فکرمند ہیں۔
رہا اصل معاملہ، سو بقول داغ

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

یعنی وہ خدا کا معاملہ "فردا" پر اُٹھا رکھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ خدا نام ہے صرف "آج" کا بلکہ اُس لمحہ کا جو
ن وقت گزر رہا ہے، کیونکہ فردا عدمِ محض ہے اور اس کا وجود "آج" ہی کی صورت میں متحقق ہو سکتا ہے
میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہوگا، لیکن جو کچھ بھی ہو مجھے تو اسی دنیا میں جان دینا ہے
پھر اُٹھنا نہیں، جنھیں حشر و نشر کا سوقیانہ ہنگامہ گوارا ہو وہ اس کی تمنا کریں، حوروں کی آرزو کیا کروں، جانتا ہوں
من و سلویٰ کھانے والے بھی لہسن پیاز پر اُتر آئے تھے، سونے چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے جبکہ
ن کی ایک اینٹ بھی فروخت کر کے یورپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ رزرو نہیں کرا سکتا، رہ گئے
پھل سو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں یونہی نزلہ کا زور رہتا ہے، چہ جائیکہ اس پر پھلوں کی بھرمار جو "سریع الاستحالہ"
ونے کی وجہ سے فوراً خلطِ غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ فردوس کا ٹمپریچر کیا ہوگا۔ کہا جاتا
ہے کہ وہاں ہر وقت صبحِ صادق کا سا سماں نظر آئے گا۔ لیکن کس موسم کی صبحِ صادق اور کس ملک کا موسم؟ - اگر
رزمینِ عرب کو معیار قرار دیا جائے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کے کس موسم کی صبحِ صادق ایسی ہو سکتی ہے جو دنیا کے
شخص کے لئے موزوں ہو۔

قطبِ شمالی کی بسنے والی قوم (اسکیمو) کے سامنے آپ جہنم کی بڑھتی ہوئی گرمی کا ذکر کریں گے تو وہ قصداً
ناہ کر کے وہیں جائے گی اور اگر فردوس کے موسم میں بڑا اعتدال پیدا کر کے آپ اُسے شرتی کے لکھنوی انگرکھے
لے کھینچ لائیے، تو سویڈن یا ناروے کے جنتی کے لئے وہ دوزخ سے بھی بدتر ہوگا۔

خدا کو اگر جنت و دوزخ بنانا ہوتی تو ساری دنیا کا موسم اور سب کا ذوق کبھی ایک ہی رکھتا۔ پھر اگر یہ نہیں ہو تو وہ کبھی نہیں — انھیں دشواریوں کو دیکھ کر مولوی کہتے ہیں کہ جنت میں سب ایک عمر، ایک ذوق اور ایک رجحان کے ہوں گے صورت نہالیا اس سے ایک نہیں بتایا کہ دوروں کو دھوکا ہو جاتا۔ بہرحال حشر و نشر کے عقیدہ کے ساتھ یہ طوما۔ بندی میرے لئے تو چیز نہیں۔ میں تو رہے خدا کو کسی جھگڑے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا، وہ اگر حشر و نشر نہ کرے کبھی ندار دے سکتا ہے تو پھر تم کیوں اسے ۔۔۔ کرے

آپ ہنستے نہیں ۔۔۔ ذرا غور کرے ۔۔۔ پہ لیا ؟

جی ہاں، کل ۔۔۔ دیکھ لیا، جس کے دیکھنے کی آرزو تو ہے لیکن ہمت نہیں۔

بادہ شد ز دوش و شادبر اد بجوش ناز چیدن
عالم در نگہت ۔۔۔ نفس در سرمہ سائیدہا !

پہلے مصرعہ میں " چو خوش پاشند " کی جگہ " پا پاشد " میرا تصرف ہے، جو میرے تاثر کے لحاظ سے ضروری تھا یوں تو ساری صحبت قیامت تھی، لیکن وہ وقت نہیں بھولتا جب رضی صاحب انتہائی جوش و خروش کے ۔۔ تھ آستینیں چڑھا کر کچھ کہنے کے لئے آمادہ ہوئے اور اُدھر سے یہ فقرہ کسا گیا کہ " ہٹ جانا ——
آشفتہ نوائے بسر دار برآید"

اس میں شک نہیں دونوں بلا ہیں، اور میں اب وہاں نہ جاؤں گا، جب تک " ردّ بلا " کا کوئی عمل ہاتھ نہ آجائے۔ تم تو خیر " نادِ علی " کے زور پر سارا زور سنبھال لیجاتے ہو، لیکن میں کیا کروں جبکہ نہ کوئی " مظہر العجائب " یہاں مدد کو پہونچتا ہے نہ کوئی مستجاب الدعوات !

مکرمی - شاعروں کی نہ کہئے، مرفوع القلم جماعت ہے۔ " رگِ جاں " میں تو دونوں الفاظ غیر متناسب نہیں ہیں، کیونکہ زندگی کا تعلق خون سے ہے جو رگوں میں دوڑتا ہے اور " شہ رگ " آپ جانتے ہی ہیں کہ کتنی اہم چیز ہے۔ لیکن اور رگوں کو کیا کہئے گا جو شعرا نے پیدا کی ہیں، آخر میں رگ کہاں سے آئی لیکن رگِ ابر اس باریک سفید خط کو کہتے ہیں جو سیاہ ابر کے ٹکڑے میں کہیں نظر آجاتا ہے۔ اور تو اور رگِ تلخی ملاحظہ کیجئے؛ اس سے مراد شراب و گلاب کی تلخی ہے۔ غالب نے بات میں بھی رگ پیدا کر دی ہے۔
لکھتا ہے :-

دریا بہم سخن گوئی غالب بتو گویم،
خون بخورست از رگ گفتار کشیدن

مغربی لٹریچر کے زیر اثر اردو کے انداز بیان میں بہت سی باتیں واقعی نہایت عجیب و غریب آ گئی ہیں، لیکن آپ ان کو محض اس بنا پر غلط نہیں کہہ سکتے کہ اساتذۂ سلف کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ زبان یونہی ترقی کرتی آئی ہے، اس پر ناک بھوں چڑھانا غلطی ہے۔ آپ اس سیلاب میں نہ پڑئیے، لیکن اس کے روکنے کی کوشش بھی نہ کیجئے، نتیجہ معلوم!

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان: مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم ایل اے، ایم ایل سی مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حال سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہنچایا کہ تن ڈھانکنے کو لیٹا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان امور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ۳۰۵ صفحات قیمت مجلد ۱۲

مضامین محمد علی: مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ مجلد ۶

مضامین رشید: پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، ترو تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۶

میدان عمل: ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۳

بیوہ: منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ

فکر و نشاط: حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے۔ قیمت

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ کانپور)

اس سے پہلے نگار کی بعض اشاعتوں میں مومن کے چند مشکل اشعار کا حل بعض استفسارات کے جواب میں آپنے شایع کیا تھا لیکن بعد کو وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نگار میں یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رکھا جائے تاکہ آخر میں ایک کتاب کی صورت ہو جائے۔ ذیل کے اشعار کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فرصت ہو تو توجہ فرمائیے:۔

۱۔ پھر زیب سر ہے شعلۂ داغِ جنوں سے عشق		پھر دور باش نالۂ اثر اہتمام ہے

دوسرا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔

۲۔ داغ سے میرے جہنم کی مثال		توبھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے

لفظ مثال نحوی ترکیب سے کس فعل سے تعلق رکھتا ہے۔

۳۔ بیوفائی کا عدو کی ہے گلہ		لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

جب معشوق عدو کی شکایت کرتا ہے تو اس میں عاشق کے ستائے جانے کی کیا بات ہے۔

۴۔ حیرت حسن سے یہ شکل بنی		کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

آئینہ دکھانے سے کیا مراد ہے، کہیں اس سے یہ مدعا تو نہیں کہ میں آئینہ کی طرح حیران رہگیا۔

۵۔ وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے		مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

"آگ لگے" سے مژدۂ وصل کا کیا تعلق ہے؟

۶۔ کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس		سب کا وشِ رقیب بجا کو ہکن سے ہے

۷۔ ان کو گمان ہے گلہ چینِ زلف کا خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے
۸۔ میں کیا کہ رگِ غیر پہ داماں تر شہ ہو وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے
۹۔ اک پری کہنے سے عدو کی یہ وحشتیں نفرت بلا تمھیں مرے دیوانہ پن سے ہے
۱۰۔ داغِ جنوں کو دیتے ہیں گل سے زباں مثال میں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے
۱۱۔ یوں بار نوحہ زن ہیں کہاں مرگ مجھ کو تو لب بستگی تصورِ بوسِ دہن سے ہے
۱۲۔ وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

(نگار) یقیناً یہ سلسلہ مفید ہے، اور کلام مومن کی شرح، کلام غالب سے زیادہ اہم چیز ہے، لیکن بہرحال موضوع کی صورت سے اس پر بحث کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ لیکن استفسارات کے سلسلہ میں بیشک لکھ سکتا ہوں۔ مطالعہ کے دوران میں آپ کو جو اشعار مشکل نظر آئیں وقتاً فوقتاً انھیں میرے پاس بھیجئے تعمیلِ ارشاد کی کوشش کروں گا

۱۔ پہلے مصرعہ کا آخری لفظ عشق نہیں تاج ہے۔ آپ کو صحیح یاد نہیں رہا۔ دوسرے مصرعہ کو یوں

پھر دور باشِ نالہ اثر اہتمام ہے

"اثر اہتمام" یعنی اثر کا اہتمام کرنے والا، اثر پیدا کرنے والا۔ دور باش سے مراد وہ عصا ہے جو آگے لیکر چلتے ہیں۔ نالہ کو دور باش کہنے کی وجہ ظاہر ہے۔

پہلے مصرعہ میں اپنے آپ کو "تاجدار عشق" کہکر نالہ کو نقیب بتایا، مطلب یہ ہوا کہ میرے سر پر تاج سوار ہے اور نالہ اہتمام اثر میں مصروف ہے

۲۔ پہلے مصرعہ کو تعجب کے لہجہ میں پڑھئے تو مطلب واضح ہو جائے گا۔ یعنی یہ ... داغ دل کو دیتا ہے! اے واعظ تو کیوں دل جلاتا ہے

۳۔ وہ عدو کی بیوفائی کا گلہ کرتے ہیں اور ظاہراً ہمراہ کا مجھ پر ... لیکن حقیقتاً وہ مجھے چاہتے ہیں، کیونکہ میں تو عدو کا ذکر ان سے کسی طرح سننا ہی نہیں چاہتا تھا ... شکایت کی صورت اور لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔

۴۔ اس کا حسن دیکھ کر سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا اور ... آئینہ دکھانے لگے۔ سکتہ کے بیمار کو دیکھتے ہیں کہ مر تو نہیں گیا۔ اگر آئینہ میں دم سے دھندلا پن پیدا ہو جاتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ سانس آرہا ہے تصور کر لیا جاتا ہے۔

۵ ۔ مژدۂ وصل سے زیادہ آگ لگانے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔

۶ ۔ اس شعر میں قیس، شیریں اور خسرو کی تلمیح ہے۔ کہتا ہے کہ اگر خسرو اپنے رقیب قیس سے کاوش رکھتا تو نادرست نہیں کیونکہ اس نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور شیریں کی سنگینی دل کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ یعنی اگر اسے شیریں سے محبت ہوتی تو وہ اس کی سنگینیِ دل کے احترام میں پتھر نہ کاٹتا۔

۷ ۔ زخم میں مشک بھرنے سے تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے تو زخم میں مشک بھرا تھا، کیونکہ مجھے یہ تکلیف پسند ہے، لیکن اس کی خوشبو کو دیکھ کر محبوب یہ سمجھا کہ شاید اس نے دہانِ زخم سے اس کی چینِ زلف کا شکوہ کیا تھا اور یہ خوشبو اسی وجہ سے پیدا ہوئی۔

۸ ۔ میرے مرنے پر اگر وہ اشک ریز ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ اسے مجھ سے محبت تھی، کیونکہ وہ تو ایسا ظالم ہے کہ کبھی رقیب کی موت پر بھی آنسو بہانے والا نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ وہ میرے چاکِ کفن کا ہنسنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

۹ ۔ میرے دیوانہ پن سے انھیں اس بلا کی نفرت ہے کہ عدو نے انھیں پری کہہ دیا تو خفا ہو گئے۔ مدعا یہ کہ میرے دیوانہ پن سے وہ کوئی نسبت گوارا نہیں کرتے، یہاں تک کہ جب میں دیوانہ ہوں تو انھیں کوئی پری بھی نہیں کہہ سکتا۔ مشہور ہے کہ پری کا سایہ پڑنے سے انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔

۱۰ ۔ میری وحشت کا یہ عالم ہے کہ میرے داغِ جنوں کو پھول سے تشبیہ دینے لگے تو بلبل کو بھی چمن سے وحشت پیدا ہونے لگی۔

۱۱ ۔ "مجھ کو تو" کا تعلق دوسرے مصرعے سے ہے۔ دوست احباب کہاں روتے ہیں، مجھے موت کہاں آتی ہے۔ میرے ہونٹ حسرت کی وجہ سے بند نہیں ہوئے بلکہ بوسۂ دہانِ یار نے ان کو مہر کر بند کیا ہوئے ہیں۔

۱۲ ۔ اگر تم دشمن سے اس لئے دوستی رکھتے ہو کہ وہ میرا بدخواہ ہے، تو غلطی کرتے ہو کیونکہ حقیقتاً میں خود اپنا بدخواہ ہوں وہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر تم کسی سے صرف اس لئے دوستی کر سکتے ہو کہ وہ میرا بدخواہ ہے، تو مجھ سے زیادہ کہ مجھ سے زیادہ میرا کوئی بدخواہ نہیں (اور وہ اس طرح کہ تم کو چاہتا ہوں)

علامہ مشرقی اور قبلہ کا رُخ

(جناب محمد سعید الرحمان صاحب۔ لاہور)

آپ نے غالباً علامہ مشرقی کا پمفلٹ نمبر ۹ دیکھا ہوگا، جس میں انھوں نے ملک محمد الدین صاحب سے ایک

استفسار کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے۔ یعنی مسجدوں کا رُخ صحیح نہیں ہے۔ لاہور و امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے، راولپنڈی والوں کا بغداد و دمشق، پشاور والوں کا بیروت، دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ، کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ۔

اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچھلی کئی قرنوں کی نمازیں قبلہ کی طرف ادا نہیں ہوئیں، اس لئے قبول نہیں ہوئیں اور یہ مولویوں کا اتنا بڑا جہل ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال کی تلوار ہندوستان میں ہوتی تو وہ ہندوستان کے تمام ملاؤں کو تہ تیغ کر دیتی۔

آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

(نگار) یہ پمفلٹ میری نگاہ سے گزرا ہے، اور اس کو دیکھنے کے بعد میرے شبہات علامۂ مشرقی کی طرف سے اور زیادہ بڑھ گئے ہیں پچھلے مہینے کے نگار میں آپ نے میری رائے خاکسار تحریک کے متعلق دیکھی ہوگی اور اب اس پمفلٹ کے مطالعہ کے بعد میں اُس پر اور زیادہ راسخ و مستحکم ہو گیا ہوں۔

خاکسار تحریک کے آغاز سے بہت پہلے علامۂ مشرقی سے میرا غائبانہ تعارف ان کی مشہور کتاب "تذکرہ" کے ذریعہ سے ہوا تھا اور میں نے ان کو ایک آزاد خیال شخص سمجھ کر اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے بعض مسایل میں انکی تائید بھی کی تھی، اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا اور مجھے نہیں معلوم کہ مصنف تذکرہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے، یہاں تک کہ دفعتًہ ان کی طرف سے خاکسار تحریک کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ میرے گوشۂ تنہائی میں بھی اس کی آواز پہونچی اور میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس تحریک کی غایت کیا ہو سکتی ہے اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ آپ کو معلوم ہی ہو چکی ہے۔

جس وقت میں دیکھتا ہوں کہ پمفلٹ زیر بحث، تذکرہ کے مصنف کا لکھا ہوا ہے تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ تذکرہ کا مشرقی ایک ایسا آزاد خیال انسان ہے جو ظاہری قیود شریعت سے بھی بیگانہ نظر آتا ہے اور وہ تمام شعائر اسلامی پر اُن کے مغز و روح کے لحاظ سے گفتگو کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نماز و روزہ کو بھی بیکار سمجھتا ہے اگر اُن سے اجتماعیت و استعلاء پیدا کرنے کا کام نہ لیا جائے۔ برخلاف اس کے پمفلٹ زیر بحث کا مصنف مشرقی ایک ایسا قدامت پرست، تاریک ذہنیت رکھنے والا انسان ہے جو مذہب کے ظواہر پر اتنا زور دیتا ہے کہ اگر کسی مسجد کا رُخ جغرافی و ہئیتی پیمایش کے لحاظ سے ٹھیک کعبہ کی طرف نہ ہو تو وہاں کی نمازیں بیکار ہیں اور اُن کے بنانے والے اس کے نزدیک قتل و قصاص کے مستوجب ہیں۔ یعنی وہی انسان جس نے

کسی وقت " اینما تولوا فثم وجہ اللہ " سے اسلام کے وسیع اُصولِ عبادت وطاعت کو پیش کیا ہو آج وہی تنگ خیال نظر آتا ہے کہ جب تک مسجدوں کا رُخ ٹھیک غلاف کعبہ کی طرف نہ ہو، نہ نماز ادا ہو سکتی ہے اور نہ ان مسجدوں کا نمازی مسلمان کہلایا جا سکتا ہے ۔

بیشک کلام مجید میں " فولوا وجوہکم شطر المسجد الحرام " کا حکم پایا جاتا ہے، لیکن شطر کے معنی " جہت وسمت " کے بھی ہیں اور کسی جہت کی طرف رُخ کرنے کے معنے یہ نہیں ہوا کرتے کہ ریاضیات کی مدد سے اسے متعین کیا جائے اگر علامۂ مشرقی کے مشورہ کے مطابق ہر مسجد کا رُخ غلاف کعبہ کے ٹھیک درمیانی حصہ کی سمت ہونا چاہئے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک ہی شہر کی ہر مسجد کا رُخ دوسری سے مختلف ہونا چاہئے، چہ جائیکہ تمام ہندوستان کہ اس صورت میں تو یہ فرق بہت زیادہ نمایاں ہوگا ۔

علامۂ مشرقی کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام مجید نہ ہیئت وجغرافیہ کی کتاب ہے، نہ فلسفہ وریاضی کی۔ اسمیں صرف اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور تمام انھیں آسانیوں کے ساتھ جو عامۃ الناس کے لئے قابل قبول ہوں ۔ کلام مجید میں اگر " شطر المسجد الحرام " منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ پہلے ہیئت میں کمال حاصل کیا جائے اور پھر عبادت کی جائے، بلکہ مقصود صرف اجتماعیت کی شان پیدا کرنا ہے اور اس غرض کے لئے صرف اس قدر ہدایت کافی تھی کہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو، اگر ہیئت کے نقطۂ نظر سے مسجدوں کا رُخ گز دو گز اِدھر اُدھر ہٹا ہوا ہے تو اس سے اصل مقصود فوت نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ شطر المسجد الحرام کی شرط پوری ہو ہی نہیں سکتی جب تک ایک ایک دقیقہ وثانیہ کا حساب کرکے صحیح سمت متعین نہ کیا جائے، تو اس سے اصل مقصود (طاعت وعبادت یا اجتماعیت) ضرور فوت ہو جائے گا، اور رصد گاہیں قایم کرکے صرف ہیئت کا مطالعہ کرنا مدعا رہ جائے گا ۔

اگر علامۂ مشرقی کلام مجید کی اس آیت میں اس قدر احتیاطِ تعمیل ضروری جانتے ہیں تو وہ اُن آیات کی کیا تاویل کریں گے جو طبقات الارض اور ہیئت کے اکثر مسلمہ مسایل کے خلاف ہیں اور اگر وہ ان آیات کی تاویل کرکے کوئی ایسا مفہوم پیدا کر سکتے ہیں جو علوم جدیدہ کے منافی نہ ہو، تو پھر " شطر المسجد الحرام " والی آیت کے متعلق کیوں اس قدر احتیاط وسختی برتی جاتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک اخلاقی مصلح عوام کو کبھی دماغی اُلجھن میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا، وہ تو نہایت سیدھے سادے الفاظ میں انھیں کے روزانہ مشاہدات وتجربات کی بنا پر اعتبار وبصیرت کی تعلیم دیتا ہے ۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گا کہ " دیکھو سورج ڈوب رہا ہے " اور یہ کبھی نہ کہے گا کہ " وہ دیکھو زمین کا محدب حصہ ہمارے اور سورج کے درمیان ہو گیا ہے " وہ اگر زمین کو مسطح کہتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ ایسی ہی نظر آتی ہے

اور وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ زمین مدور ہے یا غیر مدور، اور اگر مدور ہے تو اس کی گولائی گنبد کی طرح ہے یا نارنگی کی طرح۔

پھر جب اس قسم کی علمی حیثیات بین کلام مجید کی تعلیمات سے علٰحدہ ہے تو مسجدوں کا رُخ متعین کرنے میں اتنی سختی برتنا کہ اگر ہمارا منہ غلاف کعبہ کی سمت سے ذرا بھی ہٹ گیا تو نماز درست نہ ہوگی، کہاں تک قرینِ انصاف ہو سکتا ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس وقت مسلمان اپنی مسجدوں میں جاکر نمازیں ادا کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں کعبہ کا رُخ ہوتا ہے یا کسی اور ریلے کا۔ اگر ان کے دل و دماغ کی توجہ کعبہ اور مسجد الحرام کی طرف ہوتی ہے تو پھر کوئی حرج نہیں اگر مسجد کی جغرافی سمت کچھ بدلی ہوئی ہے اور اگر انکی توجہ خانۂ کعبہ سے ہٹی ہوئی ہے تو پھر مسجدوں کا صحیح رُخ بھی نمازوں میں کوئی معنویت پیدا نہیں کر سکتا۔ عبادت کا اصل مقصود توجہ الی اللہ ہے، یہاں تک کہ "قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں" چہ جائیکہ مسجد یا سمت مسجد کو اصل مقصود قرار دینا کہ اس سے زیادہ گری ہوئی بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامۂ مشرقی کا مقصود مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا کرنا نہیں، بلکہ ان میں افتراق پیدا کرنا، اور ایک خاص جماعت ایسی بنا لینا ہے جو اُن کے مخصوص اغراض کی تکمیل میں ان کو مدد پہونچا سکے۔ مسلمانوں کی حالت چونکہ اسوقت بالکل اس شعر کے مصداق ہے کہ:-

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لئے علامۂ مشرقی مسجدوں کا رُخ بدلدیں، کعبہ ہٹاکر کسی دوسری جگہ لیجائیں، جو چاہیں کریں، لیکن جب منزل حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کی آئے گی اسوقت مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ

"ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"

ہمیشہ یاد رکھئے

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا کیونکہ ڈاکخانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

معلومات

نازی بچوں کی ریاضی | جرمنی میں بچوں کے لئے ریاضی کا جو کورس بنایا گیا ہے، اس میں اس قسم کے سوالات نظر آتے ہیں:

۱- ایک ملکی مشین گن ۲۵۰ کارتوس صرف کرنے کے بعد ۲۰ آدمی ہلاک کرتی ہے بتاؤ کہ اوسط کیا پڑا؟

۲- قبل اس کے کہ ہٹلر نے ۱۶ مارچ ۳۵ء کو اپنے تجدید مسلح کرنے کا اعلان کیا، سرحد پر مخالف ملکوں کے ہوائی جہاز اس نسبت سے جمع تھے:- انگلستان ۱۷۰۰- بلجیم ۳۰۰۰ - فرانس ۲۰۰۰ - اٹلی ۱۴۰۰- زیکو ۸۰۰ - پولینڈ ۱۴۰۰- روس ۳۰۰۰ - ایک نقشہ کھینچکر ان اعداد کو ظاہر کرو۔

والٹیر کی ذہانت | جب ۱۷۲۶ء میں والٹیر فرانس سے انگلستان پہونچا تو دیکھا کہ وہاں فرانس کے خلاف سخت ہنگامہ برپا ہے، اور اس کی جان خطرہ میں ہے۔ ایک دن مجمع نے اسے گھیر لیا اور ہر طرف سے یہ آواز بلند ہونے لگی کہ "اس فرانسیسی کو مار ڈالو"

والٹیر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجمع کو مخاطب کرکے کہا کہ "تم لوگ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو اس لئے کہ میں فرانسیسی ہوں، لیکن کیا تمھارے نزدیک میرے لئے یہ جرم نہیں ہے کہ میں انگلستان کا باشندہ نہیں ہوں"

مجمع منتشر ہو گیا، اور وہ اپنی جائے قیام پر صحیح سلامت پہونچ گیا۔

زہر کی شناخت مچھلی کے ذریعہ سے | جب کوئی شخص مشتبہ حالت میں مرتا ہے تو اس کے جگر کا معائنہ کیا جاتا ہے، کیونکہ زہر کے ذرات یہاں ضرور کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں وہ استنے کم ہوتے ہیں کہ معمولی تجزیہ سے پتہ نہیں چلتا اور جگر کا افشردہ چوہے کے جسم میں پچکاری کے ذریعہ سے پہونچایا جاتا ہے کیونکہ چوہا بہت ذکی الحس ہوتا ہے اور زہر کے اثر کو فوراً قبول کرتا ہے۔ تاہم اگر زہر کی مقدار بہت قلیل ہو تو چوہا بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اب مچھلی کو تلاش کیا گیا ہے۔ جگر کا افشردہ پانی میں ڈال دیا جاتا ہے اور مچھلی اس میں چھوڑ دی جاتی ہے۔ اگر اس میں قلیل ترین مقدار بھی زہر کی ہوتی ہے تو مچھلی پر فوراً اس کا اثر ہو جاتا ہے۔

۲۰۰۰ سال قبل بجلی کی بیٹری

عجائب خانۂ عراق کے مہتمم کو حال ہی میں بغداد کے قریب زمین کے اندر سے ایک عجیب وغریب ظرف دستیاب ہوا ہے۔ یہ ایک مٹی کا ظرف ہے جس کے اندر تانبہ کا ایک سلنڈر پایا جاتا ہے۔ اس کے نیچے کے حصہ پر تانبہ کی چادر چڑھی ہوئی ہے اور اندرونی حصہ پر اسفلٹ کی موٹی تہ ہے۔ سلنڈر کے اوپر کے حصہ میں ایک پلگ (Terminal) ٹھوس لوہے کا لگا ہوا ہے۔ اس آلہ کا تعلق سوائے بجلی کے کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔

یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جو مسیح سے ۲۵۰ سال قبل پارتھین حکومت یہاں پائی جاتی تھی۔ اسی طرح کے اور تین چار ظرف بغداد کے قریب دجلہ میں دریافت ہوئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب سے ۲۰۰۰ سال قبل ہلکی بجلی پیدا کرنے کے لئے یہ آلات طیار کئے جاتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان سے علاج کا کام لیا جاتا ہو۔

دنیا کا سب سے پرانا اخبار بند ہو گیا

جاپان میں ایک اخبار "پیپنگ باؤ" ۲۷۰ سال قبل جاری ہوا تھا اور اپنی آزادرائے کے لئے مشہور تھا۔ اس کے بہت سے اڈیٹر بادشاہ پر نکتہ چینی کے الزام میں قتل کئے گئے لیکن یہ اخبار برابر اسی شان کے ساتھ جاری رہا۔ لیکن جاپان کی عسکری حکومت نے اب اس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

حوادث کا نشانہ

آئی اووا (Iowa) میں ایک شخص ہینک شیفر نامی رہتا ہے جو حوادث کے لحاظ سے نہایت بدقسمت انسان سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ جوان تھا تو کوئلہ کی کان میں دب گیا۔ اس کے چند سال بعد معدن میں دھماکا ہونے کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ اور ایک آنکھ غائب ہو گئی، پھر وہ پچاس فٹ کی بلندی سے گرا اور سر کو سخت صدمہ پہونچا، وہ مشکل سے اچھا ہوا تھا کہ گھوڑے نے لات ماری اور پھر اسپتال پہونچ گیا۔ ۸۰ سال کی عمر میں اسے دونوں پھیپھڑوں کا نمونیا ہو گیا۔ ۸۲ سال کی عمر میں ایک گھوڑا اسے کچلتا ہوا گزر گیا اور ۸۴ سال کی عمر میں ایک موٹر کے نیچے آ گیا۔ تین دفعہ اس پر بجلی بھی گر چکی ہے اور اب کہ اس کی عمر کی آخری ساعتیں ہیں اس کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔

پانچ کروڑ سال قبل کی مچھلی

گزشتہ دسمبر میں شمالی افریقہ کے سمندر سے ایک مچھلی نکلی ہے جو اب سے پانچ کروڑ سال قبل پائی جاتی تھی۔ بویریا کے پہاڑوں سے مچھلی کا جو ڈھانچہ برآمد ہوا تھا، وہ بالکل اسی مچھلی کا تھا اور اس زمانہ کا تھا جب یہ پہاڑ پانی سے ڈوبے ہوئے تھے۔

حیرت ہے کہ پانچ کروڑ سال میں بھی اصول ارتقا نے مچھلی کی اس قسم پر اپنا کوئی عمل نہیں کیا۔

تنوعات

دنیا میں سب سے پہلے ہڑتال مسیح سے ۳۰۸۵ سال قبل، مصر کے مزدوروں نے کی تھی جب ایک ہرم ([illegible]) کی تعمیر کے دوران میں ہلدی کم پڑ گئی تھی ——— ایک معمولی ریشمی موزہ میں ۵۰ میل لمبا ریشم کا تار ہوتا ہے ——— تیتریاں اپنی زبان کو کمان کی طرح لپیٹے رکھتی ہیں ——— اگر ایک مکڑی کرۂ ارض کے چاروں طرف ایک تار کا جالا بُن دے تو اس کا وزن ایک پونڈ ہوگا ——— امریکہ میں ۲۱۳ مذہبی طبقے پائے جاتے ہیں ——— ہیرا وزن کرنے کی ترازو اس قدر مکمل ہوتی ہے کہ ایک پلک یا خاک کے چند ذرے بھی اس کے پلڑے کو جھکا دیتے ہیں ——— گرمیوں میں انسان کا وزن کچھ بڑھ جاتا ہے ——— جب شہد کی مکھی کو کسی پھول میں شہد کی موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ اس کو پکڑ اپنے چھتہ کی طرف اُڑ جاتی ہے اور یہاں وہ رقص کرنے لگتی ہے، یہ دیکھ کر تمام مکھیاں سمجھ جاتی ہیں اور اس کے ساتھ چلی جاتی ہیں ——— وسط یوروپ کی موجودہ سیاسیات کو دیکھ کر امریکہ کے محکمۂ تعلیم کو ہدایت کی گئی ہے کہ فی الحال یہاں کا جغرافیہ بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور نقشے چھاپنا بند کر دئے جائیں ——— اہل چین سیاہ انڈے کھانے کے بڑے شایق ہیں، اس غرض کے لئے انڈے زمین میں دفن کر دئے جاتے ہیں اور کئی سال کے بعد جب ان کی زردی بالکل سیاہ ہو جاتی ہے تو نکال کر کھاتے ہیں ——— جاپان کے پجاریوں کا زیادہ وقت اس بات میں صرف ہوتا ہے کہ وہاں کے مچھلی کھانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں، کیونکہ بودھ مذہب کی رو سے کسی کی جان لینا یا گوشت کھانا سخت ممنوع ہے ——— سمندر کی موجوں کی بلندی ۲۵ سے ۵۰ فٹ تک ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ بلند موج ۸۰ فٹ کی تھی جو سنہ ۲۲ء میں دیکھی گئی ——— انگریزی کے ۲۶ حروف سے جتنی ممکن صورتیں امتزاج کی پیدا ہو سکتی ہیں ان کا ایک شخص نے برسوں کی محنت کے بعد ریاضی سے حساب لگایا ہے کہ ان کی تعداد ۶۲۰۴۴۸۴۰۱۷۳۳۲۳۹۴۳۹۳۶۰۰۰۰ ہوتی ہے ——— چینی زبان کے حروف ہجا ۵۰۰۰۴ ہیں ——— افریقہ میں ایک قوم کاروَن کے نام سے موسوم ہے ان کے یہاں یہ رسم ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی بیوی کو چرا لیتا ہے تو سردار قبیلہ قوم

کے اور بڑے بڑے آدمیوں کو بلا کر مشورہ کرتا ہے اور اگر اس زمانہ میں اتفاقاً گوشت کم میسر آتا ہے تو اسے بھون کر کھا جاتے ہیں ——— مہاراجہ میسور کے پاس ایک گائے ہے جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے ہے اس کا وزن ۲۰۰۳ پونڈ ہے اور ۵۰ پونڈ سے زیادہ روز دودھ دیتی ہے ——— ہیرے پر اگر ریڈیم شعاع ڈالی جائے تو وہ سبز ہو جاتا ہے ——— سمندر کی سب سے زیادہ گہرائی اس وقت تک جاپان اور فلپائن کے درمیان دریافت کی گئی ہے ۴۰۰۰ فٹ ہے ——— سر کا سب سے زیادہ نازک حصہ گدی ہے ——— تیتریاں اپنے پاؤں سے چکھنے کا کام لیتی ہیں اور اُن کی یہ حس ۱۲۰۰ گنا انسانی حس سے زیادہ قوی ہوتی ہے ——— برف کے بلورات کی ہزار روں تصویریں لی گئی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتی ——— ہر لفظ جو منھ سے نکلتا ہے وہ ہمارے ۷۲ مختلف عضلات کی حرکت کا نتیجہ ہوتا ہے ——— دنیا میں روزانہ ۴۴۰۰ طوفان برق باد آتے رہتے ہیں ——— شہر امسٹرڈم ۹۰ جزیروں پر تعمیر ہوا ہے ——— دنیا کی آبادی میں نصف سے زیادہ ایسی ہے جو روزانہ تین بار چاول کھاتی ہے ——— دنیا کی تمام زبانوں کے حروف ہجا میں پہلا حرف وہ ہے جس کی آواز آ یا الف سے پیدا ہوتی ہے ——— جیمس گارفیلڈ امریکہ کا پریسیڈنٹ بیک وقت ایک ہاتھ سے لاطینی خط اور دوسرے ہاتھ سے یونانی خط لکھ سکتا تھا ——— آرجنٹنا کے صوبہ سینٹیاگو میں ایک انجینیر نے برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذریعہ سے پانی برسانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے ——— دنیا کا سب سے زیادہ تیز خوشبو رکھنے والا درخت امریکہ کا زقوم (تھوہڑ) ہے جس کی ایک کلی کی خوشبو نصف میل پر محسوس ہوتی ہے ——— مشین گنوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے خشک برف استعمال کیا جاتا ہے ——— گلاب کا ایک پونڈ تیل حاصل کرنے کے لئے ۸۰ ٹن پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے ——— نیلے رنگ کی وھیل مچھلی دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ عظیم الجثہ جانور ہے، جس کی لمبائی پیدا ہوتے وقت ۲۴ فٹ ہوتی ہے ——— سمندروں میں اتنا نمک پایا جاتا ہے کہ اس سے ۴۸ لاکھ مکعب میل کی چٹان طیار ہوسکتی ہے ——— مادہ شتر مرغ دن کو انڈوں پر بیٹھتی ہے اور نر رات کو۔

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ ر۔ رعایتی ۱۲ ر۔ علاوہ محصول۔ منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

شہر یار دکن کا ایک فرمان قرآن پاک کی روشنی میں

اعلانِ اصلاحات کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت شہر یارِ دکن نے جس بلند نظری اور بلوسِ فطرت سے کام لیا ہے سیاست وتدبر کے لحاظ سے اس کا جو مرتبہ ہے وہ تو سبھی جانتے ہیں لیکن اگر نظر کو کسی قدر اور وسعت دیجائے اور واقعات کی تمام کڑیوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عقلِ انسانی کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کا تعلق دنیائے آب وگل سے نہیں بلکہ اُس عالمِ روحانیت سے ہے، جو "تاج پوش" نہیں بلکہ "تاج بخش" ہستیوں کے لئے مخصوص ہے

جن حضرات نے دورِ عثمانی کا غایر مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ دکن کا موجودہ فرمانروا اپنی سیاسیات، اپنے اُصولِ حکمرانی اور اپنی خانگی زندگی کے لحاظ سے قدرت کا وہ عجیب وغریب مظہر ہے جس میں انسانیت کا علو، اخلاق کا ارتقار اور فراست وتدبر کا استعلا، انتہائی نقطۂ عروج تک پہونچا ہوا نظر آتا ہے اور جس کی مثال، زمانہ ہزاروں کروٹیں لینے کے بعد بھی مشکل ہی سے کبھی کبھی پیش کرسکا ہے

اعلٰحضرت کی اصابتِ فکر و رائے اور حریتِ ذہن وضمیر کی اتنی روشن مثالیں دنیا کے سامنے موجود ہیں کہ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، لیکن حال ہی میں اصلاحات کے اعلان اور اس کے بعد ۲ راگست کے فرمان خصوصی نے جو مہر توثیق ان پر ثبت کردی ہے وہ تاریخ حکومت وسیاست کا یادگار واقعہ ہے

اصلاحات کے اعلان کے بعد اندرونِ ملک میں ایک خاص قسم کی شورش پیدا ہوچلی تھی اور اس کی مختلف تدبیریں لوگوں کے ذہن ودماغ میں کام کررہی تھیں، لیکن جس اُصولی غلطی کی بنا پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہورہا تھا اس کو سب سے پہلے اعلٰحضرت ہی کی نگاہ رمز شناس نے پہچانا اور اولین فرصت میں اس کی وضاحت وتصحیح فرماکر اپنے حکیمانہ فرمان کے چند جملوں سے "رئیس وریاست" کے تعلقات کا وہ کلیہ بیان کردیا جو تاریخ سیاست میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے

ارشاد ہوتا ہے :-

"میں کچھ عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ عوام میں اور بخصوص ان کے لیڈروں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ

رئیس ایک شے ہے اور اس کی مقرر کردہ کونسل دوسری شے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔۔۔ رئیس ہی کل ملک کی سود و بہبود کا واحد ذمہ دار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مشیر بھی ۔ اگر کسی وقت ، دونوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہو گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ دنیا میں اکثر ایسا ہوا کرتا ہے اور ہر شخص اپنے زاویۂ نگاہ سے رائے دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

الحاصل پبلک کو اچھی طرح سے جاننا چاہئے کہ ایسا او وقت رئیس اپنی کونسل کے مشورہ یا تجاویز کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہے یہ سمجھکر کہ سب اس کے وابستگان سے ہیں اور وفادار ہیں اور یہ گروہ اس قسم کا نہیں ہے جس نے ناعاقبت اندیشی یا خودغرضی کو اپنا شعار بنایا ہو۔۔۔۔۔۔۔"

یہ ہیں الفاظ اس فرمان کے جس کا ایک ایک لفظ دنیائے معانی اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے ۔۔۔

اس سے قبل بھی جب کوئی فرمان یا تحریر اعلیحضرت کی میری نگاہ سے گزری ہے ، میں نے ہمیشہ اس کے اندر ایک اشارۂ غیبی محسوس کیا ہے ، اور جب یہ فرمان میری نگاہ سے گزرا تو اس وقت بھی میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور فوراً سورۂ آلِ عمران کی وہ آیت میرے سامنے آ گئی جس میں رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے :-

" وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ "

(یعنی اے رسول اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرو اور جب تم کوئی ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرکے اسے کر گزرو ، کیونکہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں)

کلام مجید کی یہ آیت اک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی ، لیکن کلام خداوندی کی یہ بلاغت ہے کہ اس کے احکام خصوصی میں بھی ، اصولِ عمومی کی تعلیم پنہاں رہتی ہے ، چنانچہ اس آیت کے ذریعہ سے رسول اللہ کو ایک عام اصولِ سیاست و سیادت یہ بتایا گیا ہے کہ مشیروں سے مشورہ کرو اور اگر اس مشورہ کی بنا پر تم نے کوئی ارادہ استوار کر لیا ہے تو ضرور اس پر عمل کرو

چونکہ اعلیحضرت کو اپنی بے نظیر عالمانہ بصیرت کے لحاظ سے قرآن مجید اور احادیث نبوی پر خاص عبور حاصل ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ جب یہ فرمان سپرد قلم فرمایا گیا ہوگا اسوقت سورۂ آل عمران کی یہ آیت بلکہ ایسی تمام آیتیں جو مشورے کی اہمیت پر نازل ہوئی ہیں ، اعلیحضرت کے پیش نظر ہوں گی جبھی تو فرمانِ مبارک میں بھی پبلک کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ " رئیس اور اس کی کونسل کو دو علٰحدہ چیزیں سمجھ لینا سخت غلطی ہے "

اس آیت میں ایک اور نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ " شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ " کے بعد " فَإِذَا عَزَمْتَ " کی قید لگا دی گئی ہے ، یعنی مشیروں کی رائے پر عمل کرنا اسی وقت قرین مصلحت ہے جب تم کو بھی اس پر اطمینان ہو ، لیکن اگر تمھیں اطمینان نہ ہو تو پھر خدا پر بھروسہ کرکے جو تم مناسب سمجھتے ہو وہی کرو

فرمانِ مبارک میں بھی بہ الفاظِ دیگر اسی نکتہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ " رئیس ہی کل ملک کی بہبود کا دائمی ذمہ دار ہے اور اگر کسی وقت دونوں میں کسی مسئلہ پر اختلافِ رائے ہو گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں " یعنی رئیس نہ اپنے مشیروں کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور نہ اختلافِ رائے کی صورت میں عمل نہ کرنے پر مامور ۔ اصل چیز نیت کا خلوص ہے اور اس بنا پر اگر باوجود اختلاف کوئی رئیس اپنی کونسل کے مشورہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو یہ اس کی قائدانہ بلند نظری ہے، چہ جائیکہ خود رئیس بھی اپنے مشیروں کی رائے کو پسند کرتا ہو کہ اس صورت میں تو پھر وہی " فتوکل علی اللہ " کی ہدایت سامنے آتی ہے، جس پر ہمیشہ اعلیٰحضرت کی پرائیویٹ و پبلک زندگی کا انحصار رہا ہے اور جس کی بنا پر اعلیٰحضرت کی ذاتِ گرامی کو بجا طور پر آیۂ رحمتِ الٰہی قرار دیا جا سکتا ہے

اصلاحات کے اعلان کے بعد ملک کے بعض افراد اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے صرف کونسل کی مرضی سے ہو رہا ہے اور اعلیٰحضرت کی پسندیدگی کو اس میں دخل نہیں ہے ۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اعلیٰحضرت اور کونسل کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ۔ یقیناً یہ ایک ایسی بات تھی جس سے اقتدارِ شاہانہ پر اثر پڑتا تھا اور دکن کی پبلک کو جو اعلیٰحضرت سے انتہائی عقیدت و الفت رکھتی ہے بتشکیک متفکر و متردد ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف تھی اور دکن کی تمام اصلاحات و ترقی کا سرچشمہ اعلیٰحضرت ہی کی ذاتِ اقدس ہے، اس لئے حضرت حکیم السیاست نے فوراً پبلک کی اس دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ لیا اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ سے وہ تمام حقیقتیں بے نقاب کر دیں جو عوام کی نگاہوں سے چھپی ہوئی تھیں

اگر دکن کی کوئی جماعت واقعی ان اصلاحات کا سررشتہ اعلیٰحضرت کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں تصور کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے فرمانروا کو ابھی تک سمجھا ہی نہیں اور وہ شہریارِ دکن کی اُن بلند خصوصیات سے بالکل بے خبر ہے جو جادۂ شریعت ہی پر چلنے والے فرمانروا میں پائی جا سکتی ہیں

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دکن کے مسلمان، ذاتِ شاہانہ کے اس غیر معمولی شرف و امتیاز کو انحطاطِ اقتدار پر محمول کرتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مسلمان فرمانروا کی اصلی شان " اخذ و تناول " نہیں بلکہ " فضل و عطا " ہے، وہ اتنا لیتا نہیں جتنا دیتا ہے، اس کے یہاں " دار و گیر " نہیں بلکہ " بخشش و کرم " ہے ۔ وہ جسم کے ساتھ جان و روح پر بھی فرمانروائی کرتا ہے، دکھ درد دور کرنے میں رنگ و نسل کا امتیاز اس کے سامنے نہیں ہوتا اور جب وہ فریاد کو پہونچتا ہے تو اس کی آنکھیں یہ نہیں دیکھتیں کہ فریاد کرنے والا کون ہے

اس لئے اس وقت جو محاذ اصلاحات کے خلاف وہاں قایم ہوا ہے وہ کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا اور اب کہ فرمان خصوصی نے ان حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے اور اگر بعض افراد اب بھی اس پر اسرار کریں تو پبلک کو ان کے ساتھ بہت سمجھکر اور سنبھل کر قدم اٹھانا چاہئے کیونکہ ان کا یہ فعل اعلحضرت کی سرتابی میں شمار ہوگا جسے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی

جنوری ۱۹۴۰ء کا "نگار"

نظیر اکبرآبادی نمبر ہو گا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے وہ اہل قلم جو نظیر اکبرآبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

حسب ذیل حضرات لکھ رہے ہیں، لیکن نہ کوئی عنوان کسی کے لئے مقرر ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک عنوان پر ایک ہی صاحب کا مقالہ ہو۔

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔ اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد علوی بی۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔ احمد اکبرآبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبرآبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق	=	جناب مخمور اکبرآبادی بی۔ اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	=	جناب مولانا سیماب اکبرآبادی

(نوٹ) نظیر نمبر کی کتابت ماہ آیندہ شروع ہو جائے گی اس لئے براہ کرم جلد توجہ فرمایئے اور اپنا مقالہ بھیجکر ہم کو موقعہ دیجئے کہ اس کے لئے موزوں جگہ نکالی جاسکے۔

نیاز

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمین والوں کے دل کو فضا کو دیکھ لیا
وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا
دلوں میں بیٹھ گیا تیرِ آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر
یہ ساکنانِ فلک دردِ غم کو کیا جانیں
یہ خاکیوں کی رہِ بیش و کم کو کیا جانیں
وہ غم کو پی تو سکے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے
فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیرِ آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

مخدوم محی الدین

جنگ

طبل کے بجتے ہی اُٹھا اک فلک پیما غبار
موت کے قدموں پہ دنیا جھک گئی بے اختیار
آسمانوں پر تباہی کا دھواں چھانے لگا
جنگ کا پرچم ہوا میں پیچ و خم کھانے لگا
خوف سے گاوِ زمیں کے پاؤں تھرانے لگے
توپ گرجی، حشر اُٹھا، زلزلے آنے لگے
ڈھیر اک مٹی کا بن کر رہ گئے شہر و دیار
خاک پر سر پیٹتی ہے قصر و ایواں کی بہار
آگ کے طوفاں میں اب آتش بجاں ہے زندگی
وہ دھواں چھایا کہ دب کر رہ گئی رخشندگی
بے دل بیدار ہیں افسردہ جینے کی اُمنگ
چشمِ بینا میں ہے نقشِ زندگی بے آب و رنگ
بیکسوں کا نالۂ غمگیں کوئی سنتا نہیں
رحم و نیکی کا فریبِ عقل سر دھنتا نہیں
زندگی کی صبح دیکھ اور زندگی کی شام دیکھ
دیکھ، اے انساں! ہوس کاری کا یہ انجام دیکھ
وہ پڑی پھرتی ہیں گلیوں میں برافگندہ نقاب
جن کے جلوؤں کو ترس جاتی تھی چشمِ آفتاب

بے زبانوں کے گلے میں طوق ڈالا جائے گا
بول، اے تہذیبِ حاضر! تجھ سے دیکھا جائیگا

کاوش حیدرآبادی

مسائلِ لطیف

بہار نظر آسماں پر بچھا دے
ستاروں کو کچھ خوبصورت بنا دے

ہے مدھم ما ہ شیشۂ سرد ساقی
ذرا ساغرِ ماہ کو جگمگا دے

ہے شبنم سرشتوں کا ایماں محبت
رضا جوئی آفتاب فنا دے

وہی گرم و تیز اور وحشی محبت
وہی خوئے انجام ناآشنا دے

بقا، اک ہوس کی ہے بگڑی سی صورت
مری زندگی کو خلوصِ فنا دے

غم ناشناسی سے دل بجھ گیا ہے
مجھے اک رفیقِ مزاج آشنا دے

بہت گفتگو کر چکا ہے زمانہ
مجھے بھی کسی روز اِذنِ نوا دے

بہت مشکلیں سامنے ہنس رہی ہیں،
ذرا تو بھی اے ماہ وش مسکرا دے

بہت آفتیں پیچ و خم کھا رہی ہیں،
ذرا ان کو اک تیز چتون دکھا دے

سمندر کو ہے وہم گہرائیوں کا
مرے دل کے گوشے سے پردہ ہٹا دے

حوادث کا پندار زک کھا چکا ہے
ذرا آپ ہی اب تو گردن جھکا دے

وہ آتشکدے ہار کر بجھ چکے ہیں،
کسی اور آتشکدے کو جلا دے

مری وحشتوں میں ابھی حوصلے ہیں
کڑکتی ہوئی بجلیوں کو صدا دے

مرے بازوؤں میں ابھی شورشیں ہیں،
کسی مست طوفاں کا شانہ ہلا دے

مرے گرم انفاس مائل بہ ضد ہیں
ذرا آندھیوں کو توجہ دلا دے

مری اک غزل آتشیں لے میں پڑھ کر
فسردہ عناصر سے شعلے اٹھا دے

تعین کا افلاس ہے حدِ ہستی
ذرا اس کو حدِ عدم سے ملا دے

عدم

شکستِ نایاب

کیرم کی ایک بازی کے دلچسپ تاثرات

سچ ہے کہ بہت رات گئی بج چکے بارا ۔۔۔ کیا کیجئے کیرم کا ہے کچھ کھیل ہی پیارا
تم کھیل میں ہو، کچھ سے ہے کچھ حال ہمارا ۔۔۔ خیرہ نگہِ شوق ہے، حیران ہے نظارا
رکھوں نہ اگر پاؤں زمیں پر تو بجا ہے ۔۔۔ ذرے کو ہے مہتاب نے کرنوں سے سنوارا
رہ رہ کے ہمیں تہنیتِ عشق و وفا میں ۔۔۔ پروین نے آواز دی، زہرہ نے پکارا
کس بات میں ہم کم ہیں، فلک سر نہ اُٹھائے ۔۔۔ اک چاند ہے اُس کا، تو ہے اک چاند ہمارا
لیکن یہ قیامت ہے کہ پہلو میں بٹھا کر ۔۔۔ دشوار نگاہوں کو ہے نظارا تمھارا
ابتک تو بڑے ضبط سے ہم کھیلے ہیں لیکن ۔۔۔ کیا کہئے کہ اب کھیل کی ہمت ہے نہ یارا
مہروں کی جگہ گرتا ہے ہر ہاتھ میں ضارب ۔۔۔ بیتاب ہے جب دل ہی تو کیا کھیل ہمارا
اُف تم ہو کہ ہر وار میں پہلے سے بھی ہشیار ۔۔۔ ملتا ہے تمھیں میری شکستوں کا سہارا
جس جیب کی جانب اُٹھی انگشتِ حنائی، ۔۔۔ اُس جیب میں آہستہ سے اک مہرہ اُتارا
رخ کھیل کا بدلا ہے عجب لطف سے تم نے ۔۔۔ جو چال ہے اک سحر ہے، جو ہاتھ ہے پیارا
ہر آن میں ضربوں کا نیا رنگ ہے کیا خوب ۔۔۔ ہر لحظہ میں ہے کھیل ترقی پہ تمھارا
جس جیب کو دیکھا وہی پھولی نہ سمائی ۔۔۔ اک آن میں بازی کا ہوا وارا نیارا
افلاک کی گردش بھی اگر سچ ہے تو ہے جھوٹ ۔۔۔ اعجاز ہے مہروں کا یہ رقصِ نظر آرا
اُڑتے ہوئے مہروں کا یہ اُٹھتا ہوا طوفان ۔۔۔ جیبوں کی طرف میرا یہ حسرت سے نظارا
سچ پوچھو تو یہ بات کی اک بات ہے ورنہ ۔۔۔ بچتا ہے کہیں ہار سے یہ بھی عشق کا مارا
کیرم ہی پہ موقوف ہے کیا میری تباہی ۔۔۔ سچ یہ ہے کہ تم سے تو ہر اک کھیل میں ہارا

اس ہار پہ بھی دل کو بہت ناز ہے فطرت
یہ ہار بھی شاید ہی ہو قسمت کو گوارا

فطرت واسطی

عالمِ برشگال

اے بیم و امید کس بلا میں دل ہے، منزل پہ یقین کی گزر مشکل ہے
برسے یا لے اُڑے ہوا کیا جانیں لپٹا ہوا بادلوں میں مستقبل ہے

یہ کس کا دل و دماغ لیکر نکلے کس کی فرقت کا داغ لیکر نکلے
برسات کی تاریک شبوں میں یارب جگنو یہ کدھر چراغ لیکر نکلے

کوئل نے بھی حشر اُٹھا دیا ہے ہمدم احساس کو تھرتھرا دیا ہے ہمدم
فریاد کناں ہے کسی شاعر کی یہ روح دنیا نے جسے بھلا دیا ہے ہمدم

برسات نے منھ زخم جگر کا کھولا پھر دل کے لہو میں درد کا رس گھولا
وہ دل سے کراہنے کی آواز آئی، وہ دور کسی طرف پپیہا بولا

نجم آفندی

چند قابل مطالعہ کتابیں

واردات:۔ منشی پریم چند آنجہانی کے یادگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، کاغذ طباعت اعلیٰ تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد صرف عہ

جنون و حکمت:۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی والہانہ رباعیات کا دلکش مجموعہ قیمت ۱۲؍

شعلۂ طور:۔ (طبع ثانی) حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان جس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور جو نئی ترتیب اور بہت کچھ تازہ کلام کے اضافہ کے ساتھ شایع ہوا تھا، قریب الختم ہے۔ قیمت ۱۲؍

دیوان غالب جرمنی:۔ دیوان مکمل ہے جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ جرمنی میں خاص طور سے چھپوایا گیا ہے۔ قیمت قسم اول ۱۲؍ قسم دوم [illegible] سوم بغیر جلد عہ؍

منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

جوہر تخلیق شاہنامہ کی جنگ کاموس کشانی کا ترجمہ ہے اُردو نظم میں۔ جناب سید محمد علی صاحب حشم داعی پوری اسکے مترجم ہیں، جن کو شاہنامہ سے بہت شغف ہے اور جو ابتدا عمر سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جنگ کاموس کشانی، فردوسی نے تین ہزار اشعار میں پھیلا کر بیان کی ہے، لیکن جناب حشم نے مختصر کرکے تقریباً ۹۰۰ اشعار میں اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

اگر شاہنامہ کو بند کرکے ترجمہ کو دیکھا جائے تو اس کی سادگی و برجستگی کی داد دینا پڑے گی، لیکن اصل سے فی الحقیقت اس کو کوئی نسبت نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کا سا جوش ترجمہ میں پیدا کرنا ممکن ہی نہیں۔

مثالاً میں چند اشعار فردوسی کے اور اسی کے ساتھ ترجمہ پیش کرتا ہوں جس سے دونوں کا فرق معلوم ہوگا فردوسی ایک جگہ تیر اندازی کی تصویر کھینچتا ہے اور ترکش سے تیر نکالنے کے وقت سے لیکر اس کے پیوست نشانہ ہونے تک تمام جزئیات کا استقصار کرتا ہے اس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

خدنگے برآورد پیکاں چو آب   نہادہ بر او چار پر عقاب

اس کا ترجمہ کیا گیا ہے :-

کماں میں رکھا ناوک بے اماں   جمیں قبضۂ چرخ پر اُنگلیاں

پہلے مصرعہ میں بے اماں کا لفظ بالکل برائے بیت استعمال کیا گیا ہے اور پیکاں کی جو خوبی فردوسی نے ظاہر کی ہے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ دوسرے مصرعہ میں فردوسی نے صرف ضمیر (او) سے کام لیا تھا اور ترجمہ میں اس کی جگہ "قبضۂ چرخ" استعمال کیا گیا ہے جو علاوہ ثقیل ہونے کے اس لحاظ سے غلط بھی ہے کہ "او" کا اشارہ خدنگ کی طرف ہے نہ کہ "قبضۂ چرخ[1]" کی طرف اور چار پر عقاب کا ترجمہ اُنگلیاں تو اس قدر عجیب و غریب چیز ہے کہ کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔

---

[1] چرخ مجازاً کمان کو بھی کہتے ہیں۔

اس کے آگے فردوسی لکھتا ہے :-

بمالید چاچی کماں را بدست | بچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خم چرخ چاچی بخاست

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :-

لیا بوسۂ شست سوفار نے | لیا سخت چٹکی کو جرار نے
یہ پیچھے ہٹا وہ بڑھا ساتھ ساتھ | جھکا ایک سیدھا ہوا ایک ہاتھ

ترجمہ میں دونوں شعر کے پہلے مصرعے بالکل بیکار ہیں۔ اخیر کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس | سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ | فلک گفت احسن ملک گفت زہ

ترجمہ کیا گیا ہے :-

نشانہ بنا سینۂ اشکبوس | دلیر کشانی ہوا خاکبوس
جھکا دست بوسی کو چرخ کہن | قضا نے صدا دی بگیر و بزن

فردوسی کا دوسرا شعر بالکل الہامی ہے اور اسی کے دوسرے مصرعہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس سے میرا مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں کہ فاضل مترجم کی کاوش بالکل بے معنی ہے، لیکن اس کی کوئی خاص افادی صورت میرے سامنے نہیں۔ شاہنامہ سے لطف اُٹھانے والے ترجمہ کو دیکھیں گے نہیں اور جو ترجمہ پڑھنے والے ہیں وہ شاہنامہ سے لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اگر نثر ہی میں اس داستان کا ترجمہ کر دیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ اُن ادبی و لسانی خصوصیات کو بھی ظاہر کر دیا جاتا جو فردوسی کے کلام میں پائی جاتی ہیں تو بیشک یہ ادبی خدمت ہوتی۔

اس کا نام جوہر تخلیق صرف اس لئے رکھا گیا کہ یہ ہجری مادۂ تاریخ ہے، ورنہ اصل داستان سے اس نام کا کوئی تعلق نہیں۔

کتابت و طباعت نہایت اچھی ہے اور قیمت ۸ر - شائع کنندہ درج نہیں۔

روحِ غالب غالب کے اُردو مکاتیب کا انتخاب ہے جس کے ساتھ ان کے حالات زندگی بھی دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اس کے مرتب ہیں اور ادارۂ ادبیات اُردو نے اسے حیدر آباد سے شایع کیا ہے، لکھائی چھپائی نفیس ہے اور قیمت ۱۲؍

خواب کی دنیا مولانا عبدالمالک آروی کی تصنیف ہے اور اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع

پر اس قدر جامعیت کے ساتھ پیش کی گئی ہو۔ اس میں نہ صرف آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص ہے بلکہ مغرب و مشرق کے اور بہت سے ماہرین نفسیات کی تحقیق "خواب" کے بارہ میں پیش کی گئی ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے یہ مسئلہ ہمیشہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور لوگوں نے اس کی بڑی چھان بین کی ہے۔ لیکن اس وقت تک اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو محققین سلف کی ان تمام کاوشوں کو یکجا پیش کرتی ہو اس لئے مولانا عبدالمالک صاحب کی یہ کوشش حد درجہ قابل ستایش ہے اور امید کی جاتی ہے کہ ملک اس جنس گرانمایہ کی قدر کرکے مولانا کو موقعہ دے گا کہ وہ اپنی اور تصانیف بھی دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ طاق بستاں ۔ آرہ

روحِ حیات جناب اختر قریشی کے چند مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو ادبیت کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہیں۔ کہیں کہیں دجوہات اور فی زمانہ ایسی لغزشیں پائی جاتی ہیں لیکن بحال خیال لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ شروع میں حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ جناب تسمین عابدی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اختر صاحب کی تصویر بھی شامل ہے۔

ہمدردِ صحت ضبط تولید نمبر ہمدرد دواخانہ دہلی سے ایک طبی رسالہ "ہمدرد صحت" عرصہ سے شایع ہو رہا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسوقت ہندوستان میں کوئی طبی ادارہ ایسا نہیں ہے جو "ہمدرد صحت" سے معیاری رسالہ شایع کر رہا ہو۔ اس وقت اس رسالہ کے کئی مخصوص نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں "ضبط تولید و اصلاح نسل" شایع ہوا ہے جو کئی سو صفحات کو محیط ہے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے اس موضوع پر ایک دائرۃ المعارف کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ متعدد تصاویر و نقوش نے اس کی افادیت و دلچسپی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی جو ہمدرد دواخانہ کے مالک اور ہمدرد صحت کے اڈیٹر ہیں، بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور ہر کام کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختصر سے زمانہ میں نہ صرف دواخانہ کو غیر معمولی ترقی دیدی ہے بلکہ اتنی اور ایسی علمی خدمت انجام دی ہے کہ کوئی طبی ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ خاص نمبر بارہ آنے میں ہمدرد منزل دہلی سے مل سکتا ہے۔

زندگی کے پھول مجموعہ ہے جناب لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے بارہ فسانوں کا جو سماج کی اصلاح کے لئے سماج ہی کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

لطیف، اپنی انشاء لطیف کی وجہ سے اردو کے انشاپردازوں میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن یہ کم لوگوں

کو معلوم ہو گا کہ وہ نثر میں صرف شاعری ہی نہیں کرتے بلکہ قومی اصلاح بھی کرتے ہیں اور اس کتاب سے یہ حقیقت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

فسانے چھوٹے لیکن نتیجے بڑے، زبان سادہ لیکن مفہوم رنگین یہ ہے اس مجموعہ کی خصوصیت جسے حال ہی میں انھوں نے شایع کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ :- عظیم اطہر۔ منٹولہ۔ آگرہ۔

حیات و کلیات اسماعیل اُردو کا کونسا طالب علم ایسا ہے جو "مولانا محمد اسماعیل میرٹھی" سے واقف نہیں ان کی ریڈریں اور ان کی نظمیں "دبستانی" حیثیت رکھتی ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ہر اُردو جاننے والے کی نگاہ سے گزر چکی ہیں۔ اس کتاب میں انھیں کے حالات درج ہیں اور انھیں کے کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

حالات میں ان کے نسب، ان کی تعلیم و تربیت، ملازمت، کے علاوہ اُن کے تعلقات دوستی و قرابت، اُن کے اخلاق اور ان کی تصنیفات و تالیفات پر بھی تاریخ وار تبصرہ کیا گیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کتنی خوبیوں کے انسان تھے اور ان کی ترقی صرف ان کی فکرِ سلیم و سعیِ بلیغ کا نتیجہ تھی۔

کلام کے متعلق رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اُردو شاعری کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے گئے اور جنھوں نے بجائے خیال آرائی کے کام کی باتوں کی طرف توجہ کی۔ زبان کی سادگی، انداز بیان کی دلکشی، جزئیات نگاری اور مبالغہ سے احتراز ان کے کلام کی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے اُن کو مقبول بنایا اور جس کی پیروی بعد کو بہت سے حضرات نے کی۔

اس مجموعہ میں قطعات، قصاید، مثنویات، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترجیع بند، غزلیات و رباعیات سبھی کچھ ہے اور ہر چیز موضوع کے لحاظ سے اپنی جگہ بے مثل ہے۔ اخیر میں ان کا فارسی کلام بھی درج ہے جو بالکل پہلی مرتبہ میری نگاہ سے گزرا اور میں اس کی فارسیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

یہ مجموعہ اُن کے بڑے صاحبزادہ جناب محمد اسلم سیفی نے شایع کیا ہے اور طباعت و کتابت وغیرہ میں خاص اہتمام صرف کیا گیا ہے۔

تصاویر میں مولانا کی تصویر بھی اس میں شامل ہے اور اُن کی تحریر کا عکس بھی۔ ضخامت ۶۱۷ صفحات تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ اور قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی، لاہور یا لکھنؤ۔

سنہرا حلقہ یہ مجموعہ ہے چند ایسے خطوط کا جو سب ملکر ایک فسانہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ خطوط اُسی خاتون کی طرف سے لکھے گئے ہیں جو اس افسانہ کی ہیروئن ہے اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کتنا ایثار کر سکتی ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنی کوشش سے بہت کچھ اپنے مستقبل کو سنوار سکتی ہے

جناب ناظر کاکوروی نے بہت سلیقہ سے کام لیکر ان خطوط کو مرتب کیا ہے۔

ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً ۸ ر ہوگی۔

متاعِ اقبال | مجموعہ ہے ابوظفر عبد الواحد ایم۔ اے۔ لکچرار سٹی کالج حیدر آباد کے تین مقالوں کا جن میں اقبال کی شاعری، ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفہ پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ اس وقت تک اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کو سامنے رکھ کر کسی نے کوئی قابل ذکر مقالہ نہیں لکھا اور چونکہ وہ بیس سال سے کلام اقبال کا والہانہ مطالعہ کر رہے ہیں اس لئے انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جس وقت ہم کتاب کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس میں ناکام رہے اور انھوں نے بھی اقبال کی شاعری یا اس کے فلسفہ کے اس پہلو کو چھوڑ دیا ہے جسے سب چھوڑتے آئے ہیں۔ اقبال شاعر ہونے کے لحاظ سے اس میں شک نہیں غیر معمولی شخص تھا، لیکن مفکر ہونے کے لحاظ سے وہ زیادہ بلند مرتبہ کا انسان نہ تھا اور اسی کو ظاہر کرنے کی جرأت کسی میں نہیں ہوئی۔

بہرحال اس کے مصنف بھی اسی ایک لکیر کے پیٹنے والوں میں سے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بھی اعتقاد و حسن ظن سے کام لینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

قصائدِ نجم | مجموعہ ہے جناب نجم آفندی اکبر آبادی کے چند رباعیات، قطعات و قصائد کا جو ائمۂ معصومین کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ جناب نجم یوں بھی ملک کے مشہور خوشگو شعراء میں سے ہیں اور ان کا رنگ شعر و سخن عمومی حیثیت سے ایک کیفیت رکھتا ہے، لیکن یہ مجموعہ مذہبی شغف کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اس لئے اس کے اثرات قدرتاً زیادہ قوی ہونا چاہیئے۔

جناب نجم کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اور اس سے استادانہ شان ٹپکتی ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ سرفراز پریس لکھنؤ۔

نادر خطوطِ غالب | مجموعہ ہے غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط کا جو جناب پیارے لال شاکر میرٹھی کی کوشش سے طبع ہوکر ریویو کے لئے موصول ہوئے ہیں۔

اس مجموعہ کے مرتب جناب رسا ہمدانی ہیں۔ ان کے پردادا شاہ کرامت حسین کرامت غالب کے شاگرد تھے اور مرزا کے جو خطوط ان کے پاس آتے تھے وہ انھیں محفوظ رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ اس میں ۲۳ خطوط انھیں کے نام کے ہیں باقی چار میں سے تین صفیر بلگرامی کے نام کے ہیں اور ایک صوفی منیری بہاری کے نام کا۔

اس کی قیمت ۸ ر ہے اور ملنے کا پتہ "کاشانۂ ادب" لکھنؤ۔

سوشلزم | اردو ترجمہ ہے فریڈرک اینگلز کی کتاب کا جسے ایڈورڈ ایولنگ نے انگریزی میں منتقل کیا تھا اس کا مصنف، کارل مارکس کا دست راست تھا اس لئے سوشلزم پر اس کے خیالات قدر اول کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس موضوع کا غایر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا پڑھنا ضروری ہے

اس کے مترجم جناب باری، سوشلسٹ جماعت کے ایک پرجوش مرد ہیں جو احساس و عمل دونوں حیثیت سے اشتراکیت کی تبلیغ کر رہے ہیں، ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ قیمت چھ آنے ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ اردو لاہور۔

جواہر سخن چوتھی جلد | ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کے شعبۂ اردو نے اردو شعراء کے انتخاب جواہر سخن کے نام سے شایع کرنا شروع کئے ہیں۔ اس کی تین جلدیں پہلے شایع ہو چکی ہیں۔ یہ چوتھی جلد ہے جس میں زیادہ تر لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

یہ تذکرہ نواب فقیر محمد خاں گویا سے شروع ہوتا ہے اور شاہ عبد العلیم آسی پر ختم ہوتا ہے۔ حالات سے زیادہ انتخاب کلام پر توجہ کی گئی ہے۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ | یہ پہلا حصہ ہے جس میں جناب [illegible] نے مولانا محمد علی مرحوم، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح اور [illegible] کے حالات مختصراً تحریر شایع کئے ہیں، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات کو محیط ہے اور کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ:- دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی۔

قتیل و غالب | جناب سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی کی تصنیف ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اس وقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے محاسن سے تعلق تھا۔ لیکن اس تصنیف میں ان کی زندگی ان کے اخلاق، ان کی شاعری وغیرہ کے تاریک پہلو کو پیش کیا گیا ہے جس میں سب سے بڑے معرکہ کی چیز قتیل و غالب کی مخالفت ہے۔ فاضل مصنف نے کامل تحقیق و جستجو کے بعد ثابت کیا ہے کہ غالب کے تمام اعتراضات لغو و مہمل تھے اور خود ان کا کلام بھی ان نقایص و معائب سے پاک نہیں جو انھیں دوسروں کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعۂ ملیہ لکھنؤ سے ۸ر میں مل سکتی ہے۔

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر | مقالہ ہے مولانا غلام یزدانی ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد کا جو اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ کے سالانہ جلسہ میں انھوں نے پڑھا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس کی خوبی کے لئے مقالہ نگار کا نام کافی ضمانت ہے۔ اسکی قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ لکھنؤ

تاریخ ہندوستان کی تمہید مقالہ ہے پروفیسر محمد مجیب صاحب جو اُردو اکادمی جامعہ ملیہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ یہ مقالہ مقدمہ ہے ایک مختصر تاریخ ہند کا جو عرصہ سے انکے زیر تالیف ہے۔ اس کی قیمت [illegible] ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لکھنؤ۔

محکومیت نسواں ترجمہ ہے [illegible] Subjection [illegible] کا جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت کو دنیا میں کس کس طرح محکوم بنایا گیا اور اس کی ذہنی آزادی چھیننے کے لئے مردوں نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ قیمت [illegible] ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لکھنؤ

ہندوستانی [illegible] تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں [illegible] نے اپنے نقطۂ نگاہ سے ہندوستانی زبان کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔ مقررین کے نام یہ ہیں [illegible] بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ پنڈت [illegible] [illegible] قیمت [illegible] ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لکھنؤ۔

گ[illegible] [illegible] کی تقلید [illegible] مجلد شایع کیا گیا [illegible] اس [illegible] کے اظہار رائے کی [illegible] قیمت [illegible] مکتبہ جامعہ لکھنؤ۔

رسول پاک [illegible] نے نہایت آسان زبان میں [illegible] کے لئے یہ کتاب لکھی ہو [illegible] رسول اللہ کے اخلاق کو پیش کیا ہے۔ قیمت [illegible] روپے اور ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لکھنؤ۔

دنیا کی کہانی مجموعہ ہے [illegible] صاحب کی سترہ تقریروں کا جو لاسلکی اسٹیشن دہلی سے مختلف اوقات میں نشر کی گئی تھیں۔ ان تقریروں میں دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں سے بحث کی گئی ہے [illegible] گویا دنیا کی مختصر سی تاریخ پیش کر دی ہے۔
قیمت [illegible] ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے آخیر تک ۱ر کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے اور اسکے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔ منیجر نگار

نصاب مکاتب اسلامیہ

ہیں

۱- یہ ریڈریں اس خوبصورتی سے تیار ہوئی ہیں کہ ہر فرقہ کے مسلمان بلا امتیاز اسے پڑھاتے ہیں
۲- سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ کی طرف سے مکاتب اسلامیہ میں ۱۹۳۲ء سے رائج ہوئی ہیں اور
مکاتب اسلامیہ کے بچے خواہ سنی ہوں یا شیعہ یکساں طور پر پڑھتے ہیں۔
۳- ان کتابوں کا مؤلف ایک بلند پایہ ادیب اور ماہر تعلیمات ہے۔
۴- ان کتابوں کو ٹکسٹ بک کمیٹی نے اول نمبر پر پاس کیا ہے۔
۵- ان کتابوں میں مسلمانوں کی ضروریات کا تمام مواد موجود ہے۔
۶- مسلمان اپنے بچوں کے لئے ریڈروں میں جس قسم کا مواد چاہتے ہیں وہ سب انہیں موجود ہے
۷- صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کے متعلق اسباق ہیں۔
۸- سیرۃ النبی صلعم پر ولولہ انگیز اسباق ہیں۔
۹- دینیات، ذخیرہ (قرآن) باتیں دلچسپ اور سبق آموز نظمیں شامل ہیں۔
۱۰- دور موجودہ کی معلومات اور ضروریات پر بھی اسباق ہیں تاکہ بچے وقت سے بےخبر نہ رہیں۔
۱۱- اصلاح دیہات و صفائی پر بہترین مضامین شامل ہیں۔
۱۲- ان چاروں حصوں میں مشترک ہندوستانی مسلمانوں کی مشہور یادگار عمارتوں کے حالات اور فوٹو بھی شامل ہیں
۱۳- لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ، ٹائٹل موٹا اور مضبوط اور قیمت اسقدر کم کہ لاگت کے برابر
قیمت حصہ (۱) ۳، حصہ (۲) ۴، حصہ (۳) ۴، حصہ (۴) ۴۔ تاجران کتب کو مناسب کمیشن

ملنے کا پتہ: مینیجر صدیق بکڈپو لکھنؤ

خوشخبری

ہم کارخانہ کے سرپرستوں کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ہمارے یہاں اورینٹل امتحانات الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی نیز اعلیٰ قابلیت کی تمام کتابیں مستند اور معتبر شرحیں، خلاصے اور متعلقہ تمام امدادی کتابیں جو تقابلتہً سب جگہ سے عمدہ ہیں موجود ہیں اور نسبتاً مناسب نرخ پر مہیا کرتے ہیں، آپ لائبریری کی کتابوں کے ساتھ یہ بھی طلب فرما سکتے ہیں، اگر ضرورت ہو تو ان امتحانات کی کتابوں کی فہرست طلب فرمائیں۔

مینیجر صدیق بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

معراج تمدن یا اشتراکیت

اس عنوان سے ایک صاحب "رام" کا ناتمام مقالہ کلکتہ سے موصول ہوا ہے اس لئے ان کو اطلاع دیجاتی ہے کہ جب تک پورا مقالہ نہ مل جائے اشاعت ممکن نہیں چونکہ انھوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا اس لئے ذریعۂ نگار ان کو اطلاع دیجاتی ہے۔

نیاز

سالانہ چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بھی
اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا۔

[illegible]

نگار

جلد ۳۶	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۹ء	شمارہ ۴

اگست کا پرچہ اب کسی قیمت پر نہیں ملسکتا۔ نیجر

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اکتوبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۶

ملاحظات

موجودہ جنگ پر ایک نظر

پچھلے مہینے ملاحظات کی کاپی لکھی جا چکی تھی کہ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور جس بات کو دنیا پہلے سے سمجھے بیٹھی تھی وہ ہوکر رہی یعنی پولینڈ، اس حملہ کی تاب نہ لاسکا اور وسطی یورپ کے نقشہ میں ایک اور اہم تبدیلی پیدا ہوگئی

چونکہ اب تک جنگ کی آگ ہنوز مشتعل ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہوا کا رُخ کیا ہے اور آیندہ اس میں کیا کیا امکانات محالات پوشیدہ ہیں لیکن اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ فریقین کی عسکری و اقتصادی حالت اور ان کے سیاسی مصالح کی کتر بیونت کو سمجھ لیں

اس جنگ میں تین باتیں بالکل عام توقع کے خلاف ظاہر ہوئیں، ایک روس و جرمنی کا معاہدہ، دوسرے اطالیہ کی غیر جانبداری اور تیسرے روس و جاپان کا سمجھوتا۔۔ اس میں شک نہیں کہ سوویٹ روس اور نازی جرمن نظریۂ حکومت کے لحاظ سے بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہاں تک کہ ایک طرف ہٹلر کی زندگی کا مقصد ہی اشتراکیت کو ختم کر دینا

اور دوسری طرف نازیت سے روسی حکومت کی بیزاری کا یہ عالم ہے کہ اس کے نمایندے ایسی مجلس شوریٰ میں شریک ہونا بھی پسند نہیں کرتے جس میں نازی نمایندے شریک ہوں، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ پولینڈ کے باب میں اشتراکیت و نازیت کی یہ جنگ یک لخت ختم ہو جاتی ہے اور ٹھیک اسی وقت جبکہ جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہوتی ہیں، روسی فوجیں بھی مشرق کی طرف سے حملہ کرتی ہیں اور تقریباً نصف حصۂ ملک پر قابض ہو کر پولینڈ کے احیاء ثانیہ کو تقریباً ناممکن بنا دیتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں

دنیا میں حکومتوں کی بہت سی قسمیں ہیں اور خدا جانے کیا کیا نام ان کے رکھے گئے ہیں لیکن یہ اختلافات زیادہ تر اصول و نظریہ سے متعلق ہیں ورنہ جس حد تک عمل یا ان اصول پر کاربند ہونے کا تعلق ہے، ہمیشہ ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے جو سب پر چھایا جاتا ہے اور اسی کی مرضی قانون ہو جاتی ہے، خواہ اس کو ڈکٹیٹر کہئے، یا صدر جمہوریت، چانسلر کے نام سے پکاریے یا پرائم منسٹر کے نام سے۔ اس سے قبل روس میں جتنے ڈکٹیٹر ہوئے ہیں، ان کا مقصد عظیم تحریک اشتراکیت کو تمام دنیا میں پھیلانا تھا اور اسی لئے دنیا کی ان حکومتوں میں جو جمہوریت کو پسند کرتی تھیں، روس کے خلاف اس اشتراکی پروپاگنڈا کی وجہ سے سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی اور اسی بنا پر اطالیہ، جرمنی اور جاپان میں ایک اتحاد قایم ہو گیا جس کا نام ہی "اتحادِ اشتراکیت شکن" پڑ گیا تھا۔ لیکن جب سے اسٹالین برسر اقتدار ہوا ہے، روس کی اشتراکی پالیسی میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ اسٹالین اس کا حامی نہیں کہ ساری دنیا کو اشتراکی بنایا جائے بلکہ صرف یہ کہ روس کی اشتراکی حکومت کو مضبوط بنا لیا جائے اور اگر دوسری حکومتیں اس اصول حکومت کو قبول نہیں کرتیں تو نہ کریں۔ اسٹالین نے اپنی اس پالیسی کو کن کن تدابیر سے کامیاب بنایا اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسٹالین کا روس لینن کے روس سے بالکل مختلف چیز ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ روسی اشتراکیت میں بہت کچھ اعتدال پیدا ہو گیا ہے اور ہم اسے ایک نہایت بلند درجہ کی ڈیماکریسی کہہ سکتے ہیں

بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر پولینڈ کے باب میں جرمنی اور روس کے درمیان اتحادِ عمل پیدا ہوا تو حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اول تو اشتراکیت کا وہ زور بھی روس میں نہیں رہا جو پہلے پایا جاتا تھا اور دوسرے یہ کہ پولینڈ کے مشرقی حصہ میں بڑی آبادی سفید فام روسیوں کی ہے جو گزشتہ جنگ سے قبل روس ہی کی حکومت میں شامل تھی اور اسلئے اسٹالین نے اس کی پرواہ نہیں کی کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے ملک کو حاصل کرنے کے لئے کس حکومت سے اتحادِ عمل کر رہا ہے، اب دوسری طرف جرمنی کے نقطۂ نظر کو دیکھئے۔ وہ یہ تو فیصلہ کر چکا تھا کہ ڈینزگ اور ملحقہ علاقہ پر قبضہ کرے گا، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ بغیر جنگ کے شاید ممکن نہ ہو اور جنگ کی صورت میں فرانس و برطانیہ کی مدد پولینڈ کی طرف ہوگی۔ اسلئے اگر روس بھی اسی طرف ہو گیا تو اس کا پلہ ہلکا ہو جائے گا۔ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر اس نے اندرونی طور پر روس سے سمجھوتا کر لیا کہ پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا جائے اور یہ ایسی معمولی لالچ نہ تھی جس کے مقابلہ میں اسٹالین، فرانس و برطانیہ

کی خشک دوستی کا لحاظ کرتا۔ دنیا اسے ہر ہٹلر کا معجزہ سمجھتی ہے کہ اس نے روس کو توڑ لیا، لیکن میری رائے میں یہ برطانیہ کی سیاسی خامکاری ہے کہ اس نے ان حالات پر غور نہیں کیا اور روس و جرمنی کے اشتراک عمل کو اپنے نزدیک بالکل محال سمجھ بیٹھا تھا۔ جاپان و روس میں جو سمجھوتا ہوا ہے وہ بھی خود غرضی کی بنا پر ہے۔ اُس طرف چونکہ روس پولینڈ پر حملہ کرنے کا عزم کر چکا تھا اس لئے وہ منچوریا کے محاذ پر جاپان کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی پوری قوت پولینڈ پر صرف کر سکے دوسری طرف جاپان بھی یہی چاہتا تھا کہ روس کی طرف سے مطمئن ہو کر زیادہ قوت کے ساتھ چین پر حملہ کرے۔ الغرض روس و جاپان کی یہ مفاہمت دونوں کی خود غرضی کا نتیجہ ہے اور اسوقت تک قایم رہے گی جب تک دونوں کے مفاد کو اس سے نقصان نہیں پہونچتا

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ مسولینی نے کیوں غیر جانبدار رہنے کا اعلان کیا اور جرمنی کے ساتھ وہ کیوں جنگ میں شریک نہیں ہوا، اس کے کئی سبب ہیں، ایک یہ کہ پولینڈ کے محاذ پر اسے واقعی کسی حکومت کی مدد کی ضرورت بھی نہ تھی جبکہ روس سے اندرونی طور پر یہ سمجھوتا ہو چکا تھا اور اگر اس کی ضرورت ہوتی بھی تو اول تو اطالیہ کی فوج پر ہٹلر کو زیادہ بھروسہ نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اطالیہ کے لئے ممکن بھی نہ تھا کہ وہ اپنی فوجیں فوراً پولینڈ پہونچا سکتا۔ اس کے لئے صرف آسٹریا و زیکوسلاویکیا ہی کا راستہ ہو سکتا تھا جو علاوہ طویل ہونے کے حد درجہ دشوار گزار بھی اور شاید مہینوں میں بھی اطالیہ کی فوجیں پولینڈ نہ پہونچ سکتیں۔ علاوہ اس کے ایک مصلحت اور یہ بھی کہ اٹلی کی غیر جانبدار رہنے کی صورت میں اسکے سواحل ناکہ بندی سے محفوظ رہیں گے اور اس طرح جرمنی کے لئے باہر سے اشیاء فراہم کرنے کا ایک راستہ کھلا رہے گا، اسی کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ جب پولینڈ فتح ہو جائے گا تو اٹلی کو درمیان لا کر صلح کی گفتگو چھیڑ دیجائے گی، جیسا کہ واقعتاً ہوا

اس جنگ کے لئے جو سیاسی چالیں جرمنی نے چلیں ان کا حال تو آپ کو معلوم ہو گیا، اب اس کی جارحانہ تدابیر کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔ ہر چند پولینڈ کے پاس کافی آراستہ فوج موجود تھی اور کہا جاتا تھا کہ میدان میں وہ ۴۰ لاکھ محارب سپاہ لا سکتا تھا لیکن جرمنی کی فوجی طاقت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی اور ہٹلر سمجھتا تھا کہ پولینڈ کو تباہ کر دینا معمولی بات ہے، البتہ اگر اسے ڈر ہو سکتا تھا تو فرانس و برطانیہ کا، سو وہ اس طرف سے اس بنا پر مطمئن تھا کہ ان دونوں ملکوں کی فوج وہاں آسانی سے پہونچ ہی نہیں سکتی۔ پولینڈ کو فوجی مدد پہونچانے کے لئے دو ہی راستے ہو سکتے ہیں یا تو اندرون جرمنی سے گزرا جائے یا بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں سے فوج اُتاری جائے اور یہ دونوں باتیں ممکن نہ تھیں، کیونکہ جرمنی کی سیگفریڈ لاین کو توڑ کر جرمنی میں داخل ہونا اگر ممکن بھی ہو تو اس کے لئے مہینوں چاہئیے اور دوسری طرف بحیرۂ بالٹک میں جرمن آبدوزوں کا جال بچھا ہوا ہے اور اس کے اندر کوئی دشمن جہاز آ ہی نہیں سکتا

جرمنی نے انھیں تمام باتوں پر غور کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ پولینڈ کو تو وہ چند دن میں ختم کر دے گا اور اس کے بعد ممکن ہے کہ اس کی کوشش صلح کامیاب ہو جائے، لیکن اگر کامیابی نہ بھی ہوئی تو وہ پھر پوری قوت کے ساتھ مغربی محاذ پر جنگ کریگا

اس وقت جنگ کی صورت یہ ہے کہ پولینڈ کے نصف مشرقی حصہ پر تو روس قابض ہو چکا ہے اور مغربی حصہ پر جرمن کا قبضہ ہے، فی الحال جو حصہ آزاد ہو بہت مزاحمت پولینڈ کی فوجوں کی طرف سے ہو رہی ہے وہ بھی ہفتہ عشرہ میں ختم ہو جائے گی۔ اس سے فارغ ہو کر جرمنی نے اب مغربی محاذ کی طرف توجہ کی ہے اور فرانس کی فوجیں جو میگنو لائن سے کچھ آگے بڑھکر جرمنی کی سیگفرڈ لائن کی طرف بڑھ آئی تھیں ان کو روکنے میں مصروف ہے

یہ دونوں سرحدی خطوط مدافعت اپنی اپنی جگہ بہت زبردست ہیں (جن کا مفصل حال اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ آپ کی نظر سے گزرے گا) اور یہ سوال اسی جگہ تشنہ رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جرمنی برسوں کیا مہینوں کی تعویق بھی گوارا نہیں کر سکتا، وہ تو اب چھاپہ مارنے والی لڑائیاں لڑنا چاہتا ہے اور اس طرح نوچ کھسوٹ سے جو کچھ مل جائے اسی پر قناعت کرنا پسند کرتا ہے۔ لیکن زیادہ اس میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہم کو برطانیہ کی پالیسی کا مطالعہ کرنا پڑے گا (فرانس کو اس لئے نظر انداز کر دینا چاہئے کہ وہ برطانیہ سے علٰحدہ ہو کر نہ کچھ کر سکتا ہے نہ کرنا چاہتا ہے) اس میں شک نہیں کہ اگر فسطائی اور نازی تحریک دنیا کے لئے خطرہ کی چیز ہے تو اس خطرہ کو بڑھانے کا جرم سب سے زیادہ مسٹر چیمبرلین کی وزارت پر عاید ہوتا ہے

مسولینی حبشہ فتح کر لیتا ہے، البانیہ کو لے لیتا ہے اور برطانیہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہر ہٹلر رائن لینڈ پر قابض ہو جاتا ہے، آسٹریا کو اپنی حکومت میں شامل کر لیتا ہے، زیکوسلاویکیا پر چڑھائی کر دیتا ہے اور میمل لے لیتا ہے لیکن مسٹر چیمبرلین صرف جھرجھری سی لیکر خاموش رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ہٹلر اور آگے قدم نہ بڑھاتا۔ چنانچہ اس نے پولینڈ کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو دوسری پڑوسی حکومتوں کے ساتھ کیا تھا، لیکن اس مرتبہ یہ فرق ضرور ہو گیا کہ فرانس و برطانیہ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور خود بھی اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پھر اعلانِ جنگ سے یہ تو نہ ہو سکا کہ پولینڈ بربادی سے بچ جاتا، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ برطانوی وزارت کی صلح کل پالیسی ختم ہو گئی اور ہٹلر کے لئے یہ فتح آیندہ اُلجھنوں کا باعث ہو گئی

اب بھی اکثر حضرات کا یہی خیال ہے کہ برطانیہ حتے الامکان جنگ سے باز رہے گا اور کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھکر مصالحت کی صورت پیدا کر لیگا، لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے، کیونکہ اول تو یہ انگریز قوم کی خصوصیت ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر بہت دیر میں پہونچتی ہے، لیکن جب وہ آخر میں کسی ارادہ پر مضبوط ہو جاتی ہے تو پھر آسانی سے اسے ترک نہیں کرتی، برطانیہ نے نازی تحریک کو کبھی پسند نہیں کیا، کیونکہ وہ فی الجملہ ڈیماکریسی کے خلاف ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اسے زیادہ دبانے کی بھی کوشش نہیں کی اور غالباً اس وجہ سے کہ فرانس کا پلہ نہ بھاری پڑنے پائے، لیکن اس سہل انکاری یا غلط پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ جرمنی نے یوروپ کے توازن قوت کے مسئلہ کو درہم برہم کر دیا اور پانی کا وہ بہاؤ جو ابتدا ہی میں نہ روکنے کی وجہ سے سیلاب کی صورت اختیار کر چکا ہے اپنے چاروں طرف تباہیاں

پھیلانے لگا

برطانیہ کا اتنے تلخ تجربوں اور بیچ در پیچ فوجی نقل و حرکت کے بعد پولینڈ کی تباہی پر راضی ہوکر امن و سکون یا صلح و آشتی کی راہ ڈھونڈھنا مشکل ہے اور اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کا وجود دنیا سے ختم ہوگیا۔ اس لئے میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ وہ جرمنی کی طرف سے کسی ایسی پیشکش صلح کو مان لیگا جس کا نتیجہ جرمنی کے حق میں مفید ثابت ہو

اس جگہ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ جنگ جاری رہی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور کتنے دنوں تک اس کے جاری رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہم کو اس کا انتظار کرنا پڑے گا کہ روس کا طرز عمل متعین ہو جائے، اگر وہ کھلم کھلا جرمنی کے ساتھ شریک ہوکر لڑنے پر آمادہ ہوگیا تو یہ جنگ بہت طول پکڑ جائے گی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ نتیجہ اس کا کیا ہوگا، لیکن اگر روس نے صرف پولینڈ کے مفتوحہ حصہ پر قبضہ کر لینا کافی سمجھا اور آیندہ جنگ میں شرکت نہ کی، تو پھر یہ یقینی ہے کہ جرمنی زیادہ عرصہ تک جنگ جاری نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کے ملک کی پیداوار اس کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے اور برطانیہ ناکہ بندی کرکے اس کی تمام درآمد کو روک دیگا۔ روس کی طرف سے بیشک اس کو ذخایر کی فراہمی میں مدد ملے گی، لیکن نہ اتنی کہ ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ خود اندرون جرمنی، آسٹریا اور زیکوسلاویکیا میں بے چینی پیدا ہو جائے اور انقلاب

اطالیہ کی مدد جرمنی کے لئے زیادہ مفید ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اس کی عسکری قوت زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ بحر روم میں بیشک اس کا اقتدار ایک حد تک قایم ہو چکا ہے، لیکن نہ اتنا کہ برطانیہ کی عظیم الشان بحری قوت کا مقابلہ کر سکے۔ بہرحال جرمنی بھی روس کو دیکھ رہا ہے اور اگر روس سے اسے کوئی مدد نہیں ملتی تو پھر ہٹلر جنگ کی موجودہ صورت کو بدلیگا اور قطعاً وہ بلجیم کو روندتا ہوا پیرس کی طرف بڑھے گا اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ شاید اس کو روکنا مشکل ہو جائے، لیکن یہ لڑائی کا اختتام نہ ہوگا، بلکہ آغاز ہوگا اس ہولناک جنگ کا جس کی آگ کو تمام دنیا میں پھیل جانا ہے جس سے ہندوستان بھی نہیں بچ سکتا

ہندوستان اور جنگ

پچھلے مہینے میں ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ یہ وقت ہندوستان کے لئے خاموش بیٹھے رہنے کا نہیں بلکہ حرکت و عمل سے کچھ کما لینے کا ہے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے جو بیان شایع ہوا ہے وہ بڑی حد تک اطمینان بخش ہے بلکہ گاندھی۔ لنلتھگو گفتگو کے بعد ایک طرح حیرتناک بھی۔

ویسرائے نے اس بیان کے شایع ہونے کے بعد گاندھی جی وغیرہ سے پھر گفتگو کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے مستقبل سے ہو، لیکن مسلم لیگ کی روش نہایت عجیب و غریب ہے اور رفتہ رفتہ بالکل سرسکندر حیات خاں کی ملکیت ہوتی جاتی ہے۔ ایک طرف ملک آزادی کا مطالبہ کرنا اور دوسری طرف گورنروں کو اپنے اختیارات تیزی سے کام لیکر خود مختار صوبوں کے انتظام میں دخل دینے کا مشورہ دینا ایسا معمہ ہے جو کسی ذی ہوش انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا

جمعیت العلماء کو جو کچھ کہنا تھا اس نے بہت صدق و صفائی سے کہہ دیا ہے اور انگریزوں کی [illegible] پر بالکل پردہ نہیں پڑ گیا ہے تو ان کو سمجھنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ تاہم وہ حکومت کی طرفداری بھی نہیں کر سکتے اور ہندوستان کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک جمہوریت شکن قوت کی حمایت کرے۔ بیشک اس کو برطانیہ کی مدد کرنا چاہئے، لیکن آنکھ بند کرکے نہیں، سوچ سمجھ کر اور اس اعتماد کے بعد کہ اس کی یہ مدد برطانیہ کی خدمات سے مجبوریت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ وہ خود بھی آزادی چاہتا ہے اور دنیا میں آزادی ہی کی طرفداری اس کا نصب العین ہے

لکھنؤ میں ایک اور فتنۂ لغویہ

شیعہ سنی نزاع کا ہنوز فیصلہ نہ ہوا تھا کہ خاکساری تحریک کے ایک اور نئے فتنہ نے لکھنؤ میں سر اٹھایا۔ امین آباد پارک میں روز شام کو چند خستہ حال، غیر ذمہ دار قسم کے لوگ خاکساری بلا باندھ کر نکلتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں۔ چونکہ یو۔پی گورنمنٹ نے اس قسم کے مظاہروں کو ممنوع قرار دیدیا ہے اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرکت اس حکم کے خلاف احتجاج کے طور پر کی جاتی ہے۔

اس جماعت کے متعلق ہم اپنا خیال اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں اور ہم پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ جب تک اس جماعت کے قائدین اپنا نصب العین واضح طور پر متعین نہ کریں اس میں شرکت خطرہ سے خالی نہیں۔ عوام کی ذہنیت کو اس سے قبل بھی بارہا اسی طرح گمراہ کرکے ملک و قوم کو نقصان پہونچایا گیا ہے اور جب تک کورانہ تقلید کا مرض ہم میں باقی ہے ہمیشہ اس کا امکان رہے گا۔ ہم کو علامہ مشرقی کی ذات سے کوئی خصومت نہیں، لیکن اگر ان کی کوئی تحریک ملک کی اجتماعی حیثیت کو نقصان پہونچانے والی ثابت ہوگی تو ہم یقیناً اس کی مخالفت کریں گے

مشرقی صاحب کو صرف ایک ماہ قید معمولی کی سزا دی گئی ہے اور کلاس اے میں ان کو رکھا گیا ہے۔ رہا ہونے کے بعد یہ کیا کریں گے ہمیں معلوم نہیں لیکن خیال یہی ہے کہ یو۔پی کی کانگریس حکومت کو بدنام کرنے کے لئے اس فتنہ کو ختم نہ ہونے دیا جائے گا اور سر ضیاء الدین ایسے کھوکھلے دماغ کے لوگ کافی تعداد میں اس خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے

مسلم لیگ کا رویہ بھی اس باب میں ظاہر ہوگیا ہے کہ مدح صحابہ و تبرا کے جھگڑے میں تو اس کو سانپ سونگھ گیا تھا لیکن اب اس تحریک میں وہ خاکساروں کی ہم آواز ہے۔ لیکن سب سے زیادہ شکایت جو یوپی کی حکومت سے ہے اور وہ یہ کہ سیاست سے کام لینے کا سلیقہ اسے بالکل حاصل نہیں۔ لوگ عام طور پر کانگرس حکومت کی سختی کے شاکی ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ اس کی نرمی ہی اس کا سب سے بڑا جرم ہے

جب صوبہ میں کوئی ناگوار صورت اس قسم کی پیدا ہوتی ہے تو حکومت پہلے اس کی پرواہ بھی نہیں کرتی اور فتنہ کو بڑھنے دیتی ہے یہاں تک کہ جب نقض امن کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ چونکتی ہے اور پھر بھی سختی کے ساتھ انسدادی تدابیر اختیار نہیں کرتی

مدح صحابہ کے فتنہ کو اس نے اسی طرح بڑھنے دیا یہاں تک کہ وہ عذاب جان ہوگیا، اس کے بعد تبرا کی بدتمیزی کو وہ گوارا کرتی رہی حتیٰ کہ ناقابل برداشت ہوگئی اور پھر خاکساری تحریک کو اس نے پھیلنے دیا یہاں تک کہ اس نے سخت خطرناک صورت اختیار کرلی

ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسی تحریک کو جس سے امن و سکون کو صدمہ پہونچ سکتا ہے، ابتدا ہی میں نہایت سختی سے دبائے اور اگر کوئی حکومت ایسا نہیں کرتی تو یقیناً وہ سیاست کے اصول سے ناواقف ہے۔ نرمی کا برتاؤ کرکے کانگرس حکومت نے کونسی نیک نامی حاصل کرلی ہے کہ وہ سختی سے ڈرتی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اس فتنہ کو پورے تشدد کے ساتھ دبائے اور اس کے جملہ محرکین کو گرفتار کرکے قانون کی انتہائی سزائیں دے۔

مدح صحابہ و تبرا

مولانا ابوالکلام آزاد ہنوز فریقین سے گفتگو کرنے میں مصروف ہیں، اور بعض کو یہ حسن ظن بھی ہے کہ شاید ان دونوں جماعتوں میں صلح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن ہمیں امید نہیں، کیونکہ جب تک کیمونکے واپس نہ لیا جائے شیعہ مطمئن نہیں ہو سکتے اور کیمونکے واپس لیا گیا تو پھر سنیوں کی طرف سے مدح صحابہ کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔

رہا یہ امر کہ سنی خود جلوس نکالنے کے حق سے دست بردار ہو جائیں، سو اول تو اس کی امید نہیں اور اگر ہو بھی تو شیعہ کیونکر اس پر مطمئن ہو سکتے ہیں۔۔ اس میں شک نہیں کہ اس نزاع کو کسی نہ کسی طرح ختم ہونا چاہئے لیکن جیسا کہ پہلے ہم کہہ چکے ہیں صحیح معنی میں صلح و مفاہمت وہی ہے جو خود اپنے اندر سے پیدا ہو، دوسروں کے کہنے یا مجبور کرنے سے اختیار نہ کیا جائے۔

مولانا آزاد بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ دونوں جماعتیں خود ہی کسی متفقہ فیصلہ پر پہونچ سکیں (اور خدا کرے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائیں) لیکن حالات زیادہ مساعد نہیں معلوم ہوتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگر اس وقت کوئی صورت مصالحت کی پیدا ہو بھی جائے تو پائدار نہ ہو۔

ہندوستان کے فوجی نظام پر ایک تاریخی تبصرہ

ہندوستان اپنے سورماؤں کے لحاظ سے ہمیشہ مشہور رہا ہے اور قدیم زمانہ میں بھی یہاں باقاعدہ اور منظم افواج کا وجود پایا جاتا تھا۔ پرانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہاں کی فوج چار حصوں میں منقسم ہوتی تھی ایک رتھ سوار، دوسرے فیل سوار تیسرے گھوڑے سوار اور چوتھے پیدل۔ پرانی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے اصول ان کے یہاں مقرر تھے اور اس فن پر کتابیں بھی پائی جاتی تھیں۔

اگر کوروں پانڈوں کی لڑائی کا حال جو مہا بھارت میں درج ہے صحیح مانا جائے تو ان افواج کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو آریہ ورت کی ۵۶ جنگجو قوموں کی طرف سے میدان جنگ میں فراہم کی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ مہا بھارت میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن اتنا نہیں کیونکہ جب پنجاب کے ایک معمولی راجہ نے سکندر کا مقابلہ ۲۰۰ ہاتھیوں، ۴۰۰۰ سواروں، ۲۰۰ رتھوں اور ۳۰ ہزار پیادہ فوج سے کیا ہو تو مہا بھارت کا بیان زیادہ مبالغہ آمیز نظر نہیں آتا

اس زمانہ کے سردار و امرار رتھوں پر سوار ہو کر جنگ کرتے تھے جن میں چار گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ ایک رتھ میں چھ آدمی سوار ہوتے تھے، دو تیر و کمان والے، دو قد آدم ڈھال رکھنے والے اور دو نیزہ، تلوار، گرز وغیرہ رکھنے والے

پیادہ فوج نیزوں اور چوڑی تلوار سے بھی لڑتی تھی اور کمان سے بھی جو پانچ فٹ لمبی ہوتی تھی اور ایک سرا زمین پر رکھ کر جس کو پوری قوت سے تان کر تیر اندازی کرتے تھے۔

یونانی مورخین نے ہندوستانی تیر اندازوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ ہیروڈوٹس نے بیان کیا ہے کہ جب جنگ پلاٹیا میں ہندوستانی اور ایرانی فوج کا مقابلہ ہوا تو یہاں کے تیر اندازوں نے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دئے ایرین لکھتا ہے کہ "زرہ، بکتر، ڈھال کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہندوستان کی تیر اندازی کا مقابلہ کر سکے"

لڑائی کے بعض اخلاقی قانون بھی ان کے یہاں پائے جاتے تھے جن پر اعتماد کیا جاتا تھا اور بعض اوقات اس سے نقصان بھی پہونچتا تھا۔ مثلاً جس وقت سکندر نے حملہ کیا تو راجہ پورس نے کبھی اس کا یقین نہیں کیا کہ وہ شبخون مارے گا جو بہادری کے خلاف ہے، حالانکہ یہی ہوا اور نقصان اٹھانا پڑا۔

چندر گپت کے پاس بڑی زبردست فوج تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ۶ لاکھ پیدل، ۳۰ ہزار سوار، ۹ ہزار ہاتھی

اور ۸ ہزار رتھیں شامل تھیں ۔ ہر سوار کے پاس دو نیزے اور ایک ڈھال ہوتی تھی اور ہر ہاتھی پر علاوہ مہاوت کے تین تیر انداز بیٹھتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کا غیر مصافی عملہ بھی بڑا زبردست ہوگا اور اس طرح سب ملاکر کل تعداد ۱۰ لاکھ سے کم نہ ہوگی ۔ اس فوج کا انتظام ۳۰ ممبروں کے سپرد تھا، جو چھ کمیٹیوں پر منقسم تھے چندر گپت کی زبردست فوجی طاقت کا ثبوت پلوٹارک کے بیان سے بھی ملتا ہے اور نیز اس واقعہ سے کہ اس نے شاہ بابل سلیکوس کو شکست دی ۔

کنشکا کی فوجی طاقت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے ۷۰ ہزار سواروں سے (ہمالیہ عبور کرکے) تبت اور ترکستان پر حملہ کیا تھا ۔ ہرش کی فوجی قوت کا اندازہ چینی روایات کے مطابق، ۱۰ لاکھ پیادہ فوج، ایک لاکھ سوار اور ۶۰ ہزار ہاتھی کیا جاتا ہے (رتھوں کا رواج اسوقت مفقود ہوگیا تھا)

ہرش کے بعد ہندوستان کی فوجی طاقت میں زوال آنا شروع ہوا اور آپس میں نااتفاقی بھی پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنوی اور غوری خاندان کے فرمانرواؤں نے یہاں آکر آسانی سے فتوحات حاصل کرلیں ۔

ابتدائً سلاطین دہلی کی افواج کو نقد مشاہرہ ملتا تھا ۔ چنانچہ علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں پیادہ سپاہی کو ۲۳۴ تنکہ سالانہ ملتا اور سوار کو ۲۳۴ تنکہ ۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں جاگیر کا طریقہ رائج ہوگیا یعنی امراء اور سرداروں کو مصارف فوج کے لئے جاگیریں دیدی گئی تھیں ۔ لیکن اس نظام کی ناکامی اس سے ظاہر ہے کہ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو صرف ۴۰ ہزار پیدل فوج، ۱۰ ہزار سوار اور ۱۲۵ ہاتھی اس کے مقابلہ میں لائے جاسکے ۔

جنوب میں البتہ یہ حالت نہ تھی، چنانچہ ایک سیاح نینز نامی لکھتا ہے کہ کرشن دیوراجہ (وزیانگر) کے پاس ۸ لاکھ فوج تھی جس میں ۳۵۰۰۰ سوار اور ۶۰۰ ہاتھی بھی شامل تھے لیکن مغرب کے ترقی یافتہ اسلحہ یہاں نہ پائے جاتے تھے اور یہی سبب تھا کہ بابر نے ۷۰۰ توپوں کی مدد سے پانی پت کی لڑائی فتح کرلی اور ہندوستانی فوج کے ہاتھی اس مار کی تاب نہ لاسکے ۔

اکبر نے جاگیرداری نظام کو بدل دیا اور منصب داروں کے ۳۳ درجے مقرر کئے جو ۲۰ سے لیکر ۷۰۰۰ تک سوار رکھتے تھے ۔ ان منصب داروں کو خزانہ سے نقد معاوضہ ان سواروں کا ملتا تھا، گو بے ایمانی سے کم سواروں کا معاوضہ پورا لے لیا جاتا تھا ۔ بدایونی لکھتا ہے کہ لطف اللہ خاں جو سات ہزار سواروں کا منصب دار تھا، سات گدھے بھی نہ رکھتا تھا ۔

توپ خانہ البتہ بہتر حالت میں تھا جو رومیوں اور فرنگیوں کے ہاتھ میں تھا ۔ پہلے توپیں مغربی ممالک سے آتی تھیں لیکن بعد کو یہیں ڈھالی جانے لگیں ۔ اکبر کے زمانہ میں فوجی حالت بہت اچھی تھی چنانچہ حملۂ کابل میں ۵ ہزار ہاتھیوں، ۴۵ ہزار سواروں اور ۳ لاکھ پیادہ فوج سے کام لیا گیا تھا

شیواجی نے بھی اپنی فوجی طاقت بہت بڑھائی تھی۔ اس کے پاس ۲۰۰ قلعے تھے جہاں محافظ فوج رہتی تھی، علاوہ اس کے ۳۰ ہزار سوار، ایک لاکھ پیادہ فوج، ۱۲۰۰ ہاتھی اور ۸۰ توپیں بھی تھیں۔ سب سے پہلے اسی نے علحدارانہ نظام قایم کیا جس کی رو سے ہر محارب کو اپنا گھوڑا اور سازوسامان خود فراہم کرنا پڑتا تھا۔

برطانوی سپاہ کا آغاز ہندوستان میں ان سپاہیوں سے ہوا ہے جو انگریزی کارخانوں میں پہرہ و حفاظت کے لئے مامور کئے جاتے تھے اور جن کی تعداد ہر کوٹھی یا کارخانہ میں سو سے زیادہ نہ ہوتی تھی ان کو انگریزی میں (Peon) کہتے تھے جس کو اب چپراسی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے فرانسیسیوں نے محسوس کیا کہ اگر ہندستانیوں کو فوجی تربیت دیجائے تو یہ نہایت اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کرکے بہت سی لڑائیاں ان کی مدد سے جیتیں۔ اس کے بعد انگریزوں کو بھی اس طرف توجہ ہوئی اور سب سے پہلے میجر سٹرنگر لارنس نے ہندوستانی فوج قایم کی۔ بعد کو کلایو نے بھی اس پر عمل کیا اور تجربہ نے بتایا کہ ہندوستانی فوج نہ صرف بہادر ہے بلکہ حد درجہ خیرخواہ و نمک حلال بھی ہے۔

فتح بنگال کے بعد ہندوستانی فوج کی تعداد سات بٹالین ہوگئی (ہر بٹالین ایک ہزار سپاہیوں کی)۔ اول اول ان کے افسر ہندوستانی ہی ہوتے تھے۔

۱۷۶۶ء ۱۷۸۵ء اور ۱۷۹۶ء میں جب فوجی ترتیب بدلی گئی تو بٹالین کی کمان ہندوستانیوں سے لیکر انگریزوں کے سپرد کی گئی، جن میں اکثر دغاباز، جرائم پیشہ اور بدکردار تھے۔

مدراس میں اول اول زیادہ تر موپلا بھرتی کئے گئے اور بعد کو تامیل۔ کرناٹک کے تلنگے ادنی درجہ کے سپاہی سمجھے جاتے تھے اس لئے ان کی بھرتی کم ہوئی۔ بنگال کی فوج میں زیادہ تر برہمن اور راجپوت تھے۔

انگریز افسروں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی تھی، شراب بہت پیتے تھے اور ہمیشہ مقروض رہتے تھے، فحاشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور فوج کے لئے کسبی خانوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ ۱۸۰۰ء میں بنگال کے اندر ان کی تعداد چار ہزار تھی۔

بنگال سے باہر بھی چھاونیوں میں ناجایز اولاد کی کمی نہ تھی اور حکومت نے یہ صرف اس لئے گوارا کر رکھا تھا کہ سپاہی زیادہ تنخواہ کا مطالبہ نہ کریں۔

فوج میں بغاوت کی ابتدا بھی انگریزی فوج سے ہوتی ہے ۱۶۷۴ء اور ۱۶۷۹ء میں انگریزی فوج کمپنی سے باغی ہوگئی اور بمبئی کے قلعہ پر قبضہ کرلیا، ۱۷۶۴ء میں بنگال کی یوروپین رجمنٹ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا لیکن کلایو نے فوراً اس فتنہ کو دبادیا۔

کلایو کے جانے کے بعد بنگال فوج کے تمام انگریز افسروں نے اس بنا پر بغاوت کردی کہ ان کے الاونس میں کمی

دی گئی تھی، ۱۸۰۹ء میں، مال غنیمت کی غیر مساوی تقسیم پر مدراس میں زیادہ وسیع پیمانہ پر بغاوت شروع ہوئی اور چناپلی، سکندر آباد، اور سرنگا پٹم تک پھیل گئی۔ باغی انگریزوں نے کمپنی کا خزانہ لوٹ لیا، ہندوستانی گارڈوں کو قتل کیا، سول آبادی پر بھی حملے کئے بمشکل تمام سیلون اور بنگال کی فوج نے آکر امن قایم کیا لیکن ان سفید فام باغیوں کو صرف یہ زا دی گئی کہ چھ افسروں کو پنشن دیدی گئی اور چودہ کو علحدہ کر دیا گیا، قید وقتل کی سزا ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دی گئی ب اس کے مقابلہ میں اس سلوک کو دیکھئے جو ہندوستانی فوجوں کے ساتھ برتا گیا، ۱۷۶۵ء میں بنگال کی ہندوستانی ج نے اس بنا پر کہ ان سے سخت ڈیوٹی لیجاتی تھی اور تنخواہ میں اضافہ نہ کیا گیا تھا سرکشی کی، ۲۱ کی سزا ان کو یہ دی گئی توپوں کے منہ سے باندھ باندھ کر انھیں اُڑا دیا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں بمقام ویلور مدراس کی ایک ہندوستانی رجمنٹ نے س لئے بغاوت کر دی کہ ان کو داڑھی منڈوانے، قشقہ نہ لگانے، کان کے بالے علحدہ کرنے اور بجائے صافہ کے ٹوپی ہننے کا حکم دیا گیا تھا۔ چونکہ اس سے ان کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہونچا تھا اس لئے انھوں نے تعمیل نہیں کی، اس کا نتیجہ ہوا کہ تقریباً ساری رجمنٹ قتل کر دی گئی۔

۱۸۲۴ء میں جب پہلی جنگ برما شروع ہوئی تو بنگال کی پیادہ فوج کو رنگون جانے کا حکم دیا گیا، اس نے کہا کہ ہم کالے پانی نہ جائیں گے،، اس پر اُن کو حکم دیا گیا کہ خود اپنے صرف و انتظام سے اراخان جائیں، لیکن چونکہ جنگلوں، ہاڑوں اور دریاؤں کی کثرت کی وجہ سے یہاں پہونچنا ناممکن تھا اس لئے انھوں نے عذر پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری فوج کو پریڈ پر جمع کر کے گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔

۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ سب پر ظاہر ہے۔ اسوقت یوروپین اور ہندوستانی فوج میں چالیس ہزار اور ا لاکھ ۸۰ ہزار کی نسبت تھی۔ ہندوستانی فوج میں زیادہ تر برہمن اور راجپوت تھے جو بنگال، اودھ، روہیلکھنڈ اور سنٹرل انڈیا سے بھرتی کئے گئے تھے۔ اور جن کی ذات بلند ہونے کی وجہ سے سکھ اور جاٹ ان سے جلتے تھے۔

۵۷ء میں باغیوں کی ناکامی کے متعدد اسباب تھے ایک تو یہ کہ ان کے پاس نہ اچھے ہتھیار تھے، نہ توپ خانے دوسرے یہ کہ پنجابی، سکھ، گورکھا، مرہٹا اور راجپوت ریاستوں نے انگریزوں کی مدد کی، تیسرے یہ کہ دکن اور جنوبی ہند کی افواج نے دھوکا دیا، چوتھے یہ کہ باغیوں میں کوئی اتحاد خیال نہ تھا اور کوئی مرکزی قوت ایسی نہ تھی جو انھیں منتشر نہ ہونے دیتی۔

بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی فوج کے ہاتھ سے توپ خانے نکال لئے گئے اور انھیں اپنے وطن سے بہت دور متعین کیا گیا۔ مثلاً گورکھا فوج کو پنجاب بھیجدیا گیا، سکھوں کو سرحد پر متعین کیا گیا۔ پٹھان فوج راجپوتانہ بھیجدی گئی اور بلوچی جنوبی ہند کی طرف۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کیا گیا کہ ایک ہی رجمنٹ میں مختلف قوموں کو بھرتی کیا گیا تاکہ پوری فوج میں اتحاد نہ ہو سکے اور یوروپین افواج کی تعداد بڑھا دی گئی۔

ہندوستانی فوج کا موجودہ نظام شاہی ذمہ داری کے اصول پر قایم ہے یعنی وزیر ہند محافظت ہندوستان کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں اور وایسرائے یہاں کی فوج کے افسر اعلیٰ ہیں۔ جدید ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے ہندوستان کی محافظت کا مسئلہ گورنر جنرل کی مرضی پر منحصر رکھا گیا ہے اور فوجی کے تمام معاملات کو منظور کی وہ اپنی مرضی سے دیکھتا ہے اس میں کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

کمانڈر انچیف تمام فوجوں کا افسر ہے اور ایک ملٹری کونسل اس کی مدد کے لئے موجود ہے۔ لیکن یہ کونسل صرف مشیرانہ حیثیت رکھتی ہے اور ذمہ داری کسی قسم کی اس سے متعلق نہیں ہے

ہندوستان فوجی حیثیت سے چار حصوں میں منقسم ہے۔ شمالی حصہ جس کا ہیڈکوارٹر مری ہے مشرقی حصہ جس کا مرکز نینی تال ہے، مغربی حصہ جس کا ہیڈکوارٹر کوئٹہ ہے اور جنوبی حصہ جس کا مرکز پونا ہے۔ ان چار کمانوں کے ماتحت درجہ اول اور درجہ دوم کے فوجی اضلاع علاوہ ازیں موجود ہیں۔

فوج کی تقسیم عملی حیثیت سے یہ ہے :-

(۱) وہ فوج جس کا فرض سرحدوں کی محافظت ہے اور جو ضرورت کے وقت آسانی سے بہم پہنچایا جا سکے۔

(۲) مصافی فوج جو حفاظت ہندوستان کی ذمہ دار ہے۔

(۳) داخلی محافظ فوج جس کا کام اندرون ملک میں امن قایم رکھنا ہے۔

ہندوستانی فوج انگریزی اور دیسی افواج پر مشتمل ہے۔

انگریزی فوج :-

یہ فوج انگلستان کی فوج کا حصہ ہے جو عارضی طور پر تین سال کے لئے ہندوستان بھیجی جاتی ہے۔ اس میں پانچ رجمنٹ سواروں کی ہوتی ہیں اور ۴۸ پیادہ فوج۔ ۱۹۲۱ء تک اس میں ہندوستانی افسر بالکل شامل نہیں تھا لیکن اب یک بٹالین دیسی ہوتی ہے۔

توپ خانوں میں بھی دیسی سپاہی بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ ڈرائیور وغیرہ کی خدمت انجام دیتے ہیں، یہ لوگ توپ چلانے کے کام سے واقف نہیں ہوتے اور نہ کوئی ذمہ داری کا کام ان کے سپرد ہوتا ہے۔

فوجی انجینیری میں بھی تمام افسر انگریز ہیں اور ہندوستانیوں کو کوئی موقعہ اس میں داخل ہونے کا نہیں ملتا۔ ہوائی فوج میں افسروں کی تعداد ۲۲۰ اور ہوابازوں کی ۱۸۸۷ ہے اور یہ سب یوروپین ہیں۔ دیسی لوگوں کی تعداد صرف ۹۴۵ ہے جو معمولی ملازم یا مستری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

۱۹۳۲ء تک کوئی ہندوستانی ہواباز نہ تھا، اسی سال چھ دیسی آدمی سب سے پہلے بھرتی کئے گئے اور ایک دیسی ہوائی فوج قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن رفتار اتنی سست ہے کہ صدیوں میں بھی دیسی آدمی اس کام

کیونکہ یہ مغربی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دیسی فوج۔۔

یہ فوج ۲۱ رجمنٹ رسالہ اور ۱۲۵ بٹالین (پیادہ فوج) پر مشتمل ہے ایک رجمنٹ میں افسر و سپاہی ملا کر ۶۰۰ کی تعداد ہوتی ہے اور بٹالین ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کی میکانکی آراستگی ایسی نہیں ہے جو مغربی افواج کا مقابلہ کر سکے۔

دیسی فوج کی ترتیب میں وقتاً فوقتاً بہت تبدیلی ہوئی ہے، اول اول کمپنی کے زمانہ میں زیادہ تر بنگال اور جنوبی ہند کے سپاہی بھرتی کئے جاتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں راجپوتوں اور پٹھانوں کی فوجیں زیادہ تھیں اور اب گورکھا، سکھوں، مرہٹوں، پنجابیوں، جاٹوں اور پٹھانوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پنجابی مسلمان فوج میں تقریباً ۳۰ فی صدی پائے جاتے ہیں اور بلوچی اور پٹھان دس فی صدی۔ سکھوں کی تعداد دس فی صدی ہے، باقی میں راجپوت، جاٹ، ڈوگرا اور مرہٹے شامل ہیں۔ غرضیکہ پلٹنیں زیادہ تر دکن اور پنجاب کے لوگوں پر مشتمل ہیں۔

ٹینک کور سب سے پہلے [illegible] میں قائم کی گئی تھی جس میں چھ مسلح گاڑیاں تھیں، اسوقت پانچ ہلکے ٹینک والی کمپنیاں ہیں جن میں ۲۵ ٹینک ہوتے ہیں اور ۸ مسلح گاڑی والی کمپنیاں جن میں سولہ مسلح موٹر کار ہوتے ہیں۔ ان سب میں صرف انگریز کام کرتے ہیں، ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔

آگزلیری فوج (Auxiliary Force) جسے ہنگامی فوج بھی کہہ سکتے ہیں ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی تھی جو صرف انگریزوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کو ہر قسم کی فوجی تعلیم دی جاتی ہے اور مقصود اس فوج سے یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس سے کام لیا جا سکے۔

ہنگامی فوج دیسی سپاہیوں کی بھی ہے لیکن ان کی فوجی تربیت نہایت معمولی و ناقص قسم کی ہوتی ہے۔

ریاست کی فوجیں جو ضرورت کے وقت حکومت کے سپرد کی جا سکتی ہیں تین قسم کی ہیں ایک ہندوستانی فوج کے معیار کی دوسری اس سے کم اور تیسری نہایت معمولی ان کی مجموعی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ان فوجوں کے قیام کے ساتھ اور جن محکموں کی ضرورت ہے وہ بھی سب کے سب انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں اور ہندوستانیوں کا بہت کم حصہ ان میں پایا جاتا ہے۔

چند سال قبل یہ تحریک ہوئی تھی کہ ہندوستانی فوجوں میں زیادہ عنصر دیسی فوج کا ہونا چاہئے اور انہیں میکانکی طریقے سے آراستہ کرنا چاہئے، لیکن اس پر بہت کم عمل کیا گیا ہے اور کوئی امید نہیں کہ ہندوستان کے باشندے کسی وقت خود اپنی حفاظت کے اہل ہو سکیں گے۔

ایک ملک کے سوالِ آزادی کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہاں کی آبادی اپنی حفاظت کر سکتی ہے یا نہیں اور اس لحاظ سے ہندوستان کی حالت سخت افسوسناک ہے

(پروفیسر اورکار)

تلامذۂ مصحفی

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ جتنے شاعر مصحفی کے سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہوئے کم سے کم اس زمانے کے کسی اور استاد کو نصیب نہ ہوئے۔ مصحفی ایک جگہ خود لکھتے ہیں ۔

"در زبان [illegible] ریختہ قریب صد کس امیر زادہا و غریب زادہا کہ باشند بشاگردی من آمدہ باشند"

یہی وجہ ہے کہ جتنے استادان کے تلامذہ و متوسلین ہیں سب نکلے کسی اور شاعر کو یہ شہرت حاصل نہ ہوا۔ مصحفی اپنے تلامذہ کی کثرت پر خود ناز کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

شاگرد تازہ از پس شاگرد می رسد
یعنی رجوع خلق بسونت ہمہ کہ بود

مصحفی کی فنی اور علمی خوبیاں اصل میں لکھنؤ جاکر اجاگر ہوئیں۔ لکھنؤ کا پہونچنا تھا کہ شاگردوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ ہر ضرورت مند [illegible] شاعری کے پاس آتا اور اپنی جھولی بھر کر واپس جاتا، وہاں امیر و غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ وہاں [illegible] خاں جیسے [illegible] سے نواب تھے۔ تو ادیب جیسا کہا رکھو موجود تھا۔

مصحفی کے تلامذہ کی صحیح تعداد کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے وجہ یہ ہے کہ اکثر تذکرہ نویس حضرات اس جانب مطلق توجہ نہیں کی۔ صاحب "شعر الہند" نے ایک فہرست دی ہے لیکن یہ نہایت ہی غیر مکمل اور ہر طرح سے ناقص ہے۔ اکبر [illegible] صدیقی صاحب نے ایک مضمون اس کے متعلق لکھا تھا جس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے کام لیا تھا لیکن یہ فہرست [illegible] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسر صاحب فرط اعتقاد و محبت میں سارے جہاں کو مصحفی کا شاگرد بنانے پر تلے ہوئے ہیں [illegible] میں مرزا سعادت یار خاں رنگین مرزا سلیمان شکوہ اور شیخ امام بخش ناسخ کا نام دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں [illegible] لئے سوچنے لگا کہ افسر صاحب نے غریب انشا کو کیوں چھوڑ دیا۔ انھیں بھی مصحفی کے تلامذہ میں داخل کر دیا ہوتا۔

[illegible] علاوہ اور بھی بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ مصحفی کے تلامذہ میں داخل ہیں۔ [illegible] خاں الم۔ شیخ علی بخش بیمار۔ شیخ محمد ابراہیم جاہ۔ حسن لکھنوی۔ نواب غلام حسین خاں حسین۔ لالہ چھبیلا لال طرب۔ [illegible] علی ذبیح عظیم آبادی۔ شیخ مراد علی سردر۔ لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ غلام امام شہید۔ بندہ حسن خاں طاہر

نواب عاشور علی خاں لکھنوی۔ میر مہدی حسین معروف۔ سید اصغر علی مفتون۔ محمد مہدی ملتمس۔ محسن علی خاں ہندی۔ ان میں طرب و دلگیر ذبیح۔ شاداب۔ شہید اور ہندی کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصحفی کے شاگرد نہیں تھے۔ بقیہ حضرات کے متعلق بھی جب تک کہ کافی شہادتیں نہ پائی جائیں میں اپنی رائے بدلنے کو تیار نہیں۔ رہے رنگین، سلیمان شکوہ اور ناسخ، رنگین شاہ حاتم کے مستقل شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان مصحفی کو ضرور دکھایا تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مصحفی ان کے اُستاد تھے۔ سلیمان شکوہ کے بارے میں اکثر حضرات نے غلطی کی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں :- واضح ہو کہ مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو شیخ مصحفی بنایا کرتے تھے (آبِ حیات صفحہ ۳۱۰)

نواب خیال "مغل اور اردو" میں فرماتے ہیں :- مصحفی پر قدر کی نگاہیں پڑنے لگیں اور ان کے کمال پر نظر کر کے شہزادے نے انھیں اپنا اُستاد بنا لیا (مغل اور اردو صفحہ ۱۱۹)

رام بابو سکسینہ تاریخِ ادبِ اردو صفحہ ۲۴۴ میں فرماتے ہیں :- "ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اس کے بعد مصحفی و انشا، کو کلام دکھایا، یہی غلطی صاحب "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" اور دوسرے حضرات نے کی ہے۔

حالانکہ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس خیال کی غلطی معلوم ہونے لگتی ہے۔

(۱)　سب سے پہلی بات یہ کہ سلیمان شکوہ کے دربار میں انشا کی رسائی مصحفی سے پہلے ہو چکی تھی۔

(۲)　سلیمان شکوہ کے کلام میں انشا، کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

(۳)　انشا اور مصحفی کے درمیان جب جھگڑے کھڑے ہوئے تو سلیمان شکوہ نے انشا کا ساتھ دیا حالانکہ اگر مصحفی اُن کے اُستاد ہوتے تو یقیناً وہ ایک غیر اُستاد کے مقابلہ میں اُستاد کا ضرور خیال رکھتے اور مصحفی کا ساتھ دیتے۔

(۴)　بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سلیمان شکوہ نے مصحفی کو باضابطہ دربار میں نوکر رکھا تھا اور تنخواہ دیا کرتے تھے اسلئے ضرور اصلاح لینے ہی کے لئے انھوں نے مصحفی کو مامور کیا ہوگا۔ اگر یہ استدلال صحیح مانا جائے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ سلیمان شکوہ کے اُستاد جرأت بھی ہیں کیونکہ جرأت بھی ان کے دربار میں ملازم تھے جیسا کہ خود مصحفی کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔

اب رہے ناسخ سو ناسخ مصحفی کے نہیں بلکہ مصحفی کے ایک شاگرد میاں محمد عیسیٰ تنہا کے شاگرد تھے، ناسخ کی شاگردی کے متعلق سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ مصحفی کی ایک تحریر کا ٹکڑہ ہے :-

"حصہ نعمت الوان ایں خوان بشیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است و بفقیر ہم رسوخ از تہ دل دارد مقسوم گشت"

ظاہر ہے کہ حصہ الوان "ایں خوان" سے مراد نفس شاعری ہے نہ کہ "خوانِ فیضِ مصحفی" —— پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود مصحفی نے ان تینوں کو اپنا شاگرد نہیں لکھا حالانکہ وہ اس معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ کسی شخص نے اگر صرف چند غزلیں بھی دکھا دیں تو آپ نے اس کا نام شاگردوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ اگر یہ تینوں ان کے شاگرد ہوتے تو اس کا تذکرہ وہ ضرور کرتے

بعض بلند پایہ حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مصحفی ریاض الفصحا میں بعض غلط اور نادرست باتوں کے اندراج کے لئے مجبور تھے ایسی حالت میں کسی واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے پر "ریاض الفصحا" سے استدلال کرنا معقولیت نہیں کہا جا سکتا، راقم الحروف کسی طرح یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ مصحفی نے قصداً ان لوگوں کا تذکرہ نہیں لکھا اور بعض غلط باتیں درج کر دیں کبھی کوئی مصنف اپنی کتاب میں قصداً غلط آمیزی نہیں کرتا اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ان صاحبوں نے یہ لکھ کر ثابت کر دیا کہ مصحفی کا پلہ تذکرہ نویسی میں بہت ہی کمزور تھا اور اس تذکرہ میں بہت سی غلط باتیں مصحفی نے درج کی ہیں اس لئے اس سے استدلال صحیح نہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون ـ

تمہید طویل ہو رہی ہے، مختصر یوں سمجھئے کہ اگر نگین سلیمان شکوہ، ناسخ مصحفی کے شاگرد نہ مانے جائیں تب بھی اُن کی افضلیت اپنی جگہ پر مسلم ہے ـ

مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں سب سے پہلے کون داخل ہوا یہ کہنا ذرا دشوار ہے پھر بھی قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ میاں عسکری نالاں اور میرزا بجو اکبر قدیم تلامذہ میں ہیں اور انھوں نے شاگرد ہونے میں بہت پہل کی ہے ـ ان کے بعد شاگردوں کا سلسلہ بندھا اور یہاں تک کہ ہیکڑوں تک پہونچا، ان میں آتش، اسیر، خلیق، ضمیر اور عیشی کا شمار تو اساتذہ میں ہوتا ہے لیکن ان کے علاوہ منتظر، غافل، ہوس، افسر، شعور اور رطباں وغیرہ بھی کسی طرح بھلائے جانے کے لائق نہیں ـ

اس مضمون کی ترتیب کے وقت حسب ذیل کتابیں پیش نظر تھیں ــــــ !

تذکرۂ ہندی	مصحفی	سراپائے سخن	محسن علی
ریاض الفصحا	"	گلزار ابراہیم	نواب خلیل غیر مطبوعہ
عقد ثریا	"	ہندو شعراء	عبدالرؤف عشرت لکھنوی
سخن شعرا	نساخ	صبح گلشن	سید علی حسن خاں غیر مطبوعہ
تاریخ ادب اُردو	سکسینہ	آب حیات	آزاد
تذکرۃ الشعرا	قدرت اللہ قاسم غیر مطبوعہ	رسائل	
گلشن بیخار	شیفتہ	ندیم	انجم
خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام	سہیل	رشید احمد صدیقی

ان کتابوں میں سب سے زیادہ فایدہ میں نے تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا سے اُٹھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ مضمون میں ہر جگہ حوالہ دینا بے جا طوالت سمجھ کر ترک کر دیا گیا ہے تلامذۂ مصحفی کی حالت جہاں جہاں میں نے دوسرے تذکروں سے لی ہے وہاں اُن کا حوالہ دے دیا ہے اور جہاں جہاں یہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ وہ حالات کہاں سے لئے گئے اُنکے ماخذ یہی دونوں کتابیں ہیں ـ

"الف"

(۱) آتش تخلص خواجہ حیدر علی نام، خلف خواجہ علی بخش لکھنوی، دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور مغل پورہ میں سکونت اختیار کی، فیض آباد میں پیدا ہوئے، ان کی استعداد علمی درجہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں اور ایک رسالہ فن عروض کا پڑھا تھا، ان کی تصانیف سے دو دیوان ہیں ایک ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا دوسرا ان کے بعد میر دوست علی خلیل نے مرتب کرکے شایع کیا۔

آتش کے تلامذہ تو بہت ہیں لیکن ان میں نواب سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہادی علی خلیل، عنایت علی بسمل، پنڈت دیا شنکر نسیم کافی مشہور ہیں اور دنیائے شاعری میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ناسخ ان کے متعلق لکھتے ہیں :—

"سوائے غزل کے اور کسی صنف سخن پر قادر نہ تھے، اشعار ان کے پرمضمون و بامزہ ہوتے ہیں" سخن شعرا ص

مصحفی لکھتے ہیں :—

از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو میکرد اما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود.......

در زبان نظم ریختہ کہ آنہم در متانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ بر معاصر نیش سبقت بردجستن دشوار می نماید

اگر عمرش وفا کردہ و چندسال بر ہمیں وتیرہ رفت و فکر متینش را مانعے درپیش نیاید یکے از بے نظیران روزگار خواہد شد۔ ریاض الفصحا ص

سنہ ۱۲۶۳ھ[1] میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کئے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :—

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر — ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے،

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

آئے تھے لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا،

جوش وحشت میں جو ہوں مائل رفتار قدم — شہر ہستی سے ہے صحرائے عدم چار قدم

حباب بحر میں دیوانوں کو زندان ہستی ہے — ہمیں دشت عدم تک جا پہونچا جوش مستی ہے

[1] آب حیات صفحہ ۳۸۹

خاک ہوتے ہی ہر اک داماں نے جا دی مجھے　　ہوگئی اقبال آخر میری بربادی سب مجھے
اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے　　دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

(۲) احمد تخلص، منشی اسحٰق خاں نام متوطن لاہور، یہ شیخ صدیقی تھے، ان کے بزرگ ۳۰ سال تک لکھنؤ میں اقامت گزیں رہے، یہیں انھیں منشی کی ایک نوکری مل گئی، اور اسی سے اوقات بسری کرتے رہے۔ احمد کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں انھوں نے نشو و نما پائی ابتدا میں اردو اشعار پر قلندر بخش جرأت سے اصلاح لیا کرتے تھے اُن کی وفات کے بعد مصحفی سے اصلاح لینی شروع کی۔ طبیعت میں روانی بہت زیادہ تھی مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

"در طبعش البتہ روانی کمال است"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

گیا میں بے خودی سے نامہ کو تسطیر بے معنی　　نہ وہ یار ب جواب اسکا کرے تحریر بے معنی
بہم ہونا جہاں میں صورت و معنی کا لازم ہے　　جو دیکھو غور سے ہے صورت تصویر بے معنی
نظر کی جب سواد ابروئے قاتل پہ اے احمد　　نظر آئے حروف جوہر شمشیر بے معنی
خیال مہر تاباں گر ہوا سکے روئے روشن پر　　تو پھر خط شعاعی کا گماں پڑتا ہے چلمن پر
سمجھ کر قاتل عالم محبت اس سے کی ہم نے　　وبال خون ناحق ہے ہمارا اپنی گردن پر
میں وہ بیکس ہوں جس کے گور پر عبرت برستی ہے　　کوئی جز بیکسی۔ روتا نہیں ہے میرے مدفن پر

(۳) اختر تخلص میر اکبر علی نام، یہ پہلے انجم تخلص کرتے تھے، میر عبداللہ کے بیٹے اور سرہند کے مشائخ زادگان سے تھے آتشبازی بنانے میں یگانۂ دہر تھے، ایک مرتبہ اختر مرزا جان کے ہمراہ لکھنؤ آئے، مصحفی اس زمانہ میں میر محمد نعیم خاں کے مہمان تھے ایک روز میرزا جانی وہاں پہونچے اور ان کی اس صنعت کی اتنی تعریف کی کہ میر صاحب انکے گرویدہ ہوگئے اور آخر کار انھیں اپنے ملازمین خاص سے کرلیا۔ یہیں ان کی مصحفی سے ملاقات ہوئی، ایک روز ایک بستہ میں کچھ کاغذات و مسودات لیکر مصحفی کے پاس پہونچے کہ اصلاح دے دیجئے، یہ طیار ہوگئے اور اصلاح دیدی اس کے بعد ان کا معمول ہوگیا اور ہمیشہ مصحفی سے اصلاحیں لینے لگے، کچھ دنوں کے بعد جب مصحفی امتداد زمانہ کے باعث بہت پریشان ہوگئے تھے اور وحشت مزاجی بہت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ شعر و شاعری سے بھی بالکل دلچسپی نہ رہی تھی یہی نہیں بلکہ جیسا کہ ان کا بیان ہے کہ اس سے نفرت ہوگئی تھی اختر حسب معمول اصلاح کے لئے آئے مصحفی نے کہا کہ بھائی ! اب میرا دماغ اس کام کے لایق نہ رہا، تم میاں قلندر بخش جرأت کے پاس جاؤ اور ان سے اصلاح لیا کرو، پہلے تو یہ راضی نہ ہوئے لیکن جب دیکھا کہ مصحفی

کسی طرح تیار نہیں ہوتے تو مجبوراً جرأت کے یہاں پہونچے، ساتھ ہی ساتھ مصحفی کا ایک رقعہ بھی لیتے گئے، اس دن سے جو کچھ زندگی بھر لکھتے رہے انھیں کو دکھلاتے رہے، تاریخ وفات معلوم نہیں اور نہ تاریخ ولادت کے متعلق کچھ کہا جاسکتا ہے تقریباً تمام تذکرے اس بارے میں خاموش ہیں، ہاں لالہ سری رام نے البتہ اتنا لکھا ہے کہ ۱۷۹۳ء میں بیس برس کے تھے[1] اس حساب سے ۱۷۷۳ء تاریخ ولادت قرار پاتی ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

کس رشک گل سے لگ کر آئی صبا چمن میں — کیا بو مہک رہی ہے اب جا بجا چمن میں
سوچتے کیا ہو مرے قتل کو میاں بسم اللہ — کھینچ کر تیغ لگا بیٹھیے، ہاں بسم اللہ
تمھاری جنبش ابرو ہی کا مارا ہو وہ پیارے — کہ انجم کے ناحق قتل پر اب آپ کہتے ہیں
لائی صبا یہ کس کی نکہت چمن کے اندر — چھپتی ہے بوے غنچہ سو پیرہن کے اندر
پھڑکتا رہ گیا مرغ چمن حسرت میں اڑنے کی — بوقت ذبح بھی صیاد نے اس کے نہ پر کھولے

ان کے بعض اشعار میں ابتذال بہت ہے:-

صاف دل سے بھی جو اسکو اپنے ہم گھورے گئے — تو بھی سب دل میں گماں کچھ اور ہم پر لے گئے
بولے گھبرا کر ہمیں پیٹے جو یہ حرکت کرے — سامنے اس کے گلے تک ہم جو خنجر لے گئے
کر رہے ہیں لوگ باہر کے جو سب چرچا ابھی — کون تھا وہ جس کو تم شب گھر کے اندر لے گئے

شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں ان کا ایک شعر نقل کیا ہے جو خوب ہے:-

تماشے کے ہی جا مژگاں پہ جو لخت جگر نکلا — عجب یہ نخل ہے جس میں کہ شکل گل ثمر نکلا[2]

(۴) اخگر تخلص مرزا محمد مہدی نام ان کے آباو اجداد قرا باغ سے آئے تھے یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی، فارسی کے علاوہ عربی کی بھی متداول کتابیں ختم تھیں، ان کے متعلق خود مصحفی کی رائے ہے:-

"جوان قابل است البتہ بجائے خواہد رسید"[3]

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

جذبۂ شوق جو خضر رہ صحرا ہووے — کیوں نہ سر رشتہ ترا بادیہ پیما ہووے
آستیں کو جو نچوڑوں شب فرقت میں کبھی — کوچۂ شہر ہر اک دامن دریا ہووے
گلبرگ تر کو رنگ سے ہو جیسے انفعال — ہے ان دنوں میں وہ گل داغ کہن کا رنگ

[1] تذکرہ خمخانہ جاوید صفحہ ۱۹۹ ـ [2] گلشن بیخار، قلمی مشرقی کتب خانہ بانکی پور ـ [3] ریاض الفصحا، از مصحفی قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور ـ

جوش شگوفہ تھا کہ ہوئے تن سے جاں رواں اے وائے ہم نہ دیکھنے پائے چمن کا رنگ
ہم اس دیار کے ہیں مسافر کہ ہے جہاں نوبت کی شام ہیں رخ صبح وطن کا رنگ

---

(۵) ادیبؔ تخلص۔ لالہ گوربخش رائے نام خلف الکنی داس، ذات کے کہار، مفتی گنج (لکھنؤ) کے رہنے والے لالہ بینی پرشاد طریقؔ کی وساطت سے مصحفیؔ تک پہونچے، ابھی چند ہی غزلوں پر اصلاح لی تھی کہ استاد بھائیوں نے سمجھ لیا کہ اگر اصلاح کا سلسلہ جاری رہا تو ہم لوگوں کی خیر نہیں، ان میں تنہا بہت پیش پیش تھے، چنانچہ استاد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آیندہ وہ ادیبؔ کو اصلاح نہ دیں گے، یہ دربار مصحفی میں حاضر ہوئے تو استاد کا رنگ ہی کچھ اور دیکھا مجبور ہو کر پھر اپنے آبائی پیشہ کی طرف متوجہ ہو گئے، اسی زمانہ میں نواب سعادت علی خاں کے تامجان بردار دربار میں ہو گئے، ان کے بعد غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے، انھوں نے ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا، انعام و اکرام سے مالا مال ہوئے اور خزانۂ عامرہ کی محرری انکے سپرد کی گئی، دو شعر سنئے :-

از بسکہ تو کسی کا ہمدم یار کم ہوا رو رو گیا تو جس سے تجھ سے وہ بیزار کم ہوا
ہم خاک میں ملے تری خاطر وہ لے میاں ملنا ترا نہ غیر سے زنہار کم ہوا

---

(۶) اسیرؔ تخلص، منشی سید مظفر علی خاں نام خلف میر امداد علی حضرت عباسؓ کی اولاد میں تھے[۱] مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر ابھی دو تین ہی برس تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا کہ مصحفی کا انتقال ہو گیا، اور یہ سلسلہ بند ہو گیا، ان کی تصانیف سے چار[۲] اردو کے دیوان ہیں، ایک فارسی دیوان، ایک مثنوی " درۃ التاج " اور " رسالہ عروض " چھپکر شایع ہو چکا ہے، ان کے علاوہ مرثیہ اور قصاید بہت لکھتے ہیں علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے، زبان پر حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے ان کے شاگردوں میں امیرؔ مینائی احمد علی شوقؔ، فضل رسول خاں واسطی، کافی مشہور ہیں ۸۴ برس کی عمر پاکر رامپور میں ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ اشعار ملاحظہ ہوں :-

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی
شیشہ رہے بغل میں، جام شراب لب پہ ساقی یہی مزا ہے دو دن کی زندگی کا
اسی کا دیر میں جلوہ اسی کا نور کعبہ میں نزاعیں اس قدر رہیں کس لئے گبر و مسلماں میں
جو عاقل ہے اٹھا دل سے تعلق دہر فانی کا دم آیا یا نہ آیا کیا بھروسہ زندگانی کا
آگیا ضعف ہی کچھ کام کہ تربت میں اسیر ہو گئی ختم قیامت مرے اٹھتے اٹھتے[۳]
زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک[۴]

---

[۱] تذکرہ سراپا سخن ص۱۱ ـــ [۲] منشی امیر مینائی کہتے ہیں کہ اردو کے چھ دیوان ہیں، صاحب تاریخ ادب اردو کا بھی یہی خیال ہے ملاحظہ ہو ص۳۰۴
[۳] خمخانۂ جاوید ص۳۰۳ ـــ [۴] تاریخ ادب اردو ص۳۰۵

(۷) اسیر تخلص منشی ہدایت علی نام خلف سید امیر علی، ان کے آبا و اجداد لکھنؤ کے ایک قصبہ "زید پور" کے رہنے والے تھے مگر بعد کو میرٹھ میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ مصحفی اور نواب حسین علی خاں اثر کو دکھایا کرتے تھے اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی اشعار کہتے تھے، فارسی میں اسیری اور اُردو میں اسیر تخلص تھا نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

ہر بن مو سے اُڑاتے ہیں شرارے ہاتھ پاؤں   چار نخل آتش ہیں اب ہمارے ہاتھ پاؤں
گوہر مقصود ہاتھ آیا نہ یا آشنا   بحر اُلفت میں دلا لاکھوں ہی مارے ہاتھ پاؤں

---

(۸) اظہار یہ محمد صابر شمیم (تلمیذ مصحفی) کے چھوٹے بھائی تھے، ابتدا میں پیر بخش مسرور سے فن شعر و سخن حاصل کیا، پھر مصحفی سے اصلاح لینے لگے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے وہ جو بانکپن کرے   دعوائے تیغ پھر نہ کوئی تیغ زن کرے
اس آرزو میں ہم تو مرے تھے کہ اپنی خاک   شاید کہ خاک تو دہ وہ ناوک فگن کرے
اظہار ہو یقین مجھے کیا اُس کی بات کا   جب جھوٹے وعدے روز وہ پیماں شکن کرے
اک دم میں خاک کر دے جلا کر وہ چرخ کو   آہ حزیں کا اپنی اگر امتحاں کروں[1]
ہوں وہ بیکس میں اسیروں میں ترے اے ظالم   رحم کرتے ہیں سبھی قیدیِ زنداں مجھ پر
اپنی تو یہ خوشی ہے کہ اظہار خلق میں   وہ کام کیجئے جو کسی پر گراں نہ ہو

---

(۹) افسر تخلص، غلام اشرف نام ولد غلام رسول یہ دو تخلص کرتے تھے، اشرف اور افسر مرثیہ و سلام میں اشرف تخلص کرتے تھے اور غزل مثنوی وغیرہ میں افسر لیکن یہ مشہور افسر ہی سے ہیں، ان کے متعلق مصحفی کی رائے ہے :-

"طبعش مناسب تمام بدرستی کلام دارد"[2]

یہ صاحب دیوان تھے اور دیوان کا نادر الوجود قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں محفوظ ہے، "نگار" کے کسی دوسرے نمبر میں انشاء اللہ تعالیٰ اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا، نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

جب دیکھے ہے مہ داغ سیہ اپنی جبیں پر   آتا ہے اسے رشک ترے روئے حسیں پر
معلوم نہیں کیا ہے تہ خاک تماشا   نرگس کی جو رہتی ہے جھکی آنکھ زمیں پر

---

[1] اس مضمون کا ایک شعر میرے ایک دوست جناب جوہر فریادی عظیم آبادی کا بھی بہت خوب ہے :-

آج دیکھوں گا میں فریاد کی تاثیر اپنی   کہدو اب خیر منائے فلک پیر اپنی

[2] تذکرہ ہندی ۱۹۳۳ء مطبوعہ انجمن ترقی اُردو حیدر آباد -

کچھ تمنا دل کو اپنے باغ جنت کا نہیں   کام اسے اختر ہے مجھ کو کوچۂ دلدار سے
غم فراق سے اس شعلہ رو کے لئے اختر   جلا کرے ہے مرا مغز استخواں ہر روز

---

(۱۰) آکبر تخلص عرف بچو، یہ شوخ طبع، طرار اور اپنے وقت کے مشہور لطیفہ گو تھے جن دنوں مصحفی شاہجہاں آباد میں تھے یہ اصلاح کے لئے آئے اور اسی زمانہ سے شاگرد ہوئے، بعد کو شاہ حاتم کی خدمت میں گئے اور پورا استفادہ انھیں کی ذات سے کیا، مصحفی ان کے کلام کو ناپسند کرتے ہیں، ان کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ اساتذۂ مشہور کے اشعار اپنے نام سے پڑھ دینے میں انھیں کوئی تامل نہ تھا، زمانے کے عام مذاق کے موافق کلام متوسط درجہ کا ہے، یہ شعرائے قدیم سے تھے مصحفی کا بیان ہے کہ یہ محمد شاہ بادشاہ کے نقیبوں میں تھے، انھوں نے ایک مثنوی "افیون نامہ" بھی لکھی ہے جس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ صاحب دیوان گزرے ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو :-

ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا نہ گڑتے ہیں   یہ کافر ہو بہ جو وقت تن کر ٹک اکڑتے ہیں
خدا جانے سو ہووے اب ہمارے حق میں اے اکبر   صنم سے اپنے ہم بھی آج اک بوسہ پہ اڑتے ہیں
دل میں جو آج درد ہے اکبر کے دوستاں   کس کی نگہ کے تیر کا پیکان رہ گیا

---

(۱۱) آلم تخلص محمد حسین خاں نام، غازی پور کے رہنے والے، ان کا صرف ایک شعر مل سکا :-

گالیاں سنتا ہوں میں تیرے ہی منہ سے ورنہ   مجھکو اک بات تو کہتا یہ دہن کس کا تھا

---

(۱۲) الٰہی تخلص، الٰہی بخش نام، انھیں سر تراشی و فصادی میں کمال حاصل تھا، شیخ پیر بخش مسرور کی معرفت مصحفی کے پاس شاگرد ہونے کو آئے، مصحفی لکھتے ہیں :-

"شعر بسیار شستہ و سادہ و عاشقانہ و عارفانہ میگوید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در طبعش رسائی کمال معلوم می شود، اغلب اینہم در چندے گو از معاصرین خود خواہد برد"

نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

یارب خمار بادہ الفت عیاں نہ ہو   یا مئے کشی کا مجھ پہ کسی کو گماں نہ ہو
خواب میں بھی نہ آئے جو عاشق دلفگار کے   چرخ ستم شعار نے ایسے پہ بتلا کیا
چمن میں گل پہ کب وہ بلبل ناشاد نے دیکھا   جو عالم یار پر مجھ خانماں برباد نے دیکھا
مٹایا عشق نے جب صفحۂ ہستی سے نام اپنا   دو عالم سے پرے ہم کو نظر آیا مقام اپنا

غم نے ہماری سیر کی خاطر روز چمن تیار کیا　　　دامن کو گلزار بنایا آنکھوں سے برسا کے لہو
اس نے دیکھی ہے نشے میں کسی میخوار کی طرح　　　باغ میں جھومے ہے سرو لب جو پہ کھڑا

---

(۱۳) اندوہ تخلص، نواب سید علی حسین خاں خلف نواب شمس الدین بن بارگاہ قلی خاں، شاعری کا شوق تھا، لیکن شعر بہت کم کہا کرتے تھے، اصلاح مصحفی سے لیا کرتے تھے، مجلس مشاعرہ اکثر منعقد کرتے تھے، اندوہ کے بارے میں مصحفی کی رائے ہے۔" کلامش رفتہ رفتہ بجائے خواہد رسید"۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

صیاد نے رکھے گل پژمردہ قفس پر　　　اچھی ہوس مرغ گرفتار نکالی
مارا تھا ہمیں عشق نے اک پردہ نشیں کے　　　کیوں نعش ہماری سر بازار نکالی
غیرت مہتاب خود ہے چہرۂ روشن ترا　　　چاہئے کیا گھر میں تیرے اے بت پرفن چراغ
ہمارے نام کا دشمن ہے اس قدر وہ شوخ　　　لکھا ہوا بھی کہیں دیکھے تو مٹا ڈالے
کس سے دنیا میں رکھوں چشم مددگاری دل　　　جز غم دوست کسی نے بھی نہ کی یاری دل

---

(۱۴) " اوباش" تخلص، شیخ امیر الزماں نام، یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اپنے زمانہ کے خوشگو شاعروں میں امتیازی درجہ رکھتے تھے، ۱۲۹۳ھ میں جوان تھے، قدرت اللہ قادری اپنے تذکرہ "تذکرۃ الشعرا" میں لکھتے ہیں:۔

"مشق سخن از میاں غلام ہمدانی مصحفی نمودہ، "بامزہ" میگوید"

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

دین و دنیا سے ہم پھرے پر آہ　　　اپنی خو سے وہ بدگماں نہ پھرا
ہو گئے سیر انتظار میں ہم　　　تو بھی او باش وہ جواں نہ پھرا
مجھ سے مت منزل کی پوچھو سرگزشت　　　ہمرہاں آگے گئے، میں رہ گیا
دل و دیدہ اپنے جو یار تھے سو وہ درد و غم میں کھنچ گئے　　　ہمیں جن سے چشم امید تھی وہی آنکھ ہم سے چرا گئے

"ب"

(۱۵) برق تخلص، میاں شاہ جی نام، ان کے نام میں اختلاف ہے خمخانۂ جاوید و سخن شعرا وغیرہ میں "شاہ جی" ہے اور تذکرۂ ہندی میں "شاہ جیو"، ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو ان کے مزاج میں ظرافت اور طبیعت میں شوخی درجۂ اعتدا

---

[۱] خمخانۂ جاوید ص

سے متجاوز تھی ایک قدیم بیاض میں ان کے چند شعر ملے ہیں اور یہی اشعار تمام تذکرہ والے نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

یوں لاکھ ہوں دنیا میں تو کچھ کام نہیں ہے
واللہ کہ تجھ بن مجھے آرام نہیں ہے

ہووے دل پژمردہ مرا کیوں کہ شگفتہ
ہے باغ میں گل، پردہ گل اندام نہیں ہے

کیا دھوم سے اُٹھی ہے گھٹا اُبھی ہوا میں
افسوس کہ ساقی و مے و جام نہیں ہے

اے برق تو نے ہی اپنا جلایا دمیں اس کے
کچھ خوب تو اس کام کا انجام نہیں ہے

---

(۱۶) "بندہ" تخلص، میر بندہ علی نام، ولد میر حاتم علی، یہ سادات کرام میں سے تھے۔ بہت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھے ضلع جگت و پھبتی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو:-

سر ٹپکتا میں رہا صبح سے تا شام تلک
ہاتھ پہونچا نہ تری زلف سیہ فام تلک

بھلا بتاؤ تو دل پھر کہاں لگے اپنا
جہاں نہ ہووے کوئی یار دہرباں اپنا

بہار آئی ہے گلشن میں دیکھنے اس کو
ابھی اجاڑ نہ بلبل تو آشیاں اپنا

جی سے ہم گزرے جان سے گزرے
پر نہ تم اپنی آن سے گزرے

یہ اثر ہے ہمارے نالہ میں،
جا کے جب آسمان سے گزرے

کچھ نظر آتے ہیں اب مرگ کے آثار ہمیں
جینے دینے کا نہیں عشق کا آزار ہمیں،

شب ہجر میں جان جاتی نہیں ہے
اجل مانگتا ہوں سو آتی نہیں ہے

(۱۷) "بے باک" تخلص، میر نجف علی نام۔ ان کے آباو اجداد عربی تھے، چند پشتوں سے سرکار "کوئل"، علیگڈھ میں قیام تھا، یہ وہیں پیدا ہوئے، ۹ سال کی عمر میں شاہجہان آباد آئے اور یہیں جوان ہوئے یہ[1] اولاد امام ہمام موسیٰ کاظمؑ سے تھے صاحب تذکرۃ الشعرا بھی لکھتے ہیں، "وے از سادات رضوی" انھوں نے طبابت بھی سیکھی تھی ۲۴ ہی برس کی عمر میں مسند حکمت پر بیٹھ گئے تھے اور علاج معالجہ شروع کر دیا تھا، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے اور جو کچھ کہتے مصحفی کو دکھلاتے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

ہم کو لیل و نہار نے مارا
گردش روزگار نے مارا

ایک تو آگئے ہی تھے سودائی
تس پہ جوشش بہار نے مارا

ایک دن ہو تو کوئی صبر کرے
روز کے انتظار نے مارا

صبر کس طرح کیجئے بے باک
اس دل بے قرار نے مارا

---

[1] گلشن بیخار از شیفتہ صد ۲۹

صیاد یہ ہوس ہے دلِ داغدار میں
گلپوش کر قفس کو مرے تو بہار میں

جلتے ہیں دل کو شمع نما پاؤں کے تلے
یہ رسم اک نئی ہے بتوں کے دیار میں

بیباک کوئی دل کے دیکھے تو اب تلک
آتش بھری ہوئی ہے ہمارے مزار میں

ہمیں تیری ہی ہر دم جستجو ہے
کہ اپنا مطلب و مقصود تو ہے

گریباں کی الجھ گیا ہاتھ اپنا ناصح
گریباں اور دامن سب رفو ہے

دادخواہوں سے گھر نئے رہتے
اس کا جس کوچے سے گزار ہوا

---

(۱۸) بیمار تخلص، شیخ علی بخش نام، ساکن بانس بریلی، انھیں فارسی عربی سے بھی واقفیت تھی، "بوستان خیال" کے کئی باب اردو میں نظم کئے ہیں، کئی دیوان بھی مرتب کئے تھے۔ ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۱ھ میں ۶۷ برس کی عمر میں انتقال فرمایا، ان کے شاگردوں میں تسلیم سہسوانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، چند شعر سنئے:۔

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

سانس آہستہ لیجئے بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

مسجد میں پی شراب، پڑھی دیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

نہ بنا تا جو دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

"پ"

(۱۹) پروانہ تخلص، راجہ جسونت سنگھ نام عرف کاکاجی ولد راجہ بینی بہادر جو نواب شجاع الدولہ بہادر کے رکن رکین تھے، ظاہری وجاہت اور حسن اخلاق کے باعث اپنے ہمعصر امرا میں ممتاز تھے، ایک تذکرہ میں تو یہاں تک انکی خوبصورتی کی تعریف لکھی ہے کہ یہ جوان یوسف مثال تھے اور ایک زمانہ زلیخا وار ان کا دیوانہ اور فریفتہ تھا، استعداد بھی بہت معقول تھی، کچھ غزلیں میر تقی میر کو بھی دکھلائی تھیں، یہ صاحب دیوان تھے، کلام بہت پاکیزہ اور عمدہ ہے، خوش فکر اور بڑے طباع تھے، ہندی کبت بھی خوب کہتے تھے، ارباب کمال کے بڑے قدر داں تھے۔ لالہ سری رام صاحب "خمخانۂ جاوید" کا بیان ہے کہ ان کا دیوان ڈاکٹر اسپرنگر کے کتب خانہ میں موجود تھا، یہ پہلے فارسی زبان میں طبع آزمائی کیا کرتے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کو دکھاتے تھے، چنانچہ فارسی اشعار مصحفی کو تذکرہ اول لکھتے وقت شاہجہاں آباد میں میرزا قتیل کی معرفت ملے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب مصحفی شاہجہاں آباد سے لکھنؤ آئے تو انھیں چونکہ مصحفی سے ملاقات کا

لہ صاحب سخن شعرا نے ان کا نام الٰہی بخش لکھا ہے۔

با شوق تھا آئے، اور تپاک سے ملے اور اسی زمانہ سے فارسی ترک کرکے اُردو میں اشعار کہنے لگے۔ یہ کس کے شاگرد تھے اس کے متعلق صحیح طور پر کہنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے تذکرہ نگار حضرات کا اس میں بڑا اختلاف رہا ہے۔

لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید اور اکثر تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ "مصحفی کے شاگرد تھے"۔

عبدالغفور صاحب نساخ کا خیال ہے کہ وہ سرپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے، لکھتے ہیں:- "پروانہ شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ شعر فارسی بھی کہتے تھے، نہایت شکیل جوان تھے بعض تذکرے والوں نے ان کو مصحفی کا شاگرد بتلایا ہے، اس پر اعتبار نہیں"۔

نواب خلیل "گلزار ابراہیم صلا" میں فرماتے ہیں:- "یہ لالہ سرپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے"۔

عبدالغفور نساخ کا تذکرہ پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات میرحسن کو ان کا اُستاد سمجھتے ہیں ایسی صورت میں مجھے کوئی صحیح رائے دینی مشکل ہوتی لیکن اتفاق سے شوقی کتب خانہ پٹنہ میں قدرت اللہ قادری کے قلمی تذکرہ "تذکرۃ الشعرا" میں یہ عبارت نظر سے گزری جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں:-

در فارسی شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ ہست در ریختہ اول تلمذ تیغ بہادر خلیفہ میر تقی میر نمودہ ازاں پس میرحسن مرحوم صاحب مثنوی بدرمنیر استفادہ نمودہ، در آخر با میاں غلام ہمدانی مصحفی توسل جستہ صلا

ریختہ گوئی میں اُستادانہ درجہ رکھتے تھے[1] شاہ عالم کے جلوس کے چوبیسویں سال لکھنؤ میں موجود تھے[2] ۱۸۱۵ء میں انتقال کیا[3] طوالت کے خیال سے صرف اُردو اشعار کے نمونہ پر اکتفا کرتا ہوں:-

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غمخواری کرے ۔۔۔ ہے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے

دل یار سے اور درد مرے دل سے کہے ہے ۔۔۔ جانے کا نہیں اب تو میں پہلے ہی کسی سے

کہتی ہے عندلیب چمن میں پکار کے ۔۔۔ اپنے بھی دن پھریں گے پھر ہی دن بہار کے

جس نے دیکھا اسے، کیا سجدہ ۔۔۔ غرض اس بت نے بھی خدائی کی

کون مدفون ہے، چمن میں صبا ۔۔۔ جس کی تربت پہ گل فشانی ہے

پوچھتے اب ہو مرغ دل کا حال ۔۔۔ کب سے وہ جنت آشیانی ہے

نسیم آہ نے شاید کسی کی کی تاثیر ۔۔۔ شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے

"ت"

(۲۰) تائب تخلص، سید بندہ علی نام ولد میر محمدی، بزرگوں کا وطن کشمیر تھا خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نمایائی بقدر ضرورت عربی و فارسی سے بھی واقفیت تھی، شعر و سخن کا سلسلہ بہت دنوں سے تھا لیکن ایک روز مصحفی کی خدمت میں حاضر

[1] سہیل ج نمبر۔ [2] گلزار ابراہیم صلا۔ [3] خمخانہ جاوید جلد دوم سے لیکن خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی "ہند و شعرا" میں لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۸۲۵ء میں ہوا ملاحظہ ہو صلا

ہوئے اور مستقل شاعری شروع کردی، مصحفی نے انھیں پہلے بہت سمجھایا کہ اس جھنجھٹ میں نہ پڑو تحصیل علم کی تکمیل کرو وہ نہ مانے، آخر مجبور ہو کر مصحفی نے اپنے تلامذہ میں داخلہ کر لیا، چند شعر ملاحظہ ہوں :-

اتنا تو کر کہ اشک رواں رخ پہ ہو کوئی　　اے ضبط گریہ تجھ سے خلل آبرو میں ہے
رکھتے ہیں گرچہ مہر خموشی دہن پہ ہم　　لیکن زبان حال تری گفتگو میں ہے
تائب نہ زخم سینہ سے میرے تو ہاتھ اٹھا　　بھائی ! ابھی تو کام بہت سا رفو میں ہے

---

(۲۱) تسلی تخلص الاٹیکا رام نام، گوپال رائے بخشی کے لڑکے، یہ بھولا ناتھ کے چھوٹے بھائی تھے[۱]، خصوصاً اہل کمال سے بہت تواضع و تعظیم سے پیش آتے، بزرگوں کا وطن اٹاوہ کے قریب "کریل" ایک جگہ ہے وہیں تھا، لیکن ان کی نشو ونما لکھنؤ میں ہوئی مصحفی کا بیان ہے کہ یہ بہت مہذب جوان تھے، ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچیس برس کی عمر میں اُردو فارسی کے اشعار بہت اچھے کہنے لگے۔ اساتذہ کے اکثر دواوین اور مثنویاں جمع کیں اور انتخاب کیا چنانچہ مصحفی کا دیوان فارسی اور دیوان ہندی بھی انھوں نے نقل کیا، مصحفی کے دیوان اول کو بھی انھوں نے بہت کم عرصہ میں نقل کرکے دیدیا۔ اُن کی ذہانت طبع اگرچہ محتاج مشورہ نہ تھی تاہم فارسی اشعار میرزا محمد فاخر مکین کو دکھاتے، اُردو کی غزلیں انھوں نے بہت کم کہیں ہیں لیکن جو کہی ہیں وہ مصحفی سے دکھلائی گئی ہیں۔ انھیں کتابوں سے تو گویا عشق تھا چنانچہ ہزار ہا روپئے خرچ کرکے نادر الوجود دیوانوں کے قلمی نسخے کتب خانہ میں جمع کئے۔ صاحب "تذکرۃ الشعراء" ص۴۲ لکھتے ہیں :-

مرد خوش فکر صاحب شعور می شود

۱۸۶۳ء تک بقید حیات تھے[۲]۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

دیکھے سماں جو اس مژۂ اشکبار کا　　ہو جائے شق جگر رگ ابر بہار کا
جو چاہے سلطنت اسے ظل ہما ملے　　مجھ کو یہی ہوس ہے کہ وہ مجھ سے آملے
تو نہ میری ہی جان ہے کافر　　تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگتا ہے مرے تصور سے　　کس قدر بدگمان ہے کافر
دن پھرے پھر مگر تسلی کے　　ان دنوں مہربان ہے کافر
نہ سنی تو نے ایک بات کبھو　　ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا
تجھ پہ آفت یہ نئی پھر دل زار آئی ہے　　لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں　　کیا پوچھتے ہو حال شب انتظار کا

---

[۱] سراپا سخن ص۱۵۹ — [۲] ہندو شعراء ص۵۳

(۲۲) تمنا تخلص، بھیرول داس نام، قوم کایستھ سے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے جب ۱۹ سال کے ہوئے تو شعر کہنے کا سودا سر میں سمایا، پہلے مشورۂ سخن میاں محمد عیسیٰ تنہا (تلمیذ مصحفی) سے کیا کرتے تھے، کچھ مدت کے بعد تنہا تمنا کو لیکر مصحفی کی خدمت میں آئے اور انھیں کے سپرد کیا، ان کے بارے میں مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں :-

"چوں سلیقۂ درست داشت شعر خود را در عرصۂ قلیل بپایۂ پختگی رسانید"

کلام ملاحظہ ہو :-

سرگرم شب ہجر ہے بیدادگری پر — اور آہ نے باندھی ہے کمر بے اثری پر
پروانہ کو کیا سوز دل اسکی کی خبر ہے — گزرے ہے جو کچھ حال چراغ سحری پر
رکھ قفس دور چمن سے مرا صیاد کہیں — کان میں گل کے نہ پہونچے مری فریاد کہیں
سچ تو یہ ہے کہ تمنا کو جہاں میں ہرگز — مصحفی سا نہ ملے گا کوئی استاد کہیں،
سمجھائیں کس کو آہ غم ہجر یار میں — اپنا تو دل ہے اپنے نہیں اختیار میں
جز محنت سفر نہ تمنا ہوا حصول — ملک عدم سے آئے عبث اس دیار میں

---

(۲۳) تنہا تخلص محمد عیسیٰ نام، بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد تھا لیکن یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے[1]، اپنے وقت کے دیگر باکمالوں کی طرح دہلی کو خیرباد کہکر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور مصحفی کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوئے، خوش خلقی، سلیم الطبعی، رنگین مزاجی، کے اوصاف کے علاوہ قدامت پرستی ان کا خاص شیوہ تھا، چنانچہ تمام عمر لکھنؤ میں رہے پھر بھی دہلی کی زبان اور قدیم رنگ نہ چھوڑا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ شیخ ناسخ اوایل عمر میں ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۲ھ میں لکھنؤ جا رہے تھے، کہ ڈاکوں نے راہ میں قتل کر ڈالا، ناسخ نے ان کے وفات کی تاریخ لکھی ؎

آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا

مصحفی کو اپنے عزیز شاگرد کے مرنے کا از حد افسوس ہوا، یہ صاحب دیوان گزرے ہیں، مصحفی کے شاگردوں میں آتش کے بعد انھیں کا درجہ ہے، دیوان فارسی کے علاوہ ایک کلیات سنہ ۱۲۳۲ھ کا لکھا ہوا ہے جس میں غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی، چند مخمس اور پچیس رباعیاں بھی درج ہیں، جو مولف تذکرہ "خمخانۂ جاوید" کے کتب خانہ میں موجود ہے انتخاب کلیات حسرت موہانی نے شایع کیا ہے، مصحفی لکھتے ہیں کہ "ان کے خیالات بہت رسا ہیں" انھیں مرثیہ و سلام کہنے کا بھی بہت شوق تھا سپہگری بھی کیا کرتے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

حیراں تھا کل وہ آئینہ یکبار دیکھ کر — کچھ میں بھی رہ گیا اسے لاچار دیکھ کر
میں وہ اسیر سیر چمن ہوں شکستہ بال — روتے ہیں مجھ کو مرغ گرفتار دیکھ کر

---

[1] یہ مصحفی کا بیان ہے لیکن خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۱۸ میں ہے کہ ان کی اصل شرفائے دہلی سے تھی اور دہلی میں پیدا ہوئے۔

ے ہاتھ میں تک دامن کو اٹھا ہے یہی کوئی چلنے کی ادا　　　خاک اسکی تو یوں برباد نہ ہے جو راہ میں تیری خاک ہوا

تنہا کھیں تو قع کس بات کی کسی سے　　　ہاں سچ تو یہ ہے بھائی، کوئی نہیں کسی کا
چمن میں آکے جا ہی یہ کس نے لی ہے نسیم　　　شگفتگی سی جو ہر گل کی یاں کلی پر ہے
لگا دی آگ ساقی نے لنڈھا کر شیشۂ مے کو　　　بہایا اس نے شب محفل میں کیا سیلاب آتش کا
ساقی نے دیا تھا جو معلوم نہیں مجھکو　　　جام مے گلگوں تھا، یا جام گرفتاری
کیوں دام قفس لادے صیاد اگر سمجھے　　　صیاد کی اُلفت ہے خود دام گرفتاری

"ش"

، ثمر تخلص، مرزا اصلی نام، خلف میرزا جعفر علی لکھنوی، یہ غدر تک زندہ تھے، بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد تھا، یہ لکھنؤ پیدا ہوئے اور جوان ہوکر عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی، صاحب "سراپا سخن" نے لکھا ہے کہ اردو فارسی دو زبانوں میں شعر کہتے تھے اور دونوں کے دیوان موجود ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

غمزہ سے تڑپے ہے کوئی عشوہ سے مر گیا　　　چلتے ہیں کس طرح ترے ناز و ادا کے ہاتھ
آنکھوں سے ملتے ملتے جو اس سیمتن کے پاؤں　　　آتے جو ہاتھ چومتے اس گلبدن کے پاؤں
جستجو دل کی عبث گیسوئے دلدار میں ہے　　　چیز گم گشتہ کہیں ملتی شب تار میں ہے

"ج"

(۲) جوان تخلص، میرزا نعیم بیگ نام، شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے، ابتدائے شباب ہی سے طبع موزوں رکھتے ہے، جس زمانہ میں مصحفی شاہجہاں آباد میں رہتے تھے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور جب ملتے بڑے تپاک سے ملتے، جب مصحفی میرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں ملازم ہوئے تو ان کے تعلقات اور بڑھ گئے، ہجوم افکار کے باعث انھیں اگرچہ شعر کہنے سے چنداں سروکار نہ تھا، تاہم جب شکوہ کوئی مشاعرہ منعقد کرتے تو ان کی حاضری ضروری تھی۔ شروع سے آخر تک مصحفی کے معتقد رہے اور انھیں سے اصلاح لیتے رہے، خیالات میں نفاست کافی پائی جاتی ہے، صاحب خمخانۂ جاوید ... لکھتے ہیں کہ طبع موزوں پائی تھی، جوانی میں لکھنؤ جاکر صاحب عالم کے ملازم ہوئے اور مصحفی و انشا کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

ہم بیچتے آئینۂ دل، تیرے ہی ہاتھوں　　　پر ہم نے تجھے اس کا خریدار نہ پایا

گر اس کی بے وفائی کا شکوہ بیاں کروں — تو رفتہ رفتہ جمع میں اک داستاں کروں
اس سے تو اپنے حسن کا شعلہ نہ چھپ سکا — میں ضبط آہ کیونکر بھلا اے جواں کروں
نقاب اُلٹ کے جو شب کو وہ مہ لقا نکلے — تو چاند شرم سے بادل میں منھ چھپا نکلے
کسی کو اپنی سفارش کے واسطے اس پاس — جو لیکے جاؤں تو اس کا وہ آشنا نکلے
چین نہیں ہے جی کو ٹک آہ جگر خراش سے — ہوک اُٹھے ہے دمبدم دل میں عجب تماشہ ہے

---

(۲۲) جوشؔ تخلص، رحیم اللہ نام عرف رحمو، یہ ایک بیاداں تھے، طبع موزوں رکھتے تھے، حافظہ بڑے غضب کا تھا یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کے دفتر کے دفتر انھیں یاد تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ خود بھی موزوں کرنا شروع کیا، چند سال تک کامل طور پر اس شغل میں مصروف رہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرگوئی کی کافی قوت پیدا کرلی اور اصلاح کے لئے مرزا فدوی کے پاس آئے شاگرد ہوئے اور ان سے اصلاح لیتے رہے ان کی وفات کے بعد مصحفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا کلام انھیں کو دکھانے لگے۔ یہ ایک آزاد منش اور یار باش آدمی تھے اکثر ہولی کے زمانہ میں دوسرے آزادوں کی تقلید میں جابجا گلی گلی کوچے کوچے غزل خوانی کرتے پھرتے تھے سنہ ۱۱۹۳ھ میں دہلی میں موجود تھے[1] چند اشعار سنئے:۔

طرف پر اپنے نظر کر تو ابھی لڑکا ہے — منھ صراحی سے نہ او دلبر میخوار لگا
دریا مری آنکھوں سے نت جاری ہو کہاں ہے — بیدرد تو کیا جانے، کیا رنگ کسو کا ہے
میں نے جو کہا تجھ بن کیا کیا نہ الم گزرا — بولا کہ ابے، تیرا رونے ہی جنم گزرا[2]

"ح"

(۲۳) حاذقؔ تخلص حکیم شاہ عالم خاں نام ولد مولوی محمد عالم، قوم افغان یوسف زئی، ساکن شاہجہاں پور، یہ فن طبابت میں بھی بقدر ضرورت استعداد رکھتے تھے اسی مناسبت سے اپنا تخلص حاذق رکھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

اُٹھ کے میرے پاس سے جسوقت وہ جانے لگا — بےخودی طاری ہوئی ایسی کہ غش آنے لگا
اے صبا باغ سے خنداں تجھے آنا کیا تھا — موسم گل میں اسیروں کو ستانا کیا تھا
روز واں باڑھ دھری جاتی ہے تلواروں پر — کوئی ہوتا ہے خفا اتنا گنہگاروں پر

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۲۱۴

[2] بعض تذکرہ نگار حضرات اس شعر کو میر آلم خلف میر درد کا بتاتے ہیں لیکن مصحفی نے جوش کے انتخاب کلام میں اسے نقل کیا ہے۔

(۲۸) حباب تخلص لطف علی بیگ نام ولد مرزا کلو بیگ، ابتدائے طفولیت ہی سے طبع موزوں رکھتے تھے ان کے بارے میں مصحفی لکھتے ہیں :- "طبع رسا، و ذہن ذکا دارد" نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

حباب وار جو مٹنے کی آرزو کرتے　　چمن میں ہم بھی سر سیر آبجو کرتے
ہمارے خانۂ دل میں ہے روشنی اس کی　　کہ جس کے دیر و حرم میں ہیں جستجو کرتے
خزاں کے ہاتھ سے تنگ آ گئے ہیں نغمہ سرا　　بہار آئے کہ جس کی ہیں آرزو کرتے
سرنگوں میں ورق دل کی جو تحریر میں تھا　　رنگ بھرتا قلم فکر سے تصویر میں تھا،
گردش چرخ ستمگر نے مٹایا آخر　　نقش بہزاد میں اس چرخ کی تعمیر میں تھا
عمر گزری کہ میں واقف نہیں مےخواری سے　　ہاتھ ساقی نے بھی کھینچا مری ناداری سے
قفس تنگ میں کہتے ہیں یہ مرغان قفس،　　کب چھٹیں دیکھئے اس رنج گرفتاری سے

---

(۲۹) حریف تخلص لالہ چنی لال نام ولد روشن لال، قوم کایستھ، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، کئی سال تک کتب درسیات مصحفی سے پڑھتے رہے۔ بعد کو فن شاعری بھی انھیں سے سیکھا، اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اندریں وادیٔ پرشور کہ وحشت خیز است　　جز مغیلاں کہ کشد گوشۂ دامان مرا
قیس بیچارہ پس قافلہ دم می شمرد　　حیف اے صاحب محمل خبرے نیست ترا
شب کہ سرگرم طپش میرا دل بے تاب تھا　　اشک جو آنکھوں سے نکلا قطرۂ سیماب تھا
یہ کون غیرت حور آج بے نقاب ہوا　　کہ جس کے جلوہ سے ہر ذرہ آفتاب ہوا
نہیں ہے مجھکو دم نزع آب کی حاجت　　غم فراق سے میرا جگر ہی آب ہوا
حریف زار نے جو آج خون تھوکا ہے　　وہ شوخ غیر سے شاید کہ ہم شراب ہوا

---

(۳۰) حسام تخلص شیخ ولایت علی نام ولد شیخ زین العابدین نبیرۂ حضرت شاہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ، انھیں بھی شیخ مصحفی سے شرف تلمذ حاصل ہے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

تجھ بن جو کبھی مجھ کو گلستاں نظر آیا　　ہر صحن چمن گوشۂ زنداں نظر آیا
جاتا ہے دل زار وہاں خیر ہو یارب　　جس کوچہ میں رستم بھی ہراساں نظر آیا
کھولے جو کبھو بند قبا باغ میں اس نے　　ہر غنچۂ گل سر بگریباں نظر آیا

"خ"

(۳۱) خرّم تخلص، امام الدین احمد نام خلف شیخ رضی الدین عرف غلام مرتضیٰ سروری۔ نظم فارسی میں اپنے والد ہی سے استفادہ کیا اور اردو شاعری کا جب شوق ہوا تو مصحفی کی طرف متوجہ ہوئے اور حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ فارسی کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

بیزار گشت کعبہ و دیر از گناہ من — اکنوں بجز در تو نباشد پناہ من
زاں نیلی است جادر گردوں کہ در ازل — عکسے فتادہ بود ز بخت سیاہ من
مرا بہ آں دہن تنگ یک سخن باقیست — جہاں بکام رسیداست و کام من باقیست
زبے سبب پر پروانہ در لگن ماند است — نشانِ سوختن شمع انجمن باقیست

---

(۳۲) خلیق تخلص، میر مستحسن نام، بہ کم عمری ہی سے اشعار موزوں کرنے لگے تھے، کچھ دنوں تک تو ان کے والد ماجد انکے کلام کو دیکھتے رہے آخر جب مصحفی لکھنؤ آئے تو انھوں نے خلیق سے کہا کہ مصحفی اس فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں یہی موقع ہے کچھ ان سے حاصل کرلو۔ چنانچہ خلیق مصحفی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور مصحفی بھی اپنے زرین مشوروں سے انھیں برابر مستفیض کرتے رہے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے — جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم
اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا — تھا ستارا کہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو — پھول جو دست باغباں سے گرا
رشک آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو — صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو
گزری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب — باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

---

(۳۳) خلیل تخلص، شیخ محمد خلیل نام، ان کی حالت کچھ معلوم نہ ہوسکی، صاحب سراپا سخن ص۱۶۵ نے صرف اتنا لکھا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، دو شعر ملاحظہ ہوں :-

خم کیونکہ ہو ایسے بت مغرور کی گردن — خم کردے جو اک بات میں جمہور کی گردن
جب آگے ترے شمع نے سر اپنا اٹھایا — گلگیر نے تب اس کے دہیں دور کی گردن

(۳۴) خاں تخلص، اشرف علی خاں نام[1] ولد محمد علی خاں قوم افغان خٹک، اودھ کے بزرگ شاہجہاں آباد کے رہنے والے

---

[1] خود کہتے ہیں :- نام تیرا ہے گو کہ اشرف خاں — سب سے بدتر جہاں میں تو ہے

تھے، یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ جب انھیں شاعری کا شوق ہوا تو اپنے پدر بزرگوار کے اشارہ پر مصحفی کے شاگرد ہوئے، جناب شیفتہ گلشن بیخار[۴۳] میں فرماتے ہیں: "دہلی سے لکھنؤ گئے اور وہیں مصحفی سے شاعری سیکھی" صاحب خمخانۂ جاوید[۴۴] لکھتے ہیں :- غازی الدین حیدر کے زمانہ میں لکھنؤ میں رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ یہ صاحبِ دیوان تھے مگر دیوان نے شہرت نہ پائی۔

اے خاںؔ غمِ فراق میں تم زہر کھا مرو　　　اس کے سوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

بوسے لئے نشہ میں لبِ سرخ رنگ کے　　　غافل ہوا وہ شوخ تو ہشیار میں ہوا

میں نکل جاؤں کہاں دستِ دلِ ناشاد سے　　　مردمِ ہمسایہ نالاں ہیں مری فریاد سے

کبھی کاٹا گلا، خنجر سے لے تیغِ دو آبی سے　　　مجھے قاتل نے مارا دیکھنا کس کس خرابی سے

"ذ"

(۳۵) ذاکرؔ تخلص، میاں بشارت اللہ نام عرف محمد ذکریا ولد شیخ ہدایت قوم قدوائی سے تھے، فارسی و عربی کی اکثر کتابیں ختم تھیں، کچھ دنوں تک مصحفی سے بھی فارسی پڑھتے رہے اسی دوران میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور مصحفی سے اصلاح لینے لگے نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

دیکھی جو اس کے ابروئے خمدار کی شبیہ　　　آنکھوں میں اپنی پھر گئی تلوار کی شبیہ

تری چشمِ شوخ سے کب بشر کوئی چشم اپنی ملا سکے　　　جو نگاہ بھر تو نظر کرے تو پری بھی پر نہ ہلا سکے

---

(۳۶) ذوقؔ تخلص، شیو پرشاد نام، مولوی مظہر علی کی معرفت مصحفی کے پاس شاگرد ہونے کو آئے، فن شعر و عروض بھی مصحفی سے مکمل طور پر سیکھا، اپنا دیوان بھی مرتب کیا، یہ ہجو بھی کہا کرتے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

دیکھنے پایا نہ میں رنجِ اسیری صیاد　　　ہو گیا مرغِ دل آتے ہی تہِ دام تمام

کیا قیامت کا ہے دن یہ نہیں معلوم مجھے　　　روزِ ہجراں کی جو ہوتی ہی نہیں شام تمام

کیفیت اس کی بیاں کس سے کریں اب لے ذوقؔ　　　دیکھتے ہم ہیں تماشائے جہاں کیا کیا کچھ

آگے سے اس کے پاؤں اٹھاؤں میں کس طرح　　　خورشید و مہ بھی دیکھ کے جس کو ٹھٹھک گئے

(باقی)

مختار الدین آرزو

مُسافر

ایک لڑکی اپنی کُٹی سے باہر بیٹھی ہوئی خیالوں کی لڑیوں میں اُلجھی ہوئی تھی ۔ سامنے ایک نوجوان آکر کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا " یہاں ٹھہرنے کو جگہ مل سکتی ہے ؟"

لڑکی نے اپنی آنکھوں کو اوپر اُٹھایا۔ ان آنکھوں میں ایکدم بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے بغیر جواب دئے ہوئے نیچی نگاہ کرلی، پھر وہ جوان بولا" میں بہت دور سے آیا ہوں، میرے پیروں میں سے جان نکل گئی ہے ۔ کانٹوں سے پیر گھائل ہوگئے ہیں۔ دور دور کی خاک چھانتا چلا آرہا ہوں میں پوچھتا ہوں ۔ کیا یہاں ٹھہرنے کو جگہ مل سکتی ہے ؟"

لڑکی بولی ـــــ" یہ مسافر خانہ ہی تو ہے ۔ پھر ٹھہرنے کو جگہ کیوں نہیں مل سکتی ! یہاں سب ٹھہرنے ہی کو آتے ہیں اور پھر کوچ کر جاتے ہیں !"

بہار کے دن آئے ۔ پھل پھول آنے لگے ، پودے جوانی کے نشے میں جھومنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا قدرت نے نیا روپ لیا ہے ۔ پرندوں نے راگ الاپنے شروع کئے اور دنیا کے کونہ کونہ سے پریم کے گیت پھوٹ نکلے ۔

اس لڑکی اور مسافر پر بھی کچھ ایسا ہی رنگ چڑھا ہوا تھا ! ۔ مخمور شرابیوں کی طرح وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے !

چاندنی رات ہوتی ۔ چاندی جیسی سفید چادر ہری گھاس پر ہر طرف بچھی ہوتی، گلاب چمپئی کے پھول ہر طرف اس طرح بکھرے رہتے جیسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے مٹھی بھر بھر کر پھولوں کی بوچھار کی ہو، اور دو پودوں کا آمنے سامنے ہوتا ایسا معلوم ہوتا گویا وہ آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں ! خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہے ہیں !

وہ لڑکی اور مسافر بھی جب دونوں مل جاتے تو ایسے معلوم ہوتے ، جیسے دو پودے آمنے سامنے چپ چاپ کھڑے ہوں، مسافر کے جانے کا وقت آیا۔ بہار بھی رخصت ہونے لگی اور وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے۔

مسافر کے کندھے پر گٹھری تھی۔ اس کے آگے لمبی سڑک دور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ پیچھے مڑ مڑ کر اپنی کُٹی کو دیکھ رہی تھی !

مسافر چلدیا۔ لڑکی رو پڑی ۔ آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جس نے مسافر کو

اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

چار پانچ مہینے گزر گئے اور مسافر کی کوئی خبر سنائی نہ دی، حالانکہ اس لڑکی کے کان اسی طرف لگے رہتے! وہ روزانہ اُسی سڑک کی طرف اپنی نگاہ جمائے رہتی جس طرف سے مسافر آیا تھا اور جب سورج اندھیرے میں ڈوب جاتا تو وہ بھی کٹی کے اندر جاکر لیٹ جاتی اور نڈھال ہوکر، نااُمید ہوکر سو جاتی! اسی طرح اس کا سارا دن کٹتا۔ انتظار میں اور پھر مایوسی میں! روزانہ وہ سورج کو نکلتا ہوا دیکھتی۔ اس کی اُمید کی دنیا بھی جگمگا اٹھتی۔ روزانہ اپنے وقت پر سورج ڈوب جاتا۔ دنیا اندھیرے میں غرق ہو جاتی۔ اس کی امید کی دنیا میں بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہو جاتا! اسے معلوم ہوتا تھا کہ مسافر کو گئے ہوئے زمانہ ہو گیا ہے

سارے گاؤں میں ہل چل مچ گئی۔ کوئی کہتا ''آوارہ ہے''، کوئی کہتا ''کلٹنی ہے!'' اس کا باپ بھی اسے کلنک کا ٹیکہ سمجھتا۔

اس کلنک کے ٹیکے کو اس نے اپنے پاس سے ہٹانے کا ارادہ کر لیا۔ کلنک کے ٹیکے کو وہ اپنے پاس تھوڑے ہی رکھ سکتا تھا! دنیا والے اپنے طعنوں سے اسکو نوچ نوچ نہ کھائیں گے؟ اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ کلنکت ہو جاتا تو وہ اس کو بھی کاٹ کر پھینک دیتا! اس کی لڑکی کو بھی تو اس کے ہی جسم کا حصہ سمجھنا چاہیئے!

وہ لڑکی سب کی سنتی اور ایک کونے میں چپ چاپ آنسو بہایا کرتی۔ اس کی ٹھنڈی سانسیں اسکی چھاتی سے نکلتیں اور پھر وہیں کی وہیں سما جاتیں! اس کے دکھ درد کی کہانی سننے والا کون تھا؟ اس سے منھ موڑنے والے اسکو گالی دینے والے تو ہزاروں تھے!

تعجب تو یہ ہے کہ وہ زندہ تھی! جس دنیا نے اس کی طرف سے منھ موڑ لیا تھا اس دنیا کی طرف اب بھی امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی! مگر اس کا جینا جینے میں تو گنا نہیں جا سکتا تھا۔ ایک کونہ میں چھپ کر بیٹھنا! وہیں روتے رہنا سسکتے رہنا — جگمگاتے سنسار کی بے تعداد خوشیوں سے محروم رہنا — کیا یہ بھی کوئی جینا ہے! معلوم نہیں کونسی امید اس کے دل میں اپنا گھر بنائے تھی۔ امید سے تو دنیا قایم ہے! ممکن ہے کسی امید نے اسے بھی زندہ رکھا ہو! مگر اس کی وہ اُمید پوری نہ ہوتی تھی۔

مسافر ہی ٹھہرا، آج یہاں تو کل وہاں۔ اس کا کیا ٹھکانا، اس کے وعدوں کا کیا ٹھیک، مسافر ہی تھا نا! وہ ایک ٹھکانے سے دوسرے ٹھکانے چلتا ہی رہتا ہے! مگر ایسا ہوتے ہوئے زندگی کا بندھن کیوں جوڑا!، اور دل کو سنسار کی نظر میں کیوں ذلیل کیا!

گھٹا ٹوپ اندھیرا ----- سارا سنسار اسی اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے! لڑکی اپنی کٹی سے نکلی! اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا! دور ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کچھ آدمیوں کے بولنے کی آواز اس کے کانوں تک پہونچ رہی تھی! مگر اسے معلوم نہ ہو سکا وہ کیا بات کر رہے ہیں۔ آواز بالکل صاف سنائی نہیں دیتی تھی! پھر بھی

اس نے خیال کر لیا کہ میرا ہی چرچا ہوگا۔ گاؤں والے آجکل اور کس کا چرچا کر سکتے ہیں ؟ جو بدنام ہوتا ہے اسی کا تو چرچا کیا جاتا ہے !

وہ سوچ رہی تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ گھر سے نکال دیجا دے گی۔ اس کا پتا اپنی چھاتی پر پتھر رکھ کر اسے کوڑا کرکٹ کی طرح گھر سے نکال دے گا! کوڑا کرکٹ بھی گھر کے ایک کونہ میں پڑا رہتا ہے! مگر وہ تو کوڑے کرکٹ سے بھی بدتر سمجھی جا رہی تھی !

وہ خیال کر رہی تھی - کیا میرا پتا اور تھوڑے دنوں تک اپنے ہاں نہیں رکھ سکتا جب تک وہ مسافر واپس آجاوے۔ مگر کیسے ؟ دنیا اور دنیا والوں کو کیا منہ دکھائے گا۔ وہ ضرور صبح ہونے سے پہلے ہی اس کو گھر سے نکال دیگا اور جانے کے بعد ان لوگوں کو گھر کا کونہ کونہ دکھا دیگا کہ اس کے گھر میں لڑکی کے پاؤں کا نشان بھی نہیں ہے !

مگر وہ صبح تک رکے ہی گی نہیں ! وہ اپنے پتا کو موقع ہی نہ دے گی کہ وہ اسے نکالے۔ اس کے پتا نے اسے رات بھر ٹھہرنے کی اجازت اسی وجہ سے دیدی تھی کہ جہاں تو رات میں کون دیکھنے آوے گا کہ اس کی لڑکی ابھی تک اسکے گھر میں موجود ہے، دوسرے اس نے خیال کیا کہ رات میں کہاں جائے گی صبح کو وہ اپنا کوئی راستہ تو معلوم کرے گی۔ اگرچہ وہ اس کی محتاج نہ تھی ! اسے کوئی راستہ معلوم ہی نہ کرنا تھا کیونکہ وہ کسی راستہ کو جانتی ہی نہیں تھی ! اس کا راستہ تو صرف ایک تھا جو مسافر تک لے جاتا مگر وہ راستہ کیسے معلوم ہو ؟ — ایک سیدھی سڑک تو اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتی ہوئی دور تک چلی جا رہی تھی مگر آگے چلکر تو وہ بہت ٹیڑھی میڑھی ہوگئی تھی اور مسافر کا اسے پتہ بھی نہ معلوم تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور کہاں گیا ؟ وہ تو مسافر تھا — آیا — تھوڑی دیر قیام کیا — اور پھر گٹھری کندھے پر رکھ کر چیدیا — اس کا نام بھی تو اسے معلوم نہ تھا۔ وہ تو اس سے بالکل ناواقف تھی۔ پھر وہ کونسا راستہ ڈھونڈھتی ؟ کس کو تلاش کرتی ؟

وہ صبح تک ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھ رہی تھی ! اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ آدھی رات کو جدھر بھی منھ اٹھ جائیگا ادھر ہی چل دے گی۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑی رہی اور گاؤں والوں کی دھیمی دھیمی آواز سنتی رہی — اس کی آنکھوں میں بلا کی حسرت تھی۔ اس کی چھاتی پر قیامت کا بوجھ تھا !!

وہ بجلی کی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں میں سے آخری دفعہ صرف یہ آواز نکلی -

"—— او — بے رحم سنسار تیرے یہاں دکھیوں کی گنجایش نہیں !"

اس لڑکی کا اب کہیں پتہ نہیں ! —— وہ کٹی اب بھی ہے۔ اس میں مسافر اب بھی آتے ہیں ٹھہرتے اور چلے جاتے ہیں مگر اس لڑکی کا اب کہیں نام و نشان نہیں !

بہار پھر آئی - وہی رنگ روپ — وہی مستی - وہی نغمے — وہی چاندنی رات! مگر ان چاندنی رات میں اُن دول کا وجود نہ تھا!

وہی مسافر پھر آیا - اس نے اس لڑکی کے پتا سے پوچھا -

"کیا یہاں ٹھہرنے کو جگہ مل سکتی ہے!"

"ہاں - ہاں - کیوں نہیں بھائی"

"دس برس ہوئے جب میں پہلے یہاں آیا تھا تو یہاں ایک لڑکی بھی تو تھی؟"

"ہاں - اس کا ذکر نہ کرو! میں تو اسے یاد بھی نہیں کرتا - اس نے تو میرے کلنک کا ٹیکہ لگایا!"

"تو وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، سنا ہے ڈوب کر مرگئی"

مسافر خاموش ہوگیا اور اب اس کو یاد آیا کہ کبھی اس نے اس لڑکی سے کوئی قول و قرار کیا تھا!

شنکر سروپ بھٹناگر - ام - اے

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے - جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے، قیمت ۲ر

دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے از جی سی کما پا صاحب قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی - اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُنکے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے - قیمت ۴ر

شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُنکے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ بتایا گیا ہے کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُنکے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُنکی زندگی وابستہ ہے - قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت :- از ڈاکٹر زین العابدین صاحب - یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے - اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے - قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

ضبط تولید اور استلذاذ بالمثل

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ضبط تولید کا مسئلہ بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے اور یہ تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے کہ اب اس تحریک کو مذہبی یا قانونی حربوں سے کچلا نہیں جا سکتا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں کے تناسلی جذبات کے متعلق کچھ تحریر کرنا ایک ایسا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی تلافی "بعد یک عمر و ع" بھی نہیں ہو سکتی تھی لیکن خدا جزائے خیر کرامت فرمائے ایک جرمن ماہر جنسیات مسٹر ہیمر (Hammer) کو جنھوں نے ۱۹۱۱ء میں اس طلسم حیا کو توڑا اور اپنی تصنیف میں مرد و عورت کے تناسلی جذبات پر عدیم المثال صاف گوئی سے بحث کی۔ مسٹر ہیمر کی کتاب نے منکرین اثر ہا کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور جن حضرات کے نزدیک جنسیات پر کوئی کتاب لکھنا گناہ کبیرہ کے مترادف تھا وہ خود اس بدعت سیئے کے مرتکب ہونے لگے۔

جنگ عظیم کے بعد کی کساد بازاری اور روز افزوں افزائش نسل کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں ہیمر کی تحریک نے ضبط تولید کی صورت اختیار کر لی۔ ضبط تولید کی تحریک رفتہ رفتہ لوازم تہذیب میں داخل ہوگئی اور آخر کار بعض اسلامی ممالک (مثلاً ایران۔ ترکی) نے باوجود اس کے کہ ملک کے لحاظ سے آبادی بہت کم تھی مہذب مشہور ہونے کی غرض سے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دے دیا۔ ایران کا رقبہ چھ لاکھ تیس ہزار مربع میل اور آبادی ایک کرور سے کچھ زیادہ ہے لیکن وہاں کی حکومت نے اس مختصر آبادی کو ضرورت سے زیادہ سمجھ کر نہ صرف عقد منقطع اور تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا بلکہ عوام الناس کو تقریراً اور تحریراً ضبط تولید کی تحریک قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ ہمارے ہندوستان جنت نشان کا رقبہ ایران سے تگنا ہے اور آبادی اقل مرتبہ ۲۵ گنی زیادہ ہے مگر اب تک نہ حکومت نے ضبط تولید کی تحریک کو فروغ دینے کی کوئی کوشش کی اور نہ عوام نے اس سلسلہ میں کوئی موثر سعی کی۔ یہ ضرور ہوا کہ علامۂ نیاز۔ کرنل بھولا ناتھ اور چند دیگر محبان وطن کی تصانیف سے متاثر ہو کر بعض حضرات نے ضبط تولید پر خامہ فرسائی فرمائی لیکن میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ جس طرح کوکا پنڈت کے ارشادات قابل عمل نہیں ہیں اسی طرح ان حضرات کے افادات عالیات بھی کم از کم ہندوستانیوں کے لئے قابل عمل نہیں۔ مفکرین اروپا کی تقلید فرما کر یہ ارشاد فرمانا کہ ضبط تولید کرو اس لئے کہ ضبط تولید وطن کے لئے مفید ہے مرعوب کن تو ضرور ہے مگر کیا ایسے ملک کے باشندے جس میں خواندہ افراد کی تعداد ۱/۲ سے بھی

کم ہے صرف اس بنا پر ضبط تولید کے نظریہ پر عمل پیرا ہو کر اپنی بہیمانہ خواہشات کو فنا کر سکتے ہیں کہ ضبط تولید وطن کے لئے مفید ہے؟ اور فرض کیجیے کہ ہر ہندوستانی اتنا تعلیم یافتہ اور محب وطن ہو بھی جائے کہ وہ ضبط تولید کے بت پر اپنی ناجائز خواہشات قربان کر دے لیکن آخر کار اس کی جائز اور فطری جنسی خواہشات کا کیا مداوا ہوگا؟ یورپ اور امریکہ کا ہر فرد اتنا خوش حال ضرور ہے کہ وہ آلات مانع تولید خرید سکے لیکن ہندوستان ایسے ملک میں جس کی نصف سے زیادہ آبادی شب و روز میں صرف ایک مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے ادنےٰ طبقے کے افراد سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ قیمتی مانع تولید آلات کا کیا ذکر معمولی قسم کے آلات بھی خرید سکیں گے؟ کہا جاتا ہے کہ دیر میں شادی کرنا یا مختلف اقسام کے مانع تولید آلات کا استعمال افزایش نسل کو روکنے کا بہترین طریقہ ہیں مگر کیا کبھی یہ بھی غور کیا گیا ہے کہ یہ طریقے مخصوص ہیں طبقۂ امرا کے لئے جن کو ضبط تولید کی حقیقتاً کوئی ضرورت نہیں؟ غربا جنھیں ضبط تولید کی ضرورت ہے نہ مانع تولید آلات استعمال کر سکتے ہیں اور نہ اپنی لڑکیوں کو زیادہ عمر تک ناکتخدا رکھ سکتے ہیں۔ شاید بہت کم حضرات کو معلوم ہوگا کہ سارد ا ایکٹ کے نافذ ہونے کے بعد اسقاط حمل کے جرائم زیادہ ہونے لگے اور سڑکوں پر مردہ اور زندہ لاوارث بچے زیادہ تعداد میں پڑے پائے گئے۔ فطرت کی ترغیبات امرا و غربا کے لئے یکساں تھیں مگر امرا کی لڑکیوں کی لغزشیں چادر زر سے چھپا دی گئیں اور غریب لڑکیاں یا تو مصائب زنداں میں مبتلا ہوئیں اور یا افشائے راز کے بعد اپنے غریب لیکن سخت سماج کی نظروں میں ذلیل ہو گئیں۔ ہندوستان میں نہ لاوارث بچوں کی پرورش کا کوئی انتظام ہے اور نہ ابھی ہمارے سماج میں اتنی وسعت نظر پیدا ہوئی ہے کہ خطاکار لڑکیوں کو دامن عفو میں چھپا لے پھر اگر ضبط تولید اس کا نام ہے کہ معصوم بچوں کو ہولناک طریقوں سے ہلاک کیا جائے نوجوان لڑکیوں کو ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے اور سماج کے نظام کو درہم و برہم کر دیا جائے تو شاید ہندوستان میں ضبط تولید کی تحریک کو ختم کرنا بہتر ہوگا۔ ہمارے مفکرین و مصلحین یورپائی خیالات سے متاثر ہو کر احکام تو صادر فرما دیتے ہیں مگر یہ غور نہیں فرماتے کہ ہندوستان کی حالت یورپ اور امریکہ سے کتنی متباین ہے۔ یورپ میں ضبط تولید کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا مگر کیا اس تحریک کو ہندوستان میں بھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب عرض کرنے سے قبل میں اس شبہ کو زایل کرنا چاہتا ہوں جو اکثر حضرات کو اس مضمون کا عنوان پڑھ کر پیدا ہوا ہوگا۔ میں نہ تخیل پسند ہوں اور نہ فردوسی (Romantic) خیالات کا دل دادہ میں ایک عملی انسان ہوں اور جذبات کی رو میں بہنا پسند نہیں کرتا۔ ضبط تولید کی تحریک کا حامی میں بھی ہوں لیکن یہ نہیں چاہتا کہ اس کے نتائج سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کر دوں۔ یہ ناممکن ہے کہ ۳۵ کروڑ انسان حب وطن کے لئے اپنی فطری خواہشات فنا کر دیں اسلئے ضبط تولید کی تحریک کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں مسایل جنسی سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ اپنی فطری خواہشات کو فرو بھی کر سکیں اور ملک کی آبادی میں غیر ضروری اضافہ بھی نہ ہو؟ تفحص فرمایئے تو صرف تین طریقے ایسے ملیں گے جنھیں کم و بیش موثر کہا جا سکتا ہے (۱) فحاشی (۲) استلذاذ بالنفس اور (۳) استلذاذ بالمثل۔ فحاشی کی دو قسمیں ہیں

(الف) پیشہ ور عورتوں سے اختلاط اور (ب) غیر پیشہ ور عورتوں سے ربط ضبط۔ پیشہ ور عورتوں سے اختلاط میں سب سے زیادہ اندیشہ امراض سوداوی کا ہے کیونکہ ہندوستانی عوام حفظانِ صحت کے اصول سے قطعاً نابلد ہیں لیکن اگر اس خطرے کو نظر انداز کر دیا جائے جب بھی پیشہ ور عورتوں کی اولاد کا سوال باقی رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض خصیۃ الرحم نکلوانے پر آمادہ ہو جائیں گی لیکن کثیر تعداد ان کی ہوگی جو اس پر آمادہ نہ ہوں گی اور اس لئے ضبط تولید کی تحریک تشنۂ تکمیل رہے گی۔ اب رہا غیر پیشہ ور عورتوں کا سوال تو اس کی خرابیاں ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہیں۔

اب دوسری صورت استلذاذ بالنفس کی ہے سو وہ اس لئے یقیناً بہتر ہے کہ اس سے امراض سوداوی یا دیگر عوارض کا خدشہ نہیں رہتا۔ ہندوستان کے ان اگلے وقتوں کے اطبا کا کیا ذکر جو استلذاذ بالنفس کو ہر مرض کا منبع سمجھتے ہیں خود یورپ و امریکہ میں اب تک ایک کثیر تعداد ایسے ڈاکٹروں کی ہے جو استلذاذ بالنفس کو مختلف عوارض کا باعث جانتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ ڈاکٹروں کی ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالمثل کو استلذاذ بالضد پر طبی نقطۂ نظر سے ترجیح دیتی ہے۔ جیسے۔ برونر اور باؤس (Healy, Bronner, Bowe) اپنی کتاب (The Structure + meaning of Pychoanalysis) مطبوعہ نیویارک میں لکھتے ہیں "استلذاذ بالنفس بالکل فطری چیز ہے۔ فرائڈ (Freud) کے تجربے کے مطابق ۲ برس سے لیکر ۵ برس تک اکثر بچے اس کے عادی ہوتے ہیں اور زمانہ بلوغ کے قریب تو شاید کوئی بھی اس سے بچ نہیں سکتا طبی نقطۂ نظر سے استلذاذ بالنفس کا نقصان یا نفع ایک نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ استلذاذ بالنفس سے پریشانی پیدا ہوتی ہے کیونکہ کسی قسم کے استلذاذ سے پریشانی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟

مسٹر لیو مارکن (Leo Markun) مال (Moll) کا یہ قول درج کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ استمنا بالید، استلذاذ بالضد کے مقابلہ میں کم ضرر رساں ہو۔ مگر یہ تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے کہ استلذاذ بالنفس سے کما حقہ ضبط تولید نہیں ہو سکتا۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ انسان کسی دوسری ذات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے اس لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جنھیں استلذاذ بالمثل یا استلذاذ بالضد یا استلذاذ بالمثل کے مواقع حاصل ہوتے ہیں تو وہ فوراً استلذاذ بالنفس کو ترک کر دیتے ہیں (ملاحظہ ہو The sexual time of our time by Bloch) اس لئے استلذاذ بالنفس کے عادی حضرات سے ہر وقت یہ خطرہ رہے گا کہ وہ ملک کی آبادی میں غیر ضروری اضافہ کریں گے۔ فحاشی کے سلسلہ میں استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالمثل کے طریقے ہزاروں برس سے رائج ہیں ہمیں تاریخ کی روشنی میں یہ دیکھنا چاہئے کہ متقدمین نے غیر ضروری افزائش نسل کو روکنے کے لئے ان میں سے کس طریقے کو ذاتی تجربہ کے بعد کامیاب سمجھا تھا۔

علامہ نیاز ترغیبات جنسی کے صفحہ ۱۶۹ پر رقم طراز ہیں "بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ قدیم یونانیوں میں اس

(استلذاذ بالمثل) کا شوق اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھتی جاتی تھی اور اس کی روک تھام کے لئے وہ لوگ عورتوں سے بچنے لگے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں یونان کے اندر ریاستہائے بلدیہ کا رواج تھا اور ایک شہر کے وسایل پیداوار چونکہ محدود آبادی کے لئے کفایت کر سکتے تھے اس لئے ان لوگوں کو یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ آبادی کی تعداد بڑھنے نہ دی جائے، یہی باعث تھا کہ حکیم ارسطو جیسے شخص نے بھی لوگوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں اور استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ لطف یہ ہے کہ ارسطو سے پیشتر حکیم سقراط بھی اس حرکت کو فعل مستحسن قرار دے چکا تھا۔" گمان نہیں یقین ہے کہ اکثر حضرات اس کے عدم جواز میں اس کے "غیر فطری" ہونے کی دلیل پیش کریں گے لیکن پہلے انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ "غیر فطری" کہتے کسے ہیں؟ جن اصحاب نے اسٹیونسن (Stevenson) کا مشہور ناول ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائڈ (Dr. Jekyll & Mr. Hyde) پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسٹیونسن نے ڈاکٹر جیکل کے دو چہروں میں مہذب انسان کے دو جداگانہ طرزِ معاشرت دکھائے ہیں۔ وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ زاہد خشک کی خلوت میں شغل چنگ و شراب ہوتا ہے اور ایک خونخوار ڈاکو میں خوفِ خدا سے لرز جاتا ہے وہ یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ تہذیب کی کشمکش کی وجہ سے ہر شخص دورنگی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور اسے اپنے متعلقین و مخصوصین بلکہ بعض اوقات خود اپنی ذات سے تقیہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر کیا ہم ایسے اشخاص کے غیر فطری کہنے سے کسی فطری چیز کو غیر فطری سمجھ لیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ غیر فطری ہے؟ دراصل کسی شے پر فطری یا غیر فطری ہونے کا حکم جانوروں اور غیر متمدن وحشیوں کی عادات دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے یعنی جس چیز کو وہ جایز سمجھیں وہ فطری اور جو شے ان کے نزدیک مکروہ ہو وہ غیر فطری ہے۔ کیا خوب قول ہے ایک عالم بشریات (Anthropologist) کا کہ حقیقتاً فطری افعال صرف ان غیر مہذب انسانوں کے ہوتے ہیں جنھیں ہم وحشی کہتے ہیں اور یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ جانوروں اور وحشیوں میں استلذاذ بالمثل بکثرت موجود ہے (ملاحظہ ہو تذنیباً) طبی نقطۂ نظر سے یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ ان طریقوں سے اعصاب کو نقصان پہونچے گا لیکن بقول ایک امریکن ڈاکٹر کے حقیقت یہ ہے کہ اگر احتیاط کی جائے اور اعتدال مدنظر رہے تو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر نے جو استلذاذ بالمثل کے دو حامیوں بلوہر اور فرائڈ کا جواب دینا چاہا ہے لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ استلذاذ بالمثل کی کوئی طبی مضرت پیش نہ کر سکے اور انھیں یہ فرما کر خاموش ہو جانا پڑا " فطرت کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ یہ اتحاد بے ثمر ہے۔ لوگ کہتے ہیں غیر جسمانی تولید نہ سہی ذہنی تولید تو ممکن ہے مگر یہ نہیں سمجھتے کہ خواہش جنسی جو اپنے اصل مقصد میں ناکام رہتی ہے ذہنی تولید کو بھی مسخ کر دیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں بجائے تسکین کے نفرت کا غلبہ ہو جاتا ہے "

(نفسیات عنفوانِ شباب مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین) ہم اس سے قبل فرائڈ کا یہ قول پیش کر چکے ہیں کہ کسی قسم کے استلذاذ سے پریشانی پیدا ہونا غیر فطری ہے اس لئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ استلذاذ بالمثل سے بقول اشپرانگر کے انسان کے دل میں بجائے تسکین کے نفرت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیالات کے اطبا کا یہ قول بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ استلذاذ بالمثل کے مذاق

افراد قوت عمل سے محروم ہونے کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں اپنی عمر بسر کرتے ہیں درانحالیکہ علامہ نیاز نے ترغیبات جنسی میں ایسے افراد کی ایک طویل فہرست درج کی ہے جو استلذاذ بالمثل کے عادی ہونے کے باوجود آسمان شہرت پر مہر درخشاں بنکر چمکے مثلاً اسکندر اعظم، فریڈرک اعظم، شکسپیر، شیلے وغیرہم۔ فحاشی میں مردوں کی ایک کثیر تعداد کے جذبات کو فرو کرنے کی طاقت ہے لیکن چونکہ ایک عورت سے متعدد مرد متمتع ہوتے ہیں اس لئے عورتوں کی ایک کثیر تعداد اپنے جذبات کچلنے پر مجبور ہوتی ہے استلذاذ بالنفس میں عورت اور مرد کے جذبات کی تسکین تو ہوجاتی ہے مگر کسی دوسری ذات کی عدم موجودگی کی وجہ سے جذبۂ محبت کی تسکین نہیں ہوتی۔ استلذاذ بالمثل میں مندرجۂ بالا عیوب نہیں پائے جاتے اس سے جذبۂ محبت کی تسکین بھی ہوجاتی ہے مرد و زن کے جذبات جنسی بھی پورے ہوجاتے ہیں اور ضبط تولید کا مسئلہ بھی بحسن و جوہ حل ہوجاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد " ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ" (القرآن) کے باوجود فحاشی کو چنداں معیوب نہیں سمجھتی مگر استلذاذ بالمثل کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے درانحالیکہ استلذاذ بالمثل کی حرمت پر کوئی نص صریح وارد نہیں ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ ان حضرات کے شوق مذہبی کی تسکین کے لئے استلذاذ بالمثل پر مذہبی حیثیت سے ایک اجمالی بحث کروں۔

مسلمانوں کے تمام فرقے عملی حیثیت سے قرآن حکیم سے کتنے ہی منحرف کیوں نہ ہوں مگر زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ہم قرآنی احکام و منہیات کو اصل اول سمجھتے ہیں یہاں تک کہ حضرات اہل تشیع جن کی ایک کثیر تعداد قرآن موجود کی ترتیب کو مطابق تنزیل نہیں سمجھتی زبان سے یہی کہتے ہیں کہ " انما الحرام ما حرم اللہ فی کتابہ"۔ یعنی حرام بس وہی ہے جسے خدا نے اپنی کتاب میں حرام فرمایا۔ چونکہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے قرآن حکیم میں کوئی صریح آیت استلذاذ بالمثل کی حرمت پر نہیں ملتی اس لئے مسلمان مختلف آیات سے اس کی حرمت ثابت کرنے کی سعی لاحاصل فرماتے ہیں۔ پہلی آیت جو اس سلسلہ میں عام طور سے پیش کی جاتی ہے یہ ہے:-

" والذان یاتینہا منکم فاذوہما فان تابا واصلحا فاعرضوا عنہما ان اللہ کان توابا رحیما" (النساء آیت ۱۶)

اور تم لوگوں میں سے جن سے بدکاری سرزد ہوتی ہے ان کو مارو پیٹو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اصلاح کرلیں تو ان کو چھوڑ دو بیشک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

بظاہر یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔ سورۂ نساء کی پندرھویں آیت یہ ہے:-

"والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشہدوا علیہن اربعۃ منکم فان شہدوا فامسکوہن فی البیوت حتی یتوفٰہن الموت او یجعل اللہ لہن سبیلا" (اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو انکی بدکاری پر چار گواہوں کی گواہی ہو تو پھر اگر چاروں گواہ تصدیق کریں تو انکو گھروں میں بند رکھو یہانتک کہ موت آجائے یا خدا کوئی راہ نکالے۔

اول تو حضرات علما کا اس امر میں اختلاف ہے کہ " والّذان یاتینہا منکم فاذوہما " سے مراد کیا ہے - بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس سے دو مرد مراد ہیں لیکن صاحب جامع البیان اور دیگر حضرات کا سیاق عبارت اور عربی قواعد کو دیکھ کر یہ خیال ہے کہ اس سے مراد مرد اور عورت ہیں پھر اگر بفرض المحالات یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے دو مرد مراد ہیں جب بھی حسب تصریح علمائے عظام یہ آیات باقی از رسم منسوخ الحکم ہیں (ملاحظہ ہو افادۃ الشیوخ مولفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم) اور منسوخ الحکم آیات سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا ایک اور مایۂ ناز استدلال یہ ہے کہ چونکہ قوم لوط پر استلذاذ بالمثل کی وجہ سے عذاب الٰہی نازل ہوا اور چونکہ زنا کی وجہ سے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں ہوا اس لئے استلذاذ بالمثل کی حرمت زنا کی حرمت سے شدید تر ہے - جناب لوط اور ان کی قوم کا ذکر قرآن مجید میں سترہ جگہ آیا ہے - ان میں بعض جگہ مثلاً سورۂ انعام میں صرف جناب لوط کا ذکر ہے ان کی قوم کا ذکر نہیں، سورۂ اعراف وغیرہ میں صراحتہً قوم لوط کے استلذاذ بالمثل کا ذکر ہے مثلاً " انکم لتاتون الرجال شھوۃً من دون النسآء " یعنی تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی کے واسطے مردوں کی طرف مایل ہوتے ہو - (ممکن ہے کہ صرف اتنا عذاب نہ ہو) اور سورۂ عنکبوت وغیرہ میں استلذاذ بالمثل کے علاوہ قوم لوط کی دیگر برائیاں بھی بیان ہوتی ہیں مثلاً :-

" وتقطعون السبیل وتاتون فی نادیکم المنکر " - یعنی راہزنی کرتے ہو اور اپنی محافل میں ناشایستہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہو - اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نزول عذاب کا واحد سبب استلذاذ بالمثل ہی نہیں تھا بلکہ ممکن ہے کہ قوم لوط کی دوسری برائیاں نزول عذاب کا سبب ہوئی ہوں - اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قوم لوط پر صرف استلذاذ بالمثل کے سبب سے قہر الٰہی نازل ہوا جب بھی یہ کیونکر فرض کیا جا سکتا ہے کہ امتِ محمدیہ کے لئے بھی استلذاذ بالمثل حرام ہے درانحالیکہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملتی جس سے استلذاذ بالمثل کی حرمت ثابت ہو، ورنہ اگر اس غلط منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو اصحاب سبت (جن کا قصہ سورۂ بقرۃ میں اس طرح مذکور ہے :-

" ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لہم کونوا قردۃً خاسئین ۵ فجعلنٰہا نکالاً لما بین یدیہا وما خلفہا وموعظۃً للمتقین ۵ " اور ان کی حالت تو تمھیں خوب معلوم ہے جو ہفتے کے دن اپنی حد سے گزر گئے پس ہم نے کہا کہ راندے گئے بندر بن جاؤ، تو ہم نے اس واقعہ کو موجودہ اور آیندہ کے واسطے عذاب قرار دیا اور متقین کے لئے نصیحت) کے واقعہ سے یہ سمجھا جائے گا کہ سبت کے دن حد سے گزر جانا یا بقول مفسرین سبت کے دن مچھلی کا شکار کھیلنا سخت منع ہے کیونکہ قوم لوط کا تو صرف قصہ بیان ہوا ہے اور اصحاب سبت کے واقعہ کو عبرت قرار دیا ہے ! جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کسی بیّن آیت سے استلذاذ بالنفس کی صراحتہً حرمت ثابت نہیں ہوتی - اب رہیں احادیث جن کے بھروسے پر احکام قرآنی کے خلاف زانی کو رجم کی سزا دیجاتی ہے اور استلذاذ بالمثل کے مرتکب کو طرح طرح کی عقوبات سے قتل کیا جاتا ہے تو ان کی یہ کیفیت ہے کہ اہل قرآن (جو احادیث

کے قایل نہیں) کا کیا ذکر خود اہل حدیث حضرات یہ فرماتے ہیں کہ احادیث ظنی ہیں ان سے یقین نہیں حاصل ہو سکتا (مقدمۂ تفسیر آیات خلافت مصنفہٗ مولانا عبدالشکور صاحب) پھر لطف یہ ہے کہ جس علم پر احادیث کی صحت کا دارومدار ہے وہ علم یعنی علم رجال خود اتنا ناکمل ہے کہ پناہ بخدا ۔ عبدالرزاق بن ہمام کو علامہ ابن حجر مکی علیہ الرحمہ رافضی لکھتے ہیں تو علامہ ذہبی علیہ الرحمہ اسے تفضیلیہ بھی نہیں سمجھتے عکرمہ کو بعض خارجی اور کاذب کہتے ہیں ۔ تو بعض ثقہ اور فقیہ ۔ خلاصہ یہ ہے کہ استلذاذ بالمثل کی حرمت ہو یا کوئی اور مسئلہ کسی حدیث کے تمام راوی ایسے نہیں ہو سکتے جن پر تمام علما نے مہر توثیق ثبت کی ہو ۔ پھر جب بقول مولانا عبدالشکور صاحب مدیر النجم علما کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جرح ہر حال میں تعدیل سے بہتر ہے تو کس حدیث کو صحیح اور واجب العمل سمجھا جا سکتا ہے ؟ ہمارے فقہا کا استلذاذ بالمثل کے متعلق عجیب رویہ رہا یعنی ایک طرف تو بعض فقہا عورت کے ساتھ وطی فی الدبر کے جواز کے قایل ہو گئے اور دوسری طرف انھیں فقہا نے استلذاذ بالمثل کے مرتکب کو گردن زدنی سمجھا ۔ ہاں ایک فقیہ ایسے ضرور نکلے جنھوں نے قرآن حکیم کو سمجھنے کی کوشش کی ۔ میری مراد امام اعظم حضرت ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے ہے جن کے مندرجۂ ذیل فتاوی ان کی قرآن فہمی کی بین دلیل ہیں :-

(الف) " ومن اتی امراۃ فی الموضع المکروہ او عمل عمل قوم لوط فلا حد علیہ عند ابی حنیفۃ" ۔ (ہدایہ طبوعہ مطبع مصطفائی ص ۴۹۹)

(ب) " ولا یحد ایضاً باجنبیۃ ای بوطء اجنبیۃ فی غیر قبل یعنی فی دبرہا او فی سرتہا ونحو ذلک ولا بلواطۃ عند ابی حنیفۃ" (شرح کنز الدقایق از علامہ عینی)

صاحب جواہر الکلام (شیعی) یا بعض علمار اہلسنت کا یہ فقہی استدلال میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ عورت کے ساتھ وطی فی الدبر تو بکراہت جائز ہے مگر استلذاذ بالمثل کے مرتکب کو آگ میں جلوایا جائے گا !

ع ۔ ص

(نگار) " ضبط تولید" کی تحریک کے سلسلہ میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "ضبط تولید" واقعی ملک کے لئے ضروری ہے، تو پھر جنسی خواہش کے فرو کرنے کی کونسی صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جو مضرت رساں نہ ہوں، اور اس لئے یہ مسئلہ علاوہ "جنسیات" کے ہماری "معاشیات" سے بھی متعلق ہو جاتا ہے، جسے ہم فحش یا عریاں کہکر نہیں ٹال سکتے ۔۔

اگر ہمارے ملک کی اقتصادی تباہی کا ایک سبب کثرت اولاد بھی ہے تو یقیناً ضبط تولید کی تبلیغ کرنا پڑے گی اور جب ضبط تولید کا درس لوگوں کو دیا جائے گا تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس صورت میں جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ کیا ہوگا ۔

میں اس وقت نہ معاشیاتی نقطۂ نظر سے اس مقالہ پر کوئی گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور نہ جنسی حیثیت سے کوئی حل اس کا بتانا چاہتا ہوں، بلکہ اس کے صرف سوشل پہلو سے بحث کرنا پسند کرتا ہوں۔

اس مقالہ کے لکھنے والے میرے ایک شیعی دوست ہیں جو اپنی آزادیٔ فکر و رائے کی وجہ سے اپنی جماعت میں کافی بدنام ہیں، اور چونکہ مجھ سے خصوصیت خاص رکھتے ہیں۔ اس لئے میں ان کے اس مقالہ کو شایع کرنا زیادہ تر اس بنا پر ہے کہ میں ان کو کسی غلط نتیجہ پر پہونچتے ہوئے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا اور میری رائے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ یقیناً غلط نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ممکن تھا کہ میں نجی کی مراسلت سے اپنا مدعا ان کے ذہن نشین کر دیتا لیکن نگار میں شایع کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اگر ملک میں اُن کے ہم خیال لوگ اور بھی موجود ہیں (اور یقیناً کافی تعداد میں ہیں) تو میرے خیالات اکبار ان کے سامنے بھی آجائیں۔ فاضل مقالہ نگار کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

ضبط تولید ہمارے ملک کے اقتصادی حالات کے لحاظ سے ضروری ہے، لیکن ضبطِ تولید اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جنسی خواہشات کی تسکین کی کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے ۔ اور ان کے نزدیک استلذاذ بالمثل بہترین صورت ہے ۔ استدلال میں انھوں نے تاریخ کے بعض گزشتہ واقعات بھی بیان کئے ہیں، حال کے بعض جرمن مفکرین کی رائیں بھی پیش کی ہیں اور مذہبی حیثیت سے بھی اس کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

اس مسئلہ میں اصولاً بحث کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ ضبط تولید ضروری ہے یا نہیں، اور دوسرے یہ کہ ضبط تولید کے بعد جنسی خواہشات کی تسکین کا بہترین ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی دشواریوں کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کے لئے جن کے ذرایع معاش ناکافی ہیں نکاح کرنا ہی جُرم ہے، چہ جائیکہ ضبطِ تولید کہ وہ تو فرضیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے مسئلہ کے اس پہلو پر بحث کرنا بیکار ہے، رہ گیا دوسرا پہلو وہ البتہ بہت اہم ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جنسی خواہشات کی تسکین لوازم حیات میں داخل نہیں کہ اس پر غور کیا جائے۔ وہ شخص جو ضبطِ تولید کر سکتا ہے، ضبطِ خواہش بھی کر سکتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔ لیکن یہ تدبیر ایسی ہے جس پر ہزار دو ہزار میں شاید دو ہی چار عمل کر سکیں، اکثریت کا رجحان یہ نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے ہم کو کوئی عملی تدبیر یقیناً سوچنا چاہئے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس کی تین صورتیں بتائی ہیں، فحاشی، استلذاذ بالنفس، اور استلذاذ بالمثل اور آخری صورت کو مُرجّح قرار دیا ہے۔ میری رائے میں تینوں صورتیں بُری ہیں، اول دو صورتوں کے ناقص ہونے کا اعتراف خود مقالہ نگار کو بھی ہے اس لئے میں ان سے بحث نہیں کرتا، تیسری صورت کے متعلق البتہ مجھے کچھ کہنا ہے۔

سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ ہم ایک فعل کے اچھا یا بُرا ہونے پر کس اُصول کے تحت حکم لگاتے ہیں۔ اس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اس کا تعلق صرف سوسائٹی کے مفاد و نقصان سے ہے۔ یعنی جو چیز تجربہ سے سوسائٹی کو نقصان پہونچانے والی ثابت ہوئی اسے ناجایز قرار دیا گیا، جو مفید ثابت ہوئی اسے ضروری بتایا گیا اور جس سے نفع و نقصان کا کوئی تعلق نہ تھا

اسے صرف جواز کی حیثیت دی گئی - دنیا کے تمام قوانین خواہ وہ مذہب کی صورت میں نافذ کئے گئے ہوں یا کسی اور حیثیت سے اسی اُصول پر منضبط ہوئے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے - اس لئے اس مسئلہ میں بھی ہم کو نہ تاریخ ماضی سے استدلال کی ضرورت ہے اور نہ جرمن ماہرین کے اقوال سے استشہاد کی - ہم کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ استلذاذ بالمثل کا رواج ہماری سوسائٹی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اگر اس سے کوئی فایدہ پہونچتا ہے تو جائز کیا اسے ضروری قرار دیجئے اور اگر نقصان رساں ہے تو اس سے اجتناب کیجئے خواہ الہام ہی سے اس کا جواز کیوں نہ ثابت ہوتا ہو - مجھے یقین ہے کہ اس کے نقصانات کثیر ہیں اور اس لئے میں اس کا سخت مخالف ہوں -

کسی عمل کے نفع و نقصان کا اندازہ کرنے کے لئے سب سے بڑا معیار ہمارے پاس تجربہ ہوا کرتا ہے، سو اس کا اعتراف خود مقالہ نگار کو بھی ہوگا کہ اس وقت تک تمام اطبا نے اس کو مضرت رساں ہی سمجھا ہے، اور اگر شاید جرمنی کے بعض ڈاکٹر اس مخالفت میں آواز بلند نہ کرتے تو مقالہ نگار کو بھی اس کی مضرتیں تسلیم کرنے سے انکار نہ ہوتا - پھر اس کا کیا یقین ہے کہ آج جو کچھ یہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کل اسی کی تردید کرنے والے ماہرین فن اور نہ پیدا ہو جائیں گے اور یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اب اس تحقیق میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے - دنیا کا کونسا علم ایسا ہے، جس کا ہر جدید نظریہ پچھلے نظریہ کی تردید نہیں کرتا اور کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اب مزید تحقیق و اکتشافات کا دروازہ بند ہو گیا ہے - اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ مقالہ نگار جو محض جرمنی کے چند ڈاکٹروں کے قول پر اعتماد کرکے استلذاذ بالمثل کے استحسان کے قایل ہیں، کل کیا کہیں گے اگر اس سرزمین سے چند مخالف اس کے پیدا ہو گئے -

پھر اس کو بھی جانے دیجئے، خدا نے ہمیں عقل دی ہے، خود ہم کو سوچنا چاہئے کہ ایک فعل ہمارے لئے نفع بخش ہے یا نقصان رساں - فرض کر لیجئے کہ " استلذاذ بالمثل " اچھی چیز ہے اور ضبط تولید کی غرض سے ملک کی ۸۰ فی صدی آبادی کو اس پر عامل ہونا چاہئے، یہاں تک کہ ہندوستان کی آبادی گھٹ کر نصف نہ ہو جائے (کیونکہ جب تک آبادی آدھی نہ ہو بلائے اقتصادی دشواریاں دور نہیں ہو سکتیں) اور اس کے لئے کم از کم سو سال درکار ہوں گے، اب غور کیجئے کہ جس قوم کی ۸۰ فی صدی آبادی سو سال تک استلذاذ بالمثل میں مبتلا رہے گی اس کی ذہنیت کیا ہو جائے گی - یقیناً مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور پھر اگر نسل بڑھانے کی کبھی ضرورت ہوئی تو اس کا امکان باقی نہ رہے گا - مقالہ نگار اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ نفرت پیدا ہونے کا امکان کوئی نہیں ہے کیونکہ مرد و عورت کا تعلق فطری ہے اور اس جذبہ کو ہمیشہ اُبھارا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے مضمون میں ایک جگہ ظاہر کر چکے ہیں کہ " استلذاذ بالمثل " زیادہ فطری چیز ہے نہ کہ " استلذاذ بالضد "۔

دوسری دشواری ملاحظہ ہو :- اگر مردوں نے " استلذاذ بالمثل " پر عمل شروع کیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ عورتیں بھی دوسرے ذرایع سے اپنی جنسی خواہش پورا کرنے پر مجبور ہوں گی اور چونکہ " استلذاذ بالمثل " کی صورتیں ان کے پاس نہ ہونے کے برابر ہیں اسلئے لامحالہ " استلذاذ بالنفس " کی طرف مایل ہوں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بچہ جننے کی اہلیت ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھیں گی (جیسا کہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے)

تیسری دشواری :- اگر یہ مان لیا جائے کہ استلذاذ بالمثل ضروری ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ کو دو جماعتیں علحدہ کرنا پڑیں گی، ایک عامل، دوسری معمول اور چونکہ ہر معمول ایک خاص عمر تک پہونچنے کے بعد عامل بھی ہو جائے گا، اس لئے آپ کو اس کے لئے بھی ایک معمول جماعت قائم کرنا پڑے گی اور یہ سلسلہ اسوقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک آبادی کا سلسلہ قائم نہ رہے، درانحالیکہ آبادی ہی کے سلسلہ کو ختم کرنے کے لئے آپ نے اتنی زحمت اختیار کی تھی۔

ایک فعل کے "فطری و غیر فطری" ہونے کی بحث میں بھی، مقالہ نگار نے غور سے کام نہیں لیا۔ اصولاً وہی فعل فطری کہلائیگا جس کا نتیجہ بھی فطری ہو۔ مرد و عورت کا تعلق فطری ہے کیونکہ اس کا ایک فطری نتیجہ (اولاد) ہوا کرتا ہے۔ استلذاذ بالمثل کا آپ کوئی نتیجہ نہیں بتا سکتے۔ جس چیز کو وہ "ذہنی تولید" کہتے ہیں، اس کے سمجھنے سے میں قاصر ہوں، کیونکہ "استلذاذ بالمثل" سے ذہنی ارتقاء کی کوئی مثال میرے سامنے موجود نہیں ہے اور نہ عقل انسانی اسے باور کر سکتی ہے کہ یہ عمل قوائے ذہنیہ کی ترقی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ تاریخ کے بعض مشہور افراد یقیناً اس حرکت کے مرتکب ہوا کرتے تھے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی ذہانت و قابلیت کا سرچشمہ یہ عمل تھا، درست نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ اس میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی ذہنی ترقیوں کا کیا عالم ہوتا۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ استلذاذ بالمثل سے معمول جماعت میں ایک قسم کی نسائیت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ یہ ذہنی ترقی کا باعث ہو، اس کو انحطاط عزم و حوصلہ کا سبب ہونا چاہئے اور اس سے قوم کو جتنا نقصان پہونچ سکتا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

مقالہ نگار نے ایک جگہ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ایک عمل کے فطری ہونے کا اندازہ جانوروں اور وحشیوں کو دیکھ کر کرنا چاہئے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ رجحان پایا جاتا ہو، لیکن اس کو فطری عمل نہیں کہہ سکتے، ورنہ ظاہر ہے کہ آج نہ دنیا میں جانوروں کا وجود پایا جاتا نہ وحشی اقوام کا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک طرف اولاد کے اضافہ کو وحشیانہ حرکت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف استلذاذ بالمثل کو بھی وحشی اقوام کا پسندیدہ فعل بتایا جاتا ہے۔

سلسلۂ گفتگو میں مقالہ نگار نے ایک جگہ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس کے نقصانات طبی نقطۂ نظر سے متحقق نہیں ہے اور اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو اعصاب مضروب نہیں ہو سکتے۔ پہلا دعویٰ بالکل غلط ہے کیونکہ علم طب نے نہایت وضاحت سے اس کے نقصانات بتا دئے ہیں اور ہندوستان کی نصف صحافت انھیں اشتہاروں کی بدولت زندہ ہے، جن کا تعلق ان نقصانات سے ہے یوں بھی نہایت آسانی سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اصل چیز "مادۂ حیات" ہے اور اس کو جس قدر زیادہ ضایع کیا جائے گا اتنی ہی زیادہ کمزوری دل و دماغ میں پیدا ہو گی پھر چونکہ "استلذاذ بالمثل" اور "استلذاذ بالنفس" دونوں میں اس کا زیادہ امکان ہے، اس لئے اس کے نقصانات بھی زیادہ یقینی ہیں۔

اس بحث کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو وہ ہے جسے مذہبی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے، مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے کہ کلام الہٰی میں کسی جگہ اس کی ممانعت نہیں ہے اور احادیث چونکہ صرف ظنی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے قابل اعتبار نہیں۔

میں تفصیل کے ساتھ ان تمام آیات پر بحث نہ کروں گا جنھیں مقالہ نگار نے پیش کیا ہے، بلکہ ایک اصولی بات کہکر اسے ختم کروں گا۔ میں مانتا ہوں کہ قرآن میں کسی جگہ "استلذاذ بالمثل" کی ممانعت نہیں کی گئی ہے، لیکن کسی کے سامنے ننگے ہو کر کھڑا ہو جانے کی بھی ممانعت ہے۔ کسی کے منھ پر تھوک دینے کو کب روکا گیا ہے، کولین کھانے کی برائی کہاں درج ہے۔ لیکن کیا آپ ان تمام باتوں کو صرف اس لئے جائز قرار دیدیں گے کہ قرآن میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ قرآن میں والدین کو صرف "اف" کہنے کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن اس کے معنے یہ تو نہیں کہ ان کو زد و کوب کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قرآن نے صرف اصولی باتیں بتاکر فروع کو ہماری قوت تمیز پر چھوڑ دیا ہے اسلئے اس سے ہر ہر بات کی سند اس میں ڈھونڈھنا درست نہیں۔

اگر قرآن میں صرف یہی ایک آیت موجود ہوتی:-

"بلیٰ من کسب سیئۃً واحاطت بہٖ خطیئتہٗ فاولئک اصحاب النار"

تو بھی اس کی بنا پر ہم "استلذاذ بالمثل" کو ناجائز قرار دے سکتے تھے، چہ جائیکہ "اثم وعدوان" کی مذمت میں تو درجنوں آیتیں پائی جاتی ہیں اور یقیناً "استلذاذ بالمثل" ایسا "اثم وعدوان" ہے کہ ہم اپنے اوپر اس سے زیادہ ظلم کر ہی نہیں سکتے۔

چند سیاسی کتابیں

ہندوستان میں دیہی قرض:- مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں قرضے کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتدا:- سیاست و معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کے لئے یہ کتاب مفید ہے۔ قیمت ۸ر

سیاسیات کی پہلی کتاب:- مرتبہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے اس میں اردو جاننے والے طبقہ کو سیاسیات کی مبادیات کو آسانی اور اختصار سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ قیمت ۴ر

قوم کی آواز:- مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریروں کا مجموعہ اور سفر یورپ کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ قیمت عہ ر

میری کہانی:- پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت مجلد دو حصے للعہ ر

مینجر نگار لکھنؤ

خونی گھروندا

(صد ہا کتابوں اور چھپیں برس کی زندگی کے عملی تجربوں سے ماخوذ)

مستری ہتھیار نگر کے ایک خونی گھروندا میں بم کے گولوں کی مشین پر کام کیا کرتا تھا۔ ایک روز یکا یک ذرا سی بھول سے حادثہ ہوگیا۔ بارود میں آگ لگ گئی اور اس نے اپنی آنکھیں کھو دیں اور اب فوجی اسپتال میں اپنے آخری دن گزار رہا تھا۔

ملک میں بیروزگاری بڑھی اور بیروزگاری کے بڑھتے ہی خونی گھروندا کی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا، ہتھیار نگر میں بل بوتے والے جوانوں کی بڑی بڑی مانگ ہوئی اندھے مستری کے نوجوان لڑکے نے ایک دن آکر باپ سے کہا:-

آج میرے چند دوست مجھے ہتھیار نگر کی سیر کرانے لے گئے۔ وہاں ہماری بڑی مانگ ہے، ماں اور بہنوں کا فاقہ اب مجھ سے نہیں برداشت ہوتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں وہیں نوکری کرلوں۔ اجرت اتنی ملے گی کہ اب سب کا گزر آسانی سے ہوسکیگا پھر اس کارخانہ میں اور دوسرے کارخانوں میں کچھ فرق بھی تو نہیں۔

اندھا مستری کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا اور رک رک کر بولا:-

میرے بچے جسوقت میں نے بھی پہلی بار ہتھیار نگر میں قدم رکھا تھا، مجھے بھی اسی طرح ورغلایا گیا تھا۔ مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ اس کارخانہ میں کچھ بھی فرق نہیں۔ دونوں کاروبار اور دونوں گرم اور تیزہ کار، جس طریقہ سے چاکلیٹ کے کارخانہ میں گرم گرم بھٹی پر کافی اور ملائی کی مدد سے طرح طرح کی خوبصورت مٹھائیاں تیار ہوتی ہیں۔ اسی طرح سے ہتھیار نگر کے خونی گھروندے میں انسانی دکھ اور سکھ کے خوبصورت اور نازک کھلونے تیار ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں مجھے ملازمت دی گئی، اس وقت بھی کاروبار نہایت تیز تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں فیکٹری میں داخل ہوا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں سرسامی بخار میں مبتلا ہوگیا۔ کھٹ پٹ اور ہمارے اپنے پیدا کئے ہوئے شور و شغب کے علاوہ، ہوائی طیاروں کے روپہلے نیلے پیلے پنکھوں کا پھڑپھڑانا، سب میرین (آبدوز کشتیوں) کی سوں ساں، کبھی کبھی فیکٹری کے کسی گوشے سے ایک جھنکار سی اٹھنا، ایک گرج سی فضا میں پھیلنا، میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ بھوک اور پیاس کے ناقابل برداشت تجربوں کے بعد پالا ماری ہوئی سڑکوں برف میں ڈوبے ہوئے دن اور رات، پہاڑی ہواؤں کی گونج اور ایسے ہی دوسرے تجربوں سے نیم پاگل ہونے کے بعد جسوقت کہ میں اس حشر انگیز فضا میں داخل ہوا تھا، کوئی چیز میری زندگی کی گہرائیوں میں سے سیٹیاں بجاتی ہوئی نکل گئی تھی اور میں نے

اپنے کو خالی خالی سا محسوس کیا تھا۔۔۔۔۔

لڑکے کی جوانی نے اُسے چین نہ لینے دیا اور اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا:—

مگر میں نے تو کوئی ایسی چیز نہ محسوس کی، مجھے جاتے ہی ایک عجیب و غریب ایجاد دکھائی گئی۔ ایک بہتی ہوئی کان (مائن) نہایت سبک اور حسین اور قیمت صرف چالیس ہزار روپے،

اندھے نے اپنے لڑکے کو زیادہ نہ بولنے دیا:—

سبک اور حسین اور قیمت صرف چالیس ہزار روپے، میرے بچے، تم نے یہ بھی غور کیا کہ جس بہتی ہوئی کان نے تمہارا جوان دل لُبھا لیا، وہ تباہی اور بربادی لانے والی نہایت زہریلی ناگن ہے۔ اگر کوئی آبدوز کشتی، یا کوئی تفریحی کشتی یا بیگناہ مسافروں کا جہاز اس بہتی ہوئی کان سے چھو بھی جائے، دیکھتے دیکھتے گہرے سمندر کی تاریکیوں میں فنا ہو جائے گا، مسافر اور ناخدا سب سمندری جانوروں کے منہ میں قیمہ قیمہ ہو کر جائیں گے۔

لڑکے نے اس طرح کہا گویا وہ بوڑھے کو سمجھا رہا ہے:—

لیکن ملک کی مدافعت کے لئے اس کاروبار کا بڑھنا ضروری ہے۔ ہمیں تو یہ فخر کرنا چاہئے کہ کم سے کم بیسیوں میں ہمارے بچاؤ کے ہتھیار کیسی تیزی سے تیار ہو رہے ہیں۔ اگر یہ تجارت بھی ہے تو اس تجارت سے ملک کے کتنے بیروزگاروں کا پیٹ پلتا ہے

بڑھے نے جواب دیا:—

اگر اس کا نام بھی تجارت ہے تو یہ انوکھی تجارت ہے۔ پچاس ناخداؤں کی ننھی معصوم جانوں کے لئے پچاس ہزار روپے کی لاگت زیادہ تو نہیں ہے۔ ایک ناخدا کی قیمت صرف اسّی روپے ہی تو ہوتے ہیں۔ تم نے شاید یہ غور نہ کیا کہ یہ رواں دواں کانیں دور دراز ملکوں کو بھیجی جائیں گی جیسے کہ بلقان اور امریکہ اسطرح اگر لاگت کا سوال ہے تو ایک ناخدا کی قیمت سو روپے سے کم نہیں پڑتی۔ میرے بچے تو ابھی ہتھیار نگری بھول بھلیاں میں نہیں داخل ہوا ہے۔ ہتھیار نگر ایسا آتشکدہ ہے جہاں جاتے ہی تمہاری آنکھیں خیرہ کر دی جاتی ہیں، اس کے بعد چاروں طرف سے ایسی مقناطیسی کرنیں تمہارے دل و دماغ پر تیر اندازی کرتی رہتی ہیں کہ اگر میری طرح تم اپنی آنکھوں کو حادثہ کا شکار نہ بھی کر دو، تمہارے دل و دماغ سیاہ اور تاریک ہو جائینگے۔

لڑکے نے بحث کرتے ہوئے کہا:—

لیکن آپ اسے تجارت کس طرح کہتے ہیں۔ اگر ہمارا ہتھیار نگر سرد ہو اور ہم سامان جنگ نہ تیار کریں تو ہم کتنے دن اغیار کے ہاتھوں سے اپنے وطن کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ساری دنیا جنگی طیاریاں کر رہی ہے۔ اگر ہم اپنے ہتھیار نگر میں کام کرنے

بعض استفسارات

ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا جواب صرف خط کے ذریعہ سے دیا جا سکتا ہے بنا براں ہر استفسار کے ساتھ جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ منیجر نگار

انکار کردیں، ہماری آزادی کی ڈھال کس طرح حکومت طیار کرسکے گی۔ ہم دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کرسکیں گے۔

بوڑھے نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا:-

مجھے کب انکار ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہتھیار ڈھالنے کی بستیاں نہیں۔ ہتھیار نگر کی شاخیں دنیا بھر میں قائم ہیں۔ کاروبار ایک ہی ہے لیکن جال ہر طرف بچھا ہوا ہے۔ ہتھیار نگر کے اس خونی گھروندے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تجارت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ خونی گھروندے لانبی چوڑی تجارت گاہیں ہیں اور یہاں فنا اور بقائی متحرک تصویریں تیار ہوتی ہیں یہاں موت سے تجارت ہوتی ہے۔ زندگی سے کاروبار کیا جاتا ہے، زندگی اور موت دونوں سے منافع حاصل کئے جاتے ہیں، موت کی بنیادوں پر ایک لامتناہی انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔ کہ جس طرح ہندوستان میں ایک کالی دیوی ہے، جس کی خوشی اور ناخوشی پر انسانی جان بھی قربان کردی جاتی ہے ایک طرف خوفناک اور ہلاکت سامان ہتھیاروں کے ذریعہ موت سے کاروبار ہوتا ہے، دوسری طرف نازک اور سبک تفریحی جہازوں اور کشتیوں کو بنا کر زندگی سے بھی کاروبار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہلاکت سامان کھلونے بھی اسی لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان تفریحی دل بہلاؤ کھلونوں کو توڑیں پھوڑیں۔

لڑکے نے کسی قدر غصے سے کہا:-

باوجود ان لرزہ براندام حقایق کے ہتھیار نگر کا بازار ہمیشہ سے گرم ہے۔ میں نے ہتھیار نگر میں کام کرنے والے ہر شخص کو ہنستے اور بولتے ہی پایا۔

بوڑھے نے طنز سے جواب دیا:-

لوگ ہنستے اور بولتے ہیں؟ خونی گھروندے کی انگیٹھی برابر بھڑک رہی ہے، اور اس کے لانبے لانبے شعلے ہر طرف لپک رہے ہیں ٹھٹھرائی ہوئی انسانیت نزدیک سے نزدیک تر آتی جاتی ہے۔ نہ اُسے جھلس جانے کا خیال ہے نہ چپکتے پڑنے کا غم۔

لڑکے نے فلسفیانہ انداز میں کہا:-

مگر بیروزگاری کا کیا علاج ہے؟

بوڑھے نے تلخ ہنسی سے جواب دیا:-

بیروزگاری؟ بیروزگاری کا یہی ایک علاج ہے؟ سڑکیں بناؤ، کھانوں اور کپڑوں کے کارخانے بناؤ، زندگی کا معیار بلند سے بلند تر کرو، تجوریوں میں بند خزانوں کو نکال کر بلتا میں تقسیم کردو، بیروزگاری دور ہو جائے گی، تم ہتھیار نگر کی گرم بازاری کو بیروزگاری کا علاج بتاتے ہو لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اپنے پیٹ کی خاطر تم دنیا کے ہر حصہ میں ہزاروں بیوائیں پیدا کرتے ہو ہزاروں معصوم لڑکوں کو ان کے ماں باپ کی گود سے چھینتے ہو اور ـــــ اور، ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ ایک بڑا آدمی اسپتال کا معائنہ کرنے آیا۔ خالی خالی چارپائیوں کو دیکھکر جب اُس نے ناک بھویں چڑھائیں تو اُس سے کہا گیا

کچھ عرصہ سے لوگ کم داخل ہو رہے ہیں، پھر بھی ہماری امیدیں قائم ہیں۔ لڑائی چھڑنے ہی والی ہے۔ پھر تو ہسپتال میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملے گی ـــــ تم بیروزگاری کے علاج کے لئے ہتھیارنگر کی بستیاں بساتے ہو، غالباً اسی لئے کہ اس اور اس جیسے دنیا کے ہر جگہ کے اسپتال خالی نہ رہیں۔ ایک چارپائی بھی خالی نہ رہ سکے ـــــ

لڑکے نے بولنے کی کوشش کی مگر بوڑھا جوش میں آگیا تھا اُس نے بات جاری رکھی ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر دن اسی خونی گھروندے میں گزارے جہاں تم آج جانے پر مصر ہو۔ خونی گھروندے میں رہ کر تم اپنی جیتی جاگتی ہوئی آنکھوں سے بھی آسمانی نظارہ نہ دیکھ سکو گے اور جب اتفاقاً دیکھ بھی لو گے تو آسمان کا رنگ عجیب وغریب پاؤ گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر راکھ بچھا دی گئی ہے۔ ہتھیارنگر کے مالدار ڈائرکٹروں اور تاجروں کے ملاقات کے کمرہ کی گرم اور سفید راکھ نہیں بلکہ دکھیا کی چتا کی جلی ہوئی راکھ۔ ہوا تک بھی داغدار نظر آتی ہے۔ فضا میں ہر طرف دھبے دھبے سے نظر آتے ہیں۔ ہر وقت ہوا کراہتی ہی رہتی ہے جس طرح کہ ایک مرتا ہوا آدمی عالم سکرات میں دم توڑتا ہوتا ہو تم اپنے گاؤں کے گھر میں بیٹھے ہوئے چھم چھم کرتی بارش کی دھن کے ساتھ گنگنانے کے بڑے شایق ہو مگر ہتھیارنگر کے خونی گھروندے میں بارش بھی چنگھاڑتی اگلتی ملے گی۔

لڑکے سے نہ رہا گیا، وہ چیں بجبیں ہو کر بول ہی اُٹھا:۔

یہ ساری باتیں سچ، پھر بھی میرا سوال جواب چاہتا ہے۔ آپ نے یہ نہ بتایا کہ اگر ہتھیارنگر کا بازار سرد ہو جائے ہم اپنے وطن کو اغیار کے ہاتھوں سے کس طرح محفوظ رکھ سکیں گے؟

بوڑھے نے جواب دیا:۔

بچا ذرا سنو، وطن کی مدافعت کے لئے دنیا کے ہر ملک سے بیک وقت ہتھیارنگر کو تجارت کرنے کی ضرورت ؟ ہتھیارنگر میں جو ہلاکت سامان ہتھیار ڈھلتے ہیں وہ صرف ہمارے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے نہیں ہیں جس وقت میں ہتھیارنگر میں کام کیا کرتا تھا۔ بیک وقت چودہ حکومتوں کے ہاتھوں موت اور زندگی کے کھلونوں سے بیوپار ہو رہا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ ان چودہ حکومتوں میں دو ایسی تھیں جو اس وقت بھی ایک دوسرے سے سرگرم پیکار ہیں، پھر بھی ہتھیارنگر کو دونوں سے اپنے منافع کی خاطر تجارت کرنے میں ذرا بھی عار نہ تھا۔ میرے بچے ہتھیارنگر کے اس خونی گھروندے میں وطنیت اور عالمگیریت دونوں کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ ہوتا ہے۔ ان میں ترکی کے لئے بمباز ہوائی جہازوں کی مدافعت کے لئے بندوقیں بھی تیار ہوتی ہیں اور یونان کے لئے تیز رفتار بمباز طیارے بھی۔ پہلے ایک چیز ایک ملک کے ہاتھ فروخت کی جاتی ہے، پھر دوسرے کو ورغلایا جاتا ہے کہ اس کی تباہی کا کوئی آلہ خریدے۔ کون نہیں جانتا کہ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر فرانس کے ہتھیارنگر نے جرمنی کی فوجوں سے تجارت کی اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ آج خود تمہارا ہتھیارنگر جن ملکوں سے تجارت کر رہا ہے، ان میں سے کل کتنے خود تمھیں ہی ہلاک نہ کریں گے۔ گویا کہ تم یہ سارے ہتھیار خود اپنی تباہی کے لئے ڈھالتے ہو۔

جب میں ہتھیار نگر میں کام کر رہا تھا، ان دنوں ٹرکی کے لئے بہاز ہوائی جہازوں کی روک تھام کے لئے بندوقیں ڈھالی جا رہی تھیں، ان میں سے چند تیار ہو چکی تھیں جن کی نالیاں آسمان کو گھورا کرتی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندوستانی گویوں کی طرح جیتی جاگتی دُنیا سے منہ موڑے مسلسل آسمان کی جانب گھورے جا رہی ہیں اور اُن گویوں کو بھی خاموش زبان میں کہتی ہیں کہ اس طرح وہ فنا اور بقا کے جھولے میں بڑی لانبی لانبی پینگیں مارتی ہیں۔ اُن گویوں کی طرح وہ بندوقیں بھی معصوم اور نادان معلوم ہوتی ہیں، شاید اُن بندوقوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس لئے ڈھالی گئی ہیں کہ آسمانوں کے چیتھڑے اُڑا دیں اور زمین کو اپنے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں لپیٹ لیں۔ وہ اتنی خوبصورت اور اتنی صلح کل معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ وہ کسی جدید زمانہ کی فیشن زدہ خاتون کے ملاقات کے کمرہ کی آرائش اور زیبائش کے لئے طیار ہوتی ہیں۔

بندوق کے پیٹ پر ٹرکی کے کسی عالم فاضل کی تصنیف کی ہوئی عبارت کندہ تھی:- بندوق کو چلانے کے لئے پہلے لیور الف کو پیچھے کی طرف کھینچو، پھر اس کے بعد میں بٹن کو دباؤ اور تب ——— جس وقت کہ اُس نے یہ عبارت لکھی ہوگی، اُس نے اپنے ملک کے مرغزاروں کو دیکھ کر لکھا ہوگا۔ قدرت کی ہریالی سے آنکھیں بند کر کے تو نہ لکھا ہوگا، صرف سونے کے چند سکوں کی خاطر اور مرغ مسلّم اور شیری کے ایک گلاس کے لئے تو اُس نے اپنی طبعی آزادی کو نہ بیچا ہوگا ——— اور تب، کسی جگہ کوئی معصوم لڑکا کانپ اُٹھا ہوگا، کوئی نئی نویلی دُلہن نے بیوگی کی چیخ ماری ہوگی اور کوئی نوجوان جو ایک ہی وقت باپ اور شوہر دونوں ہوگا، بندوقوں کی آتشبازی سے بے چین ہو ہو کر، اُٹھ اُٹھ کر، تڑپ تڑپ کر، خون تھوک رہا ہوگا اور جگر کے ٹکڑے نگل رہا ہوگا ——— اور تب -

لڑکے نے سنجیدگی سے بات کاٹی اور دھیمی آواز سے کہا:-

کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے ہتھیار نگر کی یہ ساری گرم بازاری صرف تجارت ہے، سرمایہ داروں کا کھیل ہے اور ہمارے ہتھیار نگر کا رشتہ ناتہ دوسرے ممالک کے ہتھیار نگر سے بھی جڑا ہوا ہے -

بوڑھے نے آہ بھر کر کہا:-

اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے کان میں یہی آواز آتی تھی، ہمیں پرواہ نہیں جو جسے مارے کاٹے، ہمیں تو کاروبار سے مطلب ہے، ہمارا مقصد تو بیوپار ہے ——— یہ آواز جن کے منہ سے نکلتی تھی ان کے چہروں پر ابھی تجربہ کی بوڑھی جھریاں بھی نہ پڑی ہوتی تھیں۔ ان کی ابھی مسیں بھی بھیگی نہ ہوتی تھیں۔ جن کے چہروں سے شرافت ٹپکتی تھی اور جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیلتی ہوتی تھیں۔ ایسے چہرے جن پر ہمیشہ بھروسہ کیا جاتا ہے جن کو دیکھ کر چہرے کے پڑھنے والے ماہرین یہی بتاتے ہیں کہ بے رحمی سے انھیں دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہتھیار نگر کے اس خونی گھروندے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں موت اور زندگی کے کھلونوں کے ساتھ ساتھ انسان کے دل و دماغ کو بھی ڈھالا جاتا ہے، نازک نازک آدمیوں کو، جن کو شاید قدرت نے صرف محبت کے لئے پیدا کیا ہوگا، ایسا پتھر دل کر دیا جاتا ہے کہ اہرمن بھی شرم کھا سکے۔ یہ تو

ایسی ہی بات ہوئی کہ ایک گورکن یہ کہے کہ اُسے اس سے کیا مطلب کہ کون مرتا ہے، بوڑھا یا نوجوان، عورت یا مرد، امیر یا غریب، اُسے تو صرف یہ چاہیئے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ مریں تاکہ اُس کا بیوپار بڑھے اور اس کے بال بچوں کا پیٹ فراغت سے پلے۔

اس ہتھیار نگر کے ڈھالے ہوئے ہتھیار جرمنی بھی خریدتا ہے، اور روس بھی فرانس بھی اور اٹلی بھی، اسی طرح ہم بھی ان ممالک کے ہتھیار نگر سے اپنے لئے ہتھیار خریدتے ہیں یا ہتھیار ڈھالنے کے سامان خریدتے ہیں۔ اسی طرح دُنیا کے گوشے گوشے میں موت آسا بجلیاں دوڑتی رہتی ہیں۔ چھوٹی بڑی ہر سلطنت ہم سے بیوپار کرتی ہے اور ہم اُنسے بیوپار کرتے ہیں۔ اس بیوپار کی خصوصیت صرف زیادہ سے زیادہ موت، زیادہ سے زیادہ ہلاکت سامانی جتنی زیادہ ہلاکت سامانی، اتنے ہی زیادہ پیسے، ہمارے اپنے ہاتھوں کے بنائے گولے آسمانوں کے طول و عرض میں اڑیں گے اور بیچارہ زخمی آسمان خود ہم پر ہی پھٹ پڑے گا۔ غرض صرف یہ ہے کہ ہتھیار نگر کے حصہ داروں کی جیب میں زیادہ سے زیادہ پیسے آئیں۔ ان کی جیب زیادہ سے زیادہ بھاری ہو۔

لڑکے نے آخر کچھ خود بھی سوچتے ہوئے پوچھا:-

پھر میں کروں کیا؟ دوسرے نوجوان کیا کریں؟

بوڑھے نے گرجتے ہوئے کہا:-

جس طرح ہتھیار نگر کے تاجر تمھیں بہکاتے ہیں، تم انھیں بہکاؤ۔ خونی گھروندے میں سوراخ پیدا کردو، سارا ملک بلکہ ساری دنیا پاگل ہو رہی ہے، اُسے سمجھاؤ۔ یہ شاہی باجگزاری ہے، اسی کا یہ سارا کھیل ہے۔ اسے لوٹ لو، یہ ساری سلطنتیں انسدادِ غلامی، انسدادِ شراب نوشی اور دوسری تمام غیر قانونی کاروبار کی روک تھام کے لئے بڑی جلدی بے پردہ ہو جاتی ہیں لیکن جب موت اور زندگی سے بیوپار کا سوال آتا ہے تو یہی سلطنتیں اپنی عزت اور وطن کی نام نہاد عزت اور غیرت کا واسطہ دے کر نہ صرف بے دھڑک تجارت کے پروانے دیتی ہیں بلکہ ہماری رگِ حمیت کو بھڑکاتی ہیں۔ جو آدمی اپنے ہی ہمجنس کی تباہی اور بربادی کا سامان فخر کے ساتھ تیار کرے اور اُس سے بیوپار بھی کرے، اُسے موت کا تاجر نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔ جس قدر وہ زیادہ بیوپار کرے گا، اتنے ہی زیادہ منافع حاصل کرے گا۔ جس قدر زیادہ آدمی مارے جائیں گے، اپاہجوں، لولوں، اندھوں اور لنگڑوں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہوگا، اتنی ہی زیادہ اُسے مسرت ہوگی۔ کیونکہ اتنی ہی زیادہ اس کی تجارت کو ترقی ہوگی۔ میرے بچے، خود بھی سنو اور دوسروں کو بھی سنادو کہ وقت نزدیک ہے۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑنے کو ہے۔ ہزارہا معصوم جانیں اس دنیا کے گوشے گوشے میں اس تجارت کا شکار ہونے والی ہیں۔ بہار کے رگ و ریشہ میں زہر پھیل چکا ہے۔ خزاں نیلی پیلی ہو چکی، جاڑے کے دن ابھی سے تھرتھراتے آرہے ہیں۔ بدنصیبی ہواؤں کی گونج اُٹھ چکی ہے۔ خوش و خرم زندگیوں پر تاریکی کا بادل چھاتا جا رہا ہے۔ پہاڑوں

اور دادیاں میں سپاہیوں کے بھاری بھاری جوتوں کی آوازیں ایک لابنے چوڑے خواب کی طرح پھیلنے لگی ہیں۔ قدموں کے نیچے دھرتی ماتا کانپنے جا رہی ہے۔ ساری انسانی زندگی پر موت کی تجارت کا بھوت چھاتا جا رہا ہے۔ بند وقتوں کی گونجیں نوجوانوں سے یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر پریم اور پریت کے گیت اب نہ گائیں۔ گولوں کی دھڑ دھڑ یہ سنا رہی ہے کہ انسانی آبادی کو اب وسعت دینا بے کار ہے اس لئے کہ خونی گھروندے کے خداؤں کا یہی فرمان ہے کہ اس بوڑھے سیدے پر ایک مکان بھی صحیح و سالم باقی نہ رہ جائے۔ آسمانوں پر پھڑپھڑاتے ہوئے طیارے یہ سناتے اُڑے جا رہے ہیں کہ اب کھیتی باڑی بے کار ہے۔ روپیہ پیسہ جمع کرنا فضول سی بات ہے اس لئے کہ اس کے سایہ تلے کوئی چیز بھی نہ لہلہا سکے گی۔

میرے بچے، دنیا کو اب بھی بچایا جا سکتا ہے، ساری انسانی برادری کا صرف ایک دشمن ہے، وہ دشمن جسکے بازو لوہے کے ہیں جس کی سانس گندی اور بدبودار ہے اور جس کی مٹھیوں میں ہماری زندگیاں، چاندی اور سونے کے سکوں کی شکل میں، بند ہیں، لڑائی در اصل دو ملک کی جنتاؤں میں نہیں ہوا کرتی۔ دو ملک کے معصوم انجان سپاہیوں کے درمیان نہیں ہوا کرتی، بھلا جرمنی کے مزدوروں، اٹلی کے کسانوں کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ہم بھی ان کی طرح بھوکے اور پیاسے ہیں۔ وہ بھی بھوکے، ہم بھی بھوکے، بھوکے آپس میں اُس وقت تک نہیں لڑتے جب تک کہ انھیں لڑایا نہ جائے۔ یہ لڑائی، صرف سرمایہ داروں کی تجارت ہے جس میں سارے ممالک کے بے گناہ اور معصوم پُرامن شہری شخصی اور ذاتی حرص و آز کا گھاٹ بن جاتے ہیں۔

میرے بچے جاؤ اور عالمگیر جنتا سے رشتے ناتے جوڑو، دنیا کے مزدوروں اور کسانوں سے اشتراک پیدا کرو دنیا کو وطن بناؤ اور اہل دنیا سے بھائی چارہ پیدا کرو وطن کی عزت پر پھر کوئی حرف نہ لائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دنیا میں اُسی وقت امن ہو گا جب وقت وہ آجائے گا کہ اسٹالن اپنے بستر مرگ پر فرانکو کی بیوہ کو یہ خبر سنائے گا کہ میں نے مسولینی کی تجہیز و تکفین کے وقت معتبر ذریعے سے سنا ہے کہ ہٹلر قتل کر دیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کہتے کہتے خود بوڑھے کے قلب کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ لڑکے نے حسرت بھری نظر ڈالی اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

فوجی اسپتال کی ایک چارپائی
خالی ہوئی اور خدا کرے
کہ ہمیشہ خالی ہی رہے۔

فرید مچھلی شہری

مکتوبات نیاز

مخلص نواز،

یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں یہاں سے کہیں اور جا رہا ہوں۔ جب انسان وطن چھوڑ دے تو پھر وہ ہر جگہ مسافر ہے، یہاں مجھے کیا کم تکلیف ہے کہ غریب الدیار ہونے کا لطف کہیں اور جا کر ڈھونڈوں۔ اگر آپ میری زندگی سے آگاہ ہوتے تو شاید اس خبر کا اعتبار نہ کرتے۔ میرے لئے تو اب گھر سے باہر قدم نکالنا بھی دشوار ہے، چہ جائیکہ شہر سے باہر کہیں جانا

قید میں ہوں اور ناخوش نہیں۔ یہ جذبہ اسی وقت تک رہتا ہے جب پر و بال میں قوت پرواز موجود ہو۔ اب تو میں دنیا کو تنگ تر کرتا جا رہا ہوں، یہاں تک کہ اس کی وسعت "گور" کی حدود سے نہ زیادہ رہ جائے — دنیا سے بیزار ہوکر جینا بھی ایک لذت رکھتا ہے اور — "پنہاں ملول بودن و تنہا گریستن" معمولی بات نہیں۔

خدا نہ کرے آپ اس سے کبھی واقف ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں مجھ سے آپ سے اس عالم میں بھی نہ نبھے گی — آپ میرے رونے کی ہنسی اُڑائیں گے اور میں آپ کے ہنسنے پر روؤں گا۔

عرصہ سے یوسف کی خبر نہیں۔ کہاں ہیں؟ سنا تھا کہ ان کو کوئی نئی دلچسپی مل گئی ہے۔ آپ کو حالات معلوم ہوں تو لکھئے وہ نہیں تو ان کا ذکر ہی سہی!

خزانے را بہارے می تواں کرد

حضرت،

میں اور آپ کی شکایت کروں!

آپ میری اس سے زیادہ بُرائی کیجئے، اس سے زیادہ ممنون ہوں گا۔

آتش زدی، چمن چمن افروختی مرا!

جب دنیا خوش ہوکر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہونچاتی، تو اس کی برہمی کی پرواہ کیوں کروں؟ کم از کم میرے ساتھ تو اس کا یہی معاملہ ہے۔ آپ کے ساتھ یہ نہیں تو آپ ڈرئیے، ضمیر، وغیرہ سب فضول باتیں ہیں اور پھر آپ کے لئے اگر آپ کے

دماغ کی ساخت میں قدرت نے وہ حصہ رکھا ہی نہیں جس کا تعلق دل کی دھڑکن اور آنکھوں کے نم سے ہے۔

بیشک مجھ سے وہ سب کچھ کہا گیا جو آپ نے لکھا اور تھوڑی دیر تک میں اسے سنکر مضطرب بھی رہا، لیکن جب پچھلی باتیں یاد آئیں تو مطمئن ہوگیا، کیونکہ آپ کی طرف سے یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ بہرحال آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کے طرز عمل سے مطلق حیرت نہیں ہوئی اور اس لئے شکایت کیوں کرتا، کس سے کرتا!

نخورم زخم دلاں کوچہ کہ مرہم باشد
نشوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد

مکرمی: یقیناً بادی النظر میں وہی شبہ پیدا ہوتا ہے جو آپ نے ظاہر کیا، لیکن غور کرنے سے مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ بیشک شعر اسی طرح ہے!

در گلستاں دیدمش نشناختم
بر تنش پیراہنِ گل تنگ بود

آپ کا اعتراض یہ ہے کہ جب پیراہن گل اس کے لئے تنگ تھا اور وہ اس میں نہ رہ سکتا تھا تو پہلے مصرعہ کا مفہوم غلط ہوجائے گا۔ کیونکہ محبوب اور پھول دونوں میں تمیز اُٹھ جانا اس وقت ممکن ہے جب "پیراہنِ گل" اس کے جسم پر ٹھیک آجائے، نہ یہ کہ وہ تنگ ہو۔

آپ نے دوسرے مصرعہ کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا، اس لئے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔ پیراہن تنگ ہونے کے معنے نہیں ہیں کہ وہ جسم پر ٹھیک نہ آتا تھا، بلکہ مدعا یہ کہنا ہے کہ اس کے جسم پر "پیراہن گل" اتنا چست تھا کہ دونوں میں تمیز دشوار تھی اور وہ بالکل پھول ہی پھول نظر آتا تھا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

حبیبی، خط پہونچا، آپ کی برہمی بالکل بجا ہے، میں نے "قتیل و غالب" کو دیکھا ہے، بلکہ اس پر ریویو بھی کرچکا ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ فارسی شاعری میں غالب کے سامنے قتیل کیا اور بڑے بڑے مستند شاعروں کا بھی ذکر کچھ یونہی سی بات ہے۔

غالب اپنے اخلاق کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی رہا ہو، لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی جگہ تنہا نظر آتا ہے۔ ہموطن ہونے کے لحاظ سے انوری صاحب پر قتیل کا جتنا حق پایا جاتا تھا، اس سے زیادہ انھوں نے ادا کردیا، لیکن جب تک وہ یہ نہ ثابت کردیں کہ قتیل شاعری میں بھی غالب کا ہمسر تھا، نہ قتیل کی روح خوش ہوسکتی ہے، نہ خود انکا ضمیر اور یہ محال ہے

اس میں شک نہیں کہ قتیلؔ پر نکتہ چینی کرنے میں غالبؔ نے صرف زبانی روایات پر اعتماد کیا اور خود قتیلؔ کا کلام مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، لیکن اس سے قتیلؔ کی شاعری کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

غالبؔ کی شاعری کا یہ تیکھا پن کہ

"دماغِ نازکِ من بر نمی تابد تقاضا را"

اس کی شاعری میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔

شعرا کے کلام میں شوخی بھی پائی جاتی ہے اور رنگینی بھی، ندرتِ بیان بھی نظر آتی ہے اور لطفِ زبان بھی، لیکن ان سب کے ملجانے کے بعد جو ایک نئی چیز بنتی ہے، وہ غالبؔ ہی کے یہاں ملے گی۔

عرفیؔ، نظیریؔ، بیدلؔ، حافظؔ، خسروؔ، سب کے یہاں کیا نہیں۔ نہیں ہے ایک۔ تو سعدیؔ! ــ لکھتا ہے:ــ

تا چہا آئینۂ حسرت دیدار تو ایم — جلوہ بر خود کن و ما را بہ نگاہے دریاب
خندہ بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ دامن — زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

کہئے بیدلؔ سامنے آگیا یا نہیں۔ دو شعر اور سنئے خسروؔ کے رنگ کے:ــ

امید لطف تو دل میدہد بدیں شادم — وگرنہ تابِ صبوری ازیں زیادم نیست،
یادم نمی کنی و زیادم نمی روی — عمرت دراز باد فراموشکارِ من

حافظؔ کا رنگ ملاحظہ ہو:ــ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردشِ رطل گراں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہگزر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

اب عرفیؔ کا رنگ دیکھئے:ــ

بہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن — نگہ در نکتہ زائیہا، نفس در سرمہ سائیہا

اندازِ نظیریؔ کی مثالیں ملاحظہ ہوں:ــ

مراد میدنِ گل در گماں فگند امروز — کہ باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت
ما و خاک رہگزر بر فرقِ عریاں ریختن، — گل کسے جوید کہ اورا گوشۂ دستار ہست

اب چند شعر ایسے سنئے جہاں وہ اپنے رنگ میں بالکل منفرد نظر آتا ہے:ــ

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ ست — بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را — مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت
در خموشی تابشِ روئے عرقناکش نگر — تا چہا ہنگامۂ سرگرمی گفتار ہست

آگہی بے پردہ بعد داغہا نام سوخت
دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت

نہ برجستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم لیک ندانم بہ چہ عنوانم سوخت

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی !
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدنیم
نہ دیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر

ندیدہ دانہ و بالیدہ آشیانگہ شد
بانتظار، ہماں دام چیدنم بنگر

میدزدیم بوسہ و عرض ندامت می کنم
اختراعے چند در آداب صحبت می کنم

شد وحشت از مسجد بویرانہ می آرم بشہر
خانہ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ، و عبادت می کنم

راہے ز کنج دیر بہ مینو کشودہ ام
از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

بہید بادۂ گلفشام چوں سلام کنم
ہماں بہ بادہ سلام مرا دہید جواب

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا
ہلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

خجلت نگر کہ در سنائم نیافتند
جز روزۂ درست ز صہبا کشودۂ

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہاں تک لکھوں ایسے نوادر اس کے یہاں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اور اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ غریب قتیل کا کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے منہ آسکے۔

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم و لے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست !

صدیقی

میں نہیں کہہ سکتا کہ جو خبر آپ نے سُنی ہے وہ کس حد تک صحیح ہے ۔ استحالۂ عقلی تو اس میں کوئی پایا جاتا نہیں ۔ لیکن اُن کی عادت کو دیکھتے ہوئے ضرور اسے محال کہہ سکتا ہوں ۔ میری ان کی شناسائی آج کی نہیں، ایک چوتھائی صدی کی ہے اور میں نے کبھی کسی کی بُرائی کرتے ہوئے انہیں نہیں سنا ۔ اگر آپ سے کوئی خاص تکلیف انھیں

پہونچی ہے تو البتہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ورنہ یوں محض تفنن کے لئے عیب جوئی یا نکتہ چینی ان کی عادت نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں تو میں اس کی تحقیق بھی کروں گا، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راوی دروغگو ہے۔ نام آپ اس کا بتاتے نہیں اور اسکے قابل اعتماد سمجھنے پر مجھے مجبور بھی کرتے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے

بہرحال آپ مطمئن رہئے، میں دریافت کروں گا اور ضرورت ہوئی تو سامنا کرا دوں گا، لیکن اس وقت تک کہ میں کچھ آپ کو نہ لکھوں، آپ بالکل خالی الذہن رہئے اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیجئے۔

کیا پوچھتے ہو اُن کا کیا عالم ہے۔

زور دگر ہست ایں کمان را

کل تشریف لائے تھے۔ میں پہچان نہ سکا، پورے بیس سال اُس طرف بڑھ گئے ہیں۔ میں دیکھ کر مسکرایا تو بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑے اور پھر جو سراپا کا ذکر شروع کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا فردوسی "داستانِ ہوشربا" بیان کر رہے ہیں۔ میں نے کہا "سیرت؟" بولے کہ اس کا حال کیا پوچھتے ہو، اس زمانہ کی "رابعہ بصری" کہوں تو بھی کم ہے۔

عمر کی تفاوت کا میں نے ذکر چھیڑنا ہی چاہا تھا کہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "بس اس سے زیادہ وقت میں نہیں دے سکتا، انتظار ہو رہا ہوگا"

یہ تو واقعہ ہے کہ ان پر اس شادی کا بڑا اچھا اثر پڑا ہے، غریب بیوی کا کیا حال ہے، اس کی خبر نہیں۔ مگر آدمی ہوشیار ہیں، کھلنے تھوڑے ہی دیں گے!

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۲۶ء) جنوری ۵ر — (۳۰ء) مئی ۴ر — (۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ — (۳۲ء) جنوری ۱۲ر مئی تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ — (۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ — اکتوبر ۵ر جنوری عہ فروری تا دسمبر علاوہ مئی تا اکتوبر (۳۶ء) جنوری عہ، مارچ تا اگست ۸ر (۳۹ء) پورا ٹائٹل ۵ر

مینجر نگار

اعلیٰحضرت کا ایک اور فرمانِ عطوفت نشان

امسال اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن کی سالگرہ جن حالات میں ہوئی ہے، وہ بہ نسبت سنین ماسبق کے کچھ مختلف تھے اور اگر کسی انسان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس کے "نبض شناس زمانہ" ہونے کی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے، تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ فرمانروائے دکن کی ذات شاہانہ نہ صرف ایک بادشاہ بلکہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے بھی اپنا مثل نہیں رکھتی

سالگرہ سے قبل ایک فرمانِ خصوصی کے ذریعہ سے اصلاحات کی منظوری ہو چکی تھی اور وہاں کی ایک جماعت جو نہ اصولِ سیاست سے واقف ہے اور نہ اعلیٰحضرت کے شرف ذاتی کا مطالعہ صحیح زاویۂ نگاہ سے کر سکتی ہے، ان اصلاحات کی مخالف تھی، اور واقعات سے ایسے نتائج اخذ کر رہی تھی جو خلاف حقیقت بھی ہیں اور منافی مصلحت بھی، اس لئے حیدرآباد کی فضا مکدر ہو گئی تھی اور ایک خاص حلقہ میں اصلاحات کے متعلق یہ غلط خیال قایم کر لیا گیا تھا کہ وہ اعلیٰحضرت کی مرضیِ مبارک کے خلاف محض کونسل کی وجہ سے عمل میں آرہے ہیں اور اس سے اقتدار شاہانہ کو نقصان پہونچ رہا ہے

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر اعلیٰحضرت نے دوسرا فرمان جاری فرمایا جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ اصلاحات کی تجاویز خود شہریار دکن کے حکیمانہ دل و دماغ کا نتیجہ ہیں اور کونسل کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اعلیٰحضرت کی ذات شاہانہ سے بے نیاز ہو کر وہ نظمِ حکومت میں درخور رکھ سکتی ہے یکسر غلط و نادرست ہے۔ چنانچہ گزشتہ اشاعت میں اس فرمان پر گفتگو کر کے بتا چکا ہوں کہ اعلیٰحضرت نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل ہدایات قرآنی کے مطابق ہے اور مجلس شوریٰ کا قیام ذات شاہانہ کے اقتدار و اختیار میں کسی طرح حارج و مخل نہیں ہو سکتا

اس کے بعد سالگرہ مبارک کی تقریب مسعود پر تیسرا فرمان شاہی صادر ہوا، جو عمیق تاثرات اور بلند نصب العین کے لحاظ سے اعلیٰحضرت کی فراستِ ملوکانہ پر ایک اور مہر توثیق کی حیثیت رکھتا ہے اور اصولِ حکمرانی کے لحاظ سے، وقیعات عالم میں ایک مخصوص امتیاز کا حامل ہے

سالگرہ کی تقریب ہر جگہ اور ہر طبقہ میں جشن و مسرت کی تقریب سمجھی جاتی ہے، چہ جائیکہ ایوانات شاہی کہ اس موقع پر تو دہنا اضمحلال و افسوس کا خیال بھی لانا جرم ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی نشاط و مسرت کے عالم

میں سب سے پہلی آواز جو شہر یار دکن کی طرف سے بلند ہوتی ہے، وہ یکسر لبریز تاثر نظر آتی ہے، جس میں ذاتیات سے بالکل علیحدہ ہو کر اس فلسفہ کو سامنے رکھا گیا ہے کہ ایک حکمراں کی حقیقی مسرت کا تعلق صرف اس کی ذات سے نہیں بلکہ تمام ان نفوس سے ہوا کرتا ہے جن پر وہ حکمراں ہے اور اگر ان کی طرف سے کوئی بے چینی اس کے دل میں پائی جاتی ہے تو پھر تمام تقریبات مسرت و نشاط اس کے لئے بے معنی ہو جایا کرتی ہیں

اس فرمان کی ابتدا ہی اظہار تاسف سے ہوتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"آج میں اپنی سالگرہ کے موقعہ پر چند سطور شاید اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر کچھ عرصہ سے میں دیکھ رہا ہوں کہ دکن کی سیاسی فضا مکدر ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ جس کو دیکھ کر میں بہت ہی افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ــــــ یہاں کی رعایا میں جو خوشگوار برادرانہ تعلقات قدیم سے چلے آتے تھے، افسوس ہے کہ اب اس طرح کے باقی نہیں رہے یا کم از کم بادی النظر میں ویسے دکھائی نہیں دیتے جیسے پہلے تھے ــــــ"

ان الفاظ میں جو دردمندانہ کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ چونکہ یہ الفاظ اعلیٰحضرت کے اعماق دل سے نکلے ہیں، اس لئے ممکن نہیں کوئی انھیں پڑھے اور متاثر نہ ہو۔ اعلیٰحضرت افسوس فرماتے ہیں اس امر پہ کہ "دکن کی فضا کچھ عرصہ سے مکدر ہو رہی ہے" اور اس کی تعبیر آگے چلکر ان الفاظ میں فرمائی جاتی ہے کہ "یہاں کی رعایا میں جو خوشگوار برادرانہ تعلقات قدیم سے چلے آتے تھے اب اس طرح کے باقی نہیں رہے"

اس ارشاد سے اعلیٰحضرت نے حکومت کے اس اولین اصولی مسئلہ کو واضح کر دینا چاہا ہے کہ ایک ملک کی سیاسیات واقعتاً صرف رعایا کے باہمی خوشگوار تعلقات ہی سے وابستہ ہوا کرتی ہے اور اگر کسی غلط فہمی یا عاقبت اندیشی سے مختلف جماعتوں میں یہ عمرانی وحدت اور اجتماعی اخوت باقی نہ رہے تو ایک ملک کی سیاسی فضا کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی

سر سموئیل رومیلی، اٹھارویں صدی کا بڑا زبردست مصلح تسلیم کیا جاتا ہے جس نے انگلستان کے تمام قوانین اور طرز حکومت کو بدل دینا چاہا تھا، وہ سیاسیات ملکی سے بحث کرتے ہوئے بہترین حکومت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"It is the greatest happiness of the greatest number.

یعنی وہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے انتہائی مسرت کا سبب ہو سکے

اعلیٰحضرت کے فرمان گرامی میں نہ صرف اسی اصول کو سامنے رکھا گیا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایک ملک کی انتہائی مسرت کا سبب آپس کے خوشگوار تعلقات کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا

ان تمہیدی الفاظ کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، ہنوز موقعہ باقی ہے کہ مختلف اقوام و ملل کے افراد اپنے ماضی و حال کے افعال پر غور

کریں عقل و فہم سے کام لیکر، دور اندیشیوں کو پیش نظر رکھ کر ٹھنڈے دل سے انقلاب زمانہ کے مالہ و ماعلیہ پر تفحص کریں اور اس طرح سے کسی صحیح نتیجہ پر پہونچیں تاکہ آئندہ ان میں صلح و آشتی پیدا ہو سکے، نیز ان کے سود و بہبود کے حق میں اچھے نتائج مرتب ہوں، تاکہ ان کا یہ وطیرہ ایک طرف ملک کی فضا کو صاف کرنے میں اور دوسری طرف گورنمنٹ کے تفکرات کو دور کرنے میں مد و معاون ہو سکے۔ کس لئے کہ کوئی مہذب گورنمنٹ بغیر حصول امن و امان یا استقرار صلح و آشتی اپنے فرائض کما حقہ انجام نہیں دے سکتی اور نہ یہی اس کی رعایا برایا یا باشندگان ملک اطمینان قلب سے زندگی بسر نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں چیزیں لاریب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، جس کے بغیر نقشۂ حکمرانی نامکمل ہے اور یہ کلیہ آئین قدرت کے مطالعہ کرنے والوں کا مسلمہ اور منقول ہے۔"

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰحضرت کا یہ حکیمانہ و مدبرانہ ارشاد صرف حیدرآباد ہی کے موجودہ حالات پر حاوی نہیں ہے، بلکہ ان چند سطروں میں حکومت و سیاست کے تمام ان اصول کو محفوظ کر دیا گیا ہے، جنھیں کوئی بڑے سے بڑا روشن دماغ مصلح ملک و ملت پیش کر سکتا ہے

نظم حکومت میں اہم ترین چیز حاکم و محکوم کے تعلق کو ایک صحیح معیار پر لا کر قائم کر دینا ہے اور شخصی حکومتوں میں یہ معیار بہت کم متوازن حالت میں پایا جاتا ہے، لیکن اعلیٰحضرت نے باوجود آزاد و خود مختار فرمانروا ہونے کے تشخصات ذاتی و مصالح ملکی کو کبھی مخلوط ہونے نہیں دیا اور بہ حیثیت انسان ہونے کے آپ نے یہی سمجھا کہ وہ اسی رشتۂ اخوت سے وابستہ ہیں جو نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے اور بہ حیثیت فرمانروا ہونے کے انھوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ وہ اس جذبۂ اخوت کی لگن اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کے اندر پیدا کر دیں، کیونکہ رعایا کی فلاح و بہبود کا انحصار صرف اسی رشتۂ اتحاد پر ہے

اعلیٰحضرت کا اصول حکمرانی ہمیشہ تعاون و ہمدردی پر منحصر رہا ہے اور آپ نے کبھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا کہ زمانہ کے دوش بدوش عمرانیت و سیاست کی ارتقائی منزلوں کو طے کرنا ہی ایک فرمانروا کا معیاری کارنامہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس فرمان میں بھی سب سے پہلے رعایا کو اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ "انقلاب زمانہ کے مالہ و ماعلیہ پر تفحص کریں" جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ صلح و آشتی کے برکات سے واقف ہوں گے اور باہمی اتفاق و اتحاد سے حکومت کی راہ میں ترقیوں کے لئے آسانیاں بہم پہونچا سکیں گے

کس قدر بامعنی، پُرمغز اور حکیمانہ ارشاد ہے کہ "کوئی مہذب گورنمنٹ بغیر حصول امن و امان یا استقرار صلح و آشتی اپنے فرائض کما حقہ انجام نہیں دے سکتی" اس جملہ کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ ایک اٹل قانون ہے جسے بہتر الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا

سب سے پہلے گورنمنٹ کے ساتھ "مہذب" کی شرط لگائی گئی ہے جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ

سلطنت، حصولِ امن کو اولین شرطِ حکومت قرار نہیں دیتی تو وہ مہذب حکومت نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس کے بعد ہی "حصولِ امن و امان" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکومت کی بہترین خواہش و تمنا یہی ہو سکتی ہے۔ در پھر "انتقارِ صلح و آشتی" کا فقرہ ہے جس کا روئے سخن رعایا کی طرف ہے اور اس طرح اس پورے جملہ کی تشریح یوں ہوئی کہ ایک مہذب حکومت یہی چاہتی ہے کہ ملک میں امن و امان پایا جائے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود رعایا کے اندر صلح و آشتی کی جستجو کا جذبہ پایا جائے۔

حکومت کی تعریف مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ بات مستقل علم بن گیا ہے اور حکومت کی جتنی تقسیمیں دنیا میں پائی گئی ہیں ان کا بیان ایک مبسوط مضمون چاہتا ہے لیکن حکومت کے مختلف نظریوں میں افلاطون و ارسطو کے اس نظریہ سے کسی مصلح نے اختلاف نہیں کیا کہ "ایک سچی حکومت وطاقت وہی ہے جو رعایا کی فلاح و بہبود پر صرف ہو" لیکن یہ مقصود اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ملک کی مختلف الخیال جماعتوں میں تعاون عمل کی روح پیدا ہو جائے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فرمانروا کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہوا کرتا۔ جس حد تک اصلاح و ترقی کا تعلق ہے اس کا نصب العین رنگ و نسل کے امتیاز سے بہت بلند ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات کو بھی محو کر دیتا ہے اور یہ مرتبہ اتنا بلند ہے کہ آخر کار لوگ بادشاہ کو "ظل اللہ" کہنے لگے اور اس میں شک نہیں کہ جو فرمانروا اس طرح بے لاگ حکومت کرتا ہے وہ یقیناً خدا کا سایہ ہے جو تمام مخلوقات کو یکساں اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

یہی وہ اصول حکمرانی ہے جس کو متعین کرتے ہوئے اعلیٰحضرت نے نہایت دردمندانہ لہجہ میں اپنی رعایا سے ان الفاظ میں خطاب فرمایا ہے کہ :-

"یہ فقرے اس کی زبان اور گہرائی قلب سے نکلے ہیں جس نے علاوہ ربع صدی تک حکمرانی کرنے کے اپنی بقیہ عمر کو ان کی اصلاح و فلاح کی انجام دہی میں وقف کر دیا یہی درحقیقت اس کے خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے"

جب اگر یہ حقیقت ہے (اور کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے) تو کیا اس سے زیادہ روشن مثال ایک بلند معیاری حکومت کی کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے اور کیا اس رعایا کے لئے جسے ایسا وسیع المشرب، روشن خیال، سیاست داں فرمانروا نصیب ہوا ہو، یہ بات انتہائی بدنصیبی کی نہیں ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھ کر "ظلِ خداوندی" کی ان بے مثل برکات سے مستفید نہ ہو سکے!

اعلیٰحضرت نے اس فرمان میں صرف اصولی گفتگو ہی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ اپنی رعایا کا کتنا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور تمام ان سیاسی قیدیوں کی خطاؤں سے درگزر کر کے رہائی کا حکم صادر کرتے ہیں جو سلسلۂ ستیاگرہ یا اصلاحات کے خلاف مظاہرہ کرنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے

یہ ہے صلح و آشتی کا وہ پیام عظیم جو فرمانروائے دکن نے اپنی سالگرہ کی مبارک تقریب پر اپنی رعایا کو سنایا اور اس طرح گویا اس بات کی تصدیق کر دی کہ ایک بادشاہ کی صحیح تقریب مسرت وہی ہو سکتی ہے، جس میں اس کی رعایا بھی شریک ہو

اعلیٰحضرت کے دردمند دل نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ ان کی سالگرہ کا جشن منایا جائے اس حال میں کہ بعض افراد نوع انسانی ان کی حدود حکومت میں صرف اس لئے قید و سلاسل کی سختیاں جھیل رہے ہوں کہ انھوں نے حکومت کی نیت سمجھنے میں غلطی کی تھی

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس فرمان مبارک کے بعد کونسی منزل ایسی رہجاتی ہے جس کو دکن کی رعایا تذبذب و اشتباہ کی نگاہوں سے دیکھے - اس قدر صاف و واضح بیان اور ایسے دردمندانہ طرز عمل کے بعد بھی اگر دکن کی کوئی جماعت اعلیٰحضرت کے منشاء مبارک کے خلاف جرأت اقدام کر سکتی ہے تو اس سے زیادہ بدنصیب شاید وہی قومیں رہی ہوں گی جن پر نافرمانی کے پاداش میں "کُونُوا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ" کی وعید نازل ہوئی تھی اور جن کے انجام کی ذمہ داری خود انھیں کے اعمال و افعال پر عاید ہوتی ہے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان :- مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم ایل، اے، ایم، ایل، سی مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حالی سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہونچا دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان امور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے - ۲۷۵ صفحات قیمت مجلد عہ

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھے - مجلد عہ

مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت مجلد عہ

میدان عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے - قیمت مجلد عہ

مینجر نگار - لکھنؤ

باب الاستفسار

مثنوی کی بحریں

(جناب سید جلال الدین صاحب۔ کوئٹہ)

مثنوی کے لئے کون کونسی بحریں مخصوص ہیں اور ان کے اوزان کیا ہیں۔ اردو و فارسی کی مشہور مثنویوں میں کون
مثنوی کس بحر میں لکھی گئی ہے۔

(نگار) مثنوی کی سات بحریں ہیں:-

۱۔ (مفتعلن، مفتعلن، فاعلات) جو مزاحفات مطوی موقوف بحر سریع سے ہے۔ شیخ نظامی گنجوی کی "مخزن اسرار" اور امیر خسرو کی "مطلع انوار اور قران السعدین" اسی بحر میں ہیں، اس بحر کے چند اشعار مثالاً ملاحظہ ہوں:-

نرگس سرمست بہ طرف چمن، عربدہ کن باسمن و یاسمن
بر سر ہر شاخ سرا سیمہ، ہوش برد عقل رباینده

اس بحر میں اردو کی کوئی مشہور مثنوی نہیں پائی جاتی۔

۲۔ (مفعول، مفاعلن، فعولن) جو مزاحفات بحر ہزج اخرب مقبوض مجذوب مسدس سے ہے، خاقانی کی "تحفۃ العراقین"، نظامی گنجوی کی "لیلیٰ مجنوں"، فیضی کی نلدمن، اور میر حسین واعظ کی "زاد المسافرین" اسی بحر میں ہیں
اس بحر کے چند اشعار یہ ہیں:-

این طرفہ حکایت ست بنگر، روزے ز قضا گر سکندر
می رفت و ہمہ سپاہ با او، وان حشمت و مال و جاہ با او
ناگہ بخرابہ در گزر کرد، پیرے ز خرابہ سر بدر کرد

اُردو میں طالب علی خاں عیشؔ کی سوز و ساز، میر تقی ہوسؔ کی لیلیٰ مجنوں، دیا شنکر نسیمؔ کی گلزار نسیم اور منشی احمد علی شوقؔ کا ترانۂ شوق اسی بحر میں ہیں۔

سوز و ساز:- طاقت نہیں جان مضمحل میں، اک آگ سی لگ رہی ہے دل میں

لیلیٰ مجنوں:- ہر کوچہ میں بیقرار پھرتا، غش کھائے ہر ایک در پہ گرتا

گلزار نسیم:- دیکھا تو وہ گل ہوا، ہوا ہے، کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

ترانۂ شوق:- صدمہ تھا، ملال تھا، قلق تھا، آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا

۳۔ (فعولن، فعولن، فعولن، فعول - یہ بحر مزاحفات بحر متقارب مقصور مثمن سے ہے۔

فردوسی کا "شاہنامہ"، نظامی کا "سکندر نامہ"، خواجو کرمانی کا "ہمائے ہمایوں"، ظہوری کا "ساقی نامہ" اسی بحر میں ہیں۔

اس بحر کے یہ اشعار یہ ہیں:-

شنیدم کہ رندے کج اندیشۂ، ہمی زد بپا سئے خرد تیشۂ

ازانجا کہ در دل کجی پیشہ داشت، بمعراج پیغمبر اندیشہ داشت

اُردو میں سراج الدین اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان خیال، میر تقی میر کی شعلۂ شوق اور میر حسن کی سحر البیان اسی بحر میں ہیں۔

بوستان خیال:- ہر اک سمت پانی کی لہروں کی سیر، دو نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر

شعلۂ شوق:- سراسیمگی سے بگولا ہوا، پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

سحر البیان:- جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے، محبت میں دن رات گھٹنا اسے

۴۔ (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات) یہ مزاحفات رمل مسدس سے ہے۔ جلال الدین رومی کی مثنوی اور فرید الدین عطار کی "منطق الطیر" اسی بحر میں ہیں۔

مثال ملاحظہ ہو:-

دید شہرے پر فغاں و پر خروش، اندر انبوہی مردم بر جوش

آں یکے را از بروں عزم درون، واں دگر را از درون میلِ برون

اس بحر میں اُردو کی کوئی مشہور مثنوی میری نگاہ سے نہیں گزری

۵۔ (فاعلاتن، مفاعلن، فعلن) یہ مزاحفات بحر خفیف مسدس مقطوع سے ہے۔

حکیم سنائی کا حدیقہ، نظامی کا ہفت پیکر اور امیر خسرو کی ہشت بہشت اسی بحر میں ہیں۔ مثلاً:-

داشت در دِہ مقام، بیوہ زنے — تازہ رو سے و نازنیں بد نے
بود در کنج خانہ مالا مال — یلدرخم روغنش چو آب زلال

اس بحر میں اُردو کی متعدد مثنویاں نظر آتی ہیں۔ میر تقی میر کی دریائے عشق، میر اثر کی خواب و خیال، مصحفی کی بحر المحبت، سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی ریختی، آفتاب الدولہ قلق کی طلسم الفت، مرزا شوق کی بہار عشق و زہر عشق، اور منیر کی مثنوی حجاب زناں اسی بحر میں ہیں۔

دریائے عشق:- عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
خواب و خیال:- ہجر میں جی سے میرے پاس کہاں — وصل میں کر دیا ہوا سی کہاں
مثنوی ریختی:- یہ جو ملنے میں اس سے شرماتی — وہ اسے چھیڑ چھیڑ کر ماتی
طلسم الفت:- ایسی وہ کونسی ہے مہ پارہ — جس کی الفت میں تم ہو آوارہ
بہار عشق:- حسن یوسف تھا اس کے آگے ماند — چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
زہر عشق:- جس محلہ میں تھا ہمارا گھر — وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
حجاب زناں:- دونوں تلوؤں میں پڑ گئے چھالے — کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے

٦- (مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن) یہ مزاحفات بحر ہزج محذوف مسدس سے ہے۔ امیر خسرو کی عشقیہ، جامی کی یوسف زلیخا، ساوجی کی جمشید و خورشید اور مثنوی ملا غنیمت اسی بحر میں ہیں مثلاً:-

مبارک روزے از فرخ روزگاراں — نشستہ بود شیریں با بہ یاراں
یکے عیش گذشتہ یاد می کرد — بداں تاریخ دل را شاد می کرد

اُردو میں عارف الدین عاجز کی مثنوی لال و گوہر، نواب محبت خاں کی مثنوی اسرار محبت، نواب اعظم الدولہ سرور دہلوی کی سات مثنویاں سبعۂ سیارہ اور منشی امیر اللہ تسلیم کی مثنوی نالۂ تسلیم اسی بحر میں ہیں۔

لال و گوہر:- الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
اسرار محبت:- محبت نام ہے اور دل نگیں ہے — محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
نالۂ تسلیم:- پریشانی اثر ہے شادمانی — اجل تعبیر ہے خواب جوانی

٧- (فاعلاتن، فعلاتن، فعلن) یہ مزاحفات رمل مخبون سالم مسدس سے ہے۔ اس بحر میں بہت کم مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ جامی کی سبحۃ الابرار اسی بحر میں ہے مثلاً:-

محتشم زادۂ از نخوت جاہ — می خرامید ظریفانہ براہ
بہ تکبر قدمے بر می داشت — بہ تحیر علمی می افراشت

اس بحر میں بھی اُردو کی کوئی مشہور مثنوی موجود نہیں۔

ہر ہٹلر، مسولینی اور اسٹالین کے ذرائع آمدنی

(جناب محمد ذکی صاحب۔ بنارس)

براہ کرم مطلع فرمایئے کہ موجودہ مشہور ڈکٹیٹروں کی آمدنی کیا ہے اور کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر حکومت سے ان کی تنخواہ مقرر ہے تو کتنی۔

(نگار) اس وقت کے ڈکٹیٹروں میں آمدنی کے لحاظ سے ہٹلر سب سے زیادہ دولت مند اور اسٹالین سب سے زیادہ غریب ہے۔

جرمن حکومت کے قانون کے مطابق وہاں کا چانسلر (یا وزیر اعظم) چالیس ہزار پونڈ سالانہ معاوضہ پا سکتا ہے لیکن جس وقت ہٹلر اس مرتبہ پر پہونچا تو اس نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو آمدنی کتابوں کے حقوق اشاعت سے مجھے ہوتی ہے، وہی کافی ہے۔

ہٹلر کی مالیات بہت کچھ راز میں ہیں، لیکن یقین ہے کہ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ کا سرچشمہ اسکی کتاب "Mein Kamf" ہے جس کی اشاعت سے اس کو دس لاکھ پونڈ سے زیادہ مل چکا ہے۔

کسی خط کا جواب نہ دیا جائے گا
اگر جواب کے لئے ٹکٹ موصول نہ ہوئے۔ اس میں اڈیٹر کے مخصوص احباب شامل نہیں ہیں۔ منیجر نگار

اس کتاب سے جو آمدنی ہٹلر کو ہوتی ہے، وہ دوسرے تجارتی کاموں میں لگا دی جاتی ہے اور اس طرح اسکی آمدنی بہت بڑھ گئی ہے۔ تاریخ میں کوئی ڈکٹیٹر ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس قدر عجیب و غریب طریقہ سے دولت حاصل کی ہو۔ اوروں نے تو صرف قوت سے روپیہ کمایا لیکن اس نے سیاسیات و تجارت کو ملا کر ایک نیا ذریعہ کمائی کا ایجاد کیا۔ مثلاً اس کا حکم ہے کہ اس کتاب کی کوئی سکنڈ ہینڈ کاپی فروخت نہیں ہو سکتی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ یہودی سمجھا جائے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ شادی کے وقت ہر جوڑے کو یہ کتاب تحفہ میں دی جائے اور چونکہ یہ تحفہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے اس لئے حکومت کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

ان طریقوں سے جن میں سیاست، پروپیگنڈا اور تجارت سب باتیں ملی جلی ہیں، ہٹلر نے روپیہ کمایا ہے۔ پھر چونکہ اس کی زندگی کی تمام ضرورتیں حکومت کی طرف سے پوری کی جاتی ہیں، اس لئے اس کی ذاتی آمدنی بالکل محفوظ

ہے اور رات دن اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسولینی کی تنخواہ پندرہ سو پونڈ سالانہ ہے، لیکن ہٹلر کی طرح وہ بھی صحافت سے بہت کچھ کما لیتا ہے۔ وہ ایک اخبار کا مالک ہے اور چونکہ ہر شخص اس کو پڑھتا ہے اس لئے اس کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ ہٹلر کی طرح اسکے بھی تمام مصارف حکومت کی طرف سے ادا کئے جاتے ہیں اور اس لئے اس کی مالی حالت بھی نہایت اچھی ہے۔

اسوقت تک کسی کو یقینی طور پر نہیں معلوم کہ مسولینی کی یہ دولت کہاں جاتی ہے، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اسکا بہت سارا روپیہ کاروبار میں لگا ہوا ہے اور اگر کبھی اس پر زوال آیا تو وہ فقیرانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ ہوگا۔

سب سے زیادہ غریب ڈکٹیٹر اسٹالین ہے، جس کو صرف ۸۰ پونڈ یا ایک روایت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ پونڈ سالانہ ملتا ہے۔ یہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے اس قدر سادگی پسند انسان ہے کہ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی پائپ کے لئے تمباکو کی ضرورت ہو، وہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ حکومت اس کے مصارف بھی ادا کرتی ہے جو بہت کم ہیں۔ اس کی تصانیف بھی لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں ان کا نفع حکومت کو چلا جاتا ہے۔

جنوری سنہ ۴۰ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے وہ اہل قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے — حسب ذیل حضرات لکھ رہے ہیں، لیکن نہ کوئی عنوان کسی کے لئے مقرر ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک عنوان پر ایک ہی صاحب کا مقالہ ہو۔

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔ اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد علوی بی۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔ احمد اکبر آبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبر آبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	جناب مولانا عبد الباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی اور نظریۂ اخلاق	=	جناب مخمور اکبر آبادی بی۔ اے
نظیر کی خصوصیات لسانی		جناب مولانا سیماب اکبر آبادی

(نوٹ) نظیر نمبر کی کتابت ماہ آیندہ شروع ہو جائے گی اس لئے براہ کرم جلد توجہ فرمایئے اور اپنا مقالہ بھیجکر ہم کو موقعہ دیجئے کہ اس کے لئے موزوں جگہ نکالی جاسکے۔

نیاز

فرانس اور جرمنی کے خطوطِ مدافعت

جب سے جرمنی اور پولینڈ کی لڑائی شروع ہوئی ہے، مغربی محاذ کے سلسلہ میں خطِ میگنو (Maginot) اور خطِ سیگفرِیڈ (Siegfried) کا تقریباً روز ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ دونوں خط کیا ہیں اس کا علم کم حضرات کو ہوگا۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد فرانس نے جرمنی کا حملہ روکنے کے لئے اپنی سرحد پر ایک سلسلہ زمین دوز قلعوں کا اس قدر مستحکم طیار کر لیا ہے کہ اس طرف سے دشمن کا عبور کرنا محال مانا جاتا ہے اور اسی خطِ مدافعت کا نام خطِ میگنو ہے اس خط کے استحکام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرانس کو اس کی طیاری میں ۶ کرور پونڈ صرف کرنے پڑے۔

اس خط کے قیام سے فرانس کو یہ اطمینان ہو گیا کہ جب تک جرمنی، بلجیم کے اندر سے نہ گزرے فرانس پر حملہ نہیں کر سکتا اور اس طرح جرمنی کا پوزیشن مغربی سرحد کی طرف بہت ضعیف ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر کسی وقت پولینڈ یا روس کی طرف اس نے فوجکشی کی تو فرانس فوراً خطِ میگنو کی طرف سے اس کے ملک میں داخل ہو جائے گا اور اس طرح اس کو دو محاذ پر جنگ کرنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا توڑ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ بھی اپنے مغربی محاذ کو فرانس کے لئے ناقابلِ عبور بنا دے، چنانچہ جون ۱۹۳۸ء کا ایک دن تھا کہ خطِ میگنو کے قریب فرانسیسی آبادی نے دیکھا کہ جرمن فوج کی ایک بٹالین اونچی باڑھ قایم کرنے میں مصروف ہے اور یہ کام نہایت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تمام مغربی حکومتوں نے کان کھڑے کئے، اِدھر سے اُدھر تار دوڑنے لگے اور آخر کار معلوم ہوا کہ پورے ۲۵۰ میل کی سرحد پر یہ کام جاری ہے، یہاں تک کہ چند دنوں میں فرانس و جرمنی کے درمیان ایک مضبوط دیوار حایل ہو گئی اور کسی کو کچھ پتہ نہ چلا کہ اس دیوار کے اُس طرف کیا ہو رہا ہے، لیکن اندازاً یہ سب نے سمجھ لیا کہ خطِ میگنو کا جواب طیار ہو رہا ہے اور اس قدر تیزی کے ساتھ کہ کام کی رفتار کا اندازہ مشکل ہے۔ چنانچہ چھ ہفتوں کے اندر پوری دس لاکھ کی سولین آبادی دس گھنٹے روزانہ کام کرنے لگی، یہانتک کہ بہت تھوڑے زمانہ میں وہ چیز طیار ہو گئی جس کو "ناقابلِ تسخیر" کہا جاتا ہے اور ہر ہٹلر نے پہونچکر اس کے وجود کو محقق کر دیا۔ اسی کا نام سیگفریڈ ہے۔

اس خطِ مدافعت کے اندرونی حالات معلوم کرنے کے لئے تمام ممالک، خصوصیت کے ساتھ فرانس اور انگلستان بہت بے چین ہو گئے اور جاسوسی شروع ہو گئی۔ چنانچہ بہت سے جاسوس مارے بھی گئے، لیکن جزئیات کا علم کسی کو

حاصل نہ ہوا اور جرمنی کی ان دفاعی طیاریوں کا حال بدستور راز بنا رہا -

چونکہ جرمنی نے طے کرلیا تھا کہ ان قلعہ بندیوں کے حالات کو حد درجہ پوشیدہ رکھا جائے اس لئے پوری احتیاط کی گئی اور سوائے مخصوص معتمد ماہرینِ فن کے کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ اس خطِ مدافعت کے خاص خاص حصوں تک پہونچ سکے اور یکبار اتفاق سے ان قلعہ بندیوں کا کوئی راز ظاہر ہوگیا تو نگرانی کرنے والا اسٹاف تہ تیغ کر دیا گیا -

بتایا جاتا ہے کہ یہ قلعہ بندیاں مشتمل ہیں دو ہزار چھوٹے چھوٹے آہنی قلعوں پر جن میں سے ہر ایک ۷۰ فٹ قطر کا ہے ان استحکامات کی طیاری میں زمین کی طبعی خصوصیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی اس بات کو اچھی طرح دیکھ لیا گیا ہے کہ کس مقام پر کس قسم کے کتنے قلعے طیار کرنا چاہئے۔ یہ قلعے تین تین کے گروپ میں ایک دوسرے سے ۱۵۰ فٹ کے فاصلہ پر طیار کئے گئے ہیں جو نہایت تیز چلنے والی مشین گنوں اور ٹینک شکن توپوں سے آراستہ ہیں، جو چاروں طرف گھوم سکتی ہیں یہ قلعے لوہے اور کنکریٹ سے اس قدر مضبوط بنائے گئے ہیں کہ ان پر کتنے ہی بم پھینکے جائیں لیکن یہ تباہ نہیں ہو سکتے۔ ان قلعوں کا تعلق ایک دوسرے سے زمین دوز سرنگوں کے ذریعہ سے ہے جو ۲۵۰ میل (بلجیم کی سرحد تک) پھیلی ہوئی ہیں یہ سرنگیں خود اس قدر مضبوط بنائی گئی ہیں کہ انھیں ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا ہے - ان زمین دوز قلعوں کے لئے جتنی فوج یہاں محفوظ ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ زمین کے اندر پورا ایک شہر آباد ہوگیا ہے، جہاں بجلی گھر اور پانی کا پمپ بھی ہے، یہاں ہوٹل بھی ہیں اور تفریحی مشاغل بھی - میگزین ہر میل پر بنائے گئے ہیں جو ذخایرِ حرب سے معمور ہیں اور کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹاک بھی اتنی مقدار میں ہے کہ یہاں کی فوج کو عرصہ تک بیرونی رسد رسانی کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ سپاہیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے بجلی سے چلنے والی گاڑیاں بھی وہاں ہیں جن کو زمیں دوز ریل کہنا غلط نہ ہوگا - آپ یہاں پہونچ جائیں تو سوائے اس کے کہ جا بجا بیضوی شکل کے چھوٹے چھوٹے گنبد ابھرے ہوئے نظر آئیں اور کچھ نہ دکھائی دے گا۔ ہر طرف سے جھاڑیاں اور جنگل درخت گھیرے ہوئے ہیں اور یہ قلعے ایسا معلوم ہوتے ہیں جیسے بڑے بڑے کُرمتے کے پیڑ اُگے ہوئے ہیں -

کہا جاتا ہے کہ یہ استحکامات اتنے زبردست ہیں کہ ٹینک اس طرف سے گزر ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ ہوائی جہازوں پر رکھ کر انھیں نہ لیجایا جائے اور یہ محال ہے — پھر یہ دفاعی سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اسی کے ساتھ پانچ مقامات پر زمیں دوز اسٹیشن ہوائی جہازوں کے بنائے گئے ہیں، جہاں ہر وقت دو ہزار جہاز طیار رہتے ہیں۔ پٹرول کا ذخیرہ بھی یہیں محفوظ رہتا ہے

الغرض فرانس اور جرمنی کے دونوں خطوطِ مدافعت ناقابلِ تسخیر ہیں اور ان سے دونوں ملکوں کو جو فائدہ پہونچ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ فرانس اس طرف جرمنی کے حملہ سے مطمئن ہوکر اطالوی اور ہسپانوی سرحدوں کی طرف اپنی فوج بکثرت روانہ کرسکتا ہے اور جرمنی فرانس کے حملہ سے مطمئن ہوکر پولینڈ اور مشرقی یوروپ کی طرف بآسانی فوجکشی کرسکتا ہے — چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جرمنی نے جب پولینڈ پر حملہ کیا تو فرانس کی سرحد کی طرف سے بالکل مطمئن ہونے کی وجہ سے اپنی فوج کا بڑا حصہ اس طرف روانہ کردیا اور فرانس اس وقت تک جرمن حدود کے اندر داخل نہ ہوسکا — اس میں شک نہیں کہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ

سے ضرور دونوں ملک ایک دوسرے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ لیکن قبضہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب فوج وہاں پہونچ جائے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک فرانس اور جرمنی دونوں بلجیم کے اندر سے ہوکر نہ گزریں۔

الغرض جرمنی اور فرانس کے ان خطوط مدافعت کے ناقابل تسخیر ہونے نے جنگ کی دشواریوں کو بہت بڑھا دیا ہے اور اگر یہ لڑائی ختم نہ ہوئی تو بیچ میں بلجیم کا پس جانا یقینی ہے۔

جنون و حقیقت

ڈاکٹر کرٹ ہیس (Kurt Hesse) برلن یونیورسٹی میں علم جنگ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر ۵۰۰ میل کے محاذ پر جنگ جاری رکھی جائے تو جرمنی کو سالانہ اتنی اشیاء درکار ہوں گی:۔

ایندھن یا کوئلہ	=	۴ کرور ٹن
خام لوہا	=	۸ کرور ۵۰ لاکھ ٹن
تانبہ، سیسہ، جست (ہر ایک)	=	۱۲ لاکھ ٹن

ان کی سالانہ پیداوار جرمنی میں یہ ہے:۔

ایندھن یا کوئلہ	=	۴ لاکھ ٹن
خام لوہا	=	۷۶ لاکھ ٹن
تانبہ	=	۱۲ کرور ۳۰ لاکھ ٹن
سیسہ	=	ایک لاکھ ۳۵ ہزار ٹن
جست	=	ایک لاکھ ۴۴ ہزار ٹن

لیکن برطانیہ و فرانس دونوں ملکر جنگ کے لئے اتنے طیار نہیں ہیں، جتنا جرمنی۔ ہرچند ان ملکوں میں لوہے کی پیداوار بہ نسبت جرمنی کے چھ گنا زاید ہے اور کوئلہ کی دس گنا لیکن تانبہ، سیسہ اور جست کی پیداوار میں اتحادئین بہت پیچھے ہیں۔

امریکہ سے اتحادئین کو جو مدد مل سکتی ہے اس کی فہرست یہ ہے:۔

لوہا	=	۵ کرور ٹن
کوئلہ	=	۴ کرور ٹن
تانبہ	=	۲ لاکھ ۸۷ ہزار ٹن
سیسہ	=	۲ لاکھ ۲۲ ہزار ٹن ـــ جست = ۴ لاکھ ۷۶ ہزار ٹن

لیکن یہ سب اس وقت ہے جب جرمنی کی آبدوز کشتیاں اس مال کو ساحل برطانیہ و فرانس تک پہونچنے دیں۔

طرزِ "نیاز"

ہر لفظ کے دامن سے ہے دریا کی روانی　　　اعجاز بیانی ہے کہ اعجازِ معانی
ہر نثر کے انداز میں ہے نظم کی تاثیر　　　آوازِ دلی ہو گئی اسرارِ زبانی
بے ساختہ ترکیب کہ میخانہ ہے بردوش　　　آمد ہے وہ دلخواہ کہ آغازِ جوانی
جب طرز نئی اس کی طبیعت نے نکالی　　　تجدید وہ اول ہے کہ جس کا نہیں ثانی
ہر حرف وہ موتی کہ پرویا ہے لڑی میں　　　اس عہد میں ہے نثر میں وہ نظم کا بانی
تاثیر نے کہنے کا نیا ڈھنگ نکالا　　　ہر بات میں وہ درد کہ ہو دل کی نشانی
تاثیر میں جو کیف ہے وہ کیف ہو دل میں　　　کہنے کی کہانی ہے کہ سننے کی کہانی
اوروں کو اندازِ نیاز آ نہیں سکتا　　　وہ جس کے کہ ہر حرف میں ہو سحر فشانی
خامے کی روانی ہے کہ بے ساختہ تقریر　　　تقریر کے ہر لفظ میں تسخیرِ معانی
کہنا تو بہت کچھ ہے مگر کہہ نہیں سکتا　　　جو چوٹ مرے دل پہ ہے کہنا ہو زبانی

میں کیا کہوں؟ کیفی! کہ پشیمانِ بیاں ہوں
یہ ہیچ نگاری مری یہ ہیچ بیانی

(مولانا) کیفی چریاکوٹی

وداعِ دوست

وداعِ دوست آساں مرگِ مشکل ‏‏— مگر ہر سانس کی سولی پہ ہے دل
ہوئی ہے موجِ دریا کی روانہ ‏‏— پٹکتا رہ گیا سر اپنا ساحل
غبارِ خاکِ مجنوں بھی تو آئے ‏‏— ٹھہر او سارباں! ہاں روک محمل
چمن سے ٹوٹ کر زیبِ گلو ہے ‏‏— سنے گل کس طرح شورِ عنادل
جدائی اور پھر شامِ جدائی ‏‏— دہائی ہے تری اے ماہِ کامل
ارے او دو رہی راہِ نظارہ ‏‏— نگاہوں کو بھی ہو جانے دے شامل
مدد ہاں المدد اے تابِ دیدار ‏‏— چلا آیا تڑپ کر آنکھ میں دل،
مبارکباد مرگِ منتظر کو ‏‏— نہیں ہے زندگی جینے کی قابل
اندھیری شب ہے پروانے کدھر جائیں ‏‏— اُٹھا لی کس نے آ کر شمعِ محفل
سمجھ میں اپنی کیفیؔ! آ رہا ہے، ‏‏— یہی ہے مرگِ مہجوری کا حاصل

تن از ہمراہئ او ماند محروم،
مگر جاں می رود منزل بہ منزل

(مولانا) کیفیؔ چریاکوٹی

آتش نوا مغنیہ

دل کے اُفق سے عشق کا مہر ابھر رہا ہے آج ‏‏— تاروں کی سرد چھاؤں میں مجھ سے نظر ملائے جا
ہلکی سی چاندنی میں تو نغموں کی تیز لَو کے آگ ‏‏— دل کے شکستہ ساز کے تاروں کو تھرتھرائے جا
مست ہوا میں سیکڑوں طور جھلک رہے ہیں آج ‏‏— کھلتے ہیں جیسے گل، یونہی اپنی نظر اُٹھائے جا
شدتِ غم سے آئینہ دل کا کہیں نہ ٹوٹ جائے ‏‏— سینے میں گھٹ رہا ہے دم آج تو مسکرائے جا

شرف احمد خاں سروشؔ ملیح آبادی

بارگاہِ انساں

جبریل آکہ سوزِ نہاں تجھ کو سونپ دوں
اک تازہ برق ریز سی جاں تجھ کو سونپ دوں

کر دوں ترے دماغ میں بیدار ایک آنچ
اندیشہ ہائے سود و زیاں تجھ کو سونپ دوں

کیا کیا عجیب فکر د تخیل کر دوں عطا
کیا کیا حسین وہم و گماں تجھ کو سونپ دوں

عشق اور اُسکی لذتِ جاں بخش و دلنواز
عقل اور اُسکی آہ و فغاں تجھ کو سونپ دوں

تیرے جسد میں روح تو ہے اس میں شک نہیں،
پھر آکہ روحِ شعلہ فشاں تجھ کو سونپ دوں

آزادیٔ ضمیر کا پڑھ کر فسونِ خاص
خودداریوں کی روحِ رواں تجھکو سونپ دوں

سینے سے تیرے سرد و خنک دل نکال کر
اک گرمی و تپش کا جہاں تجھ کو سونپ دوں

جو مرتبہ خودی میں ہے سجدہ میں وہ کہاں،
اپنی نگاہ، اپنی زباں تجھ کو سونپ دوں

خلاق کے جگر کو بھی بھر دے جو سوز سے
وہ جاں گداز طرزِ اذاں تجھ کو سونپ دوں،

یزداں کے میکدے میں بھی گو مے تو کم نہیں
صرف ایک یہ کمی ہے کہ صہبائے غم نہیں

عدمؔ

انتساب

الغرض زخمِ نہاں مجھکو دکھانا ہی پڑا
دل کی باتوں کو ترے سامنے لانا ہی پڑا

میں کہ خلوت میں بھی ڈرتا تھا سناتے اس کو
سرِ بازار وہی گیت سنانا ہی پڑا

کھینچ لایا تجھے پردے سے میرا ذوقِ نیاز
میرے پردے میں تجھے جلوہ دکھانا ہی پڑا

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے
تیرے رخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

کیا ہوگا؟

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تیری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا

جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ اُلفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

نئی دہلی (؟) احسن (متھراوی) (؟)

سرگوشیاں

منزل :- شبِ تیرہ بساتی آرہی تھی نیند کی بستی　　کہ آنکھیں مل کے جاگ اٹھی جہانِ عشق کی مستی
تڑپتی تھی نگاہوں میں دلِ بیدار کی ہستی　　مگر امید یہ کہہ کر کبھی روتی کبھی ہنستی
ترے دل کی تڑپ ہوگی تری منزل تو کیا ہوگا؟

دل :- نفس اور فکر کا کندھے سے کندھا چھلتا جاتا تھا　　کنول مایوسیوں کی سطح پر اک کھلتا جاتا تھا
حوادث کے تھپیڑوں سے گلے بھی ملتا جاتا تھا　　صبائے عزم کے جھونکوں میں بھی کچھ ہلتا جاتا تھا
کنول اس شان کا بن جائیگا یہ دل تو کیا ہوگا؟

قلندر :- کہیں شب کو برقی قمقمے یوں جگمگاتے ہیں　　کسوٹی پر خطوطِ سیم جیسے مسکراتے ہیں
ادھر ہم عید اپنی تیرہ بختی کی مناتے ہیں　　اُدھر در پر قلندر یہ صدا آکر لگاتے ہیں
ارے آسان ہو جائے گی یہ مشکل تو کیا ہوگا؟

عرشؔ تیموری

کلیسائے عقیدت

مخزنِ بیچارگی، یہ مسجد و دیر و کنشت
تیرہ بختی کا مقدر، قسمت حرماں سرشت
ناحقیقت آشنا کا معبدِ حزن و محن،
سجدۂ اخلاص کی توقیر و عظمت کا کفن،
سادہ لوحوں کے لئے تعبیرِ خوابِ نیک و زشت
آستانِ بیخودی، بازیچۂ طفلِ بہشت
ناخدائے یاس و حسرت، مفلسی کی بارگاہ
بیکسی کی سب دعاؤں کو نفسی بے پناہ
اے کلیسائے عقیدت، اے حریفِ عقل و ہوش
درد مندی پر ہے تیری حیلہ سازی بار دوش
مضمحل دل پر چلائے تو نے سب تیر و تفنگ
بیرخی کے تازیانے، مفلسی، آزارِ ننگ
حیرتی ہوں پھر ترے در کی جبیں سائی ہے کیا
خستہ حالی میں یہ زُنّارِ شکیبائی ہے کیا،
خود فراموشی کا عالم اس سے بڑھکر کچھ نہیں،
تیری ٹھوکر پر جھکی ہے فہمِ بالغ کی جبیں،
عقلِ انساں پر گرائی تو نے وہ وہ بجلیاں،
اوجِ ہستی کا نہیں ملتا ہے آج اسکو نشاں
تو عروسِ خرّمی کا مدفنِ بوسیدہ ہے
فکرِ معصومی پہ ضربِ ہیکلِ پوشیدہ ہے

فدائی محسنی - ایم - اے

ترقی کا راز

تگ و دو خوب کی انساں نے ارضی تماہو نہیں　　ستارے اب کھٹکتے ہیں ترقی کی نگاہوں میں
جگہ کافی نہیں حرص و ہوس کا پیٹ بھرنے کو　　ابھی اک اور دنیا چاہیئے برباد کرنے کو
کوئی مشکل نہیں مشکل کہ سودا بھی ہے سر بھی ہے　　نگاہ دوربیں مریخ پر بھی چاند پر بھی ہے،
ہمارا ذوقِ استبداد آخر رائگاں کیوں ہو　　زمینِ ماہ پر فطرت ہی تنہا حکمراں کیوں ہو
نئی سائنس کی ایجاد لے جانا ضروری ہے　　وہاں بھی یہ شعاعِ مرگ پہونچانا ضروری ہے
یہ نہیں غرقِ سکوں قدرت کے شہپارے نہ رہ جائیں　　فسادِ ارض سے محروم سیارے نہ رہ جائیں،
مخل ہو درد کی آواز بھی اور خون کی بو بھی،　　فضا کے مضطرب کرنے کو آہیں بھی ہوں آنسو بھی
مرتب کشمکش افلاس کی سرمایہ داری کی　　مسلسل علم کی بڑھتی ہوئی ضو اور تاریکی
دماغِ ملک گیری اور مزاج کار فرمائی　　جنوں نیرو کا اور چنگیز خانی وحشت آرائی
تعین پر خدا کے نامناسب ناروا جھگڑے　　خدا کے نام سے مذہب پہ بے حکمِ خدا جھگڑے

فرازِ دہر کے تیور سے کیوں عیشِ سکوں ٹپکے
زمیں پر چرخ کی پرنور قندیلوں سے خوں ٹپکے

نجم آفندی

عصیمہ سے!

دماغ و دل سے، وہ ہوتی ہے گفتگو کہ نہ پوچھ　　تری نظر کی، وہ ہوتی ہے جستجو کہ نہ پوچھ
ترے تخیلِ رنگیں کے ساتھ آتا ہے،　　ہجومِ شوق و تمنائے آرزو کہ نہ پوچھ،

کبھی خیال کہ تو ہی فضا پہ چھائی ہے　　مری نظر میں، تجلی تری سمائی ہے
وہ برق ریزئ جلوہ، ارے معاذاللہ!　　حواس و ہوش کی دنیا بھی تھرتھرائی ہے!

کبھی خیال کہ بے مہر و بے وفا تو ہے　　ستم طراز، جفا ریز و کج ادا تو ہے
وہ دل کہ جس میں نہیں رحم، ترے پہلو میں!　　کمالِ شعبدہ سازی کی انتہا تو ہے

عصیمہ! ہائے عصیمہ! وہ دن بھی آئے گا　　زمانہ ڈھونڈھیگا، لیکن سمجھے نہ پائے گا!
نہ کھیل، گریۂ خونیں سے کھیلنے والی!　　تجھے یہ قصۂ غم، کون پھر سنائیگا؟

فضل اللہ بسمل

التجائے خام

برسات کی سہانی بھیگی ہوئی فضائیں ایسے میں مل کے ہم تم پھر آؤ گیت گائیں
مستی بھری نظر سے نغمات کے اثر سے کچھ تم ہمیں پلاؤ کچھ ہم تمھیں پلائیں
دنیا کوئی نتیجہ آخر نکال لیگی، ہم ماسوا کو آؤ بالکل ہی بھول جائیں،
تم قشقۂ جبیں سے ہم آہ آتشیں سے مل جل کے آج آؤ کونین کو جلائیں
آنکھیں تمھاری مندر، پہلو مرا شوالہ کچھ پھول تم چڑھاؤ کچھ پھول ہم چڑھائیں
پہلو میں ہم چھپائے 'رازِ حیات' اپنا اس پاپ کے نگر سے کچھ دور بھاگ جائیں
نظریں ذرا جھکا لو، قشقہ ذرا چھپا لو یہ آسمان والے گھبرا کے مر نہ جائیں
موسم نے ساز چھیڑا بادل سے راگ برسے تم حکم دو تو ہم بھی آنکھوں سے کچھ سنائیں
کیا فایدہ کہ دنیا دشمن بنے ہماری تم ہم کو بھول جاؤ ہم تم کو بھول جائیں

تنہا ہو عکدہ میں پانی برس رہا ہے
پھر کس سے ہو رہی ہیں مہجور التجائیں

مہجور شہسرامی

غزل

ہے آرزو یہی کہ اُٹھاؤں نہ سر کو میں کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے سنگِ در کو میں،
پیشِ نظر ہے عشق و محبت کا احترام، برباد کر رہا ہوں فغاں کے اثر کو میں
وہ بھی گئے، بہار گئی، زندگی گئی، اب خود ہی کیوں اُجاڑ نہ دوں اپنے گھر کو میں
دل کیا دیا تمھیں، مری دُنیا اُجڑ گئی تسکینِ زندگی سے گیا عمر بھر کو میں
آنکھوں میں اشک آہی گئے باوجود ضبط مخفی کسی سے رکھ نہ سکا چشمِ تر کو میں
ہیں راہِ حسن و عشق میں کیا کیا صعوبتیں، آگاہ کر رہا ہوں دلِ بے خبر کو میں
آاے جمالِ دوست مری رہنمائی کر ترتیب دے رہا ہوں پیامِ نظر کو میں
اللہ رے مآلِ محبت کی تلخیاں روتا ہے دل مجھے، دلِ شوریدہ سر کو میں

یہ کیا خبر تھی زندگی ہو جائے گی محال
آساں سمجھ رہا تھا مذاقِ نظر کو میں

نبی احمد بریلوی

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافہ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۶ — فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۹ء — شمار ۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	نومبر ۳۹ء	جلد ۳۶

ملاحظات

ارباب جامعہ ملیہ توجہ فرمائیں

ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں صرف ایک جامعۂ ملیہ ہی ایسا ادارہ ہے جس کا ایک بہترین تربیت گاہ ہونے کی حیثیت سے میں بڑا احترام کرتا ہوں اور جس کی ترقیوں کا حال سن سنکر میں ہمیشہ خوش ہوتا ہوں، اس لئے اگر اتفاق سے کبھی کوئی ایسی بات میرے علم میں آئے، جو جامعۂ ملیہ کی روایات اور میری توقعات کے خلاف ہو، تو قدرتاً مجھے تکلیف بھی اتنی ہی ہونا چاہئے

لازم ست احتمال چندیں درد
کہ محبت ہزار چندیں ست

میرے دل میں جامعۂ ملیہ کی عزت کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ میرے نزدیک وہاں طلبہ کی ذہنیتوں کو قدامت پرستانہ جبرواکراہ سے تباہ نہیں کیا جاتا اور آزادی سے سوچنے کا موقعہ دیا جاتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ وہاں کے اساتذہ کو میں صحیح معنے میں فرض شناس سمجھتا ہوں اور کبھی ان کی طرف سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ

وہ ذاتی خودغرضی پر قومی مفاد کو قربان کرسکتے ہیں۔ اس لئے میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب وہاں کے ٹریننگ کالج کے ایک طالب علم کی ایک تحریر ان دونوں باتوں کی تردید میں میری نگاہ سے گزری۔ وہ تحریر یہ ہے :-

"میں یہاں رہ کر جامعہ کی زندگی سے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔ یہ امر واقعی قابلِ افسوس ہے کہ یہاں بھی قومی خدمت کے بہانے سے کچھ انتہا درجے کے خودغرض اور ناکارہ لوگ جمع ہوگئے ہیں، بچوں میں ایک قسم کی (Narrow Nationalism) پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر مذہب وغیرہ کے متعلق بھی انھیں وہ تعلیم نہیں دی جاتی جو بیسویں صدی کے بچوں کو ملنی چاہئے۔ رمضان شروع ہونے سے پہلے نہ معلوم کس شخص نے بچوں کو روزہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ خدا ان ایام میں ساتویں آسمان سے اتر کر پہلے آسمان پر آجاتا ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ انھیں بچوں کو میں دو چار دن قبل آسمان وغیرہ کی حقیقت سے باخبر کرچکا تھا۔ چنانچہ بچوں کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوگئی اور جب ایک بچہ سے نہ رہا گیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ڈائننگ ہال میں ایسے وقت جب ہم دونوں اکیلے تھے یہ سوال کیا کہ آسمان کے متعلق یہ صحیح تھا یا وہ مولانا کچھ ڈرا ہوا تھا، ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو مجھے پس و پیش ہوا لیکن پھر میں نے حقیقت اور زیادہ صاف کردی۔ ان معاملات میں یہاں میرا کیا فرض ہے، بتائیے؟

ٹریننگ کالج کے استاد حد درجہ بیکار لوگ ہیں۔ ذرا محنت نہیں کرتے۔ لائبریری میں کتابیں موجود ہیں لیکن سبق دینے سے پہلے انھیں دیکھ کر آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کا ہر سبق ایک تماشا ہوتا ہے۔ سبق کا تتمہ رہنا تو کیا سبق کے دوران میں عدم واقفیت کے باعث اس قدر سخت غلطیاں کرجاتے ہیں کہ مجھے تو شرم آنے لگتی ہے۔ میرے ایک استاد پورے سولہ دن تک یہی پڑھاتے رہے کہ "تعلیم کا مقصد ... ... عادت پیدا کرنا ہے"۔ دوسرے صاحب کھیل کے سلسلے میں ایک دن (Schiller Spencer) کا نظریہ پڑھا گئے۔ میں نے محض شرارتاً ان سے پوچھا "شلر اسپنسر" کون تھا؟ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی کی طرف کا تھا؟ اس پر میں نے ان سے پھر پوچھا کہ "کیا شلر اسپنسر" ایک نام ہے؟" اس کے جواب میں وہ "ہاں" کہہ گئے۔ میں نے "شلر اسپنسر" کے متعلق پوچھا کہ وہ کس صدی میں تھا۔ استاد نے فرمایا "یہاں تاریخ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ جگہ میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہے۔ روز یہ حساب لگایا کرتا ہوں کہ اتنے دن ان لوگوں کی شاگردی میں اور کاٹنے ہیں۔

مجھے اس تحریر کی صداقت میں مطلق شبہ نہیں کیونکہ اس کے لکھنے والے سے میں اچھی طرح واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ جامعۂ ملیہ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اس لئے اب صرف یہ سوال سامنے رہ جاتا ہے کہ جامعۂ ملیہ کی

روایات کے خلاف کیوں اس قسم کی فرسودہ روایات سنا کر بچوں کے دماغ کو تاریک بنایا جاتا ہے اور کیوں ایسے اساتذہ رکھے جاتے ہیں جو جامعہ ملیہ کی خصوصیات کو قایم نہیں رکھ سکتے۔ یقیناً وہاں کا تمام اسٹاف ایسا نہیں ہو سکتا لیکن اگر دو چار اساتذہ بھی اس قسم کے پائے جاتے ہیں تو جامعہ ملیہ کو بدنام کرنے کے لئے کافی ہیں اور انھیں فوراً علحدہ کر دینا چاہئے۔

مغرب و مشرق کے دو نہایت اہم واقعات

اکتوبر کا مہینہ روئے زمین کے لئے بہت ہلچل کا زمانہ ثابت ہوا، اُس طرف مغرب میں ترکی و برطانیہ کے اتحاد نے جنگ کا نقشہ بدل دیا اور اِس طرف وسیرائے کے اعلان کے جواب میں کانگریسی صوبوں کی وزارتوں نے استعفے کا اعلان کر کے ہندوستان میں سخت بے چینی پیدا کر دی اور اگر ان دونوں باتوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلان وسیرائے کے بے نیازانہ انداز کا سبب غالباً یہی تھا کہ برطانوی حکومت جمہوریت ترکیہ کی حمایت حاصل ہو جانے کی وجہ سے جنگ کے نتیجہ کی طرف سے بہت مطمئن ہو گیا ہے۔

برطانیہ کی شرکت اس جنگ میں بظاہر بہت عجیب بات نظر آتی ہے، کیونکہ نہ اس کے ملک کے کسی حصہ پر جرمنی نے حملہ کیا ہے اور نہ وہ پولینڈ کی حمایت کر کے اپنے مقبوضات میں کوئی اضافہ کر سکے گا لیکن دنیا میں بہت سی لڑائیاں پیش بندی کے لئے بھی لڑی جاتی ہیں اور برطانیہ کی یہ جنگ اسی قسم کی جنگ ہے۔

برطانوی حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ صرف جمہوریت کی بقا، اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے تحفظ کے لئے جنگ کر رہی ہے، غلط نہیں، لیکن یہ کہنا کہ اس کی غایت صرف اسی قدر ہے اور اس میں کوئی خود غرضی پنہاں نہیں، ناقابل قبول ہے۔

برطانوی حکومت کی پالیسی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے تعلق نہ رکھتا ہو کیونکہ ہندوستان ہی تاج برطانیہ کا وہ درخشندہ گوہر ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی جدا کرنے کے لئے طیار نہیں۔

پھر اسوقت برطانیہ کے سامنے نہ سوال پولینڈ کی آزادی کا ہے نہ کسی اور جمہوریت کے بقاو تحفظ کا، بلکہ صرف اس بات کا کہ اگر نازی حکومت کی قوت اسی طرح بڑھتی رہی تو ایک طرف ریاستہائے بلقان اور مشرق ادنیٰ کے ممالک پر اس کا برا اثر پڑے گا اور دوسری طرف بحر روم میں برطانوی اقتدار ضعیف ہو جائے گا اور ان دونوں باتوں سے ہندوستان پر برطانوی گرفت کا کمزور ہو جانا یقینی ہے۔

روس کے حملۂ پولینڈ سے جنگ کی صورت بہت بری ہو گئی تھی اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ غالباً روسی فوج

زی افواج کا ساتھ دیں گی، اسی کے ساتھ ترکی و روس کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی اس کا رجحان بھی برطانوی مفاد کے خلاف نظر آتا تھا اور اگر یہ دونوں اندیشے پورے ہو جاتے تو اس میں شک نہیں کہ برطانیہ و فرانس کے لئے مقابلہ بہت دشوار ہو جاتا اور ویسرائے کے اعلان کے الفاظ بھی کچھ اور ہوتے۔ لیکن اب کہ ترکی نے برطانیہ و فرانس کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے اور روس بھی اس جنگ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ معلوم نہیں ہوتا، برطانیہ کے حوصلے بہت بڑھا دئے ہیں اور ہٹلر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اٹلی پر اگر اسے بھروسہ تھا بھی تو ترکی برطانوی معاہدہ نے اسے بھی ختم کر دیا کیونکہ اب ریاستہائے بلقان سے تعلقات خوشگوار رکھنا اس کے لئے ضروری ہے اور یہ ہٹلر کا ساتھ دینے سے ممکن نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کی طیاریاں بڑے وسیع پیمانے پر جاری ہیں اور یقیناً ایک بار وہ جان پر کھیل کر نہایت سخت حملہ کرے گا، لیکن اس حملہ کی نوعیت کیا ہوگی، اس کا علم کسی کو حاصل نہیں، مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ سیگفرڈ لائن کی طرف وہ برطانوی و فرانسیسی فوج کے بڑے حصہ کو الجھا کر کسی ایسے حصۂ ملک پر زبردست ہوائی حملہ کرے گا جس طرف اس کی طیاریاں بظاہر کم نظر آتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ملکی پیداوار کی کمی اور صنعتی تباہی کی وجہ سے ہٹلر عرصہ تک اس جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا اور چونکہ سوائے روس کے کوئی ملک ایسا نہیں جہاں سے اس کو کھانے پینے کا سامان یا ذخیرۂ حرب پہونچ سکے اس لئے باہر سے بھی کسی مدد کی توقع اس کو نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس صورت میں اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ ایک بار وہ ہتھیلی پر سر رکھ کر قسمت آزمائی کرے، لیکن اس کا نتیجہ بھی اس کے موافق نہیں نکل سکتا۔ ہاں اگر روس نے ترکی و ریاستہائے بلقان پر حملہ کر دیا تو بیشک صورتِ حال بالکل بدل جائے گی۔

خیال تھا کہ موجودہ جنگ کے سلسلہ میں ہندوستان کے مستقبل کا مسئلہ بڑی حد تک طے پا جائیگا لیکن یہ غلط امید نکلا۔ اس کا ایک خارجی سبب تو وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا اور دوسرا داخلی سبب مسلم لیگ کی مخالفت ہے۔ اگر اس وقت مسلم لیگ بھی کانگرس کی ہمنوا ہو کر آزادیِ ملک کا مطالبہ کرتی تو ویسرائے اقلیت و اکثریت کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر ایسا خشک جواب نہ دے سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جس وقت ہندوستان کی تاریخ آزادی مرتب کی جائے گی تو سب سے زیادہ شرمناک واقعہ اس میں یہی درج ہوگا۔ لیکن کانگرس کو بھی ہر الزام سے بری سمجھنا درست نہیں۔ اگر کانگرسی حکومتوں نے سیاست اندیشی سے کام لیا ہوتا تو آج نہ مسلم لیگ کا وجود پایا جاتا اور نہ ہندو مسلم تفریق اس حد تک پہونچتی۔ مسلم لیگ یو۔پی ہی میں زندہ ہوئی اور یہیں مسٹر جناح نے اپنا کھویا ہوا وقار مسلمانوں میں حاصل کیا، بلکہ یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر کانگرس ذرا دانشمندی سے کام لیتی اور وزارت کے بعض افراد مہاسبھائی ذہنیت

سے کام نہ لیتے تو اسوقت ہندوستان میں نصف مسلمان سے زیادہ کانگرس میں شریک نظر آتے اور مسلم لیگ کا وجود کبھی کا محو ہوچکا ہوتا۔

سب سے پہلی غلطی تو پنڈت جواہرلال نہرو نے کی کہ انھوں نے رابطۂ مسلم عوام کی تجویز کو معمولی چیز سمجھ کر پوری قوت سے نہیں چلایا اور انھوں نے خدا جانے کیوں یقین کرلیا کہ مسلمانوں کے ساتھ رابطہ بڑھا کر کانگرس کی طرف دعوت دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اول اول جب یوپی میں کانگرسی وزارت ہوئی تو ہوا کا رُخ یہ تھا کہ عام طور پر تمام مسلمان کانگرس کی طرف جُھک پڑے تھے اور اگر کانگرسی جماعت ذرا رواداری و مسالمت سے کام لیکر اُن سے ربط و اتحاد بڑھانے کا پروپاگنڈا کرتی تو صورتِ حال اس وقت کچھ اور ہوتی، لیکن پنڈت نہرو نے اس مسئلہ کو التوا میں ڈالکر مسلمانوں کے جوش و خروش سے مطلق کوئی فایدہ نہ اُٹھایا۔ اس سے زیادہ کاری ضرب جس نے دونوں جماعتوں کے درمیان سخت افتراق پیدا کردیا، اُردو ہندی کا مسئلہ تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوؤں کو ہندی پرچار کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن وہ برسرِ حکومت ہونے کے بعد اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھنے کے بجائے اُن سے کھیلنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے کانگرسی مسلمان بھی بدظن ہوگئے اور مسلم لیگ کو کانگرس کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا زبردست ذریعہ ہاتھ آگیا۔ بہرحال کانگرس سے غلطیاں ضرور ہوئیں، لیکن یہ غلطیاں ایسی نہ تھیں کہ مسلمان جوشِ انتقام میں ملک کے مفاد کو بھی نظرانداز کردیتے اور ہندوستان کے مسئلۂ آزادی کو بھی پس پشت ڈالدیتے۔

اسوقت مسلمانوں کا پوزیشن یہ ہے کہ اگر وہ اپنی مخالفت سے کانگرس کے مقاصد آزادی کو نقصان پہونچا سکتے ہیں، تو اس کے لئے وہ برطانوی حکومت کی غلامی کو بھی ہمیشہ کے لئے قبول کرلینے کے لئے طیار ہیں اور یہ ذہنیت جیسی تنگ و تاریک ہے محتاج صراحت نہیں۔

ابھی تک تمام کانگرسی وزارتوں نے استعفا نہیں دیا، لیکن بہرحال ان کو اس خدمت سے سبکدوش ہونا پڑیگا اگر برطانوی پالیسی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ کانگرس کا پروگرام کیا ہوگا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سوشلسٹ عنصر کو اس سلسلہ میں زیادہ اُبھرنے کا موقعہ ملیگا اور گاندھی جی کی پیروی کرنے والی جماعت مشکل ہی سے امن و سکون کے ساتھ ستیاگرہ کو جاری رکھ سکے گی۔ اگر ایسا ہوا تو برطانیہ کی بین الاقوامی سیاسیات کو اس سے سخت نقصان پہونچے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس اندیشہ کے خیال سے وِیسرائے کو پھر اکابر ملک سے گفتگو کرنے کی ضرورت لاحق ہو اور وہ کوئی ایسی صورت پیدا کرنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستان میں بے چینی پیدا نہ ہو پائے۔

NATION

سنی شیعہ نزاع

تحریک تبرا کے التوا کو کافی زمانہ ہو چکا ہے اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں کسی نہ کسی حد تک بارآور ثابت ہوں گی۔ لیکن اندرونی حالات کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ جھگڑا جس منزل سے شروع ہوا تھا، ابتک اسی جگہ قائم ہے اور اتنے دنوں کی سعی کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔

مولانا ابوالکلام نے دونوں فریقوں کے نمائندوں سے علیحدہ علیحدہ اور ایک ساتھ دونوں طرح گفتگو کی لیکن کوئی صورت اسوقت تک ایسی پیدا نہیں ہو سکی جو اس نزاع کو تھوڑے ہی دنوں کے لئے ملتوی کر دیتی، ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تو بڑی بات ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مدح صحابہ کا جلوس نکالنا یقیناً سنیوں کے مذہب کا ضروری جزو نہیں ہے اور بصورت متنازع اس کے وجوب کا حیلۂ شرعی اگر کوئی تھا بھی تو لکھنؤ کے اجرا کے بعد اس کو اٹھ جانا چاہیئے تھا۔ اور سنیوں کو اجرا لکھنؤ کے بعد از خود اعلان کر دینا چاہیئے تھا کہ اب وہ حضرات شیعہ کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے جلوس نہ نکالیں گے، لیکن افسوس ہے کہ بعض حضرات کی وجہ سے صلح و آشتی کی یہ فضا یہاں پیدا نہ ہو سکی اور گتھی پر گتھی پڑتی گئی، یہاں تک کہ اب اس کا سلجھانا سخت دشوار ہو گیا۔

لیکن اگر کسی طرح صورت یہ پیدا ہو جائے کہ سنی جلوس نہ نکالنے کا اعلان کر دیں تو پھر میری رائے میں شیعوں کو لکھنؤ کی واپسی پر اصرار نہ کرنا چاہیئے۔

خاکساری فتنہ

مشرقی کی اس تحریک کے متعلق جو خیال میں نے قائم کیا تھا آخر کار وہی صحیح نکلا اور "علامہ" نے حکومت برطانیہ کی امداد کے لئے اپنے خاکساروں کی فوج پیش کر کے یہ راز کھول ہی دیا کہ "خدمتِ انسانیت" کا یہ دعویٰ حقیقتاً صرف "خدمت عیسائیت" کے لئے تھا ــــ دنیا کی کوئی اجتماعی تنظیم ایسی نہیں ہے جسے برا سمجھا جائے، لیکن اس میں برائی پیدا ہوتی ہے، اس مقصد سے جو اس تنظیم کے پیش نظر ہوتا ہے ـ اگر خاکساری تنظیم کا مقصود ملک و قوم کی خدمت ہوتا تو آج سارا ہندوستان اس کے ساتھ ہوتا، لیکن اب کہ اس نے اپنا نصب العین "غلامی" کی حمایت قرار دیا ہے، کوئی غیرتمند انسان اس کا ساتھ نہیں دے سکتا ــــ مذہبی نقطۂ نظر سے مشرقی تحریک جس قدر مضرت رساں ہے، اس کا حال پہلے ہی سب کو معلوم ہو چکا تھا، سیاسی زاویۂ نگاہ سے اس کے نقصانات کا علم اب لوگوں کو ہو گیا ہے، اسلئے

میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ کی عمر اب قریب ختم ہونے کے ہے اور اگر چند سانسیں اس کی ابھی اور باقی ہیں تو ہمارا فرض ہو کہ انھیں بھی جلد ختم کر دیں ـــ لکھنؤ کی مسلم لیگ نے اپنے فرائض میں خاکساری حمایت کو بھی شامل کر لیا ہے اور چند دن قبل تو جوش وخروش کا وہ عالم تھا کہ ہندو مسلم نزاع کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن چونکہ اس کا مقصود صرف کانگرسی حکومت کی مخالفت تھی، اس لئے یہ "لُبغضِ معاویہ" بھی زیادہ دیر پا ثابت ہوتا نظر نہیں آتا۔

مسلم لیگی اخبارات کی تہذیب

جس وقت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کانگرسی وزارتیں استعفا دینے والی ہیں، اسوقت سے مسلم لیگی اخبارات نے جو اندازِ تحریر اختیار کیا ہے وہ اس قدر سخیف و ذلیل ہے کہ شاید ہی کسی قوم کی تاریخِ صحافت میں اتنا پست وادنیٰ درجہ کا لٹریچر پایا جائے۔

یہ بدنصیب خوش ہیں کہ اب پھر برطانیہ کا دفتری اقتدار صوبوں میں قایم ہونے والا ہے اور اپنی اقلیت کی بزدلانہ داستانیں دُہرا دُہرا کر انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں جس انقلاب کا تخم بویا جا چکا ہے، وہ اب کسی طرح فنا نہیں ہو سکتا اور آج نہیں تو کل اس کو ایک تناور درخت بننا ہے۔ ہندوستان کسی مخصوص قوم کا ملک نہیں ہے، لیکن اگر مسلمان اسے صرف ہندوؤں کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ملکی و قومی تحریکاتِ آزادی سے علٰحدہ رکھنا چاہتے ہیں، تو بھی یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ان کے اخبارات ایسی ذہنیت کا ثبوت دیں جو گالی گلوچ کرنے والی ادنیٰ درجہ کی جاہل وکمینہ قوموں میں پائی جاتی ہے۔

کانگرسی حکومتوں کی عارضی علٰحدگی کی امید پر اُن کو عورتوں کے سے طعنے دینا، کانگرسی وزرا، پر بازاری الفاظ میں حملہ کرنا، دامن پھیلا پھیلا کر ان کو عورتوں کے سے کوسنے دینا، ایسا ذلیل اوچھا پن ہو کہ کم از کم مسلمانوں کو تو ضرور اس سے احتراز کرنا چاہئے تھا جن کو " اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما " کی تعلیم دی گئی ہے۔

مہذب قوموں میں مخالفت و دشمنی کا بھی ایک مخصوص اخلاق ہوا کرتا ہے، لیکن مسلم لیگی اخبارات کی طرف سے جو دوستی کے آئین سے بھی واقف نہیں، یہ توقع کرنا کہ وہ دشمنی کی حالت میں سنجیدگی سے کام لیں گے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔

افسوس ہو کہ وہ دنیا کے حالات اور قدرت کے قوانین سے بالکل بے خبر ہیں، ورنہ وہ کبھی اس عارضی وجہ مسرت پر اپنی تنگ نظری کا ثبوت پیش نہ کرتے۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ ہندوؤں ہی کی سعی وکوشش سے یہ دولت اس ملک کو حاصل ہوگی، اسلئے اگر آج وہ کانگرسی صوبوں کی خود مختاری جاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں تو کل انھیں اسپر افسوس بھی کرنا پڑیگا لیکن یہ "کل" اسوقت آئے گا جب مسلمان اپنی تمام توقعات کو کھو چکے ہوں گے اور انکی " اقلیت " کا ڈر انھیں اس قدر بزدل بنا چکا ہوگا کہ ہاتھ پاؤں کی قوت سلب ہو چکی ہوگی، دل و دماغ جواب دے چکے ہوں گے اور ہندو جماعت انکے جسم و روح دونوں پر قابو پا کر ان کے گلے میں رسّی ڈالکر جدھر چاہے گی گھسیٹتی پھرے گی۔

"مسٹر جینا و شرکاؤہ" تو خیر اسوقت زندہ نہ ہوں گے، لیکن ان کی نسل کے افراد ضرور موجود ہوں گے اور وہ دیکھیں گے کہ ان کے آبا واجداد نے جس غدارانہ ذہنیت سے کام لیا تھا، اس کا خمیازہ ان کی اولاد کو کس کس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے۔

تلامذۂ مصحفی

(مسلسل)

"ر"

(۳۶) رافت تخلص میاں رؤف احمد نام، یہ بہت غریب، مسکین، وحشی اور متلون المزاج قسم کے آدمی تھے، یہ پہلے مصحفی کے شاگرد ہوئے اور چند دنوں کے بعد جرأت کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے لگے، تذکروں میں ان کے دو شعر ملتے ہیں :-

دم وداع یہ کہنا ہے کیا غضب اس کا　　کہ ہم تو جاتے ہیں رافت ترا خدا حافظ
جراح میرے زخم کو سینے کے تو سی مت　　یہ چھاتی کو دل کے جھروکے ہیں

---

(۳۷) رعنا تخلص، شیخ عبدالرحیم نام ولد شیخ عبدالکریم متوطن شاہجہاں آباد، ایک عرصہ تک لکھنؤ میں اقامت گزیں رہے :-

لاتا ہوں نقد جاں کو سو یہ واں نہیں قبول　　نذر گدا بحضرت سلطاں نہیں قبول
ناصح جو ہم سے اُلجھے تو اُلجھے وے ہمیں　　ہونا کسی سے دست و گریباں نہیں قبول
زبس بجر غم رات تھا شور وشر پر　　رہی آستیں صبح تک چشم تر پر
کیوں خال سیہ جاناں عارض پہ بناتے ہو　　اس چاند سے مکھڑے کو کیوں داغ لگاتے ہو
سنتے ہو میاں رعنا کچھ ہوش گیا سب کیا　　وہ فتنۂ عالم ہے دل کس سے لگاتے ہو

---

(۳۸) رنگین تخلص، سعادت یار خاں نام، طہماسپ بیگ خاں تورانی کے لڑکے، سرہند میں پیدا ہوئے، یہ بہت اچھے شہسوار اور فنونِ سپہ گری سے خوب واقف تھے، اوائل عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور حاتم کے شاگرد ہوئے، میر صاحب کے پاس بھی شاگرد ہونے کو آئے تھے لیکن انھوں نے صاف صاف جواب دیدیا کہ تم امیر آدمی کے لڑکے ہو، تم کو شاعری نہیں آسکتی پھر حاتم کے پاس گئے اور ان سے ایک زمانہ تک اصلاح لیتے رہے، حاتم کے بعد وہ امان نثار کو اپنا

کلام دکھاتے رہے بعد کو انھوں نے مصحفی کو پورا دیوان دکھلایا جرمن مستشرق بلوم ہارٹ ایم۔ اے کی بھی یہی تحقیق ہے کہ وہ مصحفی کے شاگرد تھے مصحفی ان کے بارے میں تذکرۂ ہندی[۱] میں لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں :۔" ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوت طبعش بر صاحب علماں غالب" رنگین نے اپنا دیوان اصلاح کے لئے پیش کیا شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا :" غلامش را بارکم اصلاح برآمدہ" اصل رائے یہ ہے :۔ چوں مزاجش عشق باز افتادہ اکثر قطعہ ہائے خوب خوب و غزل دنامہ ہائے نغز بتقریب سلک نظم کشیدہ "

ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے، مگر شیفتہ و گلدستۂ دانا سی ان کی عمر اکاسی (۸۱) اور سال وفات ۱۲۵۲ھ بتلاتے ہیں، تصانیف میں" مثنوی دلپذیر" " ایجاد رنگین" مظہر العجائب" کافی مشہور ہیں ان کے چار دیوان بھی ہیں دیوان ریختہ ، دیوان بختہ، دیوان آمیختہ، دیوان انگیختہ، رامپور اسٹیٹ لائبریری میں رنگین کا ایک مسودہ بیاض پایا جاتا ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے یہی بیکر مجموعہ بالثانی معدن المعانی ، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

جی بیچ کے یہ عشق کا جنجال خریدا　　　اس جنس کو کیوں ہم نے عجب مال خریدا
ایسے ظالم کو دل دیا ہم نے،　　　آہ اللہ ، کیا کیا ہم نے
دل ہو خوں اور حنا کو بھی آگ لگے　　　اس تری منصفی کو آگ لگے
شب کو جو آپ اٹھ گئے، نیند مری اچٹ گئی　　　تارے ہی گنتے گنتے پھر رات وہ ساری کٹ گئی

"ز"

(۳۹) زلال تخلص، میر دوست علی نام ولد میر محمد پناہ ساکن اٹاوہ، یہ پہلے دوست تخلص کرتے تھے اور مصحفی کے خاص شاگرد محمد عیسیٰ تنہا سے اصلاح لیا کرتے تھے اُن کی رحلت کے بعد مصحفی کی طرف رجوع ہوئے، فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے بعد کو انھوں نے اپنا تخلص بدل کر زلال رکھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

نازم بزلف یار کہ در یک نظارۂ　　　زنار کفر در کمر پارسا بہ بست
اک چشم کی گردش سے دو عالم کو کیا مست　　　کس ہاتھ سے تھے وہ نگہ ہوش ربا مست
دکھو تو ہا نقدے کیفیت شب مہتاب　　　نقاب چہرۂ زیبا سے ماہ رو نہ اُٹھا
سر نہیں ہے جو رہ عشق میں برباد نہ ہو　　　دل کہیں ہے نہ اسے جس میں تری یاد نہ ہو
ٹھیرا اے دست جنوں موسم گل آنے دے　　　تو ابھی سے تو گریباں کو مرے آنے دے[۱]

---

[۱] اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا گل کا قافیہ " مرے " بھی عجیب ہے۔　　　(مختار الدین)

(۴۰) زیبا تخلص، عبدالرحیم ولد خواجہ محمد تقی متوطن شاہجہاں آباد، ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے، اور پشمینہ کی تجارت کیا کرتے تھے، ان کے بارے میں مصحفی کی رائے سننے لکھتے ہیں:۔ "باوصف کم علمی طبع رسا و ذہن ذکا دارد"[1]

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

فراغت کر چکا مانی جب اُس کے طاقِ ابرو سے ‏ ‏ کفک کا اس نے نقشہ کھینچ دیکھو میرے ابرو سے
مردمانِ چشم سے یہ چشمِ تر خالی ہوئے ‏ ‏ اب تو آنکھیں ہیں یہ دونوں گھر خالی ہوئے
پھر آپ نے غیروں سے ملاقات نکالی ‏ ‏ اچھا یہ نئی چھیڑ مرے ساتھ نکالی
مول لو آئینۂ دل کو کہ ارزاں چیز ہے ‏ ‏ مفت سمجھو اس کو خوباں دست گرداں چیز ہے
پہلے تو ہم کو مارا صورت دکھا دکھا کر ‏ ‏ آخر کو لے گئے دل میرا لبھا لبھا کر
کچھ کھائے مر رہیں گے ہم تو یوں ہی پیارے ‏ ‏ راتوں کو تم پھرو گے مستی لگا لگا کر
دے بوسہ گر اس طفل پریزاد کے منہ پر ‏ ‏ تو رنگ کچھ آوے دلِ ناشاد کے منہ پر

"س"

(۴۱) سامان تخلص، خواجہ محمد حسین نام خلف خواجہ ترس، شاہجہاں آباد کے رہنے والے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ۱۱ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، کچھ دنوں کے بعد دریافت حسن و قبح کے لئے مصحفی کے پاس آئے انھیں دکھایا اور پھر شاگرد ہوئے۔ مصحفی لکھتے ہیں: "در طبعش لطافتے یافتم.... گر ہمیں وتیرہ پسندے مداومت کرد بجائے خواہد رسید"۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

منہ نمک سے بھر دو میرے زخم کے ناسور کا ‏ ‏ کون احساں سر پہ لیوے مرہم کافور کا
ہم کو مشکل ہی رہا ہجر میں نالاں ہونا ‏ ‏ زخمِ دل سیکھ گیا یار سے خنداں ہونا
نوکِ مژگاں تک مرا لختِ جگر گر آئے گا ‏ ‏ رشک سے ابرِ بہاری خون ہی برسائے گا
الٰہی تشنہ لب تھی روح کس رندِ شرابی کی ‏ ‏ مئے گلگوں کا ساغر دستِ گلگوں میں چھلکتا تھا

---

(۴۲) ساحر تخلص، فضل حق نام عرف غلام مینا ولد شیخ فضل امام متوطن کاکوری، پہلے یہ نثر نویسی کی طرف مائل تھے مصحفی نے انھیں فارسی اشعار کہنے کی طرف متوجہ کیا، وہ متوجہ ہوئے اور مصحفی سے اصلاح لینے لگے ان کی تعریف میں مصحفی کی چند سطریں بڑی قیمتی ہیں فرماتے ہیں:۔ "بطور شیخ علی حزیں علیہ الرحمہ دریں بیاباں شوار گزار پا می گزارد و مورد تحسین و آفریں می شود اگر زمانہ فرصت دارد دریں کوچۂ تنگ و تار کہ ہر نا اہل را قدم گزاشتن بسیار دشوار است یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"

[1] یہ مصحفی مرحوم کی رائے ہے، حالانکہ میرا خیال ہے کہ اُن کی غزل بھر میں مشکل سے ایک شعر بھی اچھا مل سکے، ان کے کلام میں فن کی غلطیاں، بیان کا الجھاؤ کافی پایا جاتا ہے ابتذال اور رکاکت ان کے اشعار کا خاصہ ہے۔ (مختار الدین)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

زبس شرارِ غم از استخوان من برخاست　　چہ شعلہا کہ پس از مرگم از کفن برخاست
بہ گلشنے کہ چو سحر زدیم نالۂ گرم　　شرر ز مغز دل مرغ نغمہ زن برخاست
نمی یابم دریں محفل حریف ہمزبان خود　　برنگ شمع خود گریم بسوزد داستانِ خود
دراں وادی کہ گم شد ہر قدم صد خضر رہ پیما　　کجا جویم نشانِ نقش پا از کاروانِ خود
چہ نالہ در قفس اے مرغ گلستان زدۂ　　کہ پہلوئے من خونیں جگر ستان زدۂ

---

(۴۳) پسند تخلص، میرزا لطیف بیگ ولد مرزا دائم بیگ ابن منعم بیگ، میاں شمیم کی معرفت مصحفی کے یہاں آئے اور شاگرد ہوئے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

میں اسیرِ غم کہاں اور کوچۂ قاتل کہاں　　یہ نہیں معلوم جا کر دل ہوا گھائل کہاں
جانتے تھے ترے ہاتھوں سے تھے نالاں کتنے　　دل دیا ہم نے تجھے ہم بھی تھے ناداں کتنے
مریض عشق ہو جو اس کو کیا شفا ہووے　　الٰہی کوئی کسی کا نہ مبتلا ہووے
جاں لبوں پر ہے، دم شماری ہے　　آج کی رات ہم پہ بھاری ہے
حرفِ شکوہ کا لب پہ لا نہ پسند　　کام عاشق کا جاں نثاری ہے

---

(۴۴) سخنور تخلص، مولوی احمد علی نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مرشدآباد میں قیام پذیر تھے، تفصیلی حالت باوجود تلاش وتفحص کے معلوم نہ ہو سکا، صاحب "سخن شعرا" نے ان کے صرف تین شعر دئے ہیں وہ حاضر ہیں:۔

آب گو ہے سخن غیر میں لیکن صاحب　　کان میں گرتے ہی کر دیتا ہے بہرا پانی
لب شکر شکن اس غیرتِ گل کا دکھانا ہے　　چمن میں طوطی و بلبل کو آپس میں لڑانا ہے
اثبات جزو لایتجزیٰ میں تھا کلام　　ساکت رہا وہ غنچہ دہن انفصال ہے

---

(۴۵) سرسبز تخلص، مرزا زین العابدین نام، قوم کے پٹھان، کتب دینی کا مطالعہ بہت کیا کرتے تھے، اور غنا وغیرہ سے مجتنب رہا کرتے تھے، انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا، یہاں تک کہ ۱۰ سال کی عمر میں دیوان مرتب کر چکے تھے، مصحفی چار برس تک بہ سلسلۂ ملازمت و رفاقت ان کے یہاں رہے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

قفس میں گزرے گی کیا عندلیب خانہ ویراں پر　　سنے گی جس گھڑی ہو ان دنوں عالم گلستاں پر

اس کے کوچہ کی طرف میں تو نہ جاؤں ہرگز — کشش دل ہی کھینچے لئے جاتی ہے مجھے
شب انتظار گزری ہمیں انتظار کرتے — کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے
یہ جو کانوں میں بتاں عقد گہر رکھتے ہیں — میرے آنسو ہیں کہ چن کر انھیں رکھتے ہیں

"ش"

(۴۶) شاد تخلص، نام الہ یار بیگ، یہ ایرانی نسب کے تھے، مصحفی کے شاگرد تھے، گلشن بیخار نے صرف دو شعر انکے لکھے ہیں:-

اگر چاک سینہ کا ہم وا کریں — تو ہنگامۂ حشر برپا کریں
گلعذاروں کی بے وفائی کا — داغ دل پر مری نشانی ہے

---

(۴۷) شاداب تخلص، خوش وقت رائے نام، چاندپور کے رہنے والے، مصحفی کے علاوہ قائم سے بھی اصلاحیں لی تھیں۔

جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا — تیرے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو

---

(۴۸) شاد تخلص، فضل علی نام، مصحفی کے شاگرد تھے اور بقول صاحب سراپا سخن[۲۲۶] و صاحب سخن شعرا[۲۲۷] صاحب دیوان تھے چند اشعار سنئے:-

بنا ہے برق وش دونوں کا کیا دل — مرا بے چین تیرا چلبلا دل
نہیں سنتا کبھی وہ درد دل کا — عجب بے درد کے پالے پڑا دل
عجب کمبخت وہ ساعت تھی اے شاد — لگا تھا جس گھڑی اس سے مرا دل

---

(۴۹) شائق تخلص، لالہ سیوا رام نام، شروع میں جو کچھ یہ موزوں کرتے میرزا علی نظیر کو دکھاتے رہے جب اس فن میں کچھ مذاق ہوئے تو مصحفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے، کچھ دنوں کے بعد خواجہ حیدر علی آتش کے پاس گئے اور انھیں کو اپنا کلام دکھانے لگے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اس کی نورانی جبیں پر داغ صندل کے نہیں — موتیا کے پھول پھولے ہیں شب مہتاب میں
دربدر ہم ٹھوکریں کھاتے نہ رسوائی کے ساتھ — دوستی کرتے نہ گر اس طفل ہرجائی کے ساتھ
وقار انساں کا کھو دیتا ہے آخر خندۂ بیجا — دہن ہر دم کشادہ عیب ہے موتی کے دانے کا
سبزیٔ عالم مرے اشکوں کی طغیانی سے ہے — زندگانی ساری مخلوقات کی پانی سے ہے

(۵۰) شعور تخلص، عبد الرؤف نام ولد شیخ حسن رضا عرف بستی میاں، اصلی وطن بلگرام تھا لیکن یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، مصحفی لکھتے ہیں:- "ذہنے رسا و طبعے ممیزہ دارد اگر چندے مشق نمود دریں فن از بے نظیرگان روزگار خواہد شد"۔ صاحب دیوان تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

حق تعالیٰ نے تجھے رشک قمر پیدا کیا — کم تر اس انداز کا کوئی بشر پیدا کیا
جو نشانہ گیسوئے جاناں میں ہم کھو کرتے — تو تیری اے دل گم گشتہ جستجو کرتے
سیاہ بخت ازل ہوں کہاں یہ میرے نصیب — کہ قتل کرکے مجھے آپ سرخرو کرتے
اس واسطے کہ گل کو دکھا دے بہار گل — آئینہ آپ جو نے رکھا ہے دو چار گل
نقاب چہرے سے گر اٹھائے یقین ہے چارہ کا ہو نے — جو زلف بکھرائے اپنے رخ پر خیال ہو خلق کو گہن کا
مزا اٹھایا یہ خار صحرا کا میرے پاؤں کے آبلوں نے — خیال آیا نہ خواب میں بھی دل حزیں کو کبھی وطن کا

---

(۵۱) شفق تخلص، میاں بندہ علی نام، انھوں نے اپنی چند غزلیں مصحفی کو دکھلائی تھیں، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اس لاغری پہ رنج دہ دوستاں ہوں میں — ہر چند ہوں سبک پہ دلوں پر گراں ہوں میں
اے اضطراب دل نہ تصدق چمن کا کر — رہنے دے مجھ کو باغ میں بے آشیاں ہوں میں

---

(۵۲) شکیب تخلص، نواب اصغر علی خاں نام خلف الصدق نواب عنایت علی خاں، ابتدا میں کسی کو نہیں دکھاتے تھے آخر میں مصحفی کو اپنی غزلیں دکھانی شروع کیں، مصحفی لکھتے ہیں:- "فکرش بلیغ است و ذہنش رسا"، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

آب داری اسکو کہتے ہیں زہے انداز قتل — مانگتا پانی نہیں کشتہ تری شمشیر کا[1]
عجب طرح کی کشاکش تھی مہ جبینوں میں — گیا جو آئینہ اک روز ان حسینوں میں
بہار لالہ دکھاؤں گا باغباں تجھ کو — بھرے ہیں لخت جگر میں نے آستینوں میں
دام الفت میں پھنسے ہیں اب تو لے صیاد ہم — دیکھئے اس دام سے ہوتے ہیں کب آزاد ہم
بزم عشرت ہم نے جانا قید زنداں کو شکیب — نالۂ زنجیر کو سمجھے مبارک باد ہم

---

(۵۳) شمیم تخلص، شیخ محمد صابر نام ولد شیخ عبد اللہ، مصحفی کے شاگرد تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

دل مرا جس بت پرفن کا طلبگار رہا — اس کی صورت سے مری زلیست تک انکار رہا

---

[1] اس شعر سے کچھ ملتا جلتا ایک شعر راقم کا بھی ہے:- جس کا دل سوز غم پنہاں سے پھنکتا ہو سدا — پھر وہ پانی مرتے دم تک مانگ کر پیتا نہیں
(مختار الدین)

مت کھولنا تو کاکل پیچیدہ دیکھنا — ظالم نہ کھل پڑے دل شوریدہ دیکھنا
ملی نہ دیدۂ خونبار سے ذرا فرصت — نت آستیں کو رہے ہم تو شست و شو کرتے
بھنور سے نکلی کہ طوفاں سے پھر دوچار ہوئی — ہماری کشتی نہ ساحل سے ہمکنار ہوئی

---

(۲۲) شگفتہ تخلص، مرزا احمد علی خاں نام، خلعت نواب شجاع الدولہ، پہلے بیان تخلص کرتے تھے۔ انھیں فن شاعری کے علاوہ فن موسیقی، تیر اندازی، شناوری، تصویر کشی میں بھی کافی دخل تھا، کشتی چلانی بھی جانتے تھے، خط نسخ بہترین لکھتے تھے۔ ایام طفولیت ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا، ایک ضخیم دیوان مرتب کیا لیکن عجب اتفاق کہ ان کے گھر میں آگ لگ گئی جس میں اثاث البیت کے علاوہ ان کا دونوں دیوان بھی نذر آتش ہو گیا۔ اس کا انھیں اتنا صدمہ ہوا یہاں تک شعر و شاعری قطعاً ترک کر دیا، لیکن سچ ہے ع "مرہم ساعت سے بھر جاتا ہے زخم" کچھ دنوں کے بعد پھر دوسرا دیوان مرتب کر دیا۔ مصحفی کی رائے ان کے متعلق یہ ہے:- "فکر سخن بعجز گی و صفائی تمام می کند و قصیدہ ہائے آبدار در سلک نظم کشیدہ اند ...... ریختہ شگفتن مناسب حال است از فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی، در امثال زنانہ و مردانہ نظیر خود ندارند" میری رائے ان کے اشعار کے متعلق یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت تو انھیں چھو بھی نہیں گئی ہے اور معنی بندی تو غریب کے کلام میں عنقا کی طرح غائب ہے۔ ان کے اشعار کے ورق کے ورق پڑھ جائیے، شاید آپ کو شعر بھی پسند نہ آئے گا، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

کل ترے بیمار کی کچھ تھی طبیعت اچھی — آج جو دیکھا تو منہ پر پھر گئی ہے مردنی

ایک دلچسپ شعر سنئے:-

اس قدر مرغوب خاطر ہے مرا دو نوجواں — دوڑتی ہے ان کے چہرے سے ہلنا پر سنسنی

دو فصیح و بلیغ شعر سنئے، غیر ممکن ہے کہ آپ داد نہ دیں، لکھتے ہیں:-

کب کسی پر غیر دل اس کا نکل جانا کھلا — شب کیا یوں سدہ دامن کی لگا گیا امنی
اے شگفتہ تم سے مجب رکھے دریغ اک فلس داغ — کیونکہ پھر دیتا کسی کو ہوئے یہ چرخ دنی

الجھاؤ ہی نہیں ہے، بیان کے الجھاؤ، تعقید کی بھرمار اور ابتذال کا اگر شاہکار دیکھنا چاہتے ہوں تو یہ اشعار سنئے:-

ہر کسی کی نہیں طاقت جو قدم مار سکے — وادی عشق سے تا سعد کوئی پر لا گذرا
نہ سونگھا سگ نے نہ ٹھوکا ہما نے — جلی ہی بسکہ سوئے استخواں تھی
صاف کاجل کی کوٹھری ہے جہاں — سرمہ اتنا دیا نہ کر گہرا
دن کو تو خیر جا بجا جہاں تم وہاں رہے — جب رات کو کہیں رہے پھر ہم کہاں رہے
گالی گلوچ مار کٹائی نہ ہو سو کیوں — جب اس کا ہاتھ اور نہ میری زباں رہے

(۵۵) شوقؔ تخلص، میرزا جوہر نام[1] والد میرزا وارث علی، انھیں فنِ لغز و معما سے بھی واقفیت تھی، آخر عمر میں مشہد مقدس چلے گئے، ان کی زبان میں لکنت بہت تھی یہی وجہ ہے کہ یہ مشاعروں میں شعر پڑھنے سے معذور تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کیا کیا جوشِ جنوں ہے بیاباں کی طرف — لے چل اسے وحشتِ دل مجھکو بیاباں کی طرف
تجھ بن قلق سے بسترِ غم پر تمام رات — تڑپا کیا مرا دلِ مضطر تمام رات
حاصل یہ عشق میں نہیں جاہ و حشم ہوا — آنسو تو فوجِ غم ہوئے نالہ علم ہوا
ہمارا حال زار اے شوقؔ وہ اگر دیکھے — یہ کیا ممکن ہے جو آنسو نہ چشمِ یار سے ٹپکے

---

(۵۶) شہیدیؔ تخلص، منشی کرامت علی نام ولد عبد الرسول خاں عروضی باشندہ لکھنؤ مقیم بریلی مصحفی کے علاوہ انھوں نے نصیرؔ دہلوی سے بھی اصلاحیں لی تھیں، پیشتر پنجاب و گجرات و رامپور، بریلی، بھوپال، دہلی میں رہتے تھے، یہ بیان نساخؔ کا ہے لیکن صاحب سراپا سخن نے بریلی کی اقامت کے متعلق صرف لکھا ہے، علمِ عروض و حساب میں امثال و اقران سے زیادہ دخل رکھتے تھے بڑے بے تکلف اور عاشق مزاج تھے، آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۵۵ھ میں سفر حجاز کیا اور بعد ادائے حج بیت اللہ روانہ مدینۂ منورہ ہوئے راستہ ہی میں بیمار ہوگئے، چہارم ماہ صفر المظفر ۱۲۵۶ھ میں مدینہ پہونچے روضۂ مبارکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جوشِ اشتیاق سے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، صاحب دیوان تھے اور نساخ لکھتے ہیں کہ اشعار ان کے خوب ہوتے ہیں، دیوان ان کا نظر سے گزرا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کیا ملاحت ہے رخِ جاناں میں ہے اللہ اللہ — آگیا جس کے تصور سے مزا آنکھوں میں
وعدہ شام پہ کی ہم نے عبث بانگ کے صبح — وہ کسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا
نئی باتیں نئی گھاتیں نئی چاہت نیا پیار — کیا قیامت ہے نئے شخص پہ آنا دل کا
شرم آتی ہے وگرنہ ان بتوں کے بدلے میں — جیتے جی اللہ سے اک حور جنت مانگتا
ناکامی جاوید کی ہم نا سنتے منت — افسوس شہیدیؔ تری تربت نہیں ملتی

ایک بے نظر فانی شعر سنئے:-

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے — دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

مجھے ان کا یہ شعر بہت بھاتا ہے:-

مجھے عذاب جہنم کہ بت پرست ہوں میں — وہ بت بہشت میں دعویٰ جسے خدائی کا

---

[1] ان کا نام مصحفی نے ریاض الفصحا میں میرزا جوہر لکھا ہے لیکن نساخ نے اپنے تذکرہ گلشن بیخار قلمی میں جوہر بیگ نام بتایا ہے، میں مصحفی کے بیان کو اس بارہ میں زیادہ صحیح سمجھتا ہوں اس لئے کہ ایک استاد کو اپنے شاگرد کے نام سے بہ نسبت دوسرے کے زیادہ واقفیت ہوتی ہے (نگار)

یہ فارسی میں بھی اشعار کہتے تھے، ان کا صرف ایک فارسی شعر مل سکا :-

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت — مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

"ص"

(۵۰) صبا تخلص، لالہ کانجی مل نام قوم کا یستھ سکسینہ، بزرگوں کا وطن فیروز آباد تھا خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پرورش پائی، مصحفی شروع میں انھیں کے مکان پر اقامت گزیں ہوئے تھے اسی زمانہ میں انھیں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی سا مشفق استاد موجود تھا انھیں سے کسب سخن کرنے لگے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تھوڑی مدت میں ایک مختصر دیوان مرتب کر لیا۔ مصحفی ان کے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں :-

"طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا می کرد از پیشتر قدم پیشتر می نہاد و ترقی می نمود"

[illegible] عین جوانی میں پچیس برس کی عمر میں رقوق ہوئے اور انتقال کر گئے۔ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرۂ شعرا قلمی میں لکھا ہے کہ دیار شرقیہ میں کہیں مرے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

عبث ہے یہ تمھارا پاس مرے بار بار آنا	جدائی میں مجھے مشکل ہے اے یار در قرار آنا
نہیں معلوم اسے یار صبا سے دل میں کیا آیا	ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اٹھا
مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اس قاتل کے کوچہ میں	لئے جاتا ہے تا آج تو سر اپنا برسر کا
کیا تو نے کچھ صبا سے اے تند خو کہا تھا	روتا ہوا ادھر سے باچشم تر گیا ہے
اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا	ایسا گیا کہ پھر [illegible]

([illegible]) صفا تخلص، لالہ منولال نام لکھنؤ کے رہنے والے قوم کا یستھ سے تھے۔ والد راجہ پیارے لال چند اخبار نویس [illegible] نے انھیں میر تقی میر کا شاگرد لکھا ہے اور بعض تذکرہ نویس مصحفی کا شاگرد بتلاتے ہیں، صاحب دیوان گزرے ہیں ایک فارسی گو بھی تھے۔ قلمی دیوان میں ان کی ترتیب دیوان کا قطعہ تاریخ نظر سے گزرا۔

صاحب تذکرہ گلشن بیخار نے صرف یہ ایک شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا صرف ایک شعر ملا :-

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں	کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں[1]

[illegible] ذخیرہ سے ان کے تین شعر اور گزرے ہیں ملاحظہ ہوں :-

خوبصورت جو بہت حور کو سمجھا ہے صفا	تو نے دیکھا نہیں اس رشک پری کا منھ کیا

---

[1] شعر کو بعض صاحب تذکرہ نے حسرت کے نام سے بھی لکھا ہے۔

مرے منہ میں تو اسکے نام سے پانی بھر آتا ہے — مزا ایسا ہے کیا اس بوسۂ چاہِ زنخداں میں
مرے رونے سے دل اسکا تو کچھ مائل بہ رقت ہو — مرے حق میں مرا رونا تو یہ باران رحمت ہے

"ض"

(۵۹) ضمیر تخلص، میر مظفر حسین نام خلف قادر حسین خاں، مرثیہ گو نامی، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، صاحب دیوان تھے مرثیہ کی طرف انھیں خاص رجحان تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل نہیں کہتے تھے، غزلیں بھی کہتے تھے۔ چند شعر سنئے:۔

کیا کہوں میں کہ اب کہاں ہے دل — اس گلی میں رواں دواں ہے دل
گاہ پہلو میں گاہ یار کے پاس — دیکھیو تو کہاں کہاں ہے دل
پوچھو تو ضمیر بگو افگار کہاں ہے — جس دن سے گیا وہ نہ پھر اس کی خبر آئی
حالت مری جب اس کو دگرگوں نظر آئی — اور وں کو تو کیا چشم مسیحا کی بھر آئی
صد حیف ضمیر ہم تو رو دیئں — اس کی کبھی چشم تر نہ ہوئے

"ط"

(۶۰) طپاں تخلص، میرزا رمضان علی بیگ نام ولد میرزا رجب علی بیگ قوم مغل ساکن قصبۂ آسیون من مضافات صوبہ اودھ ۱۲۲۹ھ میں تلاش معاش کے لئے وطن سے وارد لکھنؤ ہوئے، استعداد اچھی رکھتے تھے، فارسی و اردو اشعار کے علاوہ نثر نویسی میں بھی کچھ کم نہ تھے مشاعرہ میں ان کے کلام سے ایک رونق پیدا ہو جاتی تھی، نمونہ کلام ملاحظہ ہو

بے زبانم بہ سوائے لب خود وا نہ کنم — جاں بحسرت دہم و عرض تمنا نہ کنم
بر باد شد ز دست فلک آں ہم اے طپاں — در کوشش از مزار نشانے کہ داشتم
بر دل بہ کنیم جبر تا چند — اے وہ بہ خلاف صبر تا چند
ہم آزما چکے ہیں بہت گرم و سرد عشق — دیکھئے اسے فریب جو ناکردہ کار ہو
سیکھے ہم سے طریق رونے کا — دیکھ اسے ابر یوں برستے ہیں
مری حالت سے کاشکہ ہوں آگاہ — میرے رونے پہ جو کہ ہنستے ہیں
دل پتنگے کا جلا شب دیکھ جانسوزی مری — رات بھر روتی رہی سن کر مرا افسانہ شمع

"ظ"

(۶۱) ظریف تخلص، لالہ بینی پرشاد نام ولد روشن لال برادر خورد لالہ چنی لال حریف (تلمیذ مصحفی) ۱۴ سال کی عمر میں

شعر کہنا شروع کردیا تھا، ابتدا میں اردو میں شاعری کیا کرتے تھے اور بہت کم کہا کرتے تھے، اس کے بعد فارسی میں بھی کہنے لگے، مسدس و مخمس خوب کہا کرتے تھے، صاحب دیوان تھے اُن کی فارسی کی ایک مسمع و مسجع غزل سنئے پڑھئے اور جھومئے یہ خیال رہے کہ غزل آج سے ڈیڑھ سو برس قبل کی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آج کی کہی ہوئی ہو، ملاحظہ ہو:-

غارتگرِ صبرِ من و سرگرم فغانے ۔ شد عشوہ گرے، کم سخنے، آفت جانے
نازک کمرے، فتنہ گرے، ہوش ربائے ۔ شمشاد قدے، گلبدنے، غنچہ دہانے
زلفیں چمنے، سبزہ خطے، تازہ بہارے ۔ گلبرگ ترے، لالہ رخے، سرو روانے
خنجر مژہ و سخت دلے تند مزاجے ۔ عشاق کشے، کینہ ورے، گرم عنانے
خوش چشم بتے، سیم تنے، زہرہ فریبے ۔ جادو نگہے، حور وشے، برق جہانے
دارم ظہور از غم و اندوہ فراقش ۔ ہر لحظہ لبِ نعرہ و آہے و فغانے

کر تو اسے زہرہ جبیں کوٹھے پہ آ اپنا بناؤ[1] ۔ ماہ تاباں سے پئے آئینہ داری تیار

ہو ظریف[2] تجھ سے ہی چشمِ وفا کوئی اور بھی اسکا ہے تیرے سوا ۔ مری جان جو تو نے تو بھلا کہو جا کے وہ کسے مصیبت دل

اے جنوں نالہ و فریاد کروں یا نہ کروں ۔ نالۂ عشق کو آباد کروں یا نہ کروں
جا پھنسوں دام میں یا دام سے بچا لوں دل ۔ توہی کہہ خاطرِ صیاد کروں یا نہ کروں
حالت وصل کا اک شب جو سماں دیکھا تھا ۔ کیوں شبِ ہجر اسے یاد کروں یا نہ کروں

روئے گل پر قطرۂ شبنم سے خجلت بنی[3] ۔ صبحدم آیا جو وہ رشکِ گلستاں باغ میں

آزاد رہوں کیونکر دیتے ہیں[4] ظریف اب پھر ۔ بے تابئ دل مجھ کو پیغام گرفتاری

---

(۶۲۱) ظہور تخلص، منشی محمد ظہور نام، قوم شیخ، خلف محمد اسمٰعیل عرف منشو، نہال، تاریخ ولادت ۱۲۰۲ھ ابتدائے شباب ہی سے اردو شاعری کا شوق تھا، اکثر اساتذہ کلام حاصل کرکے استفادہ کرتے تھے، ابتدا میں ہجو موزوں کیا کرتے تھے والد کے انتقال کے بعد مولوی کرم محمد کرم سے سلام و مرثیہ اور دوسری چیزیں دکھاتے رہے جب مولوی صاحب کالپی چلے گئے تو ۱۲۱۱ھ میں مصحفی کے پاس آئے اور شاگرد ہوئے، یہ غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل تھے بہت تھوڑے دنوں میں دو دیوان مرتب کرلئے، دو دواوین کے علاوہ ان کی تصنیفات سے تین کتابیں اور ہیں، انیس ظہور، خاتم سلیمان، اور ایک

---

[1] "آ اپنا بناؤ" سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، اس کے لئے میں نے مصحفی کے مطبوعہ تذکرہ کے علاوہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ کے قلمی تذکرے تک دیکھے لیکن اس میں بھی "آ اپنا بناؤ" ہی ہے، شاید کہ "آج اپنا بناؤ" ہے۔ [2] یہ بھی غالباً کتابت کی غلطی ہے "ہے ظریف کو تجھ سے ہی چشم وفا" ہونا چاہئے۔ [3] اس مصرعہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ [4] "دیتے ہیں بے تابئ دل" عجب چیز ہوئی شاید کہ صحیح "دیتی ہیں" ہو۔ (مختار الدین)

مثنوی "ظہورِ عشق"۔ فنِ کتابت سے بھی واقفیت تھی خوشنویس کے ساتھ ساتھ بہت زود نویس بھی تھے، مصحفی اپنی ہاں لکھتے ہیں کہ:۔ "کلامش عاشقانہ است و طبعش در روانی چوں آبِ رواں"۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

گزری شب کو نہ بیاں رخِ نگار رہا | بندھا جو صبح تلک آنسوؤں کا تار رہا
اس بیاباں میں گزر تھا دیارِ وحشی کا | محرمِ آبلہ پایانِ جنوں خار نہ تھا
دیکھ لینے دے دمِ ذبح مجھے جانبِ یار | اتنا احساں ہے ترا خنجرِ خوں خوار بہت
کرتے ہیں منع جو اے باغباں سیرِ گلستاں کو | تجھے گلشن مبارک ہو چلے اب ہم بیاباں کو
اے جوشِ جنوں چاہیے اب کی برس میں | ثابت نہ کہیں دامنِ صحرا نظر آوے
کانپ[1] اٹھتا ہے ترے کوچہ سے جو آتی ہے نسیم | صورتِ بید کبھو یہ تنِ لاغر نہ ہوا
آب و دانہ کی بھی صیاد کو جب ہو نہ خبر | تجھے کیا خواہشِ مرغانِ گرفتار ہے کیا
دیکھ کر نبض مری رو کے[2] طبیبوں نے کہا | کچھ نہیں ہم پہ یہ کھلتا ترا آزار ہے کیا
ملائم ہو گئے ریشم سے وہ جس وقت ہم اینٹھے[3] | حقیقت کھل گئی ہم پر تمہارے زلف کے بل کی[4]

"ع"

(۳۴۳) عارف تخلص، میر عارف علی نام، متوطن قصبۂ امروہہ، یہ امروہہ کے سادات میں سے تھے، کچھ دنوں تک مرادآباد میں اقامت اختیار کی، یہ بہت ذی فہم و ذی فراست شخص تھے، عروض و قافیہ بھی اچھی جانتے تھے[5]۔ بینی پرشاد ظریف کے ساتھ مصحفی کے پاس آئے اور شاگردی اختیار کی بعد کو شاعری ترک کرکے، پند و نصیحت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ فارسی اور اردو دونوں میں اشعار کہا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

رات ساری مجھے دونوں کی تسلی میں کٹی | ہاتھ دل پر سے اٹھایا تو جگر پر رکھا
ہاتھوں کو چاکِ جیب تلک دسترس نہیں | میں کس کے بس میں ہوں کہ مرا کچھ بھی بس نہیں
وہ ہوا گرد سے جب وقتِ شکار آلودہ | تیرِ خاکی سے ہے مژگانِ غبار آلودہ
ناوکِ ناز تو تا بر جگرِ من بنشست | شد جگر روزن و دل در پسِ روزن بنشست
کجا اے کشتۂ شمشیرِ ابروئے تو می آید | کہ بانگِ شورِ محشر از سرِ کوئے تو می آید

---

[1] یہ مصرعہ میرے خیال میں ناموزوں ہے۔ [2] "و" گرتا ہے وزن میں۔ [3] یہ شعر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، زلف کے بل کو اینٹھنا ٹھیک نہیں زلف کو اینٹھنا صحیح ہوتا لیکن اس صورت میں مصرعِ اول غلط ہوگا فعل زلف کی رعایت سے نہیں لائے گئے ہیں۔ [4] گلشنِ بیخار شیفتہ، قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور۔

(۶۴) عاصی تخلص، حافظ قاسم علی خاں نام، متوطن قصبہ ردولی، یہ ایک غریب آدمی تھے اور نابینا، پھر بھی بمقتضائے موزونی طبع اشعار کہا کرتے تھے، دو تین اردو کی غزلیں مصحفی کو دکھلائی تھیں، مصحفی لکھتے ہیں :- "اگرچہ زبانش درست است اما محاورہ ریختہ بلند نیست"۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

شاید کوئی بے درد مجھے یاد کرے ہے　　جو مثل جرس دل مرا فریاد کرے ہے
خواہش سیر چمن کب اسے ہووے جس کو　　آپ سینہ ہی میں داغوں کی بہار آوے نظر
تو ہی نہ اگر پاس مرے آن رہے گا　　کس طرح سے پھر جان[۱] مری جان رہیگا

---

(۶۵) عبرت تخلص، نواب حسن علی خاں نام عرف بڑے مرزا لکھنؤ کے رہنے والے خلف نواب محمد علی خاں صاحب دیوان گزرے ہیں

تکیے میں دفن میں ہوں وہ ہو کوئے یار میں　　میرا الگ مزار جدا ہے مزار دل
گرد کدورت آئینہ رو کی مٹی نہ ہائے　　ہر چند آب گریہ سے دھویا غبار دل

صاحب سراپا سخن نے بھی ایک شعر دیا ہے :-

روئے کیا کیا نہ شب ہجر پریشانی میں　　نہ ہوا پر نہ ہوا ہائے وصال کا گل

---

(۶۶) عدل تخلص، شیخ فضل الرحمٰن نام ساکن بداؤں یہ ایک غریب آدمی تھے جس زمانہ میں مصحفی میاں غلام اشرف کے یہاں قیام پذیر تھے اور مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے یہ اکثر شریک مجلس ہوا کرتے تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

دل میں آتا ہے کہ اب محتسب و قاضی کو　　جمعہ کے روز لڑا دیجئے تالی کیجئے

---

(۶۷) عشاق تخلص، شاہ مظہر الحق نام، یہ حضرت درویش ہونے کے باوجود خوش جمالوں سے بہت مراسم رکھتے تھے" مصحفی کی شاگردی میں بغیر کسی کی ترغیب کے آئے، آخر عمر میں انھوں نے عزلت نشینی اختیار کر لی تھی۔ نمونہ کلام دیکھئے :-

یوسف کے مرقع پہ جو حیران ہوا مالی　　تب میں نے بغل سے تری تصویر نکالی
ادب عشق سے تڑپا نہ میں خنجر کے تلے　　تر لہو سے مرے تا دامن جلاد نہ ہو
گر رہا وصل میں محروم گلا کیا اس کا　　دیکھنا تھا یہ ستم اپنے مقدر سے مجھے

---

(۶۸) عیاش تخلص، میر محمد یعقوب نام ولد میر محمد انور، لکھنؤ میں نشو و نما پائی، ان کے آبا و اجداد شاہجہاں آباد سے

---

[۱] جان کو انھوں نے مذکر استعمال کیا ہے۔

رہنے والے تھے، ابتدائے جوانی ہی سے شعر کہنے کا خیال تھا، اساتذہ سے خوب خوب ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبت میں پھر ان سے خوب مستفیض ہوئے، ابتدا میں اپنے اشعار میر سوز کو دکھائے پھر میر قمر الدین منت کو اور آخر میں مصحفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے، مصحفی اپنے تذکرہ میں ان پر رائے دیتے ہیں کہ:- "غزل درست بستہ می گوید و کلامش چنداں جائے اصلاح یافتہ نمی شود مگر گاہے گاہے کم کم"۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

قدرت خدا کی دیکھو مرے دل کے زخم کو　　چھڑکے تھا جو نمک وہی مرہم لگا گیا
سجدہ کروں ہر بت کو میں اے کاتبِ قدرت　　لکھا یہی تھا تو نے مگر میرے جبیں پر
جدائی میں جیوں کب تک میں عیاش　　بھلی ہے موت ایسی زندگی سے

---

(۶۹) عیشی تخلص، طالب علی خاں نام ولد علی بخش خاں، فارسی و اردو دونوں میں مشق سخن کیا کرتے تھے، فارسی میں قتیل اور اردو میں مصحفی سے اصلاح[1] لیتے تھے، دیوان فارسی و ریختہ و مجموعہ نثر و سرو چراغاں ان کی تصنیفات سے ہیں، حسرت موہانی نے قلمی دیوان کا انتخاب شایع کیا تھا، نظم کے علاوہ نثر میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، مصحفی لکھتے ہیں:- "شعر فارسی و ہندی بمتانت و رزانت تمام می گوید و بالفعل خود استاد وقت است"۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

سوختن گرمیِ ہنگامہ آواز من است　　رقص بسمل اثر زمزمۂ ساز من است،
کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا　　اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا
دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا　　مجھ کو یکساں ہے چمن کیا خانۂ صیاد کیا
میں نے عیشی سے جو پوچھا دل پرخوں کا حال　　اک صراحی سے گلگوں کی بھری دکھلائی،

"غ"

(۷۰) غافل تخلص، منور خاں نام ولد سلابت خاں افغان۔ ان کے آباواجداد فیض آباد کے رہنے والے تھے، خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے احاطہ فقیر محمد خاں" یا میں آپ کا قیام تھا نہایت صاحب کمال اور خوش بیان شاعر تھے، مکتب نشینی ہی کے وقت سے شعر کہنا شروع کیا تھا یہاں تک کہ شاہ مظہر عشاق کی خدمت میں آئے اور شاگرد ہوئے، بعد کو مصحفی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا، ان کے متعلق مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں:- "شعر بطور سادہ دپرکاری گوید و در غزل سلامت کلامش مثل سلک گوہر است"۔ صاحب دیوان تھے، دیوان نولکشور پریس نے ۱۸۸۹ء میں چھاپ کر شایع کر دیا ہے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:- عبث وہ شرگیں رہتا ہے اب مستور آنکھوں سے　　کہ روتے روتے اب جاتا رہا ہے نور آنکھوں سے

---

[1] صاحب گلشن بیخار اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے لیکن مصحفی نے اپنے تذکرہ میں اپنے استاد ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ انشا اور قتیل سے کسب فیض کیا۔

جب آیا رحم عریانی پہ میرے دیدۂ تر کو　　　　پنھایا پیرہن آبِ رواں کا جسمِ لاغر کو
طوافِ کعبہ کو جو دل کھنچے ہے گاہے گاہے　　　　کوئی تسبیح کا رشتہ مری زنار میں ہے
سبک ساروں کو کچھ خطرہ نہیں قہرِ الٰہی سے　　　　خس و خاشاک کشتی جانتے ہیں موجِ طوفاں کو
صدمۂ ہجر مری جان اُٹھانے کی نہیں　　　　تو نہ آوے گا تو کیا موت بھی آنے کی نہیں[1]
اپنے مجنوں کی ذرا دیکھ تو بے پروائی　　　　پیرہن چاک ہے اور فکر سلانے کی نہیں

"ف"

(۱) فردؔ تخلص، وحید الدین خاں نام عرف خدا بخش خاں ولد محسن خاں قوم یوسف زئی باشندۂ دربھنگہ (بہار) مقیم کانپور پیشہ مولوتی گری کا، "شاعروں میں اپنے تئیں سب سے اونچا جانتے تھے"[2] عربی و فارسی بھی بقدر ضرورت حاصل کی تھی، صاحبِ دیوان تھے چند شعر ملاحظہ ہوں، ان کے اشعار میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے:-

کبھی کعبہ کبھی بت خانہ ہے مسکن اپنا　　　　دین و مذہب کہوں کیا شیخ و برہمن اپنا
بیتاب ہوں میں تشنگیِ نزع سے قاتل　　　　ٹپکا دے تو آبِ دمِ شمشیر گلے میں
آسیب پری ہوتا ہے جب سیمبروں کو　　　　تعویذ ہیں کرتے تری تصویر گلے میں

ان کے اشعار میں ابتذال بھی پایا جاتا ہے:-

بند انگیا کے نہ بندھوائے کبھی　　　　عمر بھر بندہ تو نامحرم رہا
سطحِ سینہ پہ ترے اے بتِ نوخیز کیا　　　　اُبھرا اُبھرا نظر آتا ہے کچھ اُٹھا اُٹھا
وہاں چھاتی سے کدائی نہ ہو کیونکر لپٹا　　　　دستِ یار و رقیب باندھتا ہی اعباں کھٹکا

---

(۲) تمدّا تخلص، فدا حسین نام خلف ضیاء الدین حسین خاں عرف آقا مرزا، نبیرۂ نواب حاتم خاں قوم مغل، لکھنؤ کے رہنے والے، فنِ رمل میں بے نظیر اور طبابت میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے، ابتدا میں اپنے اشعار پیر میر قمر الدین منتؔ یعنی میر نظام الدین کو دکھاتے تھے بعد کو بعض مجبوریوں کی بنا پر مصحفی کو دکھانے لگے اور انھیں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

خفا ہم آپ ہیں اس سے یہ دم رہے نہ رہے　　　　ترے فراق میں اے یار ہم رہے نہ رہے

---

[1] اس مضمون سے کچھ الگ ہو کر غالبؔ نے بھی کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے:-
تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں　　　　موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں
[2] سراپا سخن صفحہ ۲۰۲

ناکام کیا رہیں گے کچھ کام کر رہیں گے — بدنام ہوں گے تو بھی اک نام کر رہیں گے
رہائی دام سے صیاد کے دشوار ہے ہم کو — چمن میں دیکھئے پھر بھی ہمارا آشیاں ہوگا
مبتلا عشق کا اک شخص فدا نام جو تھا — مر گیا سر کو پٹک کے کسی دیوار کے ساتھ

---

(۴۳) فریاد تخلص، میرزا مغل بیگ نام ولد مرزا علی نقی بیگ، آبا و اجداد انکے ولایتی تھے، وہاں سے پہلے شاہجہاں آباد آئے پھر لکھنؤ میں مقیم ہوئے، ان کی پیدائش لکھنؤ ہی میں ہوئی، الہ آباد میں رجسٹری کے سررشتہ دار تھے، شروع شروع مرثیہ وسلام کی طرف راغب رہے اور افسردہ سے اصلاح لیتے رہے پھر غزل کی طرف مائل ہوئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے ناسخ نے سخن شعرا[۱] میں لکھا ہے کہ انھوں نے ناسخ سے بھی اصلاحیں لی تھیں، صاحب دیوان گزرے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں:

دن رات آتش غم بھڑکے ہے تن کے اندر — شعلے سے بھڑکے ہیں کچھ میرے بدن کے اندر
کس کے بدن کی نکہت لائی صبا چمن میں — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر
دل یہ بھرا کہ جوش سے آنسو ٹپک گئے — ساغر ہماری چشم کے آخر چھلک گئے
سو بار بہا یا فلک نیلوفری کو — کب اشک کا قطرہ مرے طوفاں نہیں ہوتا
میکشو میں رند ایسا ہوں کہ میرے واسطے — خم اٹھا کر لائے خود پیر مغاں بالائے سر

---

(۴۴) فصاحت تخلص، میر بندہ علی نام ولد میر علی، آبا و اجداد اسلام آباد کے رہنے والے تھے، خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، کمسنی ہی میں شاعری شروع کی اور اچھا کہنے لگے، ۱۰ برس کے تھے کہ انھوں نے یہ شعر کہے:-

آپ کو حال پریشاں سے مری کیا کام ہے — آپ بیٹھے ہیں سے زلفیں بنا یا کیجئے
تب ہمیں صیاد نے چھوڑا قفس سے یا نصیب — جب چمن سے پھول گلچیں جھولیاں بھر لے گئے
اگلی سی نہ وحشت ہے نہ اب شور جنوں ہے — کیا بھول گیا ہاتھ مرا جامہ دری کو

---

(۴۵) فیض تخلص، نواب جعفر حسن خاں نام خلف نواب محمد علی خاں، محلہ سنگی والان پٹنہ کے رہنے والے، اپنے وقت میں رکن رکین شہر تھے، عالی خاندان اور متمول، عربی و فارسی سے بھی واقفیت تھی اور اس میں شعر بھی کہتے تھے، خط نستعلیق کے استاد تھے لکھنؤ جا کر مصحفی سے شرف تلمذ حاصل کیا[۱]

آسماں پر اشک کو لے جائے گی تحریک آہ — یہ ہوا اٹھتی ہے دریا موج خوں ہو جائیگا

---

[۱] سخن شعرا مصنفہ ناسخ صفحہ ۳۶۳ و ندیم (بہار)

رشتۂ تسبیح اپنا ہوگیا تارِ نفس، ذکر ہو موقوف تیرا گر یہ دم بھر ٹوٹ جائے
کیسی پابندی ہمیں زنداں کی اور زنجیر کی، وہ جنوں کو زور ہے سدِّ سکندر ٹوٹ جائے
مے پینے کی تہمت تو دے سکتا نہیں لیکن آنکھوں میں گلابی سا ڈورا نظر آتا ہے
فیض اب اس کو ندامت ہے نمک پاشی سے تیرے زخموں نے عبث اس پہ شکر خند کیا

"ق"

(۷۶) قاصر تخلص، میرزا بیر علی بیگ ولد میرزا رستم علی بیگ سمرقندی، ولد و موطن شاہجہاں آباد، اصل وطن سمرقند تھا، زمانہ تک لکھنؤ میں مقیم رہے ابتدا میں جو کچھ موزوں کرتے رہے ثناء اللہ فراق کو دکھاتے رہے بعد کو مصحفی کے شاگرد ہوئے، ذریعہ معاش تجارت اور سپہگری تھا، صاحب دیوان تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

تو تو ہے صیاد عالم بیچ بتا کیونکر ہوا طائر رنگ حنا آزاد تیرے ہاتھ سے
ان دنوں جوش پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا اے صبا کہیو ٹھکانا کرے طوفاں اپنا
نسیم پر نہ کھلا آج تک کلی کا بھید کسی پہ بھی نہیں کھلتا میاں کسی کا بھید

قاصر کے تین شعر قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ میں ملے جو درج ذیل ہیں:۔

نالہ کیجئے جو کبھو سوز نہاں سے پیدا شمع ساں چاہئے ہو شعلہ زباں سے پیدا
میرے آگے نہ کسی غیر کا تو دل رکھنا سنگ اچھا نہیں شیشہ کے مقابل رکھنا
کس رنگ سے گلشن میں کروں گل پہ نظر ہا یہ غنچہ صفت باندھ چکا رختِ سفر ہیں

---

(۷۸) قسمت تخلص، نواب شمس الدولہ لطف نواب، بارگاہ قلی نسل، دہلوی ہیں بہ لکھنؤ، مرزا جہاندار شاہ کے دربار میں ان کا بڑا اقتدار تھا اصلاح سخن میاں جعفری حسرت سے لیتے تھے، ان کے انتقال کے بعد مصحفی کی طرف رجوع ہوئے اور انھیں سے اصلاح لینے لگے، سلام و مرثیہ کا بھی انھیں شوق تھا، غزل کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

الٰہی[1] یا تو میرے دامن دلدار ہاتھ آئے نہیں تو ہاتھ کے اس کی جو ہے تلوار ہاتھ آئے
پھر[2] مجھ کو کیا جو غیر کے تم جاکے گھر رہے میرے تو ساتھ وعدے ہی شام و سحر رہے
آتی نہیں کسی کی جواب تک صدائے پا واماندگانِ قافلہ یارب کدھر رہے

---

[1] [2] ناسخ مصنف تذکرہ سخن شعرا نے اپنے تذکرہ میں ان دو شعروں کو اختلاف الفاظ کے ساتھ لکھا ہے:۔
الٰہی یا تو میرے دامن دلدار ہاتھ آئے نہیں تو ہاتھ کی اس کے یہ تلوار ہاتھ آئے
پھر مجھکو کیا جو غیر کے تم جاکے گھر رہے میرے تو ساتھ وعدہ شام و سحر رہے (باقی آئندہ)

قسمت جو سیکھتا ہے فرنگی زبان کو　　　شاید نظر پڑا ہے فرنگی بچا کوئی

"ک"

(۷۹) کامل تخلص، شیخ جمال الدین نام، آنور کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

فصلِ سودے کی بھی آئی ہے خدا خیر کرے　　　دیکھیے پڑتا ہے کس کس پہ وبالِ کاکل
آغاز میں عیاں ہے یہ انجام کارِ دل　　　دو چار دن ہے زندگی مستعارِ دل
فوجِ غم والم میں پھنسا شہر یارِ دل　　　ہو کون بیکسی کے سوا غمگسارِ دل
بحرِ جہاں میں ہے یہی کامل کی آبرو　　　ہو زیبِ گوشِ یار درِ شاہوارِ دل

---

(۸۰) کاہش تخلص، مولوی اولاد علی نام جونپور کے رہنے والے، یہ صاحب گنج گیا عدالت کے پیشکار تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

بیانِ حالِ دلِ زار ہو نہیں سکتا　　　یہ درد وہ ہے کہ اظہار ہو نہیں سکتا
رشکِ مقتل ہے ترا کوچہ بہت کافر گر　　　گر تڑپے ہیں جدا، کافر جدا، ترسا جدا
بھر گئے زخمِ جگر جس شب سنی تقریرِ زلف　　　مثلِ مرہم ہو گئی اللہ رے تاثیرِ زلف
دوہری زنجیر دل میں کس پیچ سے بکھرے ہیں دل　　　واہ ری تدبیر کاکل واہ ری تاثیرِ زلف

جناب عرش گیاوی مصنف حیاتِ تسلیم کے بیان کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ شعر بھی کاہش ہی کا ہے:-

شعلۂ غم یوں تڑپتا ہے دلِ مایوس میں　　　جھلملائے شمع کی لو جس طرح فانوس میں

"گ"

(۸۱) گرم تخلص، میرزا حیدر علی نام، امتیاز علی بیگ کے لڑکے، شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ صاحب تذکرۃ الشعرا نے لکھا ہے کہ ان کا قیام "بنولا" حیدر آباد میں اکثر رہتا تھا۔ مصحفی لکھتے ہیں:-

"جوان صلاحیت شعار ہست بمقتضائے موزونیِ طبع چیزے کہ موزوں می کند آں را بنظر اصلاح فقیر می گذراند۔۔۔

۔۔۔ با وصف نو مشقی از ذکاوت طبعش معلوم می شود کہ بشاعرِ زادلت بجائے خواہد رسید"

یہ مصحفی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ نساخ[1] لکھتے ہیں کہ شعر اچھا کہتے تھے دکن کی طرف جا کر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

نالہ کی گرمیوں سے پھنکتے دل و جگر ہیں　　　اب تو یہ بھی کھد رہے ہیں کانٹے زبان پر ہیں

---

[1] سخن شعرا (نساخ) ۱۲۹۱ھ مطبوعہ نول کشور پریس

شب رخصت ہے رہو تم مرے گھر آج کی رات — ہاں سبب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات
کر دیا در کو اجابت کے فدا یا کیا بند — نہیں کرتی جو دعا میری اثر آج کی رات
سیل گریہ میں نہ ہم تا بہ کمر ڈوب گئے — اس قدر روئے کہ ہمسایوں کے گھر ڈوب گئے
گلچیں جوان کو توڑ کے ڈالی سے لے چلا — سر دھن کے عندلیب پکاری کہ ہائے دل
تیغ نگاہ کس کی دیکھی ہے ہم نے یا رب — کیوں زندگی سے اپنی بیزار اس قدر ہیں

(باقی) **مختار الدین آرزو**

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان:- مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم ایل اے، ایم، ایل سی مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حال سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہونچا دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان امور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ۵۰۲ صفحات قیمت مجلد عہ

مضامین محمد علی:- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ رہی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھے۔ قیمت مجلد ۱۲ر

مضامین رشید:- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عار

میدان عمل:- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۱۲ر

بیوہ:- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

جنگ کا ہولناک خراج نوعِ انسانی سے

سنہ ۱۴۶۹ قبل مسیح سے سنہ ۱۹۳۰ء تک، (دوہزار تین سو ننانوے سال کے زمانہ میں) صرف ۲۸۷ سال تو ایسے گزرے ہیں کہ دنیا میں امن رہا ہو ورنہ باقی ۳۱۱۲ سال جنگ ہی میں بسر ہوئے ہیں -

سنہ ۱۵۰۰ ق م سے سنہ ۱۸۶۰ء تک تقریباً آٹھ ہزار عہدنامے صلح کے مختلف ملکوں کے درمیان ہوئے، لیکن انمیں سے کسی کی عمر دو سال سے زیادہ نہ تھی - سی سالہ جنگ کے زمانہ سے جو سنہ ۱۶۱۸ء میں شروع ہوئی تھی، ۱۰۰۰ بڑی بڑی جنگیں ایسی ہوئی ہیں جن میں فرانس نے نمایاں حصہ لیا اور اس کے بعد آسٹریا ہنگری اور برطانیہ نے - پروشیا کی جنگی سرگرمیاں سنہ ۱۷۴۰ء سے شروع ہوتی ہیں -

اس زمانہ میں فرانس ۳۲ سال تک برطانیہ سے لڑتا رہا، ۸۰ سال تک جرمنی سے اور ۶۲ سال تک اسپین سے - تاریخ حاضرہ کی سب سے طویل جنگ وہ ہے جو مابین فرانس و برطانیہ سنہ ۱۳۳۷ء سے شروع ہوکر ایک صدی تک جاری رہی اور سب سے مختصر جنگ وہ ہے جو سنہ ۱۸۴۹ء میں سارڈینیا اور آسٹریا کے درمیان صرف چھ دن قایم رہی۔

پروفیسر سوروکن اور لفٹننٹ جنرل گولووِن نے دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ۵۰۰ سال قبل مسیح سے سنہ ۱۹۲۵ء تک، یونان، روما، وسطی یورپ، جرمنی، اطالیہ، فرانس، برطانیہ، نیدرلینڈ، اسپین اور روس نے ۹۰۲ باقاعدہ جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ بارھویں تیرھویں صدی میں روس کو زیادہ جنگ میں مبتلا رہنا پڑا، چودھویں صدی میں انگلستان کو، پندرھویں سولھویں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں آسٹریا (یعنی روما کی سلطنت مقدسہ) کو اور انیسویں صدی میں فرانس کو اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ تہذیب کی اشاعت جنگ سے باز نہیں رکھتی جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ جنگ عظیم ہے جو سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی -

کیمیادی طریق جنگ

زمانۂ قدیم میں بڑی بڑی بری و بحری فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوا کرتی تھیں لیکن ان کا اوسط (سنہ ۱۳۷۵ء سے سنہ ۱۶۱۸ء تک) پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں رہا- اٹھارویں صدی میں یہ اوسط ۴۰ ہزار ہوگیا اور نپولین کی جنگوں میں ایک لاکھ تک پہونچ گیا-

اس کے بعد لیپزگ کی جنگ (۱۸۱۳ء) میں ۵ لاکھ سپاہی شریک ہوئے، ۳ لاکھ ۲۰ ہزار جنگ سڈان میں (۱۸۷۰ء) اور جنگِ عظیم کے ۱۴ میل لمبے اطالوی محاذ پر ۴۸۰۰ توپوں نے سولہ دن میں ۳۰ لاکھ گولے برسائے جن کے مصارف کا اندازہ ۱۰ کرور پونڈ (تقریباً ۱۴۰ کرور روپیہ) کیا جاتا ہے

دھویں اور آگ کا استعمال گیارھویں صدی میں چین کے اندر پایا جاتا تھا۔ مغلوں نے سب سے پہلے تیرھویں صدی حملۂ یورپ کے وقت اس کا استعمال کیا اور اسی کے ساتھ غلیظ کی ہانڈیاں بھی پھینکیں تاکہ ان کی بو سے دشمن ہٹ جائے۔ یہ تھی ابتدا کیمیاوی طریقِ جنگ کی۔

موجودہ کیمیاوی طریقِ جنگ کا عملی تجربہ گزشتہ جنگ میں کیا گیا اور تقریباً تین ہزار چیزوں میں سے صرف بارہ چیزیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اگرچہ گیس کی لڑائی ۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کانگرس میں ممنوع قرار دی جا چکی ہے، لیکن اس نے کوئی قانونی صورت اختیار نہیں کی اور ہر قوم زہریلی گیس تیار کر رہی ہے۔ حبشہ کی لڑائی میں اطالیہ نے اس کو استعمال کیا اور جاپانی چین کے حملہ میں برابر اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

توپ اور بارود کی ایجاد

کہا جاتا ہے کہ بارود سب سے پہلے چھٹی صدی میں چین نے ایجاد کی، لیکن اس کا استعمال صرف آتشبازی کی حد تک محدود تھا۔ سب سے پہلا دستی بم جو بارود سے طیار کیا گیا وہ تھا جسے مغل سردار قبلائی خاں نے ۱۲۳۲ء میں استعمال کیا۔ بارود کے اجزا نویں صدی ہی میں معلوم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کو طیار کیا ایک انگریزی راہب نے تیرھویں صدی میں

یورپ میں بارود کا استعمال سب سے پہلے محاصرۂ اشبیلیہ میں کیا گیا (۱۲۴۷ء) اس کے بعد جنگ کریسی میں (۱۳۴۶ء)، پھر جرمنی میں اینیک کی محافظت کے لئے (۱۳۶۵ء) غیر دخانی بارود کی ایجاد ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔

توپوں کا استعمال بحری جنگ میں ہوتا تھا اور سب سے پہلے ۱۳۳۸ء میں ان کا استعمال کیا گیا اس کے بعد ۱۵۱۲ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی بحری جنگ میں دونوں طرف توپوں کا استعمال ہوا۔ محمد ثانی سلطان ترکی نے محاصرہ اورنہ کے لئے ایک بہت بڑی توپ ڈھلوائی تھی جس میں ۱۲۰۰ پونڈ کا سنگین گولا رکھا جاتا تھا اور جس کی آواز تیرہ میل تک جاتی تھی۔

پیچھے سے بھرنے والی توپ کا خاکہ ایک اطالوی نے ۱۵۹۷ء ہی میں طیار کر لیا تھا۔ لیکن اس قسم کی فولادی توپ سب سے پہلے کارخانۂ کرپ نے ۱۸۵۶ء میں ڈھالی اور ۱۹۱۰ء تک اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کی مار ۶ میل کی ہو گئی۔ گزشتہ جنگ میں جرمنی کی بڑی توپ سے ۳۰۰ گولے سر کئے گئے جو ۲۵ میل تک بلندی میں اور ۸۰ میل تک سامنے میدان میں پہونچتے تھے۔ اس کے گولہ کا وزن ۲۳۰ پونڈ تھا جو ۵ ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے

چلتا تھا - ۲ انچ کے چھٹنے والے گولے کی قوت کا اندازہ یوں کیجئے کہ گویا ریل کے چار ڈبے ۶۰ میل کی رفتار سے ایک دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ سب سے بڑی توپ اس وقت امریکہ کے پاس ہے جس کی مار ۳۰ میل تک ہے۔

گزشتہ جنگِ عظیم میں ذخائرِ حرب کے صرف کا اندازہ مشکل ہے، یکم جنوری ۱۹۱۶ء سے فرانسیسی کارخانوں نے جو ذخائرِ حرب طیار کرنے شروع کئے ان کا روزانہ اوسط ایک لاکھ ۵۰ ہزار بم اور ۴۰ ہزار دستی گولے تھے۔ ۳۰ کروڑ دستی بم جرمن محاذ پر پھینکے گئے اور صرف وردان کے مقام پر ایک مہینے کے اندر تیرہ لاکھ ٹن لوہا گولوں اور گولیوں کی صورت میں برسایا گیا۔

فوجی جوتے اور زین

فوجی جوتوں کا ذکر آج سے دو ہزار سال قبل مصری مخطوطات میں پایا جاتا ہے گھوڑوں کی نعلبندی کی ابتدا سنہ ۴۰۰ء سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے قبل جاپانی گھوڑوں کی نعل گھاس سے طیار کرتے تھے۔ جب قدیم اہل رومہ نے دیکھا کہ ان کی پختہ گلیاں گھوڑے کے سموں کو نقصان پہونچاتی ہیں تو انھوں نے چمڑے کے نعل استعمال کئے۔

قدیم رومہ کے لوگ رکاب کا استعمال نہ جانتے تھے، یورپ میں اس کا رواج ... رکابوں کی ... آج جن کی رواداب ... میں پائی جاتی ہیں۔ زینوں کا استعمال البتہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، جو مختلف وضع وصورت کی ہوا کرتی تھیں۔ قدیم اسیریا میں بھی گھوڑوں پر زین کسی جاتی تھی۔ اہل رومہ اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر کپڑا، چمڑا اور سمور ڈالتے تھے

جھنڈے

قدیم مصری فوجیں بھی جب لڑنے جاتی تھیں تو ان کے ساتھ جھنڈے ہوتے تھے۔ ان پر بیل اور گھڑیال کی تصویر ہوتی تھی کیونکہ ان کے یہاں یہ دونوں چیزیں مقدس تھیں۔

اسیریا والوں کے جھنڈے پر فاختہ بنی ہوتی تھی اور ایرانیوں کے جھنڈے پر سنہرا عقاب۔ اسپارٹا کے جھنڈوں پر حرفِ ...لس کی تصویر ہوتی تھی اور یونان کے جھنڈوں پر صرف اُلو کی۔

رومہ والے عقاب، بھیڑیے، سور اور گھوڑوں کی تصویر اپنے جھنڈوں پر بناتے تھے قسطنطین اعظم کے زمانہ میں صرف صلیب رہ گئی۔ سیکسن اقوام کے جھنڈوں پر شیر، اژدہے اور عقاب بنے ہوتے تھے۔

مغلوں کے جھنڈے گھوڑوں کی دم کے ہوتے تھے اور تعداد کے لحاظ سے ان دُموں میں چار تک کا اضافہ ہوتا تھا۔ چین کا جھنڈا زرد رنگ کا تھا جس پر نیلا اژدھا بنا ہوتا تھا۔ مسلمانوں کا جھنڈا سبز ہوتا تھا اور اس پر کوئی تصویر نہ ہوتی تھی۔ جرمنی کا دو سرے والا عقابی جھنڈا مشرقی سلطنت رومہ سے لیا گیا۔ شاہی جھنڈوں میں عقاب کی تصویر یورپ کے اکثر ملکوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ عقاب کو اکثر قوموں میں قوت و ہوشیاری کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔

نعرۂ جنگ

یونانیوں کا نعرۂ جنگ الالا۔ الالا تھا اور اسی کو اب فاسسٹ جماعت نے اختیار کیا ہے، اہل رومہ فری۔ فری کہا کرتے تھے۔ صلیبی فوجوں کا نعرہ "Adjuva Deus" (خدا ہماری مدد کرے) تھا۔ روسیوں کا نعرۂ جنگ وہی تھا جو تاتاریوں کا یعنی "ہرا، ہرا" جس کے معنے ہیں "مار ڈال۔ مار ڈال"۔ انگریزوں کا نعرہ تھا "St. George for England" [illegible] فرانس والوں کا نعرہ کسی وقت "Mont joie st. Denis" تھا لیکن اب "En avant" (آگے بڑھو) ہے۔ اہل اسپین کا نعرہ "San Iago" تھا اور مسلمانوں کا اللہ اکبر!

فوجی تنظیم

مسیح سے ۳۰۰۰ سال قبل مصر میں یہ رواج تھا کہ ہر صوبہ کی علیحدہ فوج ہوا کرتی تھی جو جنگ کے وقت مرکزی فوج میں شامل ہو جاتی تھی۔ یہ فوج صرف پیادہ [illegible] مشتمل ہوتی تھی۔ تلوار، خود اور زرہ وغیرہ کا پتہ نہ تھا۔ اس کے ۱۵۰۰ سال بعد مصری افواج میں تیروں، [illegible] اور رتھوں کا استعمال شروع ہوا لیکن افسروں کے ہاتھ میں بجائے ڈنڈوں کے پنکھے ہی رہا کرتے تھے۔

بابل، میدیا، اور اسیریا میں سوار و پیادہ فوج کے علاوہ [illegible] بھی پائے جاتے تھے۔ مستقل فوج کا رواج سب سے پہلے ایرانیوں کے یہاں ہوا۔ ایرانی افواج سے وفاداری کا حلف بھی لیا جاتا تھا اور سالانہ [illegible] افواج کا معائنہ بھی ہوتا تھا، ان کی تعداد دس ہزار تھی۔

پارتھیا کی سوار فوج بہترین مانی جاتی تھی اور زرہ بکتر [illegible] یونانیوں کی فوج زیادہ تر شہری لوگوں پر مشتمل تھی جنھیں کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی اور [illegible] ضرورت [illegible]

اسپارٹا میں بھی مستقل فوج رہتی تھی اور [illegible] ق۔ م۔ وہاں کے افواج کی تعداد [illegible] ہزار تھی۔

قدیم جرمنی میں اضلاع کی الگ الگ فوجیں جمع کیا کرتی تھیں [illegible] (۷۶۸ء ۔ ۸۱۴ء) باقاعدہ فوج کی بھرتی [illegible] لیکن [illegible] کسی ایک جماعت [illegible] نہ ہوتی تھی، حکومت، مذہب، جاگیردار، امراء علیحدہ علیحدہ بھرتی [illegible] تھے۔

مسلح گاڑیاں اور ٹینک

جنگی رتھ سب سے پہلے [illegible] آج کل کے مسلح موٹر کار اور ٹینک ہیں۔

۱۸۹۵ء میں کورٹس نے جو مسلح گاڑی طیار کی تھی وہ اسی وجہ سے ناکام رہی کہ اس کے چلانے کے لئے ایندھن کافی مقدار میں رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد [illegible] میں [illegible] نے مسلح گاڑی طیار کی جس پر ایک تیز چلنے والی توپ بھی رہتی تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے فرانس نے مسلح گاڑیوں سے محاذِ جنگ پر کام لیا۔ اور سنہ ۱۹۳۷ء کی ابتدا میں روس کے پاس چھ سے دس ہزار تک ٹینک پائے جاتے تھے، فرانس کے پاس ۴۵۰۰، برطانیہ اور پولینڈ کے پاس علیحدہ علیحدہ ۴۰۰، زیکوسلوواکیا کے پاس ۳۵۰، اٹلی کے پاس ۲۴۰، یگوسلوویا کے پاس ۲۰۰، اور رومانیا کے پاس ۹۰

جنگ اور اتلافِ جان

جنگ سی سالہ میں جو سنہ ۱۶۱۸ء سے سنہ ۱۶۴۸ء تک جاری رہی، جرمنی کے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ آدمی ضایع ہوئے جن میں ۹ لاکھ مرد بوہیمیا کے تھے اور ورٹمبرگ کی آبادی ۹ لاکھ سے گھٹ کر ۵۰ ہزار رہ گئی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کی لڑائیوں نے فرانسیسی آبادی کو جس قدر نقصان پہونچایا، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک کروڑ سپاہی نپولین کی جنگوں میں ختم ہوگئے۔ ۶ لاکھ کی فوج جو سنہ ۱۸۱۲ء میں روس پر حملہ کرنے کے لئے گئی تھی اس میں سے صرف ۲۰ ہزار فرانس واپس آئی اور ۲۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا بار خزانہ پر پڑا۔

امریکہ کی خانہ جنگیوں (سنہ ۱۸۶۱-۱۸۶۵ء) میں ۴۰ لاکھ سپاہی شریک جنگ ہوئے، ان میں سے ۴ لاکھ سپاہی شمالی امریکہ کے ضایع ہوئے اور ۵ لاکھ جنوبی امریکہ کے۔ ان جنگوں کے مصارف کا اندازہ ۴۰ کروڑ پونڈ کیا جاتا ہے۔

جنگ کریمیا میں ۳۰۵۰۰۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار انگریزی سپاہیوں میں سے ۲۰ ہزار جان سے مارے گئے۔ شورش ہند (سنہ ۱۸۵۷ء) اور جنگ چین (سنہ ۱۸۶۰ء) میں ۲۵ ہزار آدمی ضایع ہوئے۔ فرانس و اطالیہ کی جنگ (سنہ ۱۸۵۹ء) میں ۵۵ ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ آسٹریا اور پروشیا کی لڑائی میں (سنہ ۱۸۶۶ء) ۴ لاکھ سپاہی مقتول و مجروح ہوئے اور جنگ روس و ترکی میں (سنہ ۱۸۵۹ء) ۲ لاکھ ۵۰ ہزار انسان ہلاک کئے گئے۔ فرانس اور پروشیا کی لڑائی میں (سنہ ۱۸۷۰ء) ۵ لاکھ آدمی کھیت رہے اور فرانس کو ۵۰ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ کا نقصان ہوا۔ اسپین و امریکہ کی جنگ میں (سنہ ۱۸۹۸ء) امریکہ کا روزانہ خرچ ۵ کروڑ پونڈ اسپین کا ۳۵ ہزار پونڈ روزانہ تھا۔

جنگِ عظیم کے مالی نقصانات

ڈاکٹر نکولس مرے بٹلر کا اندازہ ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم میں تقریباً ۸۰ ارب پونڈ صرف ہوئے۔ ایک کروڑ آدمی ہلاک اور دو کروڑ زخمی ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ایک کروڑ آدمی انفلوئنزا کا شکار ہوئے جو اسی جنگ کی وجہ سے پھیلا تھا۔ اس جنگ میں ۷ کروڑ انسان ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔

اس جنگ کی وجہ سے جو اور نقصانات ہوئے، اس کا اندازہ کم از کم ۴۲ ارب پونڈ کیا جاتا ہے۔ دورانِ جنگ میں جرمنی کی تعداد پیدائش ۳۰ لاکھ کم ہوگئی اور صلح کے ۵ سال کے بعد تقریباً ۷۰ لاکھ فوجی پنشنیں وسط یورپ کی حکومتوں کو جاری کرنا پڑیں۔

جب جنگ ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے اسٹور کی بچی ہوئی چیزوں کو فروخت کیا اور ۳۰ لاکھ خریداروں

کے ہاتھ ۲۶ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ کا مال بیچا گیا۔

جنگ اطالیہ و حبشہ

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں اطالیہ نے حبشہ کو کیا کیا بھیجا، اس کی فہرست ملاحظہ ہو:

سپاہی = ۲۵۰۰۰۰ — خیمہ کا کپڑا = ۵۲ ملین فٹ —
مختلف قسم کا کپڑا = ۴۲ ملین فٹ — گھوڑے اور خچر = ۶۰ ہزار — موٹر = ۱۴۵۰۰ —
مشین گن = ۱۱۵۰۰ — رائفل = ۴۵۰۰۰۰ — توپیں = ۹۰۰ — ٹینک = ۳۰۰ —
ٹیلی فون = ۵۵۰۰ — تار ۲۰ ہزار میل لمبا — لاسلکی سٹ = ۱۰۸۱ — ۶۲۷ جہازوں سے اٹلی نے ایک ہزار ٹن وزن کے بم گرائے اور ۱۵۵۰۰۰ راؤنڈ کارتوس مشین گنوں سے چلائے گئے۔

دول عظمیٰ کی فوجی طاقت

برطانیہ:- یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو برطانیہ کی فوجی طاقت ۵ لاکھ تھی، اور ریزرو کو ملا کر ۶۲۱۰۰۰۔ ہندوستان میں ۲۱۰۰۰۰ فوج تھی جس میں تقریباً ۱۵۵۰۰۰ ہندوستانی فوج بھی شامل ہے۔

ہوائی فوج ۲۲۹۰۰ تھی اور جہازوں کی تعداد پندرہ اور سترہ سو کے درمیان تھی۔ ۱۹۳۹ء میں اس قوت کو ۲۸۶۰ جہازوں تک پہونچانے کا پروگرام بنایا گیا جو غالباً پورا نہیں ہو سکا۔ بحری فوج کی تعداد ۱۲۰۰۰۰ تھی، ریزرو فوج (۶۰۰۰۰) اس کے علاوہ تھی۔ جہازوں کی تعداد ۲۸۰ تھی جن میں پندرہ بڑے جنگی جہاز، چھ ہوائی جہازوں کو اٹھانے والے، ۴۵ کروزر، ۱۵۳ تباہ کن جہاز اور ۵۲ آبدوز جہاز تھے۔ توپوں کی تعداد ۱۶۲۵ اور تارپیڈو ٹیوب کی ۱۰۰۹ تھی ۵۶ جہاز اور زیر تعمیر تھے۔

برطانیہ کا فوجی بجٹ ۱۹۳۴ء میں ۹۳۵۰۰۰۰۰ پونڈ تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اس کی مقدار ۱۲۳۴۳۰۰۰ پونڈ ہو گئی اور ۱۹۳۹ء کے لئے ۲۲۷۰۰۰۰۰۰ پونڈ رکھے گئے ہیں۔ فوجی پنشن کے مصارف اس کے علاوہ ہیں جس کا اندازہ ۱۹۳۹ء کے لئے ۵۸۰۰۰۰۰ پونڈ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں خزانہ کو ۴۰ کروڑ پونڈ قرض لینے کی اجازت دی گئی تاکہ اس رقم سے ۱۹۴۲ء تک مدافعت کی اسکیم کو بروئے کار لایا جائے۔

فرانس:- فرانس کی فوجی طاقت ۱۹۳۸ء میں ۶۹۲۸۶۰ تھی۔ اس میں سے ۴۸۶۰۰۰ سپاہی فرانس کے لئے مخصوص تھے، ۱۵۸۰۰۰ الجزائر کے لئے، ۴۸۰۰۰ مراکش کے لئے، ۱۲۰۰۰ تیونس کے لئے اور ۶۰ ہزار نوآبادیوں کے لئے۔

ہوائی فوج کی تعداد ۱۹۳۸ء میں ۶۴۰۰۰ تھی۔ جہازوں کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی۔ ہوائی بجٹ ۱۹۳۹ء میں بجائے دو کروڑ کے ۶ کروڑ پونڈ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں جہازوں کے مصارف طیاری کا اوسط سترہ ہزار پونڈ فی جہاز تھا اور حکومت نے یہ تجویز کی تھی کہ ۱۹۳۹ء میں ہر ماہ ۵۰۰ جہاز طیار کئے جائیں۔

بحری فوج ۱۹۳۶ء میں ۷۰۱۵۰ تھی، اس کے دو سال بعد یہ تعداد ۵۵۲۰۰ ہو گئی، جہازوں کی

تعداد ۴۰۰ تھی - ۱۹۳۹ء میں ۱۳۰ جہاز اور طیار کئے جائیں گے ۔

جرمنی :- ۱۹۱۳ء میں جرمنی کی مستقل فوج، ۸ لاکھ سپاہ اور ۱۰ لاکھ ٹن کے جہازوں پر مشتمل تھی - ان پر ۷ کرور پونڈ سالانہ صرف ہوتا تھا - ۱۹۲۰ء میں معاہدۂ ورسائی کی رو سے اس کے پاس صرف ایک لاکھ فوج اور ۵۰۰۰۰ ٹن کے جہاز رہ گئے جن پر وہ ۳۰۵۰۰۰۰۰ پونڈ صرف کرتا تھا ۔ لیکن ہٹلر کی حکومت نے اس معاہدہ کو توڑ کر اپنی فوجی قوت کو بڑھانا شروع کیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسوقت واقعی قوت اس کی کیا ہے، تاہم عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سوائے روس کے اور سب ملکوں سے زیادہ فوج اس کے پاس ہے ۔

روس :- روس کی آبادی ۱۸ کرور ہے اور اس کی فوجی طاقت بڑی زبردست ہے، ۱۹۳۶ء میں اس کی فوجی قوت ۱۳ لاکھ تھی، لیکن اس کے بعد اس وقت تک ۵۲ لاکھ سے زیادہ آدمی فوجی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اس کی ہوائی طاقت ۱۹۳۱ء میں ۵۰۰ جہازوں پر مشتمل تھی، اس کے پانچ سال بعد یہ پانچ گنی ہو گئی ۔

امریکہ :- ۱۹۳۸ء میں امریکہ کی بری فوج ۱۸۰۰۰۰ تھی اور ہوائی ۱۸۷۴ - علاوہ اس مستقل فوج کے زرر و فوج بھی ہے اور اس طرح سب کو ملا کر اس کی قوت ۴۸۵۰۰۰ تھی ۔

بحری قوت کے لحاظ سے وہ دنیا کی دوسری قوت مانی جاتی ہے - اسوقت ۴۳۲ مسلح جہاز اس کے پاس موجود ہیں اور ۸۳ طیار ہو رہے ہیں ۔ ان جہازوں میں ۲۰۰۰ توپیں اور ۲۳۵۰ تارپیڈو ٹیوب نصب ہیں - اس کے ۴۱۷ جہازوں میں سے (جن میں سے ۸۳ زیر طیاری ہیں) ۱۷ بڑے جنگی جہاز، ۲۵۱ تباہ کن جہاز، ۱۰۲ آبدوز، ۳۷ کروزر اور چھ طیارہ بردار جہاز ہیں - بحری فوج کی تعداد ۱۱۵۰۰۰ ہے ۔

جاپان :- ۱۹۳۶ء میں جاپان کے پاس ۲۵۰۰۰۰ فوج تھی، لیکن جولائی ۱۹۳۸ء میں اسکے دس لاکھ سپاہی چین میں کام کر رہے تھے - اس کی ہوائی قوت کا اندازہ چار ہزار جہاز کیا جاتا ہے - ۱۹۳۸ء میں اس کی بحری قوت ۲۴۲ جہازوں پر مشتمل تھی لیکن اب اور زیادہ ہو گئی ہے ۔

اطالیہ :- اطالیہ کی بری فوج کا اندازہ پانچ لاکھ ہے، لیکن حبشہ اور اسپین کی جنگوں کی وجہ سے اس میں اضافہ کرنا پڑا تھا - اس کی ہوائی قوت ۱۹۳۴ء میں ۱۸۶۰ جہاز تھی لیکن اب بہت بڑھ گئی ہے - ۱۹۳۹ء میں اسکی بحری قوت ۲۷۲ جہازوں پر مشتمل تھی، جن میں چھ بڑے جنگی جہاز ہیں، ۲۲ کروزر ہیں، ۱۳۸ تباہ کن جہاز اور ۱۰۵ آبدوز ۔

مصارف آراستگی فوج ۱۹۳۲ء میں فوج کے مصارف آراستگی پندرہ ملکوں میں بڑھ گئے، چھ میں اپنے حال پر قایم رہے اور ۳۷ ملکوں میں کم ہو گئے - ۱۹۳۵ء میں یہ تعداد علی الترتیب ۴۱ دو اور پندرہ ہو گئی اور ۱۹۳۷ء میں ۴۹ - ایک اور آٹھ ۔

سنہ ۲۲ء میں دنیا نے آراستگی افواج پر تقریباً ......۳۴۵۱۴ پونڈ صرف کئے اور سنہ ۳۸ء میں یہ رقم ......۴۲ پونڈ تک پہونچ گئی۔

سنہ ۳۲ء میں فوجی مصارف یورپ کی آمدنی کے ۳۰ فی صدی تھے اور اب ۴۰ فی صدی ہیں۔

سنہ ۳۲ء اور سنہ ۳۸ء کے درمیان برطانیہ کے فوجی مصارف تگنے ہوگئے ہیں۔ روس کے مصارف ......۱۲۴۳۳ روبل سے ......۲۰۱۰۲۲ روبل تک پہونچ گئے، گویا ۵۰۰ فی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ فرانس میں کم ہوگئے لیکن جاپان، اٹلی، جرمنی اور امریکہ میں بہت بڑھ گئے۔

امریکہ میں سنہ ۳۲ء کا فوجی بجٹ ......۱۳۰ پونڈ تھا لیکن سنہ ۳۸ء میں ......۲۰۰ پونڈ ہوگیا۔

مصارف فی کس

سنہ ۳۸ء میں فوج کا سالانہ خرچ تمام آبادی پر پھیلانے سے یوں پڑتا تھا:۔

جرمنی = ۱۲ پونڈ — برطانیہ = ۷ پونڈ — روس = ۷ پونڈ — فرانس وجاپان = ۵ پونڈ — اطالیہ = ۳ پونڈ — امریکہ = ۲ پونڈ۔

سنہ ۱۳ء سے سنہ ۳۸ء تک یورپین اقوام کے مصارف فوج جتنے بڑھ گئے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ہوسکتا ہے:۔

	سنہ ۱۳ء	سنہ ۳۸ء
روس	۵، فی صدی	۲۲، فی صدی
جرمنی	۴ "	۱۵ "
فرانس	۶ "	۱۰ "
اطالیہ	۳ "	۹ "
برطانیہ	۵ "	۷ "

گزشتہ جنگ سے پہلے ۲۵ سال کے اندر تمام دول یورپ کے مصارف کی مقدار ۶ ارب ۱۰ کرور پونڈ تھی جو جنگ عظیم کے مصارف کا پانچواں حصہ ہے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لڑائی کیا چیز ہے اور دنیا کی خوشحالی پر اس کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں۔

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ار۔ علاوہ محصول۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مثنوی زہرِ عشق پر ایک نظر

انیسویں صدی کی معاشرت و عیشت کی داستان ہماری قومی تاریخ کا سب سے رنگین لیکن ساتھ ہی ساتھ سب سے افسوسناک باب ہے۔ زندگی "سکرِ دوام" میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہر شخص یک گونہ بیخودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ باغوں کے جلسے، برساتوں کے میلے، حسینوں کے جمگھٹے، شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں، رقص و سرود کی محفلیں، غرض ایک ہنگامۂ نشاط و طرب تھا کہ ہر طرف برپا تھا۔ اور خوب دل کھول کر دادِ عشرت دی جا رہی تھی، لکھنؤ اس بد مستی کا گہوارہ تھا، جانِ عالم پیا کی عشرت گاہ پرستان بن گئی تھی۔ غزالہ آہو، کرشن لیلا اور اندر سبھا کے تماشے ہوتے تھے۔ ساون کی مست پریوں کے گانے، باغوں کے جھولے، قیصر باغ میں دو کپڑے بھی، گلے، جوگن بھی بنی، در در میں پھری، سیال کیلئے کی تانیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام لکھنؤ جھوم رہا ہے، ہیئت کا نظام بدل گیا ہے اور روز و شب کی رنگینیاں قائم ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس زمانہ کی معاشرت کے اگر تمام خد و خال کو ملاحظہ کرنا ہے تو ہمیں اس زمانہ کا لٹریچر دیکھنا چاہئے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت کسی جگہ اس قدر واضح اور روشن نہیں ہے جتنی کہ اس معاملہ میں، اس میں ہمیں زیور و ملبوس، رسوم و آداب، عرسوں کی دھوم دھام، تکلف و تصنع، ظاہر داری، نسوانیت، سامانِ عیش و آرائش اور طرزِ گفتگو کی جیتی جاگتی تصویریں ملیں گی۔ اختر نگر کے شباب کے افسانے، رتجگے کے سامان، وصل کی داستانیں، غرض سب ہی کچھ نظر آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اس محبت بیز و عشق ریز سرزمین میں شعر و سخن کو کتنا دخل ہوگا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مشاعرہ کی یہ صحبتیں معاشرت کا جزو بن گئی تھیں۔ لکھنؤ رشکِ شیراز و صفاہاں بنا ہوا تھا۔ یہ زمانہ ایک طریقہ سے ہمارے عروج کا بھی تھا اور زوال کا بھی۔ فنونِ لطیفہ کے حصول کے لئے جس جوش و خروش کا اظہار اس زمانہ میں ہوا، اسکی نظیر نہیں ملتی۔ ہر شخص شاعر تھا اور اگر شاعر نہیں تھا تو شعر و سخن میں دخل ضرور رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اسی زمانہ میں ہمارے معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا، اسی وجہ سے اسی زمانہ کے بیشتر کلام میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ اس زمانہ کی شاعری تمام تر اجتماعی مفروضات اور معاشرتی میلانات کی مظہر ہے۔ وہی تکلف و تصنع، نسوانیت اور اخلاقی فرو مائگی جو سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہی تھی، شاعری میں بھی جلوہ گر ہے۔ نکتہ آفرینی، دقت پسندی، رعایتِ لفظی، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی فراوانی کا نام شاعری ہو کر رہ گیا۔ آوارگی اور ہوسناکی عشق کی مترادف سمجھی جانے لگی۔ اسی لئے

شاعری نے بھی جامۂ عریانی اختیار کرلیا۔ بے پردہ مضامین، مبتذل الفاظ، سوقیانہ محاورے اور انگیا چوٹی کا ذکر شعر وسخن کی جان ہوگیا۔ یوں سمجھئے کہ انشا اور ان کے ساتھیوں نے جو کام شروع کیا تھا وہ مکمل ہوگیا۔ اور "اختر ستیاں" کی فضا نے اس رنگ کو ایسا اچھالا کہ بقول شخصے ہولی کا سوانگ اور گویا دل کی کیمیا بات ہوگئی۔ اس زمانہ کی شاعری کا رنگ یہ تھا:-

چشم بد دور آج آئنے میں نظر کیا گال سات ... منہ ڈھک گیا عزال شبنم کا چادر ہوا
تصور میں ہے ایک انگیا کی چڑیا ... ہے دل کبوتر کا اب آشیاں ہے
کھولے شوق سے بند انگیا کے ... لپٹ کے ساتھ نہ شرمائیے آپ
دوپٹے کو آگے سے دہرا نہ اوڑھو ... نمود ان چیزوں کی چھپانے سے حاصل

حیرت ہوتی ہے کہ اس فضا میں انیس، دبیر اور مرزا شوق نے زبان و بیان کے کیسے کارنامے دکھلائے۔ نواب مرزا شوق کا نام سنکر کچھ لوگ چونکیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا نام بھی انھیں لوگوں میں شمار کرنا پڑیگا جنھوں نے "لسانی معصیت" کی تلافی میں حصہ لیا ہے اور زمانہ کی روش سے ہٹ کر بالکل صاف اور شگفتہ زبان اختیار کی ہے۔

ہماری پچھلی تنقیدوں کے معیار بھی عجیب وغریب تھے۔ مثنوی زہرِ عشق کی طرف لوگوں نے محض اس وجہ سے توجہ نہیں کی کہ وہ ان کے اخلاقی معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس بیسویں صدی میں ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ میں انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ادب کے جانچنے کی بھی نئی کسوٹیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اب تنقید کا وہ عام معیار نہیں رہا کہ یہ چیز اخلاقی اعتبار سے اچھی ہے یا بری بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اچھی لکھی گئی ہے یا بری۔ اسی طرح اگر مثنوی کو اسکے صحیح پس منظر کے ساتھ جانچا جائے تو مرزا شوق نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ ایک فن کار کی حیثیت سے بھی نظر آئیں گے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم عالم مثال کی مادرائی فضا سے نیچے اتر کر اسی عالم آب وگل کی سیر کریں جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور جیتے ہیں۔

نواب مرزا شوق، المنصور سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمعصر اور آتش مرحوم کے شاگرد تھے۔ ان کا اصلی نام حکیم تصدق حسین خاں تھا۔ نواب مرزا عرف اور شوق تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام مرزا آغا علی خاں لکھنوی تھا اسوقت لکھنؤ کی تمام فضا شاعرگر بنی ہوئی تھی۔ مرزا شوق بڑی موزوں طبیعت رکھتے تھے، لکھنؤ کے کہربائی اثر نے اس ذوق کو اور جلا دی۔ بہت سی غزلیں لکھیں اور غالباً ایک کلیات بھی مرتب کیا ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ مثنوی زہرِ عشق ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی مثنویاں بہارِ عشق، فریبِ عشق، لذتِ عشق لکھیں۔ لیکن جو رتبہ اور مقبولیت زہرِ عشق کو حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں زہرِ عشق کا قصہ جو آپ بیتی کے طور پر لکھا گیا ہے، بہت ہی سادہ ہے۔ شوق ہی میرِ افسانہ ہیں اور محلہ کے

ایک عالی خاندان سوداگر کی اکلوتی اور کنواری بیٹی ہیروئن۔ شوق اس سوداگر کے بارے میں لکھتے ہیں :-

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر ۔۔۔ وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
مرد اشراف ، صاحبِ دولت ۔۔۔ تاجروں میں کمال ذی عزت
غم نہ تھا کچھ فراغ بالی سے ۔۔۔ تھا بہت خاندان عالی سے

اس کے بعد اس کی "خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر" لڑکی کی تعریف کرتے ہیں :-

ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں، ۔۔۔ شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں، ۔۔۔ غیرتِ حور تھی حقیقت میں،
سبزۂ نخلِ گلِ جوانی تھا ۔۔۔ حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
رخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی، ۔۔۔ جو ادا اس کی تھی قیامت تھی،

سوداگر کی بیٹی چال ڈھال کی نستعلیق، خوبصورت اور بلا کی جامہ زیب واقع ہوئی تھی۔ وہ والدین کی چہیتی بیٹی اور گھر کی چشم و چراغ تھی۔ اس لئے سارا گھر اس پر قربان رہتا تھا۔ اسے لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور شعر و سخن سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ جوانی اور شاعری، کسی لڑکی کا خمیرِ حیات ہوجائے تو وہ مرد کے لئے بڑی قیامت خیز ہوجاتی ہے چنانچہ "مرزا" اور سوداگر کی بیٹی ایک ہی نظر میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوجاتے ہیں۔ عشق کی ابتدا اور اس کا پس منظر بڑا دلچسپ اور مناسب ہے اس نے واقعیت اور نفسیاتی کیفیت کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

ایک دن چرخ پر جو ابر آیا، ۔۔۔ کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
کھل گیا جب برس کے وہ بادل ۔۔۔ قوس تب آسماں پر آئی نکل،
دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا ۔۔۔ سیر کرنے کو بام پر آیا،

ہیرو ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے کہ "دختِ سوداگر" باصد رعنائی اپنی ہم جولیوں کے ساتھ موسم کا لطف اٹھا رہی ہے :-

دیکھا اک سمت جو اٹھا کے نظر ۔۔۔ سامنے تھی وہ دختِ سوداگر
ساتھ ہمجولیاں بھی تھیں دوچار، ۔۔۔ دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار
بام سے کچھ اترتی جاتی تھیں، ۔۔۔ چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں،

اتنے میں وہ "گل رو" اکیلی رہ جاتی ہے اور سیر کرنے میں دونوں کی نگاہیں چار ہوجاتی ہیں۔ واہ کے ساتھ اندر سے آہ بھی نکلتی ہے اور حسن و عشق دونوں بے اختیار ہوجاتے ہیں۔ مرزا نے ہیرو کی محویت کا عالم

اس طرح بیان کیا ہے :

سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر   چپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر
دیکھتا اس کو بار بار تھا میں   محو حسن جمال یار تھا میں

اسی بے اختیاری کے عالم میں ایک کنیز آکر لڑکی کو یہ پیام دیتی ہے :-

بیٹھی ناحق ابھی ہوئیں کھانے ہیں،   اماں جان آپ کی بلاتی ہیں،
گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں   چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

لڑکی چلی جاتی ہے، اس کے بعد ہیرو بھی رنج وغم سے لبریز مجبوری کے عالم میں کوٹھے سے اُتر آتا ہے۔ یہ معمولی واقعہ ان دونوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور نظروں کا وہ کیفِ تصادم، جتنا بھلایا جاتا ہے اتنا ہی اور یاد آتا ہے ؎

شام سے پھر سحر کی مر مر کے   شب وہ کاٹی خدا خدا کر کے
پڑ گیا دل میں غم سے اک ناسور   یہی اس دن سے پڑ گیا دستور
دن میں سو بار بام پر جانا   دیکھنا بھالنا، سے چلے آنا،

لیکن اس لڑکی کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی۔ میر افسانہ کا رنج وغم کی وجہ سے برا حال ہو گیا۔ چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ اور بیماروں سے بدتر حال ہو گیا۔ آخر شفیق ماں جس نے بیٹے کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کی تھی، دریافت کیا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ :-

کھاتے ہو، پیتے ہو، نہ سوتے ہو   روز اُٹھ اُٹھ کے شب کو روتے ہو
اللہ آمین سے ہم تو یوں پالیں،   آپ آفت میں جان کو ڈالیں
تیرے پیچھے کی تلخ سب اوقات   دن کو دن سمجھی اور نہ رات کو رات
پالا کس کس طرح نہیں جانی   کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی   جا کے درگاہ، چوکی بھرتی تھی
اب جو نام خدا جوان ہوئے   ایسے مختار میری جان ہوئے

"رخصتِ سوداگر" کی جراحتیں بھی حد کو پہنچ چکی تھیں :-

موج اُلفت اسے ڈبونے لگی   ایک اُلجھن سی دل کو ہونے لگی
گھٹنے طاقت لگی جو روز بروز   آتش ہجر ہو گئی دل سوز
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے   اشک گرم آنکھ سے نکلتے تھے

ہوگئی جب کمال حالتِ زار　　　شب کو رہنے لگا اسے بھی بخار

آخر اس کا دل شدتِ تمنا سے ٹوٹنے لگا۔ صبر و شکیب نے اس کا ساتھ چھوڑا اور عقل نے "پاسبانی" ترک کردی اس نے مجبور ہو کر اپنی ماما کے ہاتھ ایک مختصر سا خط بھیجا۔ ہیرو نے بڑے جوش سے اس محبت کی پذیرائی کی اور جواب میں نامۂ شوق لکھا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا جواب نہایت دلچسپ آیا جس کے لفظ لفظ سے احتراز واجتناب اور غیرت وحمیت ٹپکتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور پیار و محبت میں وقت گزرنے لگا لیکن اس دنیا میں کسی چیز کو استحکام نہیں ہے۔ مسرت کی عمر یوں بھی مختصر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا وقت بھی گزرا لڑکی کے والدین کو اس راز کا علم ہوگیا۔ اس کی نگرانی کی جانے لگی اور یہ تجویز ہوئی کہ اس کو بنارس بھیج دیا جائے دو مہینے تک ان لوگوں کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ بڑی مصیبت سے وقت گزرتا ہے لیکن ایک رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے محبوب کے پاس پہونچ جاتی ہے اور جملہ حالات اور اپنے روح فرسا ارادہ سے مطلع کرتی ہے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب۔ صبح کو وہ کچھ ہو جاتا ہے جو ہمارا جی چاہتا ہے کہ کبھی نہ ہوا ہوتا۔ وہ عشق کی سرکار میں نقدِ جاں نذر کردیتی ہے اور اس کے بعد تقریباً قصہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ عاشق اپنی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکامیاب رہتا ہے اور سخت جانی کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

یہ ایک پرخلوص محبت کی سادی سی داستان ہے۔ جو بہت سادہ انداز میں بیان کردی گئی ہے اسی لئے اس میں سوز و اثر کی نمایاں کیفیت اور جذبات کا اظہار پورے طور پر موجود ہے۔ اس زبان میں مصنوعیت قطعاً نہیں ہے۔ بے تکلفی سادگی اور نغمگی اس کی بڑی خصوصیات ہیں شوق نے عورتوں کی زبان کا بھی حق ادا کردیا ہے۔ انھوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے لیکن یہ رنگ اُن کے یہاں اسی حد تک ہے جیسا کہ بقول آزاد آنکھوں میں سرمہ اور چہرہ پر غازہ، اعتدال سے نہیں گزرے ہیں اور اسی لئے تاثیر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ شوق کے یہاں واقعیت (Realism) اور حسیت (Sensuousness) کا کمال نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی مثنوی غیر معمولی اثرات کی حامل ہے۔ ہمیں تمام مثنوی میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملتی جہاں شوق اثر انگیزی میں ناکام رہے ہوں وہ کوئی ایسی چیز بیان ہی نہیں کرتے جو قدرت کے مسلمات کے خلاف ہو یا فطرت کے اُصولوں سے متصادم نظر آتی ہو۔ ان کی زبان سادہ، بامحاورہ اور پر اثر ہے تشبیہیں اور استعارے قریب الماخذ ہیں، واقعات ایسے ہیں جو اس دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کے کردار بالکل اسی دنیا کے انسان ہیں، جن میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ اچھائیاں بھی اور برائیاں بھی۔ لیکن اُن میں سے ہر ایک ہماری ہمدردیاں حاصل کرتا ہے اور ہم بہت خوشی کے ساتھ اس کی ہر اچھی بری بات میں شریک رہتے ہیں۔

شوق کی مثنوی زہرِ عشق کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ان کا اپنا واقعہ ہے جس کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اُن کے حالات زیادہ نہیں معلوم اس لئے اس سلسلہ میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی لیکن شوق نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کرکے قصہ کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں اس پر واقعہ کا شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ ایک فنکار کا بڑا کمال ہے۔ شوق کے کردار ایسے نہیں ہیں جو اس عالم کی چیز نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اس کی ہیروئن ایک شریف سوداگر کی بیٹی ہے اور اس کی سوسائٹی میں وہی پوزیشن ہے جو ہیرو کی۔ دونوں ایک محلہ میں رہتے ہیں۔ پھر عشق کی اس داستان سرگشتگی کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہ کوئی جنگل، پرستان، کنج باغ، یا دریا کا کنارہ نہیں ہے۔ وہ صرف مکان کی چھت ہے۔ جو لکھنؤ کے ایک گوشہ میں واقع ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا اصلیت کا ثبوت ہوسکتا ہے۔ عشق کی یہ ابتدا بہت سادہ ہے۔ اودھ کی شام ہے پانی برس کر ابھی ابھی کھلا ہے۔ قوس قزح نکل آئی ہے۔ سوداگر کی لڑکی اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ موسم کا لطف اُٹھا رہی ہے۔ ایسے میں ہیرو کی نظر جو اپنا دل بہلانے کے لئے اوپر چلا آیا ہے، لڑکی پر پڑتی ہے، اور نگاہوں نگاہوں میں دل کا سودا ہوجاتا ہے۔ یہ بات غیر معمولی ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ان لوگوں کی مراسلت اور ملاقات بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام قصہ میں صرف دو جگہیں ایسی ہیں۔ جہاں "ناممکن" کا گمان ہوتا ہے یا اگر ایسا نہیں تو طبیعت میں شک اور شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ماں اور بیٹے کی گفتگو بڑی حیرت انگیز ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے کی حالت پر ماں کا پریشان ہونا، بالکل بجا اور درست ہے لیکن انیسویں صدی میں اور وہ بھی لکھنؤ کے اندر جہاں کہ شریف گھرانوں میں اخلاق و آداب انتہا سے زیادہ برتے جاتے تھے، یہ بات ذرا انوکھی معلوم ہوتی ہے کہ ماں، بیٹے سے یہ سوال کرے :-

رنج کس شعلہ رو کا کھاتے ہو   شمع کی طرح پگھلے جاتے ہو
کون سی ماہرو پہ مرتے ہو   سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو
یہ کہو مہ جبیں ملا ہے کون ؟   تم کو ایسا حسیں ملا ہے کون؟

یہ سوالات اگر کسی دوست کی زبانی ہوتے تو زیادہ اچھے معلوم ہوتے۔ لیکن ماں کی محبت باؤلی ہوتی ہے۔ شاید عزیز بیٹے کا بُرا حال دیکھ کر یہ سوالات بھی کر بیٹھی ہو۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں یہ "مرض" بہت عام تھا۔ مگر باوجود اس کے پرانے خاندان اور شریف گھرانے کا خیال کرکے اس چیز کے باور کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اسی طرح مثنوی کا اختتام بھی فن کے اعتبار سے کچھ اچھا نہیں ہے۔ آخر میں ایک دم سے جذباتی دلکشی (Emotional Appeal) کم ہوجاتی ہے۔ عاشق محبوب کے مرنے کے بعد قبر پہ آہ و زاری کرتا ہے۔ پھر گھبرا کر زہر کھا لیتا ہے، لیکن عجیب و غریب طریقہ سے بچ جاتا ہے۔ قصہ کا خاتمہ بہت عجلت کے ساتھ کیا گیا ہے اور

اس میں کوئی خاص سلیقہ نہیں برتا گیا۔ پلاٹ کے اور واقعات کے ساتھ ساتھ اختتام بھی سادہ ہے لیکن اس سے صناعانہ تکمیل کا پتہ نہیں چلتا۔ برناڈ شاہ نے اپنے حزنیہ "سینٹ جون" میں انگریز پادری کا کردار بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور آخر میں جذباتی دلکشی کو اور بڑھا دیا ہے۔ وہ اب تک جون کے خون کا پیاسا تھا، لیکن آخر میں اس کا ضمیر بغاوت کرتا ہے اور وہ یہ کہہ اُٹھتا ہے :- "مسیح، مسیح، میرے حال پر رحم کر، وہ تیری آغوش میں ہے اور میں ـــــ ہمیشہ کے جہنم میں ـــــ" مثنوی کے ہیرو اور پادری کے کیرکٹر میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن پھر بھی "دیکھا آنکھوں سے تھا جو ایسا قہر" کے بعد ہم زہر اور اس سے بچ جانے کے معمولی نتائج سے زیادہ کوئی اہم اور موثر اختتام چاہتے ہیں۔ مثنوی کا جو اختتام ہے اس کے جواز میں اگر کوئی بات کہی جا سکتی ہے تو صرف یہ کہ ہیروئن کی وصیت اس کے ترتیب دینے میں بڑی امداد دیتی ہے اور ہیرو اسی کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔
تیسرا اعتراض جو مثنوی پر ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس کی ساری داستان صرف ہیروئن کے کردار پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کیرکٹر اتنا دلچسپ نہیں معلوم ہوتا۔ قصہ میں تنوع بھی نہیں ہے۔ اور مسلسل یکسانی کو دور کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ لیکن قصہ کے اختصار نے اس نقص کو بڑی حد تک چھپا لیا ہے۔

مثنوی کا قصہ بہت مختصر اور سادہ ہے اسی لئے اس میں زیادہ اشخاص نظر نہیں آتے۔ اس میں ہیرو، ہیروئن دونوں کی مائیں اور ایک کنیز کو پیش کیا گیا ہے لیکن ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ اور کوئی کچھ کام نہیں کرتا۔ میرا افسانہ کی ماں، بیٹے کی حالت پر مضطرب ہے اور ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اس سے چند سوالات کرتی ہے لڑکی کی ماں روتی ہوئی اور پریشان دکھلائی گئی ہے اس کی کیفیت بالکل موقع کے مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ قاری اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کنیز تمام قصہ میں صرف ایک جملہ زبان سے نکالتی ہے :-

"چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں"

میرا افسانہ کا کردار کسی نمایاں خصوصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ اگر بامعان نظر دیکھا جائے تو اس میں چند ایسی خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے مثنوی ختم کرنے کے بعد اس سے کوئی خاص ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اس کی کچھ باتیں ہمارے اوپر بہت برا اثر چھوڑ جاتی ہیں اور بعض تو پہلی نظر میں بالکل ناقابل معافی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ شروع ہی سے کچھ دلگیر، مستغرق اور مجہول قسم کا انسان نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس سے کوئی عمل (بمعنی Action) سرزد نہیں ہوتا۔ ہر چیز کی ابتدا ہیروئن کی طرف سے ہوتی ہے۔ مرزا نے عاشق کی حالتِ ہجر بہت تفصیل سے دکھلائی ہے اور بتلایا ہے کہ اس کا حال بالکل بیمار دل کا سا ہو گیا تھا۔ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ ہر وقت روتے ہی گزرتی تھی لیکن اس عرصہ میں وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کی ہمت اور عمل کا ثبوت ملے۔ اس وقت بھی ہیروئن ہی نسبتاً ہمت سے کام کرتی ہے۔ ممکن ہے اسے سہولتیں حاصل ہوں لیکن ہیرو کو یہ ثبوت نہیں ملتا

ہیروئن اسے خط بھیجتی ہے۔ ہیرو اس کا جواب دیتا ہے اور اس میں اپنی محبت کو ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن اسکے "عدم عمل" کے مقابلہ پر یہ فقرے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے :-

بن گئی یاں تو جان پر میری خوب لی آپ نے خبر میری
ہجر میں مر کے زندگانی کی اب بھی پوچھا تو مہربانی کی

وہ اپنے صبر و ضبط اور خودداری کا ثبوت اس طرح دیتا ہے :-

مر گئے ہم تو رنج فرقت سے پر خبر کی نہ اپنی حالت سے

لیکن آگے کے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ خودداری نہیں بلکہ بے عملی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اسوقت تھا جب لڑکی دو مہینے تک نہیں آتی اور وہ اس کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے سخت موقع پر وہ محبت کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود صرف اتنا سوچ کر رہ جاتا ہے :-

کون ایسا ہے جائے گھر اس کے کس کو بھیجوں مکان پر اس کے

اسوقت بھی ہیروئن ہی مستعدی کے ساتھ کام کرتی ہے اور ہیرو اشکباری سے زیادہ اور کسی چیز سے اپنی محبت کا ثبوت نہیں دیتا۔ "آخری منظر" میں اس کا عدم عمل (Inaction) قاری کے لئے بالکل ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ محبوب کو اپنے مہلک ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کوئی موثر اقدام نہیں کرتا۔ وہ صرف منع کرتا ہے اور وہ بھی کچھ ایسے انداز میں جو موقع کی نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ کہتا ہے :-

پہونچا ماں باپ سے اگر ہے الم اس کا کرنا نہ چاہئے تمہیں غم
صدمہ ہر ایک پہ گزرتا ہے زہر کھا کے بھی کوئی مرتا ہے
شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے ان کا اولاد پر بڑا حق ہے
ہوں جو ناراض یہ قیامت ہے اُن کے قدموں کے نیچے جنت ہے
تم تو نام خدا سے ہو دانا اس پہ رتبہ نہ ان کا پہچانا
غور سے کیجئے جو دل میں خیال، اُن کا غصہ نہیں ہے جائے ملال

عاشق محبوب کی دشواری کو کسی طرح حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی نہ کوئی امداد کرتا ہے اور نہ اسے کوئی مشورہ دیتا ہے۔ اس کی مجہولیت اور بے عملی کا سب سے افسوسناک ثبوت شاید اسی شعر میں مضمر ہے :-

کون روکے گا جا کے گھر بیٹھے جو کہا ہے وہی نہ کر بیٹھے

اور اس کے تساہل اور عدم عمل کا شاید اس سے زیادہ صحیح مرقع مثنوی بھر میں نہیں مل سکتا :-

ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں چپکا روتا تھا بیٹھا میں محزوں

اس کے بعد ہی شور ماتم اٹھتا ہے اور محبوبہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

ان تمام واقعات کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ عاشق صحیح معنوں میں محبت نہیں کرتا بلکہ اسکا مطمح نظر صرف بوالہوسی ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ مثنوی میں اس کا پورا ثبوت موجود ہے کہ اسے محبوبہ سے محبت ہے اس کی ہر تکلیف سے آزردہ ہوتا ہے۔ ہجر میں اس کی حالت بالکل غیر ہو جاتی ہے وہ پہچانا نہیں جاتا۔ لوگ اسے دیکھ کر مہینوں کا بیمار سمجھتے ہیں۔ آخری ملاقات میں اس کی اشکباری اور آزردگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ محبوبہ کی تسلی کے الفاظ بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں :-

رو نہ اس طرح سے تو زار و قطار دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں

میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مر کیوں سجائی ہیں آنکھیں رو رو کر

اپنے تئیں بیزار ہوتے ہیں یوں کہیں مرد وے بھی روتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ مرزا شوق نے ہیرو کو بالکل معمولی انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ ان کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت ہے۔ ہیرو غیر معمولی خصوصیات کا حامل نہیں ہے بلکہ اوسط درجہ کا ایک شخص ہے جس سے ہمیں زندگی میں روز سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے افراد میں عملیت سے زیادہ جذباتیت بھری ہوئی تھی اور لوگ تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قایل تھے۔ شوق کا ہیرو بڑی حد تک زمانہ کا نمونہ ہے۔ وہ خطرات کا عادی نہیں ہے اور مردانگی سے زیادہ نسوانیت کا مظہر ہے۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ محبوب سے محبت نہیں رکھتا۔ یا انیسویں صدی کا ایک آوارہ گرد بوالہوس ہے، سراسر زیادتی اور اس کے کردار سے صریح ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس کی محبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کی وصیت پر ہر ممکن طریقہ سے عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو زہر کھا لیتا ہے۔ جانبر ہونے کے بعد بھی اس کی سخت جانی اور بیچارگی ظاہر ہے:

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی دل دیا غم سے آشنائی کی

ان تمام واقعات کی روشنی میں میر مثنوی کے محبت و خلوص پر شک کرنا بڑا ظلم ہوگا تمام مثنوی میں ایک موقع بھی ایسا نہیں ملتا جہاں اس کی اشکباری اور دلفگاری کا کافی ثبوت موجود نہ ہو۔ وہ حسیات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی ہے لیکن عمل کے اعتبار سے نہایت کمزور قسم کا انسان ہے۔ اس کے کردار میں بطلانہ اور جوانمردانہ رنگ نہیں ہے۔ آخر میں زہر کھا لینا اس کی عملیت سے زیادہ محبت کا ثبوت ہے لیکن مرزا نے ایک اچھے حقیقت نگار کی طرح یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اسے خواہ مخواہ معمولی انسانوں سے بلند تر کر کے دکھلائیں اور اس طرح

مثنوی کی اصلیت اور واقعیت کو مجروح کردیں ۔ مرزا نے ہیروئن کو ہیرو سے بلند تر دکھلایا ہے اور یہ خوبی یا خرابی (؟) شیکسپیئر کے بھی اکثر ڈراموں میں پائی جاتی ہے ۔

مرزا نے ہیروئن کے کردار پیش کرنے میں بڑی صناعی اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے ۔ عام افسانہ کے کیرکٹر کی طرح اس میں عمومیت نہیں پائی جاتی ۔ وہ نہایت اعلیٰ تصوریت اور مثالیت کی حامل ہے ۔ اس کے خیالات میں بلندی، استواری اور مضبوطی پائی جاتی ہے ۔ اس میں محبت، حمیت، ایثار اور عمل کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ اخلاقی قوت، مستقل مزاجی اور استواریٔ طبیعت کے لحاظ سے ہیرو پر فوقیت اور برتری حاصل ہے وہ عام انسانوں سے بلند ہے لیکن اس دنیائے آب و گل سے بالکل علیحدہ اور غیر متعلق بھی نہیں ہے غرض اگر اس کے کیرکٹر کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو وہ کمالیات اور سیرت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ نظر آتی ہے ۔ ہیروئن ایک شریف اور متوسط الحال طبقہ کی پڑھی لکھی لڑکی ہے اور صورت، شکل، چال ڈھال اور اخلاق میں اپنا مثال نہیں رکھتی ۔ مرزا نے اس کی خوبصورتی اور جوانی کی تعریف اس طرح کی ہے :۔

سبز نخل گل جوانی تھا ۔۔۔۔ حسن یوسف فقط کہانی تھا
رخ پہ گیسو کی ہیں آفت تھی ۔۔۔۔ ہر ادا اس کی تھی قیامت تھی

ایک رنگین شام کو وہ محبوب نظریں ملتی ہیں اور آن کی آن میں دلوں کی دنیا تاراج ہوجاتی ہے ہیروئن کے اوپر بھی عشق کا آہستہ آہستہ اثر ہوتا ہے :۔

چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے ۔۔۔۔ دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوش فریاد قلب سننے لگے ۔۔۔۔ خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
درد غم دل کو آگیا جو پسند ۔۔۔۔ سونا راتوں کا ہوگیا سوگند
موج الفت اسے ڈبونے لگی ۔۔۔۔ ایک اُلجھن سی دل کو ہونے لگی

اب وہ "چوں اشک از سر مژگاں چکیدم نم بنگر" کی مجسم تصویر تھی ۔ ایک قطرۂ گریۂ بے اختیار تھی جس کو آغوش دامن سے محروم کردیا گیا تھا ۔ اس کی طاقت کی کمی کے ساتھ ساتھ دل کا صبر و شکیب بھی رخصت ہونے لگا اور آخرکار اس نے بالکل مجبور ہوکر ایک خط لکھا جس کو ایک ماما کے ہاتھ میر مثنوی کے پاس بھیجدیا ۔ لڑکی کی یہ جسارت بہت زیادہ بحث و تمحیص کا موضوع رہی ہے اور بہت سے لوگوں نے اسی بنا پر اسے "بے حیا" کا خطاب دیا ہے ۔ سچ ہے فلسفہ جذبات سے ناآشنا منطقی اور مباحث علمیہ کے ماہرین ہذیان محبت کو اس سے زیادہ اور کیا سمجھ سکتے تھے ! لیکن محبت، اخلاق کے ان سخت اور جابر نظریوں کو تسلیم نہیں کرتی ۔ دل کی تڑپ عقلیات کے اصولوں کی پابند نہیں ہے ۔ عشق کی آگ ان معمولی حدبندیوں کو مسمار کردیتی ہے اور اس لئے [illegible] ہے

اس "صہبائے آتشیں" کو جانچنے کے لئے عقل و خرد کے ادنیٰ پیمانے کام نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ہیروئن نے تحریر میں غیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے غیرت و حمیت ٹپکتی ہے۔ لکھتی ہے :-

اس محبت پہ ہو خدا کی مار جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
سارے الفت نے کھو دئے اوسان ورنہ یوں لکھتی ہیں، خدا کی شان
اب کوئی اس میں کیا ذلیل کرے جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

عاشق اس خط کا جواب نہایت جسارت آمیز لہجہ میں لکھتا ہے :-

اب جو بھیجی ہے آپ نے تحریر ہے یہ لازم کرو کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں دل کی سب حسرتیں نکل جائیں

اس خط کو دیکھ کر اس کے تخیل کو صدمہ پہونچتا ہے اور وہ ایسا جواب نامہ لکھتی ہے جو صحیح معنوں میں اس کی غیرت و حمیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے :-

تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی

آگے چل کر لکھتی ہے :-

تجھ پہ مرتے بھی گر مرے بدخواہ یوں نہ لکھتی کبھی معاذاللہ
جان پاپوش سے نکل جاتی، پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی

اسے اپنے خاندان کی عزت و شرافت کا پورا احساس ہے اس کا ثبوت مثنوی میں جا بجا ملتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اُسی کے تحفظ کے لئے محبت سے مجبور ہو کر جان قربان کر دیتی ہے اپنے دوست کو وصیت کرتے وقت بھی وہ اس پر بڑا زور دیتی ہے :-

ضبط کرنا، اگر ملال رہے، میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

پھر ہدایت کرتی ہے :-

تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مرا نام منھ سے نہ لیجئے گا مرا
آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

غرض تمام مثنوی میں بلا مبالغہ چودہ پندرہ جگہ اسی قسم کا تذکرہ ہے جس سے اپنی اور خاندان کی عزت و حرمت کا پاس اور لحاظ پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ احتراز و اجتناب کے بعد "وصل کا اقرار" ہوتا ہے اور اس "اعتراف شکست" کے بعد بالکل واقعات کا رخ بدل جاتا ہے۔ دونوں کے لئے دنیا محض "محبت" کا نام ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک حسین خواب ہے جو مجسم ہو جاتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں، عہد و پیمان ہوتے ہیں، عمر بھر نباہ کے اقرار کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ مسرت دیرپا نہیں ہوتی۔ والدین پر یہ راز افشا ہو جاتا ہے اور وہ ہیروئن کو بنارس بھیجنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ہیروئن کے لئے یہ گویا ایک سزا ہے جو فلک نے مروجہ ضابطہ اخلاق کے خلاف بغاوت کرنے کے سلسلہ میں تجویز کی ہے لیکن ہیروئن اسے قبول نہیں کرتی وہ اسے حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ ایک بلند ہستی ہے جو اپنی دنیا آپ بناتی ہے اور اپنے بے پناہ عزم اور منشا سے واقعات کا رخ بدل دیتی ہے اس کی تخلیق محض نزاکت اور جمال ہی کی مظہر نہیں ہے بلکہ اس میں عزم اور ارادہ کی بھی ایسی بلندی ودیعت ہوئی ہے جو اسے کسی جبر کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی وہ اپنے آہنی عزم کے ساتھ عاشق سے آخری بار ملنے جاتی ہے اور اسے تمام واقعہ سے آگاہ کر دیتی ہے۔ یہ منظر نہایت دلدوز ہے اور اثر انگیزی کے اعتبار سے شاید ہی اس کی کوئی مثال اردو لٹریچر میں مل سکے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی روح کی امانت کو موت کے سپرد کر دیتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسے موت کی ہیبتناک صورت اسے ڈراؤنی نہیں معلوم ہوتی۔ سکرات کی تلخی اور نزع کی پر ظلمت تکلیف کا احساس اسے پریشان نہیں کرتا۔ اس کی ہر ہر ادا سے ملکوتی سکون اور ارادہ مضبوطی ظاہر ہوتی ہے اور ان سب پر جو چیز غالب ہے وہ بے غرضی، جذبہ محبت اور حمیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نے اس کے اوپر سے خودکشی کی برائی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے   موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خون دل کب تلک پیئے کوئی   بے حیا بن کے کیا جیئے کوئی
نوع انسان بے حمیت ہو   آدمی کیا نہ جس کو غیرت ہو
کہتی ہے بار بار ہمت عشق   ہے یہی مقتضائے غیرت عشق
چار پائی پہ کون پڑ کے مرے   کون یوں ایڑیاں رگڑ کے مرے
عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں   آج ہی جان کیوں نہ کھو جائیں

ہیروئن کا تمام کردار اس سے بہتر اور مختصر الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا:-

گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی   مگر اپنی سی میں نباہ چلی

اس کی لغزش کو لوگ لغزش کہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسی جسارت، دلکشی اور خوبصورتی موجود ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس آخری منظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آسمانی دوشیزہ ہے جو بکمال رعنائی و دلفریبی اسی مادیت آبادِ ارضی پر اتری، ٹھہری اور جلدی لوٹ گئی رخصت ہوتے وقت اس کے یہ الفاظ معمولی بھول سے دور نہیں ہو سکتے۔ کہتی ہے ؎

اب فقط یہ ہے خوں بہا میرا — بخش دیجو کہا سنا میرا
ماں سے لے کر بلائیں تا بہ قدم — بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کمبخت — بام پر آئی تھی میں کون سے وقت
پھر یہ بولی وہ پونچھ کر آنسو — میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو
آزماتی تھی تجھکو کہتی تھی — میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی

ہیروئن کی ساری زندگی صرف ایک لفظ محبت سے عبارت ہے۔ وہ اسی کے لئے زندہ ہے اور اسی کیلئے مرتی ہے۔ عاشق کا ذرا سا اضمحلال اسے بے چین کر دیتا ہے ؎

دل کو اپنے کرو ملول نہیں — رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں
ہم کو کیا ہے جو اپنے دل کو کڑھائے — ہم کو ہے ہے کرے جو اشک بہائے

پھر مضطرب ہو کر کہتی ہے ؎

رونا اس طرح سے تو زار و قطار — دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
آپ اچھے بھلے بگڑ جائیں — اور لینے کے دینے پڑ جائیں
میں دل و جاں سے ہوں فدا تیری — لے کے مر جاؤں میں بلا تیری
میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مر — کیوں ہوا بائی ہے آنکھیں رو رو کر
اشک بہتے ہیں ناگوار ترے — تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں — یوں کہیں مرد بھی روتے ہیں

پھر معشوق نے ارادۂ خودکشی پر کہتی ہے :-

کون سا پڑ گیا ہے رنج و محن — جان کیوں دیں گے آپ کے دشمن
تم نے جی دینے کی جو کی تدبیر — حشر کے روز ہوں گی دامنگیر
تو سلامت جہاں میں رہ مری جاں — نکلیں ماں باپ کے ترے ارماں
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا — چاند سی بہو گھر میں بیاہ کے لا

پھر موت سے کھیلتے ہوئے، ذرا ان الفاظ کے ادا کرنے کے لئے جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرمائیے

مرگ کا کس کو انتظار نہیں　　زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
خوب سا آج دیکھ بھال لو تم　　دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں　　ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

یہ جذباتیت اور اس کی فطریت بھی ملاحظہ فرمائیے :-

کل گلے سے کسے لگاؤ گے　　یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
حال کس کا سنائے گی آکر　　کس کی ماما بلانے گی آ کر
ہم تو اُٹھتے ہیں اس مکان سے کل　　اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں　　پان کل کے لئے لگاتے جائیں

رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ اسے اس کا ایک دم سے خیال آتا ہے اور بے چین ہو جاتی ہے لیکن اس تلخی تلاطم کے نیچے بھی جوشِ محبت، حسیت اور استواریِ عزم کا بے پناہ سمندر لہریں مارتا ہوا نظر آتا ہے :-

بولی گھبرا کے پھر ٹھہر مری جان　　کچھ سنا بھی کہ کیا بجا اس آن
حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے　　اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
گود میں اپنی پھر بٹھا لو تم　　پھر گلے سے ہمیں لگا لو تم
ڈال دو پھر گلے میں باہوں کو　　پھر گلوری چبا کے منہ میں دو
پھر کہاں ہم، کہاں یہ صحبت یار　　کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار
پھر مرے سر پہ رکھ دو سر اپنا　　گال پھر رکھ دو گال پر اپنا
پھر اسی طرح منہ کو منہ سے ملو　　پھر وہی باتیں پیار کی کر لو
لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی　　بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھا لو تم　　پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر بلائیں تمہاری یار لیں ہم　　آؤ پھر سر سے سر اتار لیں ہم

موت اور اس کی قربت نے اس نفسی واردات اور حیاتی بیان میں سوز و گداز اور حسرت و ارمان کی جو نمایاں کیفیت پیدا کر دی ہے وہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے الفاظ میں نہیں سما سکتی۔

رات گزرتی جاتی ہے، ہر لمحے کی آواز موت کا تازہ پیام ہے۔ ہیروئن گھبرا جاتی ہے، اس نفسیاتی حالت [illegible] نے خوب دکھلایا ہے :-

مردنی رخ پہ چھا گئی اس کے دل میں وحشت سما گئی اس کے
دل پہ گزرا جو اس کے تیغ کا تنگ ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک
ٹھنڈی جسدم چلی نسیمِ سحر ہو گیا حال اور بھی ابتر
اتنے میں صبح کی ہوئی زردی ہو گئی زرد چہرے کی زردی
ہوئے ثابت جو صبح کے آثار ہو گئی اور اس کی حالت زار
بید کی طرح جسم تھرایا سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں کرتی جو تھیں سو بھول گئی دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

لیکن وہ ـــ معمولی عورت نہیں ہے۔ اس کا خمیر حیات محبت دجرأت سے گوندھا گیا ہے وہ سراسر "ہمتِ عشق" ہے جس نے جسم اختیار کر لیا ہے وہ فوراً اپنی کمزوری پر قابو پالیتی ہے اور کہتی ہے ؎

"بخش دیجیو کہا سنا میرا" پھر "میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو"

اور بالکل چلتے وقت :-

"آزماتی تھی تجھ کو کستی تھی، میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی"

سبحان اللہ! اس دنیا کی ایک لڑکی، دنیا کی ہوتے ہوئے بھی، اس دنیا سے اور کیا دور ہو سکتی تھی؟ مثالیت کا اس سے زیادہ اور کیا عروج اُسے حاصل ہو سکتا تھا۔ مادیت اور روحانیت ([illegible]) کا اس سے خوبصورت اجماع (Conflux) اور کیا ممکن تھا لیکن نامراد زیست، جوان ارمانوں کی مالک ومنظہر لڑکی، ایک "ستارہ" ہے، اس عالم سے دور اور نزدیک، جس کی ضیاپاشیاں ہماری روح میں طوفانِ نکہت و نور برپا کر دیتی ہیں، نہیں - بلکہ یہ لطف ہمارا مائیہ خمیر بن جاتا ہے اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بغیر روح اور جسم کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائے گا۔

مثنوی زہر عشق میں زبان، منظر کشی، جذبات نگاری اور نفسیاتی واقعیت کا اعجاز نظر آتا ہے۔ بعض اخلاقی مضامین مثلاً دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی کے بھی نہایت اعلیٰ مرقعے ملتے ہیں۔ روزمرہ اتنی صفائی کے ساتھ دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ اسی طرح عورتوں کی زبان بالکل انھیں کے انداز میں لکھی گئی ہے اور مرزا نے اس کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے ساری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے لایق ہے یہاں چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

سبز نخلِ گلِ جوانی تھا حسن یوسف فقط کہانی تھا
بام سے کچھ اُتر تی جاتی تھیں چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں،   چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں
میرے بچے کی جو کڑھائے جان   سات بار اس کو میں کروں قربان
اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں،   آپ آفت میں جان کو ڈالیں
اب جو نام خدا جوان ہوئے   ایسے مختار میری جان ہوئے
چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے   دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوش، فریادِ قلب سننے لگے،   خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
موجِ الفت اسے ڈبونے لگی   ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی
اس محبت پہ ہو خدا کی مار   جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
سارے الفت نے کھو دئے اوسان   ورنہ یہ کھتی میں، خدا کی شان
تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی،   کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
کالا دانا ذرا اتروا لو،   رائی لون اس سمجھ پر کر ڈالو
جان پاپوش سے نکل جاتی،   پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی،
مالزادی نہیں یہاں کوئی   جو کرے تم سے گرمیاں کوئی
دیکھ تحریر فیل لائے آپ   خوب جلدی، مزے میں آئے آپ
جائے عبرت سرائے فانی ہے   موردِ مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے   آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے،
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم   آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے، نوجواں تھے جو   صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی،   نام کو بھی نہیں نشاں باقی
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے   یہی دنیا کا کارخانہ ہے،
موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ، کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں   موت عینِ حیات ہے اس میں
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے   تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
عمر بھر کون کس کو روتا ہے   کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں   ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

حسرت دل نگوڑی باقی ہے ___ اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں، ___ اور لینے کے دینے پڑ جائیں
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں ___ یوں کہیں مرد وے بھی روتے ہیں
کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور ___ کہتی ہوں کچھ نکلتا ہے کچھ اور
نوج، انسان بے حمیت ہو ___ آدمی کیا، نہ جس کو غیرت ہو،
آنہ باقی تھی تجھ کو کستی تھی ___ میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے ___ جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
ہوئیں کس بات پر خفا بولو ___ اماں واری، ذرا جواب تو دو
ترکِ عادت بھی اک عداوت ہے ___ رات کا جاگنا قیامت ہے

"قصۂ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو چکے تھے، مثنوی زہرِ عشق، اردو شاعری میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور اپنے حیاتی رنگ کے اعتبار سے بڑی مکمل چیز ہے، اور اسکے حسین اثرات اور اثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر کسی طرح بیک جنبش لب اعتراف کیا جا سکتا ہے تو صرف ڈیوس کے حسب ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی شاعری کا کوئی جامہ تعریف ایسا نہیں ہے جو مرزا کی مثنوی پر اتنا چست بیٹھتا ہو:-

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سانسوں کی آمد و شد پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس تعداد پر کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا نکار ج ہو۔ اب خواہ یہ دونوں صورتیں کسی جذبہ محبت کے ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور حیات بخش نظارہ چیز کو دیکھ کر عمل میں آویں"

خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے

اگر اکتوبر کا پرچہ آپ کو نہیں پہونچا

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ بھیجئے۔ نومبر ختم ہونے کے بعد آٹھ آنے کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ادب اور اسکے مقاصد

میرے ہموطن اور نوجوان ادیب جناب فضل الدین صاحب اثرؔ ایم۔ اے۔ سیمابی اکبرآبادی کو ادب اور اسکے مقاصد پر ایک مضمون سپرد قلم فرمانا تھا (جو نگار بابت اگست ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا ہے) اور انھیں مناسب نظر آیا کہ وہ اپنے اس مضمون کی بنا میرے اُس مضمون کی تنقید پر رکھیں جو نیا ادب لکھنؤ کے پہلے نمبر میں "ہمارا ادب اور زمانہ کے تقاضے" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ ان کی بصیرت افروز تنقید سے مجھے جو روشنی پہونچی اس کے لئے میں اثرؔ صاحب کا شکر گزار ہوں۔

تنقیدی مجادلہ یعنی "جواب بعد الجواب" سے میں سمجھتا ہوں کوئی فایدہ مترتب نہیں ہوتا اور مقصد تنقید فوت ہو کر اصل نقطۂ بحث کی گرما گرمی میں غائب ہو جاتا اور ذاتی پرخاش کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ نقد کے سلسلہ میں میں اس کو کافی سمجھتا ہوں کہ نقاد اپنے اعتراضات پیش کر دے اور پھر پڑھنے والوں کو فیصلے کا حق استعمال کرنے دیا جائے۔ یہی میں کرتا اگر فاضل نقاد نے میرے مفہوم کو صحیح طور پر پیش کیا ہوتا یا جیسے بھی پیش کیا تھا اسی پرچے میں شایع کرتے جس میں میرا مضمون چھپا تھا چنانچہ میں ناظرین نگار اور خود فاضل نقاد کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ میں اپنے مضمون کو صحیح طور پر پیش کرنے کے لئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد پڑھنے والوں کو حق ہوگا کہ وہ مجھے ان تمام باتوں کا ملزم سمجھیں جو اثرؔ صاحب نے اپنے مضمون میں فرمائی ہیں یا اسکے خلاف۔ لیکن اگر اسکے بعد اثرؔ صاحب نے "جواب الجواب" کی زحمت فرمائی تو میں ابھی سے ہتھیار ڈالدینے کا اعلان کئے دیتا ہوں۔

میں یہ کہنے کی جرأت نہ کروں گا کہ فاضل نقاد نے میرے مضمون کو دانستہ غلط سمجھا، البتہ بلا توقف اعتراف کر لوں گا کہ میں ہی اپنے مضمون کو ان کے لئے قابل فہم نہ بنا سکا۔ میں ان کو یہ الزام بھی نہیں دینا چاہتا کہ انھوں نے میرے مفہوم کو اپنے لفظوں میں پیش کر کے اس کا مطلب ہی بدلدیا ہے اور فاضل نقاد الفاظ کی نشست بدل جانے کے ساتھ مفہوم میں فرق ہو جانے کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ مگر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فاضل نقاد نے میرے مضمون سے جو استنباط کئے ہیں وہ ایسی ذہنیت کے ہیں جیسے کوئی قرآن سے "نماز کے قریب نہ جانے کا" استدلال کرے۔

ادبی مسلک کے اعتبار سے میں واقعیت نگاری کا قایل ہوں جیسے دنیا میں اور بہت سے آدمی قایل ہیں اور ۔۔۔ کی اشاعت کے لئے میں نے ناظرین نیا ادب کے سامنے اپنے مضمون کی ابتدا ان الفاظ سے

کی تھی :-

"اس زمانے میں ہر قوم کا ادب حقیقت نگاری کے راستے پر چل رہا ہے۔ حقیقت نگاری" آرٹ برائے زندگی کی قائل ہے۔

. . . . چنانچہ حقیقت نگاری کے تحت جو ادب پیدا ہو رہا ہے اسے تعمیری ادب کہا جاتا ہے"

فاضل نقاد نے اپنے مضمون میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس کی بناء پر میں انھیں "مطمحی" مسلک ادب کا پیرو یعنی "ادب برائے ادب" کا قائل سمجھتا ہوں۔ اس لئے ان کو میرے ادبی عقیدے سے اختلاف ہونا ہی چاہئے لیکن ان کا تنقیدی منصب یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے واقعیت نگاری کے مسلک کی تنقید کر کے بتاتے کہ آرٹ برائے زندگی کا مسلک صحیح نہیں ہے۔ مگر شاید انھوں نے سمجھا ہی نہیں کہ ادب کے باب میں میرا ان کا اصولی اختلاف ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھوں گا کہ واقعیت نگاری کے مسلک کو باطل قرار دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ میرا قومی ادب کے لئے اُس کے اندر عام قومی عادات و خصائل نظر آنے کی شرط لگانا ذیلی استدلال تھا جو واقعیت نگاری کے عقیدے کے تحت تھا فاضل نقاد اگر اصل عقیدے کی تردید نہیں فرما سکتے تو پھر میرا ذیلی استدلال اپنی جگہ اٹل رہے گا۔

اسی بحث میں فاضل نقاد نے تحریر فرمایا ہے "لطیف صاحب اگر ادب کے مفہوم پر غور کر لیتے تو ان کے اصول دوسرے ہوتے"۔ لیکن یہ لکھتے وقت فاضل نقاد نے میری معذوری پر نظر نہیں کی۔ اور میری معذوری خود فاضل نقاد کی تحریر سے ثابت ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"ادب کیا ہے ؟ یہ سوال بہت مرتبہ پوچھا جا چکا ہے۔ لیکن عام رائے یہ ہے کہ اس کا صحیح جواب اب تک کسی نے نہیں دیا مجھے اس گمان سے اتفاق نہیں۔ میں نے اپنے ایک انگریزی مقالے میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے"

اثر صاحب کے مضمون کی تنقید اسوقت میرا مقصود نہیں، مجھے تو اپنے مضمون پر تنقید کے بعض نقاط کو واضح کرنا ہے، ورنہ اس تین سطر کی عبارت میں اتنی گنجائش تھی کہ فاضل نقاد صاحب کے مضمون کے برابر مضمون طیار ہو جاتا۔ خیر! اس عبارت سے ثابت ہے کہ ادب کی صحیح تعریف کے متعلق دنیا کا فیصلہ تھا کہ وہ فیصل شدہ نہیں ہے۔ دنیا کے "فیصلے" کو فاضل نقاد نے "گمان" قرار دیا۔ بہت خوب آپ کو اختیار تھا، آپ نے اپنے انگریزی مقالے میں ادب کی تعریف فرما دی، دنیا پر بڑا احسان کیا! لیکن وہ بدبخت جو اپنی ہی زبان سے سر کھپاتا رہتا ہو اگر اس مقالے کی زیارت سے محروم رہے جو نہ معلوم "اینتھیام" میں چھپا ہوگا یا "نائنٹینتھ سنچری" میں تو اس کی اصلاح کی کیا صورت ممکن۔ یہی میری معذوری تھی کہ اس مقالے کے سوا ادب کا مفہوم دنیا میں متعین نہ تھا اور اس گرانقدر مقالے تک میری پہونچ نہ تھی۔ بہر حال میری عاطفہ نگاری کا اردو زبان پر احسان ہے کہ وہ تعریف ادب انگریزی سے اردو میں منتقل ہوگئی۔

فاضل نقاد کے خیال میں میرا یہ خیال بھی غلط ہے کہ ادب زندگی اپنے زمانے کی زندگی کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔

اُس زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ بھی - - - - - اور ادب و کلچر ایک دوسرے کے لئے لازمی ہیں"

فاضل نقاد کا خیال ہے کہ کلچر بدلنے والی چیز نہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں لازم و ملزوم نہیں ہو سکتے۔ میں بادب یہ گزارش کروں گا کہ جو میں نے پیش کیا وہی صحیح ہے اور اس کو میں ثابت اس طرح کر سکتا ہوں کہ ایک جاہل ایک تعلیم یافتہ کے مقابلے میں، ایک تعلیم یافتہ ایک ادبی آدمی کے مقابلے میں، ایک بدذوق ایک صاحب ذوق کے مقابلے میں، ہمیشہ کم درجہ ثقیف ہوتا ہے، اور یہ روزمرہ کے مشاہدے کی بات ہے۔ خود فاضل نقاد انگریزی میں ادبی مقالے لکھتے ہیں، اردو رسائل میں ان کا شاعرانہ کلام بھی چھپتا رہتا ہے، یعنی ان کی علمیت و ادبیت مسلم ہے۔ اب اگر اتفاق سے ان کے کوئی بھائی یا عزیز ہوں انھیں کے ماحول اور سوسائٹی کے تربیت یافتہ ہوں، لیکن ان ادبی و علمی اوصاف سے متصف نہ ہوں جو فاضل نقاد کی خصوصیات ہیں، تو کلچر کا فرق آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میری تحریر کا مطلب یہی ہے کہ انسانی ثقافت میں ادب کا ذوق و مطالعہ بڑا کام کرتا ہے۔

ادب کے ذریعے سے عوام میں مدنیت اور تہذیب عام کرنے پر فاضل نقاد کے اعتراض کا ذمہ دار اصل میں فلاطون کا یہ قول ہے کہ "حسین روح حسین جسم تلاش کرتی ہے"۔ لیکن اگر فاضل نقاد سے کوئی سوال کر دے کہ وہ کیسی روح کو حسین کہیں گے، تو ان کو پھر فلاطون کی تصانیف الٹنا پلٹنا پڑیں گی اور اس زحمت کے بعد بھی وہ نہ بتا سکیں گے کہ ایک مکروہ شکل کا کیڑا جب تتلی کا حسین جسم اختیار کر لیتا ہے تو آیا اس کی روح اُس وقت بھی حسین تھی یا اُس جسم میں آکر حسین ہو گئی، یا تتلی حسین ہی نہیں؟ فاضل نقاد کو یہ بتانے میں بھی دشواری نظر آئے گی کہ حسن افعال کے اندر ہے یا اشکال میں؟ فاضل نقاد نے حسن کا مدار اگر افعال پر رکھا ہے تو وہ اپنے اس استدلال کو قلم زد فرمانے پر مجبور ہوں گے اور اگر اشکال میں حسن کو تسلیم کیا تو بدکردار انسان کے حسن عمل کی تکذیب کرنا پڑے گی اور بحث یہاں بھی ختم نہ ہوگی۔ انھیں "حسن" کے "خیر مجرد" ہونے کا نظریہ بھی باطل قرار دینا پڑے گا اور اسکی تردید لکھنا پڑے گی اور اس صورت میں ان کی جنگ بڑے بڑوں سے چھڑ جائے گی۔

فلاطون کے نظریے میں پناہ لیتے ہوئے فاضل نقاد کی نظر اس بات پر نہیں پڑی کہ خود یہ فقرہ جامع اور مانع بیان نہیں ہے۔ "حسین جسم کی تلاش" کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی حسین روح کسی مکروہ جسم میں قیام نہیں کرتی ہے؟ کیا ہر حسین جسم کی روح حسین ہوتی ہے؟ اور حسن روح کا کیا پیمانہ ہے؟

فاضل نقاد نے یہ کہکر کہ سلاست زبان کا طرفدار ورڈز ورتھ بھی تھا، مجھ پر یہ بہتان بھی لگایا ہے کہ میں اپنے تئیں اس خیال کا خلاق سمجھتا ہوں۔ فاضل نقاد کو میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ نہ میرا یہ خیال ہے اور نہ میں نے اپنے مضمون میں کہیں یہ دعوے کیا ہے۔ وہ میرے مضمون کو پھر پڑھیں۔ لیکن اس اطلاع کے لئے ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ورڈز ورتھ کا خیال بتا دیا۔

فاضل نقاد کو گمان ہے کہ کالرج نے ورڈز ورتھ کے نظریۂ سلاست زبان کے چیتھڑے اُڑا دئے۔ بہت خوب لیکن کیا فاضل نقاد کو یقین ہو گیا کہ کالرج کے بعد اس کی قوم اور ملک میں اور خود فاضل نقاد کی قوم اور ملک میں، سلاست زبان کے عقیدے کا جنازہ نکل گیا، اور وہ دفن کر دیا گیا؟ اور کیا فاضل نقاد کو صدمہ نہ ہوگا اگر میں انھیں بتاؤں کہ کالرج کے بعد بھی انگلستان اور دنیا بھر میں سلیس زبان کے حامی پیدا ہوتے رہے ہیں، اور آج بھی دنیا کے ہر خطے میں اس خیال کے ایسے حامی ملیں گے جن کی اصابت رائے سے شاید فاضل نقاد کو بھی مجال انحراف نہ ہو سکے گی؟

سلاست زبان کے ذیل میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ چونکہ ادب قومی زندگی کا آئینہ اور اس کے سدھا سنوار کا ذریعہ ہے اس لئے ہمارے ادب میں اُن موضوعات کو بھی جگہ ملنا چاہئے جو اب تک ادب سے خارج تھے اور اس زندگی کا بھی بیان ہونا چاہئے جو اب تک نظر انداز رہی ہے اور اس لئے ہماری ادبی زبان سلیس ہو تاکہ اس ادب سے زیادہ سے زیادہ افراد قوم فیضیاب ہو سکیں۔ اس سلسلۂ گفتگو میں میں نے "عقیق تراشیدہ" اور "لعل گویا" کی تشبیہ کے مقابلے میں، "راگ رس ہے جو جسم کر رہ گیا ہے"۔ مثالاً پیش بھی کیا تھا کہ کیا یہ اظہار و بیان حسین نہ کہا جائیگا

فاضل نقاد کالرج کے متبع ہیں اور سلیس زبان کے مخالف۔ اس لئے ان کو لازم تھا کہ وہ میرے مثالی جملے غیر ادبی اور غیر شاعرانہ ثابت کرتے اور بتاتے کہ "عقیق تراشیدہ" اور "لعل گویا" ہی حسین اظہار بیان ہے۔ اسے عوض، فاضل نقاد نے فانی و اقبال کے سادہ و دقیق اشعار پیش کر دئے (حالانکہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تما مضامین کی انشا و عبارت یکساں ہو) اور اسی لئے فاضل نقاد فلاطون کی وہ سند لائے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے

اس بحث میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلاطون کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے فاضل نقاد کو فلا وارسطو کے ادبی اختلاف کا علم بھی ہونا چاہئے، اور پھر ناممکن ہے جو ان کو یہ معلوم ہو کہ فلاطون کے ادبی خیالا ما بعد الطبیعاتی بنیاد پر قایم تھے جن کو ارسطو کی حیاتیات پر مبنی بحثوں نے مسترد کر دیا اور جب اتنا کچھ معلوم ہو توا سامنے ارسطو کا یہ نظریہ بھی ہونا لازمی ہے کہ زبان کا رتبہ موضوع کے رتبے کے موافق ہونا چاہئے۔ اس کو سمجھ لینے بعد یہ نظریہ کہ دقیق خیال کے لئے دقیق زبان لازمی ہے، تمام تر صحیح نہیں رہتا؟ اس کا بڑا مدار مصنف کی اس قدرت پر ہے جو اُسے زبان پر حاصل ہو۔ خیالات موضوع کے مطابق ہوں گے اور موضوع سے موافق زبان انتخا کرنا ایک مصنف کا صحیح راستہ ہے۔

میرے مضمون کا وہ حصہ جس میں زندگی اور موضوعات ادب سے گفتگو کی گئی ہے، یہ ہے:-

"اب رہ جاتا ہے شعر و ادب کے موضوعات کا سوال۔ عام زندگی سے ادب کے موضوع جتنا اتنا ہی حسین ہو سکتا ہے جتنا ایک خیالی معشوق اور وہمی تعیش کو کلام کا موضوع قرار دینا۔ کیونکہ زندگی بہر حال حسین ہے اور حسن صداقت سے خالی

نہیں ۔ حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک دہقان کی سوگوار زندگی حسن سے خالی ہے اور اسکی محنت شقت مقدس نہیں ؟ وہ رشتۂ ہم آہنگی جو ایک کسان کو اپنی آراضی سے ہے کیا حسین نہیں ؟ کون انکار کرسکتا ہے کہ بھٹی کے سامنے ایک مزدور کا پسینا بہانا شان سے خالی ہے ؟"

اس عبارت کا فاضل نقاد نے جو خلاصہ کیا ہے وہ یہ ہے :-

"زندگی ہر جگہ حسین ہے تو پھر کسان مزدور ہی ہمارے موضوع کیوں نہ بنیں ؟"

اب میں حیران ہوں کہ فاضل نقاد کو الفاظ کے مفہوم و معنی سمجھنے سے بیگانہ سمجھوں یا ان کی نیت کو بخیر جانوں تو کس دل سے ؟ فاضل نقاد کم سے کم دو زبانوں کے ادیب اور شاعر ہیں ۔ فاضل نقاد کو یقیناً بات کی اس "ہی" کا صحیح استعمال اور اس کا صحیح مفہوم معلوم ہونا چاہیئے اور ایک نقاد ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی نیت کیوں خراب کریں ؟ لیکن میرے اقتباس اور فاضل نقاد کا خلاصہ دونوں نقل کر دئے گئے ہیں ، ناظرین کو اسے قائم کر لینے کا موقعہ ہے ۔

زندگی حسین ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں فاضل نقاد نے یہ بھی سمجھا دیا کہ ... کی سیر فرما چکے اور وہاں کے بعض مناظر سے آنکھیں بھی بند کر چکے ہیں اور اسپتال اور پوسٹ مارٹم کے نظاروں نے فاضل نقاد کے "حسن جمال" کو مجروح بھی کیا ہے اور یہ بات ان کے خیال میں کافی دلیل ہے کہ زندگی غیر حسین ہے لکروہ بھی ہے ۔ اس باب میں میں فاضل نقاد کی خدمت میں بس یہی عرض کرسکتا ہوں کہ وہ آرٹ کے فلسفے میں زندگی کو سمجھیں ، وہ جان لیں کہ بدصورتی میں بھی حسن ہے ! پہاڑوں کے بھیانک اور پوسٹ مارٹم کے مکروہ نظاروں سے فاضل نقاد کا خوفزدہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب مشغلہ "جمالیات" کے بھی نصف دوست ہیں اور "علوئے جلال" کے عنصر سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لئے میں یہ دوہرانے پر مجبور ہوں کہ "زندگی ہر جگہ حسین ہے" کیونکہ اہل فکر و صاحب بصیرت لوگوں نے اسے یہی سمجھا ہے ۔

سمرسیٹ موگھم اسی برادری کا ایک فرد ہے جس کے بہت سے نام فاضل نقاد نے اپنے مضمون میں گنوائے ہیں ۔ فاضل نقاد اس کے ادبی رتبہ اور مقبولیت سے انکار نہ کرسکیں گے ۔ اس کی خود نوشت سوانح عمری حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔ فاضل نقاد اگر اس کی رائے کو کوئی وقعت دے سکتے ہیں تو وہ اس کتاب کے اندر ملاحظہ فرمائیں گے کہ موگھم نے ڈاکٹری پڑھی اور ڈاکٹری سے ہی زندگی شروع کی ۔ اسپتال کے نظارے اسکی کتاب "لیزا آف لمبیتھ" کے پس منظر ہیں ۔ موگھم کہتا ہے کہ اسپتال ناولنگاروں کے لئے بہترین درسگاہ ہے ۔ وہ زندگی کو حسین کہتا اور بار بار کہتا ہے وہ فاضل نقاد کی طرح آئیڈیل ادب کا بھی قایل نہیں ہے ۔ غرض فاضل نقاد نے میرے مضمون پر جو اعتراضات وارد کئے ہیں ان سب کا جواب موگھم نے اس کتاب میں دیدیا ہے ۔ فاضل نقاد نے ... Wren وغیرہ وغیرہ کو پڑھا ہوں گے ان کا خیال ہے پوسٹ مارٹم کا مکروہ ترین نظارہ بھی حسین ترین ہے ! مجھے افسوس ہے کہ

ان حوالوں سے فاضل نقاد کے مزعومات کو صدمہ پہونچے گا، مگر خیال ہے کہ وہ اسے ایک آپریشن کی طرح برداشت کرلیں گے میں فاضل نقاد کی تعلیمی ڈگری پر اعتبار کر کے مانے لیتا ہوں کہ ان تمام انگریز ادبا و شعراء کے باب میں جن کے نام فاضل نقاد نے اپنے مضمون میں لئے ہیں، فاضل نقاد کی رائے صحیح و درست ہے۔ لیکن کیا فاضل نقاد یہ ثابت کرسکیں گے کہ ڈکنس اور ہارڈی زندگی کے ناخوشگوار اور مکروہ پہلو کو (یعنی مزدور و کسان کی زندگی کو) اپنے ادب کا موضوع بنا کر انگریزی ادب میں کوئی درجہ نہ پا سکے؟ یا ان کا ادبی مرتبہ ٹھیکرے کے ادبی مرتبے سے کم ہے جو فاضل نقاد کی نظر میں رنگین زندگی یا زندگی کی رنگینی کا شارح ہے؟ کیا فاضل نقاد بتلائیں گے کہ انگریزی ادب ڈکنس اور ہارڈی پر نازاں نہیں ہے جو ان کی رائے میں زندگی کے مکروہ پہلو کے مفسر ہیں؟

فاضل نقاد نے مجھسے اس خیال کو بھی منسوب کیا ہے کہ اُردو ادب ایک ہی ڈھرے پر چل رہا ہے۔ فاضل نقاد کا یہ فرمانا بھی صحیح و درست نہیں۔ اس ذیل میں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:-

"اس نقطے سے جب ہم اپنے ادبی ذخیرے پر نظر ڈالتے ہیں تو اُنیسویں صدی کے آخر تک ہمارا ادب امراء کے تفریحی مشغلوں میں سے ایک شغل نظر آتا ہے، اور اس سے زیادہ کارآمد معلوم نہیں ہوتا کہ امیروں کی تفریحوں میں اضافہ کا سبب ہو۔ قومی زندگی سے اس ادب کو بہت دور کا تعلق ہے۔ اس کے اندر امیروں کے طبقے کی بھی خاص خاص حالتوں کا نقشہ تو نظر آتا ہے مگر پوری زندگی اس طبقے کی بھی دیکھنے میں نظر نہیں آتی۔ ایسے ادب کو جس کے اندر عام قومی عادات و خصائل نظر نہ آتے ہوں سچا ادب نہیں کہا جا سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیسویں صدی شروع ہونے کے بعد سے ہمارا ادب رنگ بدلتا ضرور نظر آتا ہے اور رومانیت کی جگہ "حقیقت نگاری" لے رہی ہے لیکن یہ حقیقت نگاری بھی اس مقصد کو پورا نہیں کرتی کہ ادب ان چند بڑی قوتوں میں سے ایک ہے جو کم سے کم مدت میں ننانوے فیصدی غریبوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرسکتی ہیں۔ اس وقت حقیقت نگاری کے تحت جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس کے اندر لفظی انقلاب تو ہے لیکن حسی انقلاب کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ شاعر یا مصنف کا احساس انقلابی ہو۔"

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہمارا موجودہ ادب بدل رہا ہے، فاضل نقاد نے طویل بحث کر ماری ہے، حالانکہ اس اقتباس میں میرا کھلا اعتراف موجود ہے۔ بہرحال اس بحث میں بھی ناظرین نگار فیصلے کے مجاز ہیں کہ وہ فاضل نقاد کا عاید کردہ جرم صحیح سمجھتے ہیں یا غلط۔ مگر فاضل نقاد نے اُردو ادب کی بدلتی ہوئی حالت کے متعلق جو استدلال فرمایا ہے ایک ایسے شخص کے شایان شان ہرگز نہ تھا جو افلاطون کا طالب علم ہو۔

میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ فاضل نقاد کو میرے مضمون پر تنقید کرنا تھی، اس لئے انھوں نے میرے مضمون کی غایت اور اسپرٹ کو سمجھنا اور دیکھنا ہی نہ چاہا۔ مگر میں نہ تو "کہیں کا دانا" اور نہ "کسی ہنر میں یکتا"، فاضل نقاد کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو وہ مفہوم منقلب کرنے پر مجبور ہوگئے؟

دیکھئے اور سمجھئے، میری غایت انشا، یہ تھی اور اب کہ آپ کو تنقید لکھنا نہیں ہے اگر پڑھئے گا تو یہی مطلب سمجھ میں آئے گا کہ انسانیت کے پسپا طبقے دنیا کے ہر حصے میں چونک پڑے ہیں۔ ان کو چونکانے میں دوسرے ممالک میں ادب کی قوت سے زبردست کام لیا گیا ہے اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو اس سے سبق لیکر اپنے ادب کو ایسا ادب بنا دینا چاہئے جس سے اندر قوم کی اجتماعی زندگی چھلکے اور جو قوم کے اندر تہذیب و تمدن پھیلانے کا ذریعہ بنے۔

اس غایت تحریر سے فاضل نقاد نے اپنی تنقید میں مطلق بحث نہیں کی، البتہ میرے استدلال کے بعض ٹکڑے لیکر ان خیالات کو غلط ثابت فرمایا ہے — آخر مضمون میں فاضل نقاد نے "ذہنی عیاشی" سے گفتگو کرتے ہوئے واقعی حسین انشاء کا نمونہ پیش کیا ہے، جس کے الفاظ بہت خوشنما ہیں اور ایک علمی انکشاف بھی فرمایا ہے ورنہ "مذہب کی کامیابی" کا انکشاف ہے! فاضل نقاد فرماتے ہیں:-

"آج دنیا میں اگر کوئی مذہب کامیاب ہے تو وہ مذہب ہے جس کی تبلیغ عورت اور شراب کے سپرد ہے۔ وہ وہ جسکی باگ ڈور پیران خود دسال کے ہاتھ میں ہے"

دنیا کے مفکر آج تک اس اُدھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے کہ کس مذہب کو کامیاب کہیں، اور مذہب کی کامیابی کس چیز کو قرار دیں۔ الحمدللہ کہ میری غلط نگاری صرف ادب کی ایک قطعی تعریف ہی قایم نہیں کرا سکی بلکہ مذہب کی کامیابی کو بھی حتمی بنوا دیا — فاضل نقاد نے استعارہ فرمایا ہے، اور اگر میں بالکل گمراہ نہیں ہو گیا ہوں تو "کامیاب مذہب" سے ان کا مقصود یورپ کا مذہب یعنی مسیحیت ہے اور کامیابی سے مراد وہاں کی مادی ترقیاں ہیں! کوئی مانے نہ مانے مگر میں تو مانے لیتا ہوں کہ مذہب کا مقصود د منتہا اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا جو فاضل نقاد نے قرار دیا اور مذہب کی کامیابی بھی لوہے لکڑی کے بڑے بڑے کارخانوں سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی!

بہرحال مجھے فاضل نقاد کی تنقید سے جو ہدایت ملی اس کے لئے پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے حق میں وہی دعا کرتا ہوں جو ایک ہادی کو ملتی ہے یعنی "اللہ آپ پر رحم کرے!"

دیکھئے آپ ادیب و شاعر ہیں، اس فقرے کے بھی غلط معنی نہ سمجھ لیجئے گا۔ "نقاد" مرحوم کے سرورق پر چھپا رہتا تھا:- "رحم اللہ بدانی اسلےعیوبی" — اور یہ مجھے یاد ہے۔ میری نیت بفضلہ بخیر ہے!

آخر کلام پر مشورتاً نہیں بلکہ تفریحاً عرض کرتا ہوں کہ اُسی برادری کا ایک فرد جس کے اکثر لوگوں سے فاضل نقاد واقف ہیں لکھ گیا ہے کہ:-

"If youth could only think" (اے کاش شباب سمجھ بھی سکتا)

ل - احمد

مکتوبات نیاز

قبلۂ مستمنداں، عطوفت نامہ کل شام کی ڈاک سے ملا۔ ساری رات اس بے چینی میں کٹی کہ کب صبح ہو اور کب اس کے جواب میں اپنا اعترافِ عقیدت پیش کروں، لیکن اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کس کو لکھوں ــــ کہتے ہیں شاعری نام ہے جذبات نگاری کا، لیکن جب جذبات کا ہجوم طاقت گویائی چھین لے تو اسے کیا کہیں گے؟ شاعری سے زیادہ بلند اور کیا چیز ہو سکتی ہے ـــــ شاید سکوت!

بہرحال اگر میں اظہار منت پذیری میں قاصر رہوں تو اس کو احسان فراموشی نہ سمجھا جائے۔ اور نہ میرے اس اظہار کو شاعری

میں اپنی اُن تمام ذمہ داریوں سے واقف ہوں جو موجودہ حالات میں مجھ پر عاید ہوتی ہیں، امید ہے کہ آپ کو شکایت کا موقعہ کبھی نہ ملیگا۔ میں ہر وقت حاضر ہوں، جب ضرورت ہو تار دیکر بلا لیجئے

حضرت، یہ آپ مجھے کیا سنایا کرتے ہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے، آپ کی دنیا مجھ سے بے خبر، میں آپ کی دنیا سے ناواقف، ایک کو دوسرے سے واسطہ ہی کیا

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز
هم محک تو زرنہ دید، هم زرِ من محک نخواست

آپ کی عنایتوں کا شکرگزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا، لیکن اسی دنیا کے اُصول کو سامنے رکھ کر جس کے آپ دلدادہ ہیں، ورنہ سچ پوچھئے تو میرا دل آپ کی طرف سے بہت زیادہ لبریز شکایت ہے

میں جن مکروہات سے دامن چھڑانا چاہتا ہوں، انھیں میں آپ مجھے پھر مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نام آپنے رکھا ہے، محبت ـ خلوص ـ صداقت ـ عنایت اور خدا جانے کیا کیا ـــ باز آیا میں آپ کی اس "خواجگی و سرپرستی" سے! مجھے آپ ہی لوگوں نے وطن سے بیگانہ بنایا اور اب اس دنیا سے بھی بیگانہ بنا دینا چاہتے ہیں، جہاں یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ میں اس کرہ کا باشندہ ہوں یا کسی اور کرہ کا ـــ آؤں گا، لیکن ابھی نہیں، کلیجہ ذرا اور پتھر کا بنا لوں۔

صدیقی ۔ حیران ہوں کہ آپ کو کیا مشورہ دوں۔ اس سے پہلے شادی کا خیال یا تو لوگوں کو خائف بنا دیتا تھا یا مسرور اور اب اس کی طرف سے نہ خوف باقی رہا ہے نہ دلکشی

خوف نتیجہ تھا ذمہ داریوں کے احساس کا اور دلکشی اخلاقی نگہداشت کا۔ سو اب نہ یہ ہے نہ وہ۔

ہم سب آزادی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہے جا رہے ہیں اور کوئی صورت نہیں کہ ایک جگہ قدم جما کر یہ تو دیکھیں کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا رہے ہیں

عورت و مرد کے جنسی تعلقات کا شادی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس خیال سے ہٹ کر شادی کرنا آپ لوگوں کے نزدیک محبت کی توہین ہے اور یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ بیوی سے محبت کیسی؟

وہ محبت جس کا تعلق صرف جنسی خواہش سے ہو، میرے یہاں دوستی کہلاتی ہے اور محبت سے زیادہ بلند چیز ہے، لیکن آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی

بہرحال آپ نے میری رائے دریافت کی ہے تو اسے سن لیجیے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنی موجودہ "حیات معاشقہ" کی لذت کچھ دنوں اور قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو شادی کا خیال ترک کر دیجیے اور اگر آپ کی ہونے والی بیوی میں اتنا صبر و تحمل ہے کہ وہ صرف آپ کی دوستی پر قناعت کر کے آپ کی جوانی کو آزاد چھوڑ سکتی ہیں، تو شادی میں کوئی حرج نہیں۔

آپ کی طبیعت سے خوب واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ اس ولولہ کی عمر کتنی ہے۔ آپ کیوں اس غریب کی عمر تباہ کریں گے۔

مکرمی ۔ رات میں نے نہایت عجیب و غریب خواب دیکھا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست نے چند مخصوص احباب کو دعوت دی ہے اور ان کی ضیافت کے اہتمام میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ لیکن جس وقت مہمان کرسی پر آ کر بیٹھتا ہے تو پشت کی طرف سے جا کر اس کی گردن کاٹ ڈالتے ہیں، جب یہ دہ احباب ذبح ہو جاتے ہیں تو میری طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب دعوت مکمل ہو گئی۔ میں ان تمام ذبیحوں کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ دفعتاً آنکھ کھل جاتی ہے۔

آپ کو تعبیر بتانے میں بڑا ملکہ حاصل ہے، ذرا دیکھ کر بتائیے تو سہی یہ کیا بات ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ہی میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے جن دوست کا ذکر کیا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ہمیشہ اپنے احباب کے لئے قربانیاں کی ہیں اور اسی عادت نے ان کو تباہ کر رکھا ہے۔ بعض اوقات خواب میں اشارات خفیہ ضرور پائے جاتے ہیں اسی لئے میں نے آپ سے پوچھا کہ اس خواب میں کس بات

کی طرف سے مجھے متنبہ کیا گیا ہے - بقائے روح کا قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن بعض ایسے حضرات سے ضرور واقف ہوں جنھوں نے رات کو خواب میں وہی بات دیکھی جو صبح کو ہونے والی ہے -

---

قصۂ عشق کہ ماند ایں ہمہ ناگفتہ بہ ہے
با تو گوئیم بشرطیکہ نہ گوئی بہ کسے

آپ سمجھے "قصۂ عشق" سے کیا مراد ہے اور "کسے" کا اشارہ کس طرف ہے ؟ غالب یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ "غم عشق وغم روزگار" دونوں ایک ہی چیز ہیں اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ اپنے سوا ساری دنیا "کسے" میں شامل ہے - تم کو میں نے اس لئے علحدہ کر دیا کہ تم اس دنیا کے آدمی نہیں اور تم سے باتیں کرنا گویا اپنے آپ سے سرگوشیاں کرنا ہے -

پھر اب کیا پوچھتے ہو کہ کیا عالم ہے - نظیر کا ایک شعر یاد آگیا :-

جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب
کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہے عشق اللہ

سو بھئی، اب تو زمانہ وہی ہے کہ سوائے اس کے کہ سر منڈا کر، گلے میں کفنی ڈال کر، ہاتھ میں سونٹا لئے ہوئے "عشق اللہ" کہتے پھریں اور کیا ہو سکتا ہے -

کیں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد

اور شام کے مرے ہوئے کو صبح تک کون روتا ہے -

میری تجویزیں تو خدا جانے کیا کیا تھیں، لیکن اب ان سب کو ملا کر میں نے ایک کر لیا ہے اور وہ یہ کہ دیوبند جا کر مولوی اشرف علی صاحب کا مرید ہو جاؤں -

یہ ہے خلاصہ اس تمام جواب کا جو آپ کی تحریر پڑھ کر انھوں نے دیا - آئندہ جو کچھ پوچھنا ہو مہربانی فرما کر براہ راست انھیں سے پوچھئے، میرے پاس نہ اتنا وقت کہ ان کو چھیڑ کر تراویح شبینہ کی نیت باندھ لوں اور نہ اتنی عقل کہ جو کچھ وہ کہیں اسے سمجھ سکوں ـــ اچھا - عشق اللہ !

لاحول ولاقوۃ ، اتنا زمانہ ہوگیا اور اب تک تم اس بت کو رام نہ کر سکے -

برہمن می شدم گر ایں قدر زنار می بستم !

"فکرِ فضول" کی کمی ہے یا "جرأت رندانہ" کی ـــ آخر بات کیا ہے ؟ میں تو سمجھتا ہوں دونوں ہی ضعیف

ارسے طنطنے معلوم ہوتا ہے جلوت ہی کے ہیں اور خلوت میں جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے
ظاہر کروگے لیکن غریب غالب کو آخر میں کہنا ہی پڑا کہ

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

دیکھ رہا ہوں کہ ایک دان کے لئے آؤں اور تمہاری شکست کو "بیں" برمحل " دیکھ کر لطف اٹھاؤں،
تا ہوں کہ اسوقت تم کیا کروگے، اور کیا کہوگے! کیا تمہارے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ

شیر قالیں اور ہے شیر نیستاں اور ہے

انتباہ و تصحیح

اکتوبر کے باب الاستفسار میں مثنوی کی بحروں کا ذکر کرتے ہوئے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اردو کی
مثنوی ان میں موجود نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ میری نگاہ سے نہیں گزری۔
لیکن ہمارے فاضل دوست محمد عباس صاحب طالب صفوی نے ان بحروں میں بعض اردو مثنویوں کی طرف
دلائی ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"بحر سریع میں مولوی حفظ اللہ بندہ کی مثنوی اور غلام امام شہید کی مثنوی قصۂ بلال موجود ہے۔
اسی طرح بحر رمل مسدس میں سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی ایجاد رنگیں محمد عبد اللہ خاں کی،
مثنوی عابد اور مبین دہلوی کی ایک مثنوی پائی جاتی ہے۔ بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید
کی مثنوی نغمۂ عشق موجود ہے"

طالب صاحب ایک ایک شعر بھی لکھ دیتے تو بہتر ہوتا، تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو
یں۔
اسی مضمون میں کاتب صاحب نے غلطی سے رمل مسدس کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اُسے
کر دیا جائے۔

ریاض مرحوم کی انشاء عالیہ

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب میں حیدرآباد گیا تو مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے دولتکدہ پر شعر و سخن کی مختلف صحبتوں میں ریاض کا بھی ذکر بار بار آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ریاض مرحوم اپنی زندگی کی آخری ساعتیں خیرآباد میں درویشانہ صبر و استقلال کے ساتھ بسر کر رہے تھے اور اپنی زاویہ نشینی کو ترک کرنے کے لئے کسی طرح طیار نہ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جب حیدرآباد کا ذکر آتا تھا تو ان کے انتقال و حرکت کی قوت بالکل جواب دے جاتی تھی، کیونکہ انھیں یہ وہم پیدا ہو گیا تھا کہ جس سرزمین نے داغ و امیر کو ہمیشہ کیلئے اپنے اندر جذب کر لیا، وہ ریاض کے لئے بھی ایسی ہی دامنگیر ثابت ہوگی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ سوائے خیرآباد کے کہیں اور سپرد خاک کئے جائیں۔

مہاراجہ بہادر نے کئی بار یہ کہہ فرمایا کہ ریاض سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، لیکن میں نے ہر بار یہی عذر پیش کر دیا کہ وہ اب نقل و حرکت سے معذور ہیں اور واقعی ایک حد تک وہ تھے بھی معذور رہی۔ اس کے بعد انہیں صحبتوں میں کچھ ایسی گفتگو ہوئی جس نے مجھے یہ توقع دلائی کہ اگر خود ریاض کی طرف سے کوئی عرضداشت پیش ہو جائے تو بارگاہ شادؔ سے کسی مستقل امداد کا جاری ہو جانا ممکن ہے۔

جب میں لکھنؤ واپس آیا، تو میں نے مرحوم کو ایک خط لکھا کہ وہ ایک درخواست لکھ کر میرے پاس بھیج دیں، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک خط کے ساتھ وہ درخواست میرے پاس بھیجدی جو ذیل میں درج ہیں اور جن کے مطالعہ سے ریاض الاخبار اور فتنہ کا دور سامنے آجاتا ہے، جب گورکھپور میں ریاض کا طوطی بول رہا تھا اور ملک میں کوئی اس کا ہمصفیر موجود نہ تھا۔

ریاض کے ایک ناز مولانا نیاز - آپ سے جدا ہو کر بیمار ہو گیا پانچ روز کے بعد اجابت کیا ہوئی دنیا نصیب ہوا۔ قصد تھا خود آپکے پاس لکھنؤ آؤں مگر مجبور ہوں۔ اب درخواست ذریعہ ڈاک بھیج رہا ہوں ایک تو آپکے مسودے کی نقل ہے، دوسری آپکے الفاظ سے بدل کر لکھی ہے۔ بہر حال جو آپ پسند فرمائیں اور اگر میری حاضری کی ضرورت ہو تو ایک کارڈ بھیجدیجئے میں فوراً اول تو یوں ہی کارڈ ملنے پر آجاؤں گا۔ ستمبر کا نگار تیار ہی ہوگا۔ آپ بھی دکن جانے کو تیار ہونگے۔ مجھسے زیادہ آپکو میرا خیال ہے۔ گھر میں اور بچوں کو بہت بہت دعا۔

ریاض — ۲ر ستمبر ۳۲ء

بندگان ہمایوں ہزاکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ دکن بالقابہ دام اجلالہ و اقبالہ

سرکار والا

درویش شکستہ ناخن ریاضِ گوشہ نشیں، دور سے سلام کے لئے خمیدہ سر ادب بصد عجز حضور میں پیش کرتا ہے۔

قبول ہو کہ نہ ہو ہم تو سجدہ کر لینا

آہ — پیرانہ سری و پیرانہ سالی میں، جب نہ دماغ پر قابو ہے نہ زبان قلم پر، اظہار مدعا کے لئے کیا صورت اختیار کروں۔ یا ملاقات کو دیکھ کر بیٹھے تھے دُہرا ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اب نشاط زندگی و لطف حیات کا سوال نہیں سوال ہے تو نفس کی آمد و شد کا وہ بھی اس طرح

زندگی آئی ہے پہلو سے نکلتی ہے قاتل   سانس کی طرح رواں سینے میں خنجر ہوتا

میں چاہتا ہوں حضور شاد سے وہی دلِ ناشاد کو بصورت نالۂ فریاد، اپنا سراپا بنا کر اس شعر کے سانچے میں پیش کروں:—

کچھ اپنے حال کا مجھے احساس ہی نہیں   ہے یہ ہوا ہے چین ہے کہ مردہ کفن میں ہے

یہ کون ہے وہ ریاض ہے جس کا انداز یہ ہے:

جانِ سخن ریاض ہے جانِ سخن میں ہے

یہ کون ہے وہ ریاض جو اس وقت تصور میں کہ پیش نظر اس سرکار والا کے در پر یہ شعر پیش کر رہا ہے:—

واعظ نے بزم وعظ میں چھینکا ہے جس کے جام   وہ نو کشیدہ میں نہ شرابِ کہن میں ہے،

یہ کون ہے وہ ریاض ہے جسے مسیحا نفس سرکار والا نے کبھی اپنے لب اعجاز نما سے [illegible] کے ہر [illegible] قبول ہونے والی دعا دی تھی

شاد صاحب کی دعا ہے مہاراج   رہے سرسبز ریاض احمد

یہ کون ہے یہ وہی ریاض ہے جو سرکار والا کی دعا سے [illegible] میں بھی نونہال نخل گل کی طرح پھولا پھلا۔ اسی دعا کا اثر ہے، پچاسی سالگی میں بھی متعدد بہاریں دیکھیں [illegible] کہ دو [illegible] اس کی سرسبزی کو بڑھاتے رہے یہاں تک کہ جب نشاط زندگانی بہ اعتبار زن و فرزند مبدل بہ مایوسی و نامرادی ہو چکی تھی، عروس نو بہار نوید نونہال لاتی رہی کہ سرسبز ریاض یہ کہتا ہوا دل گیا۔

میرے اللہ نے دی مجھ کو یہ اولاد سعید   میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے

سرکار والا، [illegible]

[illegible] زندگانی کا سوال ہے [illegible] کہاں قدرت کی

یہ ودیعتِ عظیم، کجا میرے عظام رمیم۔ مگر نیرنگ قدرت کی ستم ظریفی کو ضرور اُس قبول ہونے والی دُعا سے لگاؤ ہے جس پر بصورت صحیح اثر کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

دعا سے تا اجابت فاصلہ تھا تیر کی زد کا،

کیا سرکار والا اپنے لبِ معجز نما سے اِس مصرع کو جاں بخش تبسم کے ساتھ دُہرانے کی تکلیف میری بازگشت شباب کے لئے گوارا فرما سکتے ہیں

رہے سرسبز ریاض احمد

کیا دُہرانے کی خاموش آواز یا دور کی آواز فردوس گوش بن کر مجھ تک پہونچ سکتی ہے کہ میں دعائے دولت واقبال کے لئے جوانانہ اُمنگ کے ساتھ چند روز اور زندہ رہ سکوں ورنہ ظاہر ہے

دم واپسیں برسرِ راہ ہے   عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

فدائی ریاض - از خیرآباد

افسانہ ہی افسانے

انشائے لطیف :- اُردو ادب میں صاحب "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم وحکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے۔ یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن وعشق کی صحیح تماشی دیکھنا ہے اور ادب وشعریت کا ذوق ہے، تو اس مجموعے کو دیکھئے پورے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات :- اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو کی نفاست ولطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل :- ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ :- یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے۔ لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری واخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

مینیجر "نگار" لکھنؤ

باب الاستفسار

شیفتہ کی شاعری

(جناب محمد نعیم اللہ صاحب ۔ مبارکپور)

میں نے شیفتہ کے کلام کا بہت کم مطالعہ کیا ہے لیکن ان کے چند اشعار پڑھنے سننے میں ان کو دیکھ کر میں نے ان کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی رائے قایم نہیں کی۔ میں ایک سلسلۂ تصنیف میں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اگر نامناسب نہ ہو تو تفصیل کے ساتھ مجھے اپنی رائے سے مطلع فرمایئے۔ تاکہ میں اپنی کتاب میں ان کے متعلق کوئی غلط رائے نہ قایم کرسکوں، گو پھر بھی مجھے اپنی ذاتی رائے پر قایم رہنے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر میں آپ کے بیان سے مطمئن نہ ہوا۔

(نگار) میں شاید آپ کے استفسار کا جواب دینے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیتا، اگر آپ یہ نہ ظاہر کردیتے کہ کسی تصنیف میں شیفتہ کا ذکر کیا جارہا ہے ۔ چونکہ مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ مبادا آپ کی رائے جو یقیناً غلطی پر مبنی ہے پبلک کو بھی گمراہ کردے، اسلئے میں اولین فرصت میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ شیفتہ کے متعلق آپنے جو رائے قایم کی ہے وہ بالکل غلط ہے حیرت ہے کہ آپ ایک تصنیف کے سلسلہ میں شیفتہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور صرف ان چند اشعار پر اپنی رائے کا حصر کرنا چاہتے ہیں جو ادھر اُدھر لوگوں سے سن لئے ہیں ۔ آپ کا ایک طرف یہ فرمانا کہ "میں نے کلام شیفتہ کا بہت کم مطالعہ کیا ہے" اور دوسری طرف ان کے متعلق ایک بُری رائے قایم کرکے اسے مستقل تصنیف میں جگہ دینا، اس قدر عجیب بات ہے کہ دنیائے تصنیف و تالیف میں شاید ہی کوئی دوسری مثال اس کی مل سکے۔

لوگ برسوں ایک ایک مسئلہ کی چھان بین کرتے ہیں، جب کہیں جاکر وہ کسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔ لیکن آپ محض چند سنے سنائے اشعار پر اس قدر اعتماد کرلیتے ہیں کہ کسی مزید کاوش و جستجو کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

معاف فرمایئے، اگر آپ کی یہ تصنیف تمامتر انھیں خوش ادائیوں کا نتیجہ ہے، تو ڈرتا ہوں کہ معلوم نہیں آپ نے

اور کس کس کو حل کیا ہوگا۔ سچ ہے :-

با چابکان دلبر و شوخان دلفریب
بسیار در فتادہ و اندک رہیدہ اند

افسوس ہے کہ آپ نے ان اشعار کو تحریر نہیں فرمایا جن کی بنا پر آپ نے شیفتہ کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے ورنہ ممکن ہے آپ کا ذوق سمجھنے میں کافی مدد ملتی، بلکہ چونکہ شیفتہ کے وہی اشعار زیادہ مشہور ہیں جو واقعی زیادہ اچھے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے ذوق اور آپ کی تصنیف دونوں کی معذرت ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

شیفتہ کے چند مشہور اشعار یہ ہیں اور غالباً آپ نے بھی انھیں کو سنا ہوگا :

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ		اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا		قاصد وہ بہت الم کریں گے

ہائے وہ شیفتہ کی ہیبت ہی		تھام لینا وہ تیری محمل کو

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی		میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین		دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

فارسی کے اشعار میں اس لئے نہیں لکھتا کہ آپ نے غالباً انھیں سنا بھی نہ ہوگا، اور اگر سنا ہوگا تو سمجھنے کی کوشش نہ کی ہوگی۔

ہر چند آپ نے میری رائے پر عمل کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے، تاہم مجھے اس کے ظاہر کر دینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ شیفتہ اپنے زمانہ کے بہترین شعرا میں شمار کیا جاتا تھا اور یہ رائے نہ میری ہے نہ مجھ جیسے کسی اور نا اہل کی بلکہ ان کی جنکی شاعری کے غالباً آپ بھی معترف ہوں گے یعنی غالب و مومن۔

غالب کہتا ہے :-

غالب، ز حسرتی چہ سرایدکہ در غزل		چوں او تلاش معنی و مضموں نہ کردہ کس

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ شیفتہ، فارسی میں حسرتی تخلص کیا کرتے تھے اور انھیں کے متعلق غالب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

[illegible]

[illegible] مصطفیٰ خاں [illegible]

مصطفیٰ خاں [illegible] کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مصطفیٰ خاں [illegible]

[illegible]

[illegible] ذوق کی داد

[illegible]

[illegible]

[illegible] مصطفیٰ خاں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] عبدالرحمن آزردہ ـــ [illegible] ـــ

[illegible] اصفہانی ـــ میرزا اسد اللہ خاں غالب ـــ حکیم مومن خاں مومن ـــ

[illegible] ـــ غلام علی خاں وحشت

انھیں لوگوں [illegible] شیفتہ کے ذوق سخن کا [illegible] نہایت دلکش اسلوب اختیار کر لیا تھا۔

اسی زمانہ میں شیفتہ نے شاعری کی اور اس آن بان کے ساتھ کہ کبھی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا اور آج بھی ہر صاحب ذوق اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

انھوں نے سب سے پہلے مومن کا تلمذ اختیار کیا اور اس کے بعد غالب کا، لیکن سچ یہ ہے کہ خود فطرت نے انھیں شاعر پیدا کیا تھا، اور اگر ان میں سے کسی کا تلمذ حاصل نہ ہوتا تو بھی وہ اسی مرتبہ کی شاعری کرتے۔

آپ نے غالب کی وہ مشہور غزل سُنی ہوگی جس کا ایک شعر یہ ہے :-

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اسی زمین میں شیفتہ کے بھی دو شعر سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہیں :-

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے،　　　صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی

اژدہامِ غم و رشک و حرماں،　　　پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

اور مقطع تو ایسا لکھ گئے ہیں کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، ملاحظہ ہو :-

میری خاطر سے چلو شیفتہ وال　　　خیر اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

مومن کے مشکل رنگ کو بھی انھوں نے کمال حسن و خوبی کے ساتھ نباہا، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

یار کو محروم تماشا کیا　　　مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا،

عرضِ تمنا سے رہا بیقرار　　　شب وہ مجھے، میں اسے چھیڑا کیا

غیر ہی کو چاہتے ہیں اب شیفتہ　　　کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا،

کل نغمہ گر جو مُطرب جادو ترانہ تھا　　　ہوش و حواس عقل و خرد کا پتہ نہ تھا

دشمن کے فعل کی تمھیں توجیہ کیا ضرور　　　تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھے　　　آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

ان کے یہاں اور اساتذہ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے، مثلاً مصحفی

اس نو بہارِ حُسن کو بدنام مت کرو　　　تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا　　　شیفتہ اُس کو تو تو تم سے محبت نکلی،

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں　　　کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

اسے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی　　　کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

وہ مجھ سے خفا ہے تو اُسے یہ بھی ہے زیبا　　　پر شیفتہ میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا

انھوں نے میرؔ سے بھی استفادہ کیا، مثلاً :-

اے ستمگر رگِ جاں میں ہے مرے پیوستہ — دم نکل جائے گا سینہ سے مرے تیر نہ کھینچ [1]
کہتے ہیں علاج آپ کریں کچھ خفقان کا — دل کا سبب کو رہویگا سنائی اگر ایسی

لیکن ان کا طبعی رنگ وہی تھا جس پر مومنؔ و غالبؔ کی شہرت قایم ہوئی، ملاحظہ ہو :-

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم — واقف ہیں شیوۂ دل شورش ادا سے ہم
دامن تک اسکے ہائے نہ پہونچا کبھی وہ ہاتھ — جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
رنگیں ہے بھیگتا ہوں کے خوں سے سوادِ شہر — حالانکہ داں ہنوز سرِ امتحاں نہیں
وجد کو زمزمۂ مرغِ سحر کافی ہے — شیفتہ نازِ مغنی و مزامیر نہ کھینچ
قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو — دیکھا وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

معلوم نہیں شیفتہؔ کی فارسی شاعری کے متعلق آپ کچھ سننا پسند کریں گے یا نہیں، لیکن خیر اب ذکر آگیا ہے تو اُسے بھی "بادلِ ناخواہ" سُن لیجئے۔

شیفتہ فارسی میں حسرتیؔ تخلص کرتے تھے اور اتنا اچھا کہتے تھے کہ اگر آپ غالبؔ و نظیریؔ کے کلام کے ساتھ ان کے اشعار ملا دیجئے تو مطلق تمیز نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے غالبؔ، نظیریؔ و حافظؔ کی طرحوں پر بہت سی غزلیں کہی ہیں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ جو اُس وقت کے معیاری فارسی تغزل میں پائی جاتی تھیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشان ست — کسے نہ داد تسلی دلِ زلیخا را
خندہ چہ خوش شیوہ ایست از لبِ خشم و عتاب — لذتِ دیگر دہد زخمِ نمک سود را
رحم ست بر کسے کہ در اں کوئے می رود — در دست نامۂ من و بر لب سلام ما
در چارۂ او کوش کہ دیوانہ ات امروز — از نکہتِ گل بوئے ترا باز ندانست
بر آں سرم کہ نہ ہر نیک و بد کنارہ کنم — خورم شراب و رُخِ نیکواں نظارہ کنم

زبان کے لحاظ سے اُن کے کلام کی ایرانیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے :-

نہ چو عشق سازگارم بہ مزاجِ دردمنداں — نہ چو حسن اعتبارم بہ نگاہِ خود پسنداں
برخ چو آفتابت نگہ قمر عداراں — بکمندِ عنبرینت سرِ عنبریں کمنداں

---

[1] میرؔ کا شعر ہے :-

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں ہمیت — تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں ہمیت

شب وصل بخیر رفتم پئے التماس لطفے — چو ہجوم عیش دیدم شدہ شوق من دوچنداں

ز چہ حسرتی تنالم ز جفاے طالعے بد — بہ فراق یار کشتم چو فغان دردمنداں

انھوں نے فارسی قصائد بھی لکھے ہیں اور سب اس رنگ کے ہیں جن پر عرفی کا دھوکا ہوتا ہے اور فارسی رقعات میں تو بالکل غالب نظر آتے ہیں اور ایسے ایسے پاکیزہ استعارات صرف کئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حسرتی کے ذوق سخن پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔

یہ خیال میرا بھی ہے رسالے میں شیفتہ اپنے زمانہ کا ایک اچھا شاعر تھا اور یہ ممکن نہیں کہ مومن و غالب کے ذکر کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیا جائے لیکن اگر آپ کے نزدیک ایسا نہیں ہے تو اس بارے میں آپ کا خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

رحم بر جان ذرہ کہ مرد رہ نیست!

جنوری سنہ ۴۰ء کا نگار

نظیر نمبر

زیر ترتیب ہے اور کتابت شروع ہوگئی ہے۔ جن صاحب نے اب تک اپنے موعودہ مقالات ارسال نہیں کئے، وہ براہ کرم جلد توجہ فرمائیں زیادہ سے زیادہ ۲۵ نومبر تک مضامین دفتر میں پہونچ جانا چاہئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ایجنٹوں کو معلوم ہونا چاہئے

کہ نظیر نمبر بھی سالنامہ خاص نمبر کی طرح پھر کسی قیمت پر نہ مل سکے گا، اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ جتنے پرچے طلب کریں گے اتنا ہی زیادہ فایدہ ان کو ہوگا

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

کمیشن ۲۵ فیصدی، مصارف ڈاک ہمارے ذمہ ہوں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

غــزل:

حواس و ہوش کی دنیا پہ چھا گیا کوئی
نفس نفس کو مرے جگمگا گیا کوئی

کسی کی مست نگاہیں ارے معاذ اللہ
خرابِ بادۂ الفت بنا گیا کوئی

جنوں نواز نگاہوں سے دیکھ کر مجھ کو
تباہ حال کی دُنیا بنا گیا کوئی

کہا جو میں نے یہ سب کچھ کرم تمہارا ہے
تو مُسکرا کے نگاہیں چرا گیا کوئی

بڑھیں جو حد سے مری وحشتیں تو گھبرا کر
تھپک تھپک کے مجھے خود سلا گیا کوئی

یہ چاہتا ہوں کہ اب اُس کو بھول جاؤں مگر
الٰہی خیر کہ پھر یاد آ گیا کوئی

شبِ وصال، غمِ انفراق، سلے راحت
فنائے زیست کا حاصل بتا گیا کوئی

(نوابزادہ) راحت سعید خاں بی۔اے

بازگشت

عارض پہ پسینے کے قطرے وہ بھیگا ہوا شبنم میں گلاب
مست آنکھوں میں وہ آنسو جیسے ساغر سے چھلکنے کو شراب

کچھ کھویا کھویا سا عالم کچھ بھیگی بھیگی سی پلکیں،
کچھ اُترا اُترا سا چہرہ کچھ بکھری بکھری سی زلفیں

وہ اپنے آپ مچل جانا پھر سوچ کے خود چپ ہو جانا
اک سمت نگاہ جما دینا اور بیٹھے بیٹھے کھو جانا

گھبرائی ہوئی سی وہ نظریں کچھ جیسے چھپانے کی کوشش
دانتوں میں دبا کر ہونٹوں کی آنسو پی جانے کی کوشش

عشاق کے ارمانوں کی طرح وہ بل کھا کھا کر رہ جانا
جب دل پر کوئی بس نہ چلے ہونٹوں کو چبا کر رہ جانا

وہ آرزوؤں میں لپٹی ہوئی صد شعلہ بجاں ٹھنڈی سانسیں
ماتھے پہ شکن ابروؤں میں بل اور دلمیں محبت کی پھانسیں

وان حُسن کے تیور بگڑے ہوئے یاں عشق کی حالت لٹی ہوئی
اک آگ کے دو شعلے لیکن دونوں کی صورت بدلی ہوئی

طوفانِ غلط فہمی برپا حُسن اور محبت میں باہم
تمکینؔ نظامِ مہر و وفا ہونے ہی کو تھا درہم برہم

اکبار جو آنکھیں چار ہوئیں نظروں میں تکلم آ ہی گیا
پھر لاکھ بنائے کچھ نہ بنی ہونٹوں پہ تبسم آ ہی گیا

سرمست تمکین

مسائلِ لطیف

کیفِ تخئیل میں گم رقص کناں جاتا ہے،
کس کو فرصت ہے یہ سوچے کہ کہاں جاتا ہے

زندگی کیفِ مسلسل ہے، وہ غم ہو کہ خوشی
راہروِ بے خبرِ سود و زیاں جاتا ہے

شرحِ یک قطرۂ شبنم کے لئے بھی ساقی
مانگنے مہرِ درخشاں کی زباں جاتا ہے

کس حسیں زلف نے بھیجا ہے مہکنے کا پیام
کس طرف قافلۂ بوئے جناں جاتا ہے

ہے جنوں بھی مگر عرفان کی اک منزلِ خاص
جانے! دل کس کے تجسس میں کہاں جاتا ہے

میکدہ، شرح بہ ایجاز ہے اُس جلوے کی،
کعبہ اُس سمت بہ تاویلِ گراں جاتا ہے

ہے تصوف بھی خرابات کی چھوٹی سی صفت
راستہ یہ بھی سوئے بزمِ مغاں جاتا ہے

موج ٹکرا کے کنارے سے سکوں یاب نہیں،
یہ جنوں وہ ہے، کراں تا بہ کراں جاتا ہے

دیکھنا جاتے ہوئے ساقیِ مہوش کو عدمؔ
گویا ساتھ اپنے لئے کون و مکاں جاتا ہے

عدم

دیوانے

کیا دشت نوردی میں مصروف ہیں دیوانے
کچھ حُسن کے سودائی، کچھ عشق کے پروانے

کھوئے ہوئے وحشت میں ڈوبے ہوئے اُلفت میں
حالات سے ناواقف، ماحول سے بیگانے

اُمڈے ہوئے آنکھوں میں اسرارِ جہاں بینی
گوندھے ہوئے نقطوں میں کونین کے افسانے

اللہ رے وحشت کا اندازِ خود آرائی
صد چاک گریباں پر ہنستی ہوئی رسوائی

گفتار کی لہروں میں اسرار کی طغیانی
رفتار کی موجوں میں طوفان کی برنائی

وحشت کی روش میں بھی کچھ خاص مطالب سے
اندازِ جنوں میں بھی ادراک کی رعنائی

کشتی کی طرح پیہم کھاتی ہوئی ہچکولے
آہوں کے تلاطم میں آفاق کی پہنائی

اسرارِ محبت کی آواز ہیں دیوانے
میخانۂ فطرت کے ہمراز ہیں دیوانے

باقی صدیقی

غزل:-

چمن در انتظار ہے کلی کلی گلاب کی
بہار آکے کھول دے گرہ ذرا نقاب کی

بلند ایک شاخ پر، یہ کہہ رہا ہے تن کے گل
مصوری میں کر رہا ہوں حُسن کے شباب کی

سفینہ ہے یہ زندگی، ہوائے تیز ہر نفس
حزین و بے قرار دل ہے موج اضطراب کی

اُٹھا ہے فتنۂ سحر، تمھیں ہے خواب بے خبر
نگاہ بن کے پڑ رہی ہے دھوپ آفتاب کی

کہے پیام دل کا کوئی اُن سے وہ جہاں بھی ہوں
بہ قدرِ تابِ دید ہے گل آبرو حجاب کی

درِ حرم پہ سر مرا دماغ آسمان پر
کہ بہشت! تیری آرزو نے عاقبت خراب کی

بڑھے ہیں وہ رواں دواں، مگر ذرا خبر نہیں
شباب! اُف شباب ہے کہ موج ہے شراب کی

نگاہ میں وہ شوق کی، کرم ہے تابِ دید کا
جبیں پہ بل پڑا ہوا، نظر ہے یہ عتاب کی

کلیم اور مجھ میں فرق ہے یہ کیفی حزیں
اُدھر سوالِ ہوش تھا، عشق ادھر جواب کی

(مولانا) کیفی چریاکوٹی

غزل:

اک "کیفِ مستقل" میں بسر زندگی ہوئی،
ہر سانس میں تھی یادِ کسی کی بسی ہوئی

ہاں رہ نوردِ عشق، ذرا دیکھ بھال کر
غافل یہیں کہیں سے قیامت چھپی ہوئی

شاید یہیں ملی ہیں حدیں حسن و عشق کی
ہر چیز پر ہے مہرِ خموشی لگی ہوئی،

ہرچند دار و طور بھی ہیں مرکزِ جمال
لیکن مری نظر ہے تجھی پر جمی ہوئی

برہم زنِ کون و مکاں دیکھنا کلیم
جس دن بھڑک اٹھی مرے دل کی دبی ہوئی

کروٹ کے ساتھ ساتھ زمانہ بدل گیا
اک آہ میں تمام "شبِ زندگی" ہوئی

کیسا حساب اور کہاں کی سزا بہار
کمبخت آئے گی نہ جوانی گئی ہوئی

بہار۔ کوٹی

غزل:

بہار آئی ہے پھر خاکِ چمن گلریز ہے ساقی
اٹھا ساغر کہ دنیا آج عنبر بیز ہے ساقی

نہ جانے کتنے دل خوں کر دئے تیری نگاہوں نے
تبسم ہے ترا یا خنجرِ خوں ریز ہے ساقی

ترے صدقے ترے قرباں پلائے جا پلائے جا!
مری ہر سانس اب اک موجِ آتش ریز ہے ساقی

مجھے اندیشۂ افلاک کیوں ہو، خوفِ فردا کیوں؟
ابھی تو تیرے پیمانے میں تند و تیز ہے ساقی

نہ دے صہبا، مجھے دردِ تہِ ساغر ہی کافی ہے
مئے گلگوں کا ہر قطرہ نشاط انگیز ہے ساقی

گدائے حسن ہے کاوش مگر وہ اس پہ نازاں ہے
کہ تیری ٹھوکروں میں دولتِ پرویز ہے ساقی

کاوش حیدرآبادی

گلِ مزار

جھٹ پٹے کا وقت ہے، ٹوٹی ہوئی قبر کے سرہانے چھوٹے سے خزاں رسیدہ پودے کی ٹہنی میں ایک ننھا سا زرد رنگ کا پھول کھلا ہوا ہے، قبرستان کے چٹیل میدان کی ہوائیں، اس پھول کو جھولا جھلا رہی ہیں، کبھی پینگ بڑھ جاتی ہے کبھی گھٹ جاتی ہے، مگر پھول سب سے بے پروا کسی کی تلاش میں سرگرم ہے، اور قطرۂ شبنم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

پھول:۔

رنگ الگ لٹ گیا، چھینی گئی خوشبو الگ — خاک ایسی زندگی پر، میں الگ اور تم الگ

قطرۂ شبنم یہ سنکر پھول کی پنکھڑی پر ٹپک پڑتا ہے اور آفتاب آہستہ آہستہ سر نکال کر کہتا ہے،

آفتاب:۔

ہوں سمندر زندگی کا، نور کا ہوں آبشار — لوٹتی ہیں میری کرنیں باغِ دنیا کی بہار
خون سے میرے یہاں کے ذرہ ذرہ میں نمو — دہر میں ہر چیز کو رہتی ہے میری آرزو
بخشتا ہوں لعل، پتھر کو سمندر کو گہر — پھول پھل اشجار کو حیوان و انساں کو نظر
روشنیِ بزمِ عالم، میں نہیں تو اور کون؟ — بادشاہِ روحِ آدم میں نہیں تو اور کون؟

قطرۂ شبنم:۔

میں کسی کی منتظر آنکھوں سے ہوں ٹپکا ہوا — آ رہا ہوں آسمانِ عشق سے لپکا ہوا
اس گلِ بے رنگ و بو کی دیکھ کر تنہائیاں — میں سکھانا چاہتا ہوں اس کو بزم آرائیاں
چاہتا ہوں آپ گم ہوں، پھول کو زندہ کروں — شہرِ خاموشاں میں روشن شمعِ رخشندہ کروں

آفتاب:۔

پھول ہی باقی رہے گا اور نہ تیری آب و تاب — رہتی دنیا تک رہوں گا صرف اک میں "آفتاب"

قطرۂ شبنم کے دل کو ٹھیس لگتی ہے لیکن مسکراتا ہوا کہتا ہے:

قطرۂ شبنم:۔ تو خودی کا سحر ہے میں بے خودی کا معجزہ — تو فسونِ ہوش ہے میں بیہشی کا معجزہ

یعنی میں ہوں بے جہت اور تو بہت محدود ہے — میں ہوں بے مقصود، تو زندانیِ مقصود ہے
بے نیازِ راہ ہوں میں تو ہے جادہ کا غلام، — میں فنائے مستقل اور تو حیاتِ ناتمام

(آفتاب توہین آمیز تبسم سے دیکھتا ہے اور قطرۂ شبنم اس میں جذب ہوکر فنا ہو جاتا ہے)

(تھوڑی دیر خاموشی)

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، ایک شاعر داخل ہوتا ہے، اور قبر کے سرہانے ایک پھول دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے)

شاعر:۔

اے گُل تو تجھ پہ ہے افسردگی چھائی ہوئی — تیری نکہت بھی نظر آتی ہے گھبرائی ہوئی،
کاٹ دے ہنس کھیل کر تو اپنی عمرِ مختصر — کاروبارِ اہلِ عالم پر ہے کیوں تیری نظر

پھول:۔

ہے لبِ گور اپنی پیدائش کے دن سے زندگی — ابتدا ہی سے ہے افسردہ مری تابندگی
میری شمعِ رنگ کا پروانہ کوئی بھی نہیں — بھینی خوشبو کا مری مستانہ کوئی بھی نہیں
شب کو تھر قبر کے جل کر جلاتے ہیں مجھے — دن میں ذرے خاک کے آنکھیں دکھاتے ہیں مجھے
ہمنشیں اک قطرۂ شبنم تھا دم بھر کو ملا، — وہ بھی بدبختی سے میرے نذرِ نخوت ہو گیا
چاہتا ہوں چند لمحے عیش میں کیجے بسر — تو ہی مجھ کو اپنے سینے سے لگا لے توڑ کر

شاعر:۔

داستاں سن کر تری دل ہے میرا خوننابہ بار — لالہ زارِ زندگی ہے درحقیقت خار زار
میں بھی دل کا قافلہ لٹوا کے آیا ہوں یہاں — کر چکی ہیں خاک مجھ کو عشق کی چنگاریاں
یوں سمجھ لے بس کہ اک پامال نقشِ جادہ ہوں — یعنی تجھ سے بھی زیادہ میں فنا آمادہ ہوں،

پھول، بس سنتے ہی یہ، شاعر کے سینہ پر گرا — اور شاعر بھی نہ اس صدمہ سے جانبر ہوسکا

عرش تیموری

ایک غلطی کی تصحیح

- پچھلے پرچہ میں صفحہ ۵۹ پر یہ شعر غالب سے منسوب کیا گیا ہے:۔

عمرت دراز باد فراموشکارِ من، — یادم نمی کنی و زیادم نمی روی

یہ شعر کلیاتِ غالب میں تو ہے لیکن غالب کا نہیں ہے شاید خسرو یا کسی اور شاعر کا ہے جسے غالب نے بطور حوالہ نقل کیا ہے۔ — ن

غزل:

رکی جاتی ہے شرحِ رازِ دل پر بے زباں میری
نگاہِ بے خبر یہ آخری ہیں ہچکیاں میری

ہوئی جاتی ہے افسردہ کسی کی محفلِ عشرت
بدل دے اے نیازِ عشق تاثیرِ بیاں میری

جدا ہوں بزم سے لیکن نظر میں ہے وہی عالم
تجھے بھولی نہیں ہیں آج تک بیتابیاں میری

خموشی میں بھی رازِ عشق اے ہمدم نہیں چھپتا
کہ تشریحِ غمِ پنہاں ہے چشمِ خونفشاں میری

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مآلِ کار کیا ہوگا
دمِ عرضِ تمنا آج رکتی ہے زباں میری

کسی کے سنگِ در پر چند سجدے اور کر لیتا
اجازت مجھکو دیدیتی اگر عمرِ رواں میری

خدا کا شکر ہے میں بے نیازِ جلوۂ گل ہوں
اسیری پر فدا ہیں اے جنوں آزادیاں میری

ہر آہِ سرد میں مضمر ہے سوز و ساز کی دنیا
توجہ سے کبھی تو آپ سنئے داستاں میری

ہر اک فقرہ میں اے خیرآت لاکھوں رمز پنہاں ہیں
مرقع ہے غم و درد و الم کا داستاں میری

(جناب) خیرآت تاندوری

جذباتِ تہنیت

یہ نظم حضرت امید امیٹھوی کی ہے - جو جناب انورؔی فریدآبادی کے سفرِ ولایت سے واپس آنے کی مسرت میں لکھی گئی ہے اور

سلے نو براہل بنیش و سے سید انورؔی
زیبد ز عیدِ خویش دہم گر نویدِ عید

بر بوسے دیدِ تست چو نظارگانِ ما
بستیم چشمِ شوق بماہِ سعیدِ عید

قفلے کہ روزہ بر درِ عیدم نہادہ بود
دادند از ہلال بدستم کلیدِ عید

در ہر جدید گرچہ بود لذتِ جدید
اما مپرس لذتِ عیدِ جدیدِ عید

اے غائب از دو دیدہ و اے ہمنشینِ دل
تو عیدِ روسے ائی و دیدِ تو عیدِ عید

از خانہ ہیچو آمنہ بیروں نمیروی
گرچہ جواب دید بود باز دیدِ عید

یک جلوۂ تو حاصلِ سی روزہ منست
دیگر مرا چہ کار ز گفت و شنیدِ عید

نازم بدیں کہ بندۂ سبے دامتم و لے
حاشا نیم غلامِ غم زر خریدِ عید

کاش از تلطفے بدہی مژدۂ وصال
کاج از تفقدے بفرستی بریدِ عید

اے روسے غم سیاہ کہ در روزِ عید ہم
بدقسمتم ز دیدنِ روسے سپیدِ عید

در انتظارِ وعدۂ عیدش وعید شد
امید کس مباد چو من ناامیدِ عید

باز آمدم ز شکوہ و دیگر بشوق دید
آوردہ ام بہ نذرِ تو دُرِّ فریدِ عید

در مبحثِ تقدم دید تو ہمدگر
در جنگ آمدند دو طفلِ عنیدِ عید

طغیانِ رشک بین کہ تو گوئی بُریدہ شد
حبل الوریدِ عید ز تیغِ حدیدِ عید

اے دہ چہ ملت ست کہ اے سروِ نازِ من
در مذہبت ہدر شدہ خونِ شہیدِ عید

منکر مشو ز معجزِ سحرِ حلالِ من
اے مصحفِ رُخ تو کلامِ مجیدِ عید

گوئی کہ از بیاضِ سویدا سوادِ من
وام ست روشنائیِ صبحِ امیدِ عید

شایانِ شانِ قافیہ حرفے کہ رُو نمود
پیوند کرد مشں بہ ردیفِ مفیدِ عید

نازو عطاردار بفلک بر نگارشم
آید برقصِ زہرہ ز لحنِ نشیدِ عید

چوں برگِ گل پرد و رقم در ہواسے شوق
کلکم دود بصفحہ ز تابِ نبیدِ عید

زیں عرضِ شوق عرضِ عقیدت بود مراد
نے استفادتِ زرِ سُرخ و سپیدِ عید

چندانکہ شوق دید شود بر مزید شوق
بادا مزیدِ عید ترا بر مزیدِ عید

اے در نصیبِ خصمِ تو دارالبوارِ غم
وے بارگاہِ عیش تو قصرِ مشیدِ عید

چشمِ بد زمانہ ز عیدت بود بعید
عمرت دراز باد چو طولِ امیدِ عید

(ابوالکمال) امید امیٹھوی

نگار

جلد ۳۶ | فہرست مضامین دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء | شمار ۶

نگار

ایڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمار ۶	دسمبر ۳۹ء	جلد ۳۶

ملاحظات

سخنہائے گفتنی

اس اشاعت کے ساتھ نگار کا اٹھارواں سال ختم ہوتا ہے اور جب میں غور کرتا ہوں کہ اس مدت میں ایک بار بھی مجھے تاخیرِ اشاعت پر معذرت خواہی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہو سکا

ہندوستان میں کسانوں کے بعد سب سے زیادہ تباہ حال طبقہ اُردو جرائد ورسائل کے مدیروں کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس تباہ حالی کا سبب مشترک شاید یہ ہو کہ وہ تغذیۂ جسم کا سامان فراہم کرتا ہے اور یہ تغذیۂ روح کا۔ بہرحال سبب یہ ہو یا کوئی اور، یہ حقیقت ہے کہ ہماری صحافت مہذب گداگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور گداگری بھی ایک ایسے کاسۂ گدائی کے ساتھ جس کے ٹوٹ جانے کے لئے ذراسی ٹھیس کی ضرورت ہے

اس لئے یہاں مشکل ہی سے کوئی سخت جان رسالہ یا اخبار ایسا نظر آئے گا جو چند سال سے زیادہ زندگی پائے ورنہ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ یہ دردِ حد سے گزر کر دوا ہو گیا اور رسالہ یا اخبار ہمیشہ کے لئے ختم !

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہماری صحافت کا معیار اس قدر پست و ادنیٰ ہے کہ ہر طفلِ دبستاں اڈیٹر بن سکتا ہے

اور دوسرا یہ کہ خود پبلک کسی معیاری رسالہ کی قدر شناس نہیں۔ اس لئے پست و ادنیٰ رسالے تو اس لئے بند ہو جاتے ہیں کہ وہ پست و ادنیٰ ہیں اور اچھے رسالے اس لئے زندہ نہیں رہتے کہ وہ اچھے ہیں

پس ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں اور ایسی پبلک کے درمیان جہاں اچھے اور بُرے کا امتیاز کوئی معنی نہ رکھتا ہو کسی رسالہ کا اتنے عرصہ تک زندہ رہنا معجزہ سے کم نہیں، لیکن جس وقت آپ "نگار" کی تاریخ پر غور کریں گے تو اس کی زندگی معجزہ سے کچھ بلند تر چیز نظر آئے گی

اسوقت ہندوستان میں جتنے رسایل پندرہ بیس سال یا اس سے زاید عمر کے نظر آتے ہیں ان کی بقا کا راز یہ ہے کہ یا تو وہ کسی سرمایہ دار ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں یا خود ان کا اڈیٹر دولتمند ہونے کی وجہ سے نفع یا نقصان کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نگار کو ان دونوں میں سے کوئی چیز حاصل نہیں۔ نہ وہ کسی ادارہ سے تعلق رکھتا ہے اور نہ اس کا اڈیٹر اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ اس بار کو برداشت کر سکے۔ اور اسی لئے میں نے کہا کہ نگار کی زندگی معجزہ سے بھی زیادہ کوئی اور چیز ہے جسے عام لوگ "فضل خداوندی" کہہ سکتے ہیں، لیکن میری زبان میں اس کا نام "حسن تدبیر" ہے

سنہ ۲۲ء سے اسوقت تک کے پرچے اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۲۰ ہزار صفحات میں سے کم و بیش آٹھ ہزار صفحات صرف میرے قلم کے ہیں اور اس طرح گویا ادارت کے تقریباً نصف مصارف خود میں نے یا میرے دماغ نے برداشت کئے اور ایک دن کے لئے بھی مُعاون کی خدمات حاصل نہیں کیں۔ یہ تو ہوا شعبۂ ادارت کا حال، اب رہ گیا انتظامی شعبہ سو اس کو بھی ابتدائی چند سالوں تک میں نے ہی سنبھالا اور اس کے بعد سوائے ایک شخص کے جس کی تنخواہ ایک معمولی کلرک سے زیادہ نہیں ہے کسی اور کا اضافہ نہیں کیا گیا

اس میں شک نہیں کہ پبلک نے نگار کی قدر کی، لیکن اس قدر شناسی کی حد اس سے آگے کبھی نہ بڑھی کہ میں صرف مزدوروں کی طرح کام کر کے نگار اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ لیکن اب کہ میں عناصر میں اعتدال کی کمی اور قوا میں اضمحلال کی زیادتی بیّن طور پر محسوس کرنے لگا ہوں، یہ سوچنا ناگزیر ہو گیا ہے کہ میں اس محنت کو کبتک برداشت کر سکوں گا، اور غالبًا اس باب میں آپ کو مجھ سے زیادہ سوچنا چاہئے

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کوئی "مرد راہب" نہیں ہوں، زندگی کے تمام وہ تعلقات جنھیں "دنیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے، میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور میں اُن سے بے نیاز ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ ابتدا سے میں جس معاشرت کا عادی ہوں وہ بھی معمولی سطح سے کچھ بلند ہے، اس لئے نگار کی زندگی کے ساتھ میری ضروریاتِ زندگی کا سوال بھی آپ کے سامنے ہونا چاہئے

پھر یہ مسئلہ نہ فراہمی دولت کا ہے، نہ کسی کے لئے اسباب عیش و نشاط فراہم کرنے کا، بلکہ صرف یہ کہ اگر واقعی نگار نے اسوقت تک کوئی مفید خدمت انجام دی ہے تو مجھے اس کا معاوضہ کم از کم اتنا ضرور ملنا چاہئے کہ میں اسے

زندہ رکھ سکوں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ جو اسوقت تک اسے حاصل رہی ہیں

کاروباری سلسلہ میں اس وقت تک میں نے قارئین نگار کو کبھی اس قدر اہتمام کے ساتھ مخاطب نہیں کیا اور شاید اب بھی اسے گوارا نہ کرتا، اگر حالات مجبور نہ کرتے ۔ جنگ نے کاغذ و طباعت کے مصارف دوچند کر دئے ہیں جو صرف آپ ہی کی توجہ سے پورے ہو سکتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ:-

آپ اپنی خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے، ساتھ ہی ساتھ کم از کم ایک خریدار اور پیدا کیجئے ۔ انفرادی طور پر آپ کی یہ کوشش بہت معمولی بات ہے لیکن اجتماعی طور پر اس کا جو اثر پڑے گا وہ بڑی اہم چیز ہے جو میری بہت سی فکروں کو دور کر دیگا اور آیندہ زیادہ اطمینان کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقعہ دے گا۔

جنگ کا فیصلہ اسٹالین کے ہاتھ میں ہے

جنگ جس انداز و رفتار سے جاری ہے وہ لوگوں کے لئے بہت مایوس کن ہے ۔ "مایوس کن" اس لئے کہ دنیا تو یہ چاہتی ہے کہ روز قتل و غارتگری کی داستانیں سننے میں آئیں، ہلاکت و خونریزی کے ہولناک واقعات رونما ہوں، اخباروں میں یہ خبریں نظر آئیں کہ جرمنی نے پیرس و لندن پر اور اتحادیین نے برلن پر ہوائی تاخت شروع کر دی، لیکن وہاں یہ حال ہے کہ نہ نازی فوج آگے بڑھتی ہے نہ اتحادی افواج کوئی جارحانہ اقدام شروع کرتی ہیں

یقیناً موجودہ حالاتِ جنگ بہت غیر دلچسپ ہیں اور اگر ان جہازوں کی غرقابی کو نظر انداز کر دیا جائے جو جزیرۂ انگلستان کے قرب و جوار میں جرمن آبدوزوں اور سرنگوں کی وجہ سے سننے میں آتی رہتی ہے تو ہم کو یہ سمجھنے کا موقعہ بھی نہیں ملتا کہ واقعی جنگ جاری بھی ہے یا نہیں ۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سکون کی تہ میں کتنا اضطراب پنہاں ہے اور فضا کی یہ خاموشی کتنے زبردست طوفان کا اعلان ہے

گزشتہ جنگ عظیم چاہے کتنی ہی ہولناک رہی ہو، لیکن اتنی پیچیدہ نہ تھی ۔ اس میں کھلے ہوئے فریق تھے، کھلے ہوئے مقاصد تھے، اور کھلی ہوئی لڑائیاں ہو رہی تھیں، لیکن اس جنگ میں تو ابھی تک یہی پتہ نہیں چلا کہ کون کس کا ساتھ دے گا اور جنگ کی مرکزی حیثیت کس حصۂ زمین کو حاصل ہوگی

اس جنگ کو جس ملک نے معمہ بنا رکھا ہے وہ روس ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آیندہ طرزِ عمل جنگ

کے نقشے میں کیا تبدیلیاں پیدا کرنے والا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے روس کی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے

جسوقت زیکوسلوویکیا کا مسئلہ طے کرنے کے لئے میونک کانفرنس میں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اطالیہ کے نمایندے جمع ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ روس کی نمایندگی ضروری ہے یا نہیں (خاصکر ایسی صورت میں جبکہ روس اور زیکوسلوویکیا کے درمیان معاہدۂ اتحاد و تعاون ہو چکا تھا) اس پر جرمنی و اطالیہ کے نمایندوں نے کہا کہ ہم روسی نمایندوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی گوارا نہ کریں گے، فرانس و برطانیہ یہ سنکر خاموش ہو رہے اور انھوں نے بھی روس کی شرکت کو غیر ضروری سمجھ کر زیکوسلوویکیا کی موت کا فیصلہ صادر کر دیا

اس توہین نے روس کی آنکھیں کھول دیں اور ایک عام جوش وہاں پیدا ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کو جو اس سے قبل نکالدئے گئے تھے اور جن کے نکل جانے کی وجہ سے سوویٹ حکومت کا اقتدار ضعیف ہو گیا تھا پھر بلا بلا کر ذمہ داری کی جگہیں دی گئیں اور نئی پالیسی متعین کرنے پر غور ہونے لگا۔ اسی دوران میں ہٹلر نے زیکوسلوویکیا و میمل پر قبضہ کر لیا جس نے سارے یورپ میں بےچینی پیدا کر دی اور فرانس و برطانیہ پوری طرح محسوس کرنے لگے کہ اب پولینڈ کی بھی خیر نہیں ہے۔

اس وقت فرانس و برطانیہ کی حالت ایک ڈوبنے والے کی سی تھی جو تنکے کا سہارا بھی بہت سمجھتا ہے اور انھوں نے اُسی سوویٹ حکومت سے اعانت چاہی جسے چند دن قبل میونک کانفرنس میں وہ اس قدر ذلیل کر چکے تھے۔ خود پولینڈ بھی سوویٹ حکومت کا مخالف اور جرمنی کا طرفدار تھا۔ لیکن مجبوراً اسے بھی روس کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا

یہ رنگ دیکھ کر جرمنی و اٹلی بھی چوکنا ہوئے اور ٹھیک اس وقت جبکہ برطانیہ و فرانس اور روس کے درمیان فوجی اتحاد پر گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے روس کے ساتھ ساز باز شروع کر دی اور جو اتحاد فرانس و برطانیہ کے ساتھ ہونے والا تھا وہ جرمنی کے ساتھ ہو گیا

اس واقعہ کو لوگ ہٹلر کا معجزہ کہتے ہیں، لیکن اس میں معجزہ کی کوئی بات نہیں۔ جو روس کی اندرونی پالیسی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ روس کے لئے کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہ تھا کہ وہ جرمنی کا ساتھ دے اور اس سے پہلے بھی اس نے کبھی جرمنی کے خلاف فرانس و برطانیہ سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی

روس کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ جاپان اور جرمنی میں اتحاد پیدا ہو جائے، کیونکہ اس صورت میں اس کے مشرقی و مغربی حصے دونوں بیک وقت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں اسی لئے وہ جرمنی سے بگاڑ کر کے جاپان کے خطرہ کو اپنے لئے اور زیادہ مہلک نہیں بنا سکتا تھا اور اور اس نے اتحادیین کے مقابلہ میں جرمنی کے ساتھ معاہدہ کرنا مناسب سمجھا، علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ فوجی و جنگی نقطۂ نظر سے روس، برطانیہ

اور فرانس دونوں کو کمزور سمجھتا ہے اور جرمنی کو مضبوط۔ اسے یقین ہے کہ فرانس و برطانیہ سے اتحاد کرنے کے باوجود وہ جرمنی سے مقابلہ کرکے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور اس یقین کے لئے وہ وجہ بھی رکھتا ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں جب برطانیہ و فرانس کی فوجوں پر جرمن افواج کا دباؤ پڑتا تھا تو فرانس و برطانیہ روس سے درخواست کرتے تھے کہ مشرقی محاذ پر حملہ کرکے اس دباؤ کو ہلکا کردے اور اگر کبھی روس ایسا کرنے سے قاصر رہتا تھا تو اسے دھمکی دیجاتی تھی کہ ذخیرۂ حرب بھیجنا بند کردیا جائے گا، لیکن برخلاف اس کے جب روس کی طرف جرمن افواج کا دباؤ ہوتا تھا تو برطانیہ و فرانس کی فوجیں کبھی اس کی پرواہ نہ کرتی تھیں

اس مرتبہ بھی روس نے یہی خیال کیا کہ اگر جرمنی نے اس پر حملہ کردیا تو فرانس و برطانیہ اس کی کوئی مدد نہ کرینگے، وہ کیونکہ فرانس و برطانیہ سوا اس کے روس پر حملہ کردینے کی کوئی صورت ہی نہیں کہ اس کا اندیشہ اس کو پیدا ہوتا

الغرض روس کا جرمنی کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا کوئی حیرتناک بات نہیں، بلکہ نتیجہ ہے اس کے اُن تلخ تجربات کا جو گزشتہ جنگ عظیم میں اسے حاصل ہوئے تھے۔ رہا یہ سوال کہ بالشیویت و نازیت کا تضاد کیونکر اس اتحاد کو گوارا کرسکتا تھا سو اس کے متعلق یہ کہدینا غالباً کافی ہوگا کہ اسٹالین کی ڈپلومیسی اب سخت مادی قسم کی ڈپلومیسی ہے جس کا تعلق "جذبات" سے بہت کم ہے اور وہ اسے تو گوارا کرسکتا ہے کہ اشتراکیت کو تھوڑا سا صدمہ پہونچ جائے لیکن وہ جرمن ایسی قوی حکومت کو جو بالکل اس کی سرحد پر واقع ہے اپنا دشمن بنالے، ممکن نہیں

الغرض روس و جرمن کا اتحاد پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی بات تھی اور اب یہ اتحاد یا تو اسی وقت ختم ہوسکتا ہے جب جاپان کی طرف سے روس کو بالکل اطمینان ہوجائے (اور اس کی کوئی امید نہیں) یا پھر یہ کہ نازی حکومت ختم ہوکر، جرمنی میں بالشیویت کا دور دورہ ہوجائے (اور اس کا امکان ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ جنگ کا اختتام کیونکر ہوگا اور پولینڈ کا مسئلہ کیونکر سلجھے گا

اگر جنگ کا اختتام اس فیصلہ پر ہوتا ہے کہ پولینڈ کی حکومت کو جوں کا توں پھر بحال کردیا جائے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ مان لیں کہ جرمنی اپنے مفتوحہ حصہ کو واپس کردینے کے لئے راضی ہوجائے گا، تو بھی روس سے سمجھوتے کا کیا امکان ہے؟ کیا وہ پولینڈ کے مشرقی علاقہ کو واپس کردے گا؟ اور کیا بحیرۂ بالٹک پر جو اقتدار اس نے قایم کرلیا ہے اسے اپنے ہاتھ سے دیدیگا۔ یقیناً اس کی کوئی امید نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سوائے جرمنی کے اس پر حملہ کرنے کی ہمت کسی میں نہیں ہے اور جرمنی، روس سے بگاڑ کرکے اپنی ہیبت کو کم نہیں کرسکتا

روس و جرمنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی صحیح نوعیت کا علم کسی کو نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ جس حد تک خام پیداوار کا تعلق ہے، روس اس کی مدد ضرور کرے گا۔ رہی فوجی اعانت، سو اس کا امکان فی الحال تو نہیں ہے لیکن جس وقت روس ریاستہائے بالٹک کی طرف سے مطمئن ہوگیا اور فن لینڈ بھی اس کے زیر اثر آگیا، اسوقت

امکان ہے کہ وہ جرمنی کو زیادہ ٹھوس مدد دے سکے اور یہی وہ وقت ہے جس کا سب کو منتظر رہنا ہے اور وہ آ نہیں چکتا لیکن اگر کسی وجہ سے روس نے جرمنی کی فوجی مدد کی اور یہ جنگ ایک سال تک اسی طرح قائم رہی تو ہٹلر کا ناکام رہنا یقینی ہے اور پھر نہیں کہا جا سکتا کہ اُسوقت جرمنی میں دوبارہ دورِ شاہیت کا اعادہ ہو گا یا بالشویت کا سیلاب جرمنی و فرانس بلکہ سارے وسطی یورپ سے گزر کر سواحلِ انگلستان سے ٹکراتا ہوا نظر آئے گا

جنگ کی اس متذبذب حالت کو دیکھ کر بعض سیاسی مفکرین کے دماغ میں ضرور یہ باتیں آتی ہوں گی کہ:

اگر ایک سال قبل مسٹر چیمبرلین اور مسٹر ہانٹ (   ) اہلِ زیک کی ہمت نہ توڑتے۔۔۔۔۔

اگر مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر کے ہر ہٹلر کو آسٹریا لینے کا موقع نہ دیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔

اگر بجائے مسٹر ولیم اسٹرینگ (Mr. Strang) لارڈ ہیلی فاکس ماسکو روانہ کئے جاتے۔۔۔۔۔

اگر پولینڈ کو ذخیرۂ حرب خریدنے کی اجازت دیدی جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور

اگر مسٹر چیمبرلین کے مشیروں میں مسٹر چرچل ایسے قوی عزم و ارادہ کے لوگ شامل ہوتے۔۔۔۔ تو شاید نتیجہ یہ نہ نکلتا۔ لیکن یہ تمام باتیں "مشت بعد از جنگ" کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس وقت صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر روس بھی اپنی ۴۰ لاکھ مسلح فوج کے ساتھ جرمنی کا شریک ہو گیا تو کیا ہو گا؟

اگر برطانیہ نے ابھی تک اس مسئلہ پر غور نہیں کیا تو اب پوری طرح غور کر لینا چاہئے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ اگر خدا نخواستہ جنگ نے یہ نازک صورت اختیار کر لی تو پھر اس کی دھاک اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب وہ اپنے تمام مقبوضات کی آبادی کا دل اپنے ہاتھ میں لے لے اور وعدہ و وعید کی اس پالیسی کو ترک کر دے جس پر اعتماد کرنے کی ہمت اب کسی میں باقی نہیں

جنگ اور ہندوستان کا مستقبل

جنگ، "عالمِ کون و فساد" کا بہترین مظہر ہوا کرتی ہے جس میں خدا جانے کتنے بگڑتے ہیں اور کتنے بنتے ہیں اور اس لئے ہر قوم اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ہندوستان جو باوجود ۳۵ کروڑ آبادی رکھنے کے تمدنی و عمرانی آزادی کی منزل تک بھی نہیں پہونچا، کیا یعنی پچھلی جنگ سے وہ کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا اس لئے اگر ہم اس وقت اس کی کوئی توقع قائم کر سکتا ہے

ہندوستان نے پچھلی لڑائی میں کیا کچھ نہیں کیا، لیکن بجائے انعام کے جاتی آزادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا

اور اب موجودہ جنگ میں بھی وہ ہر قربانی کے لئے طیار ہے، لیکن اس کے اعتراف میں برطانوی حکومت صاف صاف یہ بتانے کے لئے بھی طیار نہیں کہ اغراض و نتائج جنگ سے ہندوستان کا کیا اور کتنا تعلق ہے

اول اول جب وائسرائے ہندوستان کے لیڈروں سے گفتگو کر رہے تھے تو امید کی جھلک پائی جاتی تھی لیکن اب کہ احتجاجاً کانگرسی وزارتوں نے استعفا دیدیا ہے، یہ سوال سامنے ہے کہ اگر واقعی برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کی تو کانگرس کا آیندہ طرزِ عمل کیا ہوگا۔ حال ہی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں ہوا تھا جس میں اسنے اپنے آیندہ اقدامات کا ذکر تو نہیں کیا، لیکن ایکبار اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ

"برطانوی حکومت کے سامراجی انداز کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے اور اسکے باشندوں کو کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی (مجلس خود مختار) کے ذریعہ اپنا نظام حکومت خود بنانے کا حق تسلیم کیا جائے"

اقلیتوں کے تحفظ کے متعلق یہ اسمبلی ایسا نظام مرتب کرے گی جس کی رو سے انھیں پوری طرح اطمینان دلا دیا جائے گا اور اگر اقلیتوں کے حقوق کے معاملات پر باہمی اتفاق نہ ہوا تو انھیں ثالثی کے ذریعہ سے طے کیا جائے گا

اسی کے ساتھ ورکنگ کمیٹی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اگر حکومت نے گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا اور ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو ٹھکرا دیا گیا تو وہ عدم تعاون کرے گی اور حکومت کا ساتھ دینے سے بالکل انکار کر دے گی

ورکنگ کمیٹی کے اس رزولیوشن کا حکومت پر کیا اثر ہوگا، اسپر حکم لگانا قبل از وقت ہے، لیکن یہ قرینِ قیاس ہے کہ ۱۸ دسمبر تک (جو ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اجلاس کی تاریخ ہے) کوئی نہ کوئی بیان حکومت کی طرف سے ضرور شایع ہوگا اور اسکے الفاظ کچھ ایسے پیچیدہ ہوں گے کہ ان سے پھر کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہ ہوسکیگا اور کانگرس کو لامحالہ کوئی نہ کوئی آخری فیصلہ اس باب میں کرنا ہوگا

اس میں شک نہیں کہ کانگرس کا اثر ان کانگرسی ہندوؤں کی وجہ سے جو مہاسبھائی ذہنیت رکھتے ہیں، مسلمانوں پر بہت کم رہ گیا ہے اور خود کانگرس کے اندر بھی دو جماعتیں مختلف الخیال پیدا ہو گئی ہیں، لیکن آزادیِ ملک کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جسپر سب کو اتفاق ہے اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اختلافات کا اثر اسپر بھی پڑے۔ مسلم لیگ بھی اپنا نصب العین ہندوستان کی آزادی ظاہر کر چکی ہے اور کانگرس بھی، اسلئے کسی ایک مقصد پر متحد ہو جانے کے بعد اسکے حصول کے ذرایع پر اتنا اختلاف نہ ہونا چاہیئے کہ اصل مدعا ہاتھ سے جاتا رہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسوقت صورت کچھ ایسی ہی پیدا ہو گئی ہے جس سے حکومت فایدہ اُٹھانا چاہتی ہے اور کسی قسم کی رواداری سے کام لینے کے لئے آمادہ نہیں اور اس باب میں جنگ کی موجودہ رفتار بھی بہت کچھ حکومت کی مُعاون ہے

اگر جنگ نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی اور ہندوستان پر بھی براہ راست اسکا اثر پڑا، تو یقیناً حکومت کو اپنی موجودہ پالیسی میں تبدیلی کرنا پڑیگی، لیکن یہ صورت پھر وہی سودا کرنے کی ہو جائے گی، جسپر حکومت اسوقت ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ اسلئے دانشمندی کا اقتضا یہی ہے کہ خطرہ آنے سے پہلے ہی اسکے مقابلہ کا انتظام کر لیا جائے اور اسکی صورت صرف یہ ہے کہ حکومت اپنی پالیسی کا اعلان کر دے اور ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو تعویق میں ڈالکر لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ نہ دے کہ برطانوی ڈماکریسی اور جرمن نازیت دونوں فی الحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔

تلامذۂ مصحفی

(مسلسل)

"م"

(۸۲) مائل، یہ اصل میں میر غلام علی حسرت بریلوی کے شاگرد رشید تھے مصحفی جس زمانہ میں لکھنؤ میں اقامت گزیں تھے اسی زمانہ میں اکثر غزلیں احتیاطاً ان سے دکھلائیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

اس دم کو دیکھ آئینہ حیران رہ گیا		سنبل بھی دیکھ زلف پریشان رہ گیا
سب ہم صفیر منزل مقصود کو گئے		میں پاشکستہ بے سر و سامان رہ گیا
وہ اک آن میں آن کر توڑتا ہے،		تصور جو ہم سا لہا باندھتے ہیں

(۸۳) مخلوق تخلص، سید احسان حسن نام خلف میر حسن مرحوم، شعر و شاعری ان کی خاندانی چیز تھی یہی وجہ ہے کہ نوعمری ہی میں اچھے اشعار کہنے لگے تھے، ابتدائے ایام میں اپنا کلام اپنے بڑے بھائی کو دکھاتے رہے، جب فیض آباد سے لکھنؤ پہونچے تو مصحفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

اس کے آنے تلک سنبھل جاوے		کیا بلا ہے جو دم نکل جاوے
شمع اس سے کرے ہے دعوئ حسن،		یارب اس کی زبان جل جاوے،
وائے حسرت قفس سے باغ میں ہم		چھٹ کے تب آئے جب خزاں آئی
پوچھا تب اس نے حالِ دلِ میرا		جب زباں میں رہی نہ گویائی،
دیکھتا ہوں اسے تو کہتا ہے		کتنا ہشیار ہے یہ سودائی

---

(۸۴) مخمور تخلص، محمد جعفر نام ولد خواجہ محمد تقی سرور (شاگرد آتش) ان کے لڑکے تھے، آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے اور خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں عطاری کا پیشہ کرتے رہے، منور خاں غافل (تلمیذ مصحفی)

ل سراپا سخن صفحہ ۲۱۳، سخن شعرا صفحہ ۴۲۹

کی معرفت مصحفی مرحوم کی خدمت میں آئے اور شاگرد ہوئے، صاحب دیوان تھے، دیوان غالباً لکھنؤ میں موجود ہے دیوان کا قلمی نسخہ جناب حسرت موہانی کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے انتخاب غزلیات بھی شایع کیا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

ہتکڑی ہاتھوں کی ٹوٹی پاؤں کی زنجیر بھی　　　اس قدر جوشِ جنوں میں ہم نے مارے ہاتھ پاؤں
دست رنگیں وہ دکھاتا ہے میں جب کہتا ہوں　　　قتل کرنے سے مرے آپ کو کیا ہاتھ لگا
ایک دم بیکار یہ دستِ جنوں رہتا نہیں　　　پھاڑے دامن کو اگر یاد گریباں بھول جائے
معجزہ وادیِ مجنوں میں یہ دیکھا کہ وہاں　　　ہر شجر سے "انا لیلیٰ" کی صدا آتی ہے

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر　　　چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل

---

(۸۵) مست تخلص محمد قاسم نام، قوم کے پٹھان، بہت وجیہ، شجاع و خوش وضع آدمی تھے، آخر عمر میں لباس گیروی پہنا کرتے تھے۔ اغیار سے میل جول بالکل بند کر دی تھی، فن موسیقی میں یگانۂ عصر تھے، ان کے صرف تین شعر ملے ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

دکھاؤں سے تجھے ایک نقشہ مصور　　　رہے گر ترا ہوش برجا مصور
نہ کر دھیان نازک خیالی کا اس کی　　　لیا ہے تجھے وہم نے کیا مصور
جو کھینچے گا تصویر تو اس پری کی　　　تو ہو جائے گا تجھ کو سودا مصور

---

(۸۶) مسرور تخلص، شیخ پیر بخش نام خلف حکیم حیات اللہ قلاش قصبہ کاکوری کے رہنے والے حکیم خیر اللہ کے نواسے تھے، لکھنؤ میں تربیت پائی وہیں علم طب پڑھا، ابتدائے سن بلوغ ہی سے انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن جو کچھ کہتے کسی کو دکھاتے نہیں وہ اسی فکر میں تھے کہ اتفاق سے سنہ ۱۲۲۰ھ میں مصحفی مرحوم سے ملاقات ہو گئی اور ان سے مشورۂ سخن کرنے لگے، مصحفی لکھتے ہیں:۔

"حالا کہ مشق او بدوازدہ سال رسیدہ وضع خود نیش در ریختہ احیاسۂ دل دیگران می کند و در بیان فن از معاصرین خویش پائے کمی نہ آرد و شیرین گفتاریش نمک بر جراحت عشق بازاں می پاشد"[1]

ناسخ لکھتے ہیں کہ صاحب دیوان گزرے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

دیکھ لو آتا ہے کس انداز سے کافر مرا　　　شیشۂ مے ہے بغل میں اور ساغر ہاتھ میں

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

کہتی ہے یہ ہر وقت مجھے آبلہ پائی — آگے کو قدم دشتِ مغیلاں سے نہ اُٹھے
ہوا پنہاں جو اس کا چہرۂ پرنور آنکھوں سے — یہاں تک روئے عاشق ہو گئے مجبور آنکھوں سے
سدا چشمِ تصور سے ہم اسکو دیکھ لیتے ہیں — وہ دل سے ہی بہت نزدیک گو ہے دور آنکھوں سے
کوئی دیتا ہی نہیں گورِ غریباں سے جواب — روز ہم جا کے عزیزوں کو پکار آتے ہیں
آرزو ہے کہ تری بزم میں اک دم ساقی — لڑکھڑا کر میں گروں اور تو سنبھالے مجھکو
اے جنوں کرنے دے آرام مغیلاں کے تلے — رنج دیتے ہیں بہت پاؤں کے چھالے مجھکو
اپنے بیگانے ہوئے بیزار تیرے واسطے — یہ ستم ہم نے اُٹھایا یار تیرے واسطے
بہ فیضِ مصحفی ہے کہ مسرور ان دنوں — ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا

(۸۷) مضطر تخلص، کرپا دیال عرف لالہ کنور سین پسر دیبی پرشاد قوم کایستھ سکسینہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی تقریباً ۱۲ سال تک ڈبائی میں جو متعلقات بلند شہر سے ہے تحصیلداری کا کام کرتے رہے، شعر و شاعری کا ذوق انہیں بچپن ہی سے تھا، جب مکتب میں پڑھتے تھے اسی وقت سے فارسی اور اُردو کی چیزیں موزوں کرتے تھے لیکن شرم سے کسی سے نہ کہتے تھے یہاں تک کہ اپنے بزرگوں سے بھی چھپاتے رہے، کچھ دنوں کے بعد محمد عیسیٰ تنہا کے ساتھ مصحفی کے پاس آئے اور ان کے شاگرد ہوئے، طبیعت میں بیحد روانی تھی لیکن عروض، طرزِ شعر اور محاورۂ زبان نہ جاننے کی وجہ سے معذور رہتے تھے، صاحب گلشنِ بیخار فرماتے ہیں:۔

"شعرش از اندازہ افزوں قباحت نہ فہم انکسار فراواں دارد قصیدہ در واقعہ کربلا نوشتہ او سہ بیت ازاں برمن خواندہ بود معلوم می شد کہ مضامین معقول یافتہ باشد"[1]

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

سیکھ کر باغ میں قد سے ترے رعنائی کو — کام فرمانے لگا سرو بھی مرزائی کو
دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہوا اور غیر کو دوست — ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو
جب سے اس شوخ کا عاشق میں ہوا ہوں مضطر — ہر کوئی دیکھ ہنسے ہے مری رسوائی کو
سوزِ جگر کو دیدۂ پرنم کو دیکھئے — ان آفتوں کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے
خلل اندازِ وفا کون سا غماز ہوا — کہ جواب خطِ مضطر قلم انداز ہوا

[1] گلشن بیخار از شیفتہ صلالہ قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ

(۸۸) مظلوم تخلص غلام حسین نام معروف بہ مظلوم شاہ، باشندہ پنجاب، بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے آخر ایام میں الہ آباد میں سکونت اختیار کی۔

نظر افگن ہے کس کے عارض پر نور پر تجلی   کرے ہے قصد گرنے کا چراغ طور پر تجلی
چلاتا ہوں از بس میں شب ہجر میں مظلوم   دم بند کیا ہے مرے نالوں نے عسس کا
سامنے آتا ہے جب موئے میاں کا مضموں   کمر شاہد لفظ ارہ چمک جاتی ہے

---

(۸۹) مفتوں تخلص، نواب فصیح اللہ خاں نام، خلف نواب نصر اللہ خاں، جس زمانہ میں ان کا قیام رامپور میں تھا احمد خاں نشاط کے شاگردوں میں تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد مصحفی کے پاس آئے اور ان کے شاگرد ہوئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

مفتوں کے تئیں دیکھ کہا میں نے جو تو آج   غمگین ہے کیا تجھکو ستایا ہے کسی نے
تو کھینچ کے وہ اک آہ لگا کہنے کہ مت پوچھ   دل لیکے ہمیں دل سے بھلایا ہے کسی نے
وہ کیفیت نہ دیکھی یہاں چمن کی آب جاری میں   نظر جو لطف آیا چشم تر کی آبیاری میں
ترے مفتوں کا جو دن آہ و نالہ میں گزرتا ہے   کٹے ہے رات اسے رشک قمر اختر شماری میں

---

(۹۰) مفتوں تخلص سید محمد رضا نام، متوطن بلگرام مقیم آرہ، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مشق سخن کیا کرتے تھے فارسی میں رضا اور اردو میں مفتوں تخلص کرتے تھے دیوان درد اور قصہ گنجینۂ محبت ان سے یادگار ہیں، فارسی میں قتیل سے اور اردو میں مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، آخر عمر میں آرہ آکر مستقل اقامت اختیار کرلی تھی اور وہیں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

گر کرے زیب گلو وہ نوجوان سبز رنگ   فیض رنگ سبز سے تسبیح مرجاں سبز ہو
ماہرو میں نے کہا تم کو تو عالم نے کہا   میرے ہی کہنے سے صاحب عرش کے تارے ہوئے
ناصح نہ سیکھیں گے لب نوشیں کی قسم ہے   شیریں سخنی تیری ہمارے لئے سم ہے

---

(۹۱) مقتول تخلص، مرزا ابراہیم بیگ نام ولد مرزا محمد علی، بزرگوں کا مولد اصفہان تھا لیکن انھوں نے شاہجہاں آباد میں نشو ونما پائی، انشا پردازی میں کمال رکھتے تھے، اشعار بہت کم کہا کرتے تھے اور جو کہتے مصحفی کے علاوہ کسی کو نہ دکھاتے مصحفی سے انھیں تلمذ تھا خود لکھتے ہیں:۔

مقتول مصحفی سے ہوا ہے تجھے یقیں   حق دیر کا جگ میں رکھے اسکی ذات کو

مصحفی کے شاگرد ہونے کے علاوہ مقتول ان کے بڑے گہرے دوست بھی تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

مطلب رہا نہ کچھ ہمیں دیر و حرم کے ساتھ ۔۔۔ ان کا ہے دل اک ایسے ہی کافر صنم کے ساتھ
رنگ شفق کی خاک میں مل جائے سب بہار ۔۔۔ جس دم وہ کھولے اپنے حنا بستہ ہات کو
یا تو ہم اس سے آٹھ پہر ہم کلام تھے ۔۔۔ یا اب غضب ہے یہ کہ ترستے ہیں بات کو
میں یاں خون رو رہا ہوں ہاتھوں سے انکے ۔۔۔ جو پاؤں میں ان کے حنا باندھتے ہیں [1]

---

(۹۲) منتظر تخلص میاں نور الاسلام نام ولد شاہ فیض علی عرف پیر غلام، عربی صرف و نحو تک پڑھی تھی، ہاں درسیات نظم و نثر فارسی اکثر ختم تھیں، ۱۲ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے، بعد کو مصحفی کے شاگرد ہوئے ان کی ذہانت طبع کو دیکھکر اکثر حضرات نے چاہا کر میرے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو جائیں لیکن انھوں نے بالکل التفات نہ کی، ان کے بارے میں مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں:۔

"کلامش از غایت صلابت و صفائی کہ از کلام مولف در پایہ کمی نیست"

صاحب دیوان گزرے ہیں ان کا دیوان قلمی کتب خانہ ندوہ (لکھنؤ) میں موجود ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

ہر دم خیال یار جو پیش نظر رہا ۔۔۔ ہجراں میں بھی وصال ہمیں میسر رہا
طرف چمن نہ جا نہ سوئے لالہ زار دیکھ ۔۔۔ تو آپ باغ حسن ہے اپنی بہار دیکھ
یک سر مو نہ یہ حال دل ابتر سمجھے ۔۔۔ زلف سے تیری خدا او بت کافر سمجھے
کس کی تو جستجو میں تھا خورشید ۔۔۔ شام کو جو گیا سحر آیا
گر پردہ فاش نالے نے کم آہ نے کیا ۔۔۔ رسوائے خلق ہم کو تری چاہ نے کیا
نہ تو عشق سے مجھے عشق ہے نہ تو پیار کی مجھے چاہ ہے ۔۔۔ وہ جو بات منہ سے نکالی تھی سو اسی کا مجھ کو نباہ ہے

---

(۹۳) موجی تخلص لالہ موجی رام نام ولد دیوان لالہ چھتر پت، ملازم بہا مالدولہ نواب حسین علی خاں، قوم کے کالیستھ متوطن قصبہ سانڈی محمد عیسیٰ تنہا کے ساتھ مصحفی کے پاس شاگرد ہونے کو آئے، بڑے پر گو شاعر تھے، فارسی میں معقول استعداد رکھتے تھے فارسی و اردو دونوں میں مشق سخن کرتے تھے، اردو و فارسی کے سات دیوان مرتب ہیں۔

---

[1] قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:۔
"در شعر فہمی و سلیقہ درستی کلامش مرغوب است و تخلص محو المقتول" ۔ تذکرۂ شعراء مشمولہ نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

کیا کہوں تجھ سے جو حالت ترے بیمار کی ہے　　تا دمِ مرگ تمنا اسے دیدار کی ہے
رشتۂ جاں ہے مرا ہر ایک تار موئے دوست　　بے دھڑک اسے شانہ مت سلجھائیو گیسوئے دوست
مانی نہ ایک بات سحر تک شبِ وصال　　میرا سرِ نیاز تھا اور سیمتن کے پاؤں
کھولی جو اس نے زلفِ گرہ گیر کی رسن　　زاہد کے ہاتھ باندھ لئے برہمن کے پاؤں
جاؤں گا تیشہ لیکے سوئے بے ستوں اگر　　ٹھہریں گے سامنے مرے کب کوہکن کے پاؤں
رواجے دادہ ام دیوانِ دردِ بیقراری را　　نوشتم جائے بسم اللہ مد اشک جاری را
دماغم جز بہ بوئے یار با چیزے نمی سازد　　دعا گوئید از من نکہت بادِ بہاری را
گل داغ دل عشاق از آہِ سحر خندہ　　صبا را سبزۂ بیگانہ داند گلستانِ من
بپایاں کے رسد افسانۂ حالِ پریشانم　　شبِ زلفِ درازش کوتہ است از داستانِ من
نسیم صبح شاید از سر کوئے تو می آید　　ز بوئے گل ارمشام جان من بوئے تو می آید
اے سنگ دل ز رحم نگاہے بسوئے او　　موجی بہ شوق کوئے تو از خانماں گزشت

"ن"

(۹۴) ناداں تخلص میر شیر علی نام فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، ابتدا میں میاں محمد عیسیٰ تنہا (تلمیذ مصحفی) سے مشورۂ سخن کیا بعد کو مصحفی سے اصلاح لینے لگے، نمونۂ کلام :-

آزاد گر قفس سے ہوا فصل گل تو کیا　　رونا ہے مجھ کو یہ کہ مرے بال و پر نہیں
میں وہ اسیر ہوں جس کا بہ حسرت پرواز　　پھڑک پھڑک کے قفس ہی میں کام ہوتا ہے
ساقیا ہے یہی انصاف کہ میخانے میں　　مے پئیں غیر ترستے رہیں اک جام کو ہم
بزم رنداں کا قدح نوش ہے تو اے ناداں　　سمجھے ہیں کفر سے بدتر ترے اسلام کو ہم

(۹۵) نالاں تخلص، میرزا محمد جان نام ولد مرزا مہدی علی خاں صوبہ دار بانس بریلی، لکھنؤ کے رہنے والے، ابتدائے عمر ہی سے طبع موزوں رکھتے تھے، پہلے موجی رام موجی (تلمیذ مصحفی) سے مشورۂ سخن کرتے تھے کچھ دنوں کے بعد مصحفی سے اصلاح لینے لگے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

عاشق مزاج کہتے ہیں طفلی سے مجھ کو لوگ　　آتا نہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر

گرچہ افسانے سے نیند آتی ہے مجھ کو لیکن — قصۂ عشقِ دلِ زار نے سونے نہ دیا
چھیڑنے کو مرے تصویرِ خیالی بھیجی — خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا
یاد روزِ سیہِ ہجر دلا کر مجھکو — وصل میں بھی تو شبِ تار نے سونے نہ دیا

---

(۹۶) نالاںؔ تخلص، میاں محمد عسکری نام، یہ قوم کے مغل تھے اور شاہجہاں آباد کے پہلے وہ شاعر ہیں جو مصحفی کے حلقۂ شاگردی میں آئے، میر حسن نے اپنے تذکرہ میں انھیں شاہ حاتم کا شاگرد لکھا ہے یہ محض غلط ہے، دہلی کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، نوے برس کی عمر پاکر وفات پائی. نمونۂ کلام ؎

سحر کے ہونے کا از بس خیال رہتا ہے — شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگمان ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے — رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے،
کانوں پہ جب رکھتا ہے گل اک اس طرف اک اس طرف — شمس و قمر رہتے ہیں تل اک اس طرف اک اس طرف

---

(۹۷) کیفؔ تخلص، شیخ عبد الکریم نام ساکن رنبیر پور فارسی و اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اک دن بسے گا یہ چمن اُجڑا بہار سے — بلبل نہ کر فغاں خلشِ نوکِ خار سے
اشک نے دل میں مرے آہ سے دی آگ لگا — شعلۂ برق فرو ہو نہ سکا باراں سے
ابکی موسم میں مرے ہاتھوں سے اے وحشتِ عشق — دیکھئے کیا ستم ایجاد نیا ہوتا ہے
اپنی بھی جا لڑی ہے اسی پردگی سے چشم — جلوے نے جس کے طور کو پھونکا شرار سے
اے دوستو تمھیں یہ مبارک ہو سیرِ باغ — ہم داغ لیچلے چمنِ روزگار سے

---

(۹۸) نزارؔ تخلص، سید قاسم علی نام ولد میر احمد علی ابن میر علی حسین ان کے بزرگ مشہد مقدس کے رہنے والے تھے وہاں سے آکے دہلی میں رہے وہاں سے فیض آباد میں آئے ان کا مولد و مسکن لکھنؤ تھا، یہ بہت پرگو شاعر تھے ۱۳ برس کی عمر میں دیوان مرتب کرلیا تھا،

پاسِ عزت ہے نہ کچھ دھیان ہے رسوائی کا — حال پہونچا ہے یہاں تک ترے سودائی کا
چشمِ بلبل ہی نہیں شیفتہ رخسار کو دیکھ — محو ہے کبکِ دری بھی تری رفتار کو دیکھ
کرجائے سفر جلد کہیں جان بھی تن سے — چھٹ جاؤں میں تا روز کے اس رنج و محن سے
اسکے گھر جانا نہیں چھٹنے کا گر تجھ سے نزار — یہ سمجھ لے کہ قضا صبح نہیں شام آئی

(۹۹) نزہت تخلص، مولوی برہان الدین نام، ولد سرفراز علی، باشندہ قصبۂ "دیوا"[1] ضلع الہ آباد، فارسی و اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

گو تم دم مردن مرے بالین پر آئے　　　کیا ظلم کہ اسوقت بھی منھ ڈھانپ کر آئے
اک قامت رعنا کا تصور تھا مجھے صبح　　　ہنگامۂ محشر کے تماشے نظر آئے

چہ تواں کرد ہمہ مایۂ دیں داریِ دل　　　نگہ نازبت دشمن ایمانم سوخت
صحت بیماری نزہت بے مشکل بود　　　کز تف عشق نہاں سوزن دل بریان است

---

(۱۰۰) نظر تخلص، میرزا علی نام، خلف میرزا محمد زماں[2]، مالک اشتر کے خاندان سے تھے بزرگ ان کے مدینۂ منورہ کے رہنے والے تھے لیکن میرزا نظر خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے ابتدائے عمر ہی سے اشعار موزوں کرتے تھے مصحفی لکھتے ہیں

"حالا ترقی بسیار کردہ شعر را بہ فصاحت و بلاغت تمام می گوید در مرتبۂ ریختہ برابر فارسی رسانیدہ وطرز عاشقانہ و معنی بندہم دو بسیار خوب می گوید وکلامش از غلطی پاک و در فن شاعری چالاک"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دامن صحرا کو یکسر موتیوں سے بھر دیا　　　وا ہوا دست عجب چشم گوہر بار کا
بوں پہ گل کے لئے جان زار آہی گئی　　　قفس سے چھوٹے نہ ہم اور بہار آہی گئی
رحم آتا ہے مجھے احوال سیر چرخ پر　　　اس مسافر کو کہیں آسایش منزل نہیں
یہی ہے ایک دلیل قوی تناسخ کی　　　تہی ہو شیشہ تو لبریز جام ہوتا ہے
امید ضبط تھی دل خانہ خراب سے　　　عاشق سمجھ گیا وہ مجھے اضطراب سے
باہر ہوا میں جبر سے نہ اختیار سے　　　کس کو مفر ہے شعبدۂ روزگار سے
آسماں تیری سی بیدادگری کیا جانے　　　کج خرامی کے سوا کج نظری کیا جانے
سوزن عیسیٰ مریم کو نہ تکلیف کرو　　　دل صد چاک کی وہ بخیہ گری کیا جانے
دل پہ جو صدمہ ہے وہ آنکھوں کو معلوم نہیں　　　عالت خانہ نشیں رہ گزری کیا جانے
لحظہ کے لحظہ وہ مہ نامہرباں سے ملے　　　اتنی تو ہم کو داد دل اے آسماں ملے

---

[1] مصحفی نے تذکرۂ ریاض الفصحا صفحہ ۳۲ میں قصبہ "دلوہ" لکھا ہے اور ناسخ نے سخن شعرا صفحہ ۵ میں "دیوا" میرے نزدیک ناسخ کا بیان صحیح ہے۔

[2] مصحفی نے ان کا نام میرزا محمد زماں لکھا ہے اور ناسخ نے میرزا محمد اماں۔

اطاعت دل کی واجب ہو نہ کیونکر دیدۂ تر کو　　جہاں میں ہو سراسر فیض شیشے ہی سے ساغر کو
جانتے تھے ہمیں سب کامل فن گرچہ نظر　　عشق بازی میں نہ مجنوں تھے نہ فرہاد تھے ہم

---

(۱۰۱) نگاہ تخلص، شیخ حیدر علی قریشی نام ولد شیخ نوازش علی آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے اور پشمینہ اور گھوڑے کی تجارت کرتے تھے، نگاہ خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی، من کلامہ ؎

دے نہ تکلیف سفر مجھ کو جوانی میں اجل　　کون اس موسم گرما میں وطن سے نکلے
سر کو دھنتی ہے گلستاں میں نسیم سحری　　نکہت گل تو ابھی نہ چمن سے نکلے
روح مجنوں کی لپٹتی ہے بگولا بن کر　　عرصۂ نجد میں جو ناقہ سوار آتا ہے
کیا نامہ بری کی تھی کسی خستہ جگر کی　　بال و پر جبریل ہیں آلودہ لہو سے

"و"

(۱۰۲) واصل تخلص، شیخ محمد بخش نام ولد شیخ شاہ محمد آبا و اجداد امیٹھی کے رہنے والے تھے خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، ابتدا سے انتہا تک مصحفی سے اصلاح لیتے رہے ان کے بارے میں خود مصحفی لکھتے ہیں:-

"نہایت مہذب الاخلاق و سعادت مند و با اعتقاد یافتمش، بدایت شعر ش علی الرسم زمانہ بود آخر بطور شدت بخاری سمند خیالش بطرف معنی بندی و نازک خیالی عطف عنان نمودہ قوت شاعری را بطوریکہ دریں زمانہ تحت لفظ خوانی خوش یافتہ خرچ می نماید"۔ ریاض الفصحا صـ ۳۵۸

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

عیاں کر نتیجۂ غم آفتاب داغ سینہ کو　　کہ ہووے صرف چاک صبح تار اپنے گریباں کا
تصور یار کا میری نگہبانی میں ہے ہر دم　　یہاں تک مرتبہ پہونچا ہے اسکی بدگمانی کا
شعلۂ حسن سے ظاہر نہیں دود سیاہ　　جعد عنبر گوں کو کھولے ہے برائے شانہ شمع
موشگافوں سے نہیں زینت کی خواہش حسن کو　　اپنی زلف میں کب کھینچتی ہے شانہ شمع

---

(۱۰۳) واثق تخلص، شیخ بہادر علی نام، ترمذ کے سادات سے تھے، آبا و اجداد اصل میں ترمذ کے رہنے والے تھے لیکن بعد کو قصبۂ چرامؤ میں اقامت اختیار کی، واثق یہیں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، جس زمانہ میں تحصیل علم کے سلسلہ میں لکھنؤ میں تھا، طبع موزوں کے باعث اکثر اشعار موزوں کیا کرتے تھے اور جو موزوں کرتے میر ساجد علی کے

ذریعہ مصحفی تک پہنچے۔ اُردو و فارسی دونوں میں فکر کیا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

مکن آزردہ دل ظالم چو من آزردہ جانے را	زند یک نالۂ آزردہ دل برہم جہانے را
محبت پیشگاں را صبر ہم یک گونہ می باید	چرا رسوائے عالم میکنی اے چشم تر ما را
ہویدا گرچہ می روم رخ او در نظر بود	ہرگز میانۂ من و جاناں حجاب نیست
مست مئے محبتم دیر و حرم مرا یکیست	پائے خم و سبو بود سجدہ گہ نماز من

---

(۱۰۴) وحشی تخلص، شیخ زین علی نام، خلف شیخ فرحت اللہ، آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے، خود وحشی بھی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، ابتدا میں منور خاں غافل (تلمیذ مصحفی) سے مشورہ کیا کرتے تھے بعد کو خود مصحفی سے استفادہ کرنے لگے، نمونۂ کلام دیکھئے:-

آلودہ گرد خط سے روئے بتاں نہ ہوئے	اس باغ میں الٰہی دخل خزاں نہ ہووے
قافلے والوں سے کیونکر جا ملے وہ ناتواں	جس کو کوسوں تک نہ آواز درا معلوم ہو

---

(۱۰۵) ولا تخلص، مظہر علی خاں نام، عرف مرزا لطف علی ولد سلیمان علی خاں، کچھ دنوں تک ان کا قیام کلکتہ میں بھی تھا، ابتدا میں کچھ دنوں تک مرزا جان طپش سے استفادہ کرتے رہے اس کے بعد مصحفی کے شاگرد ہوئے، بعد کو میر نظام الدین ممنون سے مشورہ لیتے رہے، ان کی تصنیفات سے ایک "بیتال پچیسی" ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سنے	ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر
نہ حاجت کے لئے دست دعا کو تجھ پہ لاتا ہوں	میں اپنی زندگی سے سیج تو یہ ہاتھ اُٹھاتا ہوں
یونہیں گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں،	آپ بھی رو دیں گے اک دن منہ پہ دھر کر آستیں
عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں ولا	رنگ زرد و آہ سرد و اشک سے تر آستیں،

"ہ"

(۱۰۶) ہوس تخلص، نواب مرزا محمد تقی خاں نام خلف نواب مرزا علی خاں مرحوم، میرزا احمد علی خاں شوکت کے بھائی تھے، فیض آباد کے رہنے والے یہ بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ہمیشہ مقرب ملوک و سلاطین رہے ابتدا میں جو کچھ موزوں کرتے رہے میر حسن مصنف "سحر البیان" کو دکھاتے رہے اُن کی وفات کے بعد مصحفی کو اپنا اُستاد بنایا اور آخر تک انھیں سے اصلاح لیتے رہے ان کی تصنیفات سے مثنوی "لیلیٰ مجنوں" اور

دیوان غزلیات بتایا جاتا ہے، صاحب تذکرہ سراپا سخن کا بیان ہے کہ ان کے ہر شعر میں لیلیٰ مجنوں کا مضمون ہوتا ہے، نساخ کہتے ہیں یہ غلط ہے اور یہی واقعہ بھی ہے، ان کا قلمی دیوان نساخ صاحب سخن شعرا مولانا شبلی نعمانی حسرت موہانی، عشرت لکھنوی کی نظر سے گزرا ہے اور اس کی متعدد نقلیں کتب خانوں میں موجود ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

جانہ صحرا میں کہ صحرا کہیں برباد نہ ہو — دیکھ سرسبز تجھے اپنا ہی صیاد نہ ہو
ہے قسم تجھ کو کہ دیوانہ بھرلے بادِ بہار — خاک جب تک کسی دیوانے کی برباد نہ ہو
تیز رکھیو سر پر خار کو اے دشتِ جنوں — تا نہ آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا — آئی ہچکی تو کہا اس نے ہمیں یاد کیا
رنجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے — مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنورتے ہیں
راحت ملک عدم یاد نہیں یاروں کو — عالم آزادی کا بھولا ہے گرفتاروں کو

ہوئے عازم ملکِ عدم جو ہوس تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
یہ فراغ الم سے نہ واں بھی ملا وہاں غم یہ رہا کہ وہ ہم سے چھٹے
کبھی دیر میں تھے کسی بت پہ فدا کبھی کعبہ میں کرتے تھے جا کے دعا
ترے کوچے میں بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکش دیر و حرم سے چھٹے

"ی"

(۱۰۷) یاس تخلص، میر الٰہی بخش نام ولد رحمت علی، ان کے آبا و اجداد شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے خود یاس لکھنؤ میں پیدا ہوئے، یہیں نشو و نما پائی اور یہیں سنِ تمیز کو پہونچے، فن شاعری کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھے پھر بھی کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

سامنے کیوں آئینہ حیران نہ ہو رو دیکھ کر — مار مرتے ہیں ہزاروں دل انکے گیسو دیکھ کر
ہیں سیکڑوں جہاں میں طرحدار آدمی — بندے ہیں ہم اسی کے جو ہو یار آدمی
قاتل جو تو کرے ہے مجھے قتل بے گناہ — کیا منصفی کریں گے نہ دو چار آدمی

مختار الدین آرزو

نقاشی اور موسیقی عہد قدیم میں

نقاشی کی قدامت فن نقاشی کی عمر ۵۰ ہزار سال بتائی جاتی ہے اور شمالی ہسپانیہ و جنوبی فرانس میں اس زمانہ کی نقاشی کے بہت سے نمونے غاروں کے اندر پائے گئے ہیں جہاں انسان پہلے رہا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ نمونے ہیں جو اسپین کے غار التمیرا (Altamira) میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ۱۸۷۹ء میں دریافت ہوئے تھے لیکن عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ ان کو قبل تاریخ کے زمانہ کی چیز سمجھا جائے یا نہیں، آخرکار ۱۸۹۵ء میں تمام ماہرین آثار قدیمہ نے متفقہ طور پر تسلیم کرلیا کہ ان کی عمر ۵۰ ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

اسوقت زیادہ تر شکار کے جانوروں کی تصویریں غاروں کی دیواروں پر کندہ کیجاتی تھیں اور پھر انھیں سیاہ سرخ اور زرد رنگ سے رنگتے تھے اور ان نمونوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم کے انسان میں رنگ اور خطوط کے امتزاج کا احساس بہت پاکیزہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہاں کس قسم کا خط کھینچنا چاہیئے اور کس جگہ کونسا رنگ بھرنا چاہیئے۔ یہ نقوش اسوقت فنی حیثیت نہ رکھتے تھے، بلکہ سحر و افسوں کے طور پر بنائے جاتے تھے تاکہ شکار زیادہ دستیاب ہو اور ان نقوش کو دیکھ کر شکار کا جذبہ تازہ رہے۔

فرانس جنوبی فرانس کے لاکمبریل میں گھوڑے، ہرن، بھیڑیئے، گینڈے، شیر، بارہ سنگے اور بیل کی تصویریں منقوش پائی گئی ہیں۔ نقاب پوش آدمیوں کی تصویریں بھی پائی گئی ہیں، لیکن وہ بہت بھدی ہیں

سمیری عہد حال ہی میں آثار قدیمہ کے ماہرین پر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ سمیری (Sumerian) تہذیب کا وجود مصری تہذیب سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔ اس بات کا ثبوت کہ نقاشی کا رواج قدیم ترین سمیری اقوام میں پایا جاتا تھا، اُن منقوش ظروف سے ملتا ہے جو اُر (Ur) کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے مجسمے جو تین ہزار سال قبل مسیح کے برآمد ہوئے ہیں وہ بھی بُرے نہیں ہیں اور اس کے ۵۰۰ سال کے بعد کے تو نہایت ہی اچھے ہیں۔

بابل و اسیریا جب دو ہزار سال قبل مسیح اس قوم کو بابل والوں نے مغلوب کیا تو ان کا فن بھی ختم ہوگیا، کیونکہ

بابل اور اسیریا کے لوگوں میں فنون لطیفہ کا احساس بہت کم تھا اور دستیاب شدہ منقوش مصر میں بھی مسیح سے ۴۰۰۰ سال نقاشی کا رواج پایا جاتا تھا، جس کا ثبوت قدیم قبروں کے ظروف سے ملتا ہے۔ ان کے یہاں دیواروں پر بھی نقوش بنانے کا رواج تھا اور جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے علاوہ جہازوں کی تصویریں بھی بناتے تھے۔

قدیم مصر ہرمی عہد (Pyramid age) میں مقبروں کے اندر جو تصویریں بنائی جاتی تھیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے مصریوں کی تہذیب و معاشرت کا کیا رنگ تھا۔ یہ نقوش پتھر کے اندر کھودے جاتے اور پھر ان میں مختلف رنگ بھرے گئے ہیں۔ چونکہ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوجاتا بلکہ اسکو انھیں تمام اشیاء کی ضرورت رہتی ہے جن سے وہ دنیا میں کام لیا کرتا تھا، اس لئے مقبروں میں بھی انھیں تمام چیزوں کی تصویریں منقوش ہوتی تھیں۔

ان کے فن مجسمہ سازی کا بہترین نمونہ ابوالہول (Sphinx) کا مجسمہ ہے جو ایک ہی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے، اس کے سر کا دور ۱۵ فٹ کا ہے اور پیشانی سے ٹھوڑی تک کا فاصلہ ۱۹ فٹ ہے۔ بلندی ۶۶ فٹ ہے اور جسم کا حیوانی حصہ ۱۷۲ فٹ لمبا ہے۔

چین چینیوں کی نقاشی کا پتہ صرف دو ہزار سال قبل تک کا چلتا ہے، لیکن غالباً اس کی عمر اس سے زیادہ ہے۔ چینیوں کے لئے نقاشی جزو زندگی ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نقاشی سے خالی ہو، یہاں تک کہ ان کی تحریر خود نقاشی ہے۔

قدیم چینی نقاشی کا بہترین نمونہ وہ ہے جس میں خاندان جِنگ کے دربار کا نقشہ پیش کیا گیا ہے (۲۶۵ء - ۴۲۰ء) جس آرٹسٹ کی یہ تصویر ہے اس کا ایک نہایت مشہور نقش وہ ہے جس میں ایک نظم "دختر بحر" کو مصور کیا گیا ہے۔ اس نقاش کا نام کو کائی چیہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ نقاش وہاں کا وو تاؤ تزو تھا جو خاندان تانگ (۶۱۸ء - ۹۰۶ء) کے عہد میں پایا جاتا تھا۔ اس نے بہت سی تصویریں تیار کیں لیکن سوائے چند نقوش کے اب ان میں سے کوئی دستیاب نہیں ہوتی۔ اس خاندان کے زمانہ میں دو اور مشہور نقاش پائے جاتے تھے۔ وی چی اور پن تیئن۔ منظری نقاشی کی ابتدا ... کی سو ... نے کی جو ساتویں صدی کے وسط میں پایا جاتا تھا۔ سبز، نیلے اور سنہرے رنگ یہ زیادہ استعمال کرتا تھا اور دریاؤں، پہاڑوں اور جھیلوں کو بہت نمایاں طور پر دکھاتا تھا۔

آٹھویں صدی میں وہاں حیوانات کی تصویر بنانے والے متعدد نقاش پائے جاتے تھے۔ ان سب میں ہان کان بہت مشہور ہوا جو زیادہ تر گھوڑوں کی تصویریں بناتا تھا۔ دسویں صدی کی ابتدا میں وہاں نقاشی کا موضوع "پھول" قرار پایا اور بعد کو اس نے بہت رواج پایا۔

عہد قبل تاریخ کی نہایت قدیم نقاشی کے نمونے شمالی وسطی ہندوستان کے غاروں میں بہت پائے جاتے ہیں - ان میں بھی شکار کے جانوروں اور شکار کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے، گینڈے اور بارہ سنگھے کے شکار کا سین اور گھوڑے، ہرن اور زرافہ کی تصویریں ان میں دکھائی گئی ہیں -

اس عہد کے نہایت مشہور نقوش وہ ہیں جو بودھ کے مندروں اور خانقاہ اجنٹا کی دیواروں پر منقوش ہیں - ان میں سے بعض پہلی صدی ہجری سے بھی پہلے کے ہیں -

گیارھویں بارھویں صدی میں، خاندان پال کے زمانہ میں ایک نہایت مشہور مسلک نقاشی کا بہار و بنگال میں پایا جاتا تھا - تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک گجرات میں ایک خاص مسلک نقاشی کا رائج تھا جو زیادہ تر جینی مذہبی کتابوں کو مصور کیا کرتا تھا -

ہندوستان ہندوستان کا وہ انداز نقاشی جسے "راجپوت اسکول" کہتے ہیں، خاص شہرت رکھتا ہے - اول اول اس کے نقاش صرف دیواروں کو اپنے نقوش سے آراستہ کیا کرتے تھے - جس کے اچھے نمونے بیکانیر کے پرانے محلوں میں نظر آتے ہیں - اس اسکول کی نقاشی میں رنگوں کا اُبھار خاص چیز ہے خطوط اور ہیئت پر اول اول کم توجہ دی جاتی تھی -

کانگڑا اسکول نقاشی میں بہت مشہور ہوا جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں پایا جاتا تھا - یہی زمانہ مغل آرٹ کے بھی ترقی و تکمیل کا تھا جو ایران و ہندوستان دونوں جگہ کے ذوق پر مشتمل تھا -

یونان غاروں کی نقاشی کے سلسلہ میں، بعض نہایت قدیم نقوش لنکا میں بھی پائے جاتے ہیں اس فن کی ترقی اور قدر شناسی کے لحاظ سے یونان کا وہ عہد جو پانچویں اور چوتھی صدی ہجری سے تعبیر کیا جاتا ہے خاص زمانہ تھا، دنیا کا کوئی قدیم آرٹ ایسا نہیں جس نے یونان کی نقاشی سے زیادہ موجودہ زمانہ کے تمدن کو متاثر کیا ہو - اول اول وہاں کے مجسمہ ساز اور نقاش عریاں جسم انسانی کو پیش کرتے تھے، ان کے سامنے قدرتی مناظر پہاڑ، دریا، اور صحرا کوئی وقعت نہ رکھتے تھے -

قدیم یونانی عہد کا کوئی نقش سوائے گلدانوں کے اس وقت نہیں پایا جاتا - گلدانوں کے نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصریوں سے زیادہ اس فن کے ماہر تھے -

قدیم یونانی نقاشوں میں پولیگ نوٹس بہت مشہور ہوا ہے، جو یونانی علم الاصنام کا نقاش تھا - اس نے بہت سی روایات اصنامی کو دیواروں پر منقوش کیا، ارسطو بھی اس کا بڑا مداح تھا -

اطالیہ جنوبی اطالیہ کا نقاش زیوکسس (پانچویں صدی قبل مسیح) بھی بڑا مشہور آرٹسٹ ہوا ہے - اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اس نے انگور کے خوشہ کی تصویر بنائی تو چڑیاں آ آ کر اس پر چونچ مارنے لگیں

قدیم زمانہ کا سب سے زیادہ مشہور نقاش اپلیس مانا جاتا ہے جو کولوفن (آئی اونیا) میں پیدا ہوا تھا (سنہ ۴ق م) انسانی تصویر کھینچنے کی ابتدا اسی نے کی اور اس فن کو کمال تک پہونچا دیا — اسکندر اعظم کی بھی تصویر اس نے بنائی تھی، اور حکومت مقدونیا کے بہت سے امراء کی بھی۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصویر وہ ہے جس میں محبت کی دیوی کو اپنے بال نچوڑتے ہوئے دکھایا ہے جب وہ سمندر سے پیدا ہوکر باہر نکلی ہی تھی۔

اس تصویر کو روما کے سب سے پہلے بادشاہ اگسٹس نے جس قیمت میں خریدا وہ موجودہ سکوں میں ۲۰ ہزار پونڈ (ڈھائی لاکھ روپیہ سے زاید) ہوتی ہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یونانی نقاشی پر زوال آنا شروع ہوا اور دوسری صدی میں اہل روما نے اس کو اپنے آرٹ میں شامل کرکے ایک نئے آرٹ کی بنیاد ڈالی جو یونانی آرٹ سے بہت فروتر تھا۔

رومن قوم کے آرٹ پر اس سے پہلے فلسطینی اثر پڑ چکا تھا (جو عراق، مصر اور یونان کی نقاشیوں کا امتزاج تھا) لیکن جب یونانی نقاشی کے اثرات براہ راست اس پر پڑے، تو اس میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ چنانچہ یورپ کا سب سے پہلا اسکول نقاشی گیوٹو (اطالوی) ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ یہ آرٹسٹ تیرھویں صدی کے اخیر میں پایا جاتا تھا اور اپنا وقت زیادہ تر دیواروں اور قربانگاہوں کی نقاشی میں صرف کرتا تھا۔ یہ فن تعمیر کا بھی بڑا ماہر تھا۔

اس کے بعد پندرھویں صدی کے اخیر میں لیونارڈو ڈاونسی پیدا ہوا جس کی تصویر مونالیسا خاص شہرت رکھتی ہے، یہ نقاش ہونے کے علاوہ مجسمہ ساز بھی تھا، شاعر بھی تھا۔ اس کا ہمعصر میکائیل انجلو جو بُت سازی اور نقاشی میں اپنے عہد کا سب سے بڑا آرٹسٹ مانا گیا ہے۔ اس کا نہایت عجیب وغریب کارنامہ وہ نقاشی ہے جو اس نے کلیسائے روم کی چھت میں کی ہے اور جس میں اس کے چار سال صرف ہوئے۔

جرمنی اسی زمانہ میں جرمنی نے ایک آرٹسٹ پیدا کیا جس کا نام البرٹ ڈورا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ لکڑی اور تانبہ پر کھدائی کا کام کرنے میں اس کا جواب نہ تھا۔ فلینڈرز (بلجیم) کا نہایت مشہور نقاش پیٹر پال رومنیس تھا (سنہ ۱۵۷۷ء — سنہ ۱۶۴۰ء) اس نے انگلستان پہنچکر بڑا نام پیدا کیا اور نیشنل گیلری میں اس کی بعض تصویریں اب تک محفوظ ہیں۔

ڈچ اسکول کی نقاشی میں رمبرانڈ بہت مشہور ہوا ہے (سنہ ۱۶۰۶ء - سنہ ۱۶۶۹ء) یہ دنیائے نقاشی کا شیکسپیر مانا جاتا تھا۔ اسی طرح اسپین، فرانس اور انگلستان میں بعض اچھے اچھے نقاش پیدا ہوئے، ان کی فہرست ملاحظہ ہو:-

اسپین :- ولاسکوئز (سنہ ۱۵۹۹ء - سنہ ۱۶۶۰ء) یہ دنیا کے چوٹی کے نقاشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فرانسسکو گویا (سنہ ۱۷۴۶ء - سنہ ۱۸۲۸ء) بھی اسپین کا مشہور آرٹسٹ تھا اور موجودہ آرٹ پر اس کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔

فرانس :- سب سے پہلا فرانسیسی ماہر فن نکولس پوسین تھا (۱۵۹۴ء - ۱۶۶۵ء) اس کا موضوع زیادہ تر مناظر کی تصویرکشی تھا - اسی کا ہمعصر کلاڈ لورین (۱۶۰۰ء - ۱۶۸۲ء) بھی تھا اور اس کی ٹکر کا آرٹسٹ تھا - اس کے بعد اٹھارھویں صدی میں انٹوائن واٹیو اور فراگونارڈ بہت مشہور ہوئے - انیسویں صدی میں اچھے نقاشوں کی تعداد کافی ہوگئی -

انگلستان یہاں کی نقاشی میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد اخلاق پر قائم تھی وہاں جو نقوش تیار کئے جاتے تھے، ان میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ کوئی اخلاقی درس اس سے حاصل کیا جاسکے - اس سلسلہ میں پہلے ولیم ہوگرتھ (۱۶۹۷ء - ۱۷۶۴ء) کا نام لیا جاتا ہے، تصویر کا ایک ایسا مرقع طیار کیا جس میں یہ دکھایا گیا کہ عورتوں کے ساتھ قید خانوں میں کتنا برا سلوک کیا جاتا ہے - اس کے بعد چار اور مشہور نقاش پیدا ہوئے سر رینالڈز (۱۷۲۳ء - ۱۷۹۲ء)، گینس برو (۱۷۲۷ء - ۱۷۸۸ء)، جارج رومنی (۱۷۳۴ء - ۱۸۰۲ء) اور ٹامس (۱۷۶۹ء - ۱۸۳۰ء)، رینالڈز بڑا محنتی تھا اس نے تقریباً چار ہزار نقش طیار کئے، کہا جاتا ہے کہ رنگ بھرنے میں اس کا نظیر پیدا نہیں ہوا -

گینس برو، مناظر و انسان دونوں کی تصویرکشی کرتا تھا، یہ بہت تیز مزاج تھا اور ایکبار رینالڈز سے لڑ گیا تھا - رومنی نے بادشاہوں اور امراء کی تصویریں زیادہ بنائیں اور ہرچند اس کی سالانہ آمدنی بیس ہزار پونڈ سے کم نہ تھی، لیکن وہ مقروض ہی مرا - منظرکشی میں کانسٹیبل (۱۷۷۶ء - ۱۸۳۷ء) اور جوزف ٹرنر (۱۷۷۵ء - ۱۸۵۱ء) نے خاص شہرت حاصل کی -

بعض تصاویر کی غیر معمولی قیمت گزشتہ پچاس سال کے اندر یورپ میں اس فن کی عظمت بہت بڑھ گئی ہے اور امراء پرانی تصویروں کو بڑی بڑی قیمت پر خریدتے ہیں - ذیل کی ایک فہرست سے معلوم ہوگا کہ تصویروں کی کتنی بڑی قیمتیں امراء مغرب نے ادا کی ہیں :-

تصویر کا عنوان	نقاش	قیمت
Welsh Funeral	ڈیوڈ کاکس	۲۵۲۰
Lady Betty Del	رینالڈز	۱۱۵۵۰
Dutches of Devonshire.	گینس برو	۱۰۵۰۰
Ladies Spencer	رومنی	۱۱۰۲۵
Harvest wagon	گینس برو	۵۴۰۰۰
Bath Sheba	رمبرانٹ	۴۴۰۰۰

Blue Boy.	گینس برو	ایک لاکھ پونڈ
Mrs: Siddons	رینالڈز	دو لاکھ پونڈ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تصویریں ہیں جن کی مجموعی قیمت لاکھوں پونڈ ہوتی ہے۔

سب سے بڑی تصویریں دنیا کی سب سے بڑی روغنی تصویروں میں ایک وہ ہے جو وینس کے گریٹ ہال میں آویزاں ہے۔ یہ نقش ٹنٹرٹو کا ہے اور اس کا عنوان " Paradise " ہے یہ تصویر ۸۴ فٹ لمبی اور ۳۴ فٹ چوڑی ہے۔

اسی موضوع کو ٹگنارڈ نے پیرس کے ایک گرجا کی دیوار پر نقش کیا ہے جس میں ۳۰۰ آدمیوں کی تصویریں ہیں اور ہر تصویر اصل قد سے تگنی بڑی ہے۔ " Last judgement " کی ایک تصویر کا رنیلیس کی بنائی ہوئی میونخ کے گرجا میں پائی جاتی ہے جو ۵۹ فٹ چوڑی ہے۔

مشہور مجسمے دنیا کا قدیم ترین مجسمہ جو انسان نے بنایا غالباً ارنا بھینسے کا ہے۔ یہ مجسمہ مٹی کا ہے جو فرانس میں دستیاب ہوا۔ زہرہ کا مشہور مجسمہ جزیرۂ ملو میں پایا گیا تھا اور ہرمس کا مجسمہ یونان میں۔

اس وقت کا سب سے بڑا مجسمہ وہ ہے جو "آزادی" کا مجسمہ کہلاتا ہے اور نیویارک کے بندرگاہ پر نصب ہے۔ یہ ۱۵۰ فٹ اونچا ہے اور ۱۷۰ فٹ بلند چبوترے پر قائم ہے۔ یہ تانبا اور لوہے سے بنایا گیا ہے اور ۱۰۰ ٹن وزنی ہے۔ اس کا سر اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر بیس آدمی سما سکتے ہیں۔

جزیرۂ ایسٹر (جو چلی کے مقبوضات میں ہے) نہایت سنسان جزیرہ ہے یہاں آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ پایا جاتا ہے اور اس کا دور صرف ۲۹ میل کا ہے تہذیب سے ۲۰۰۰ میل دور واقع ہے، اور جب مجرموں کو جلا وطنی کی سزا دی جاتی ہے تو یہیں بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اس وحشت ناک جزیرہ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز یہاں کے وہ مجسمے ہیں جو پہاڑوں کے پگھلے ہوئے مادہ سے طیار کئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد ۵۵۰ سے اوپر ہے، ان میں سے بعض ۷۰ فٹ اونچے اور سو ٹن سے زیادہ وزنی ہیں، ان میں سے اکثر لیٹی ہوئی حالت سے ہیں اور ان کا ایک حصہ زمین میں مدفون ہے۔

ماہرین نے مختلف نظریئے قائم کئے ہیں، لیکن صحت کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب اور کیوں طیار کئے گئے تھے۔

موسیقی بارہ سروں کی سرگم کا رواج مسیح سے تین ہزار برس قبل چین میں پایا جاتا تھا اور ۲۲۷۷ قبل مسیح میں بادشاہ ہوانگ ٹی نے ایک ماہر فن لنگ سن کو حکم دیا تھا کہ اصول موسیقی پر کتاب لکھے۔

قدیم مصریوں میں لکھی ہوئی موسیقی کو سامنے رکھ کر بانسری، بگل، اور ڈھول بجانے کا رواج پایا جاتا تھا۔

یہودیوں کے یہاں کئی آدمی ملکر گاتے تھے اور قدیم ہندوستان گانے اور بجانے دونوں سے واقف تھا۔ ان کے یہاں تار کے ساز، اور منھ سے بجائے جانے والے اور پیٹے جانے والے ہر قسم کے پائے جاتے تھے۔

برطانوی عجائب خانہ میں قدیم بابل کی موسیقی کا ایک نمونہ مٹی کی تختی پر نقش کیا ہوا محفوظ ہے۔ یہ سمیری زبان میں ہے لیکن اس کا ترجمہ بابلی زبان میں بھی دیدیا گیا ہے۔ یہ بہت کچھ اس چینی موسیقی سے ملتا جلتا ہے جو دو انگلیوں سے آٹھ تار کے رباب پر بجائی جاتی تھی۔

یونانی ہر چند علمی حیثیت سے موسیقی کے ماہر نہ تھے، لیکن عملاً ان کے یہاں گانا بجانا دونوں پایا جاتا تھا۔ بانسری بہت مقبول ساز تھا اور اسکولوں میں اس کی تعلیم دیجاتی تھی، افلاطون نے بھی موسیقی کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

فوج میں پیتل کے بنے ہوئے سازوں کا رواج عہد قدیم سے چلا آتا ہے۔ اہل رومہ انھیں مذہبی مراسم کے وقت بھی استعمال کرتے تھے۔

اہل برطانیہ کی ابتدائی موسیقی کا حال بہت کم معلوم ہے، بربط کا رواج سب سے پہلے آئرلینڈ میں ہوا، (سنہ [illegible] ق۔م)۔ عام اعلان یا خطرہ کی اطلاع دینے کے لئے جانوروں کے سینگوں سے کام لیتے تھے اور اسی لئے انھیں قرنا کہتے ہیں (قرن بہ معنی سینگ)۔ ان سینگوں سے پیالوں کا کام بھی لیا جاتا تھا اور ان میں شراب بھر کر پی جاتی تھی۔

دنیا کا قدیم ترین بربط وہ ہے جو ۱۹۳۳ء میں بمقام اُر دستیاب ہوا، اس کے دوسرے سال بڈاپسٹ کے قریب قدیم ترین ارغنوں دستیاب ہوا۔

لنکا کی مذہبی روایات کی بنا پر سب سے پہلا تار کا ساز راون نے بنایا تھا۔ لکڑی کے ایک ٹکڑے پر دونوں طرف دو کھونٹیاں لگا کر دو تار کھینچ دئے گئے تھے۔

یونانی روایت کے مطابق سب سے پہلے اپالو نے کچھوے کی ہڈی پر تار کھینچکر بربط تیار کیا تھا۔ عربوں کے یہاں بھی مزامیر (منھ سے پھونکے جانے والے) اور تار والے سازوں کا بہت رواج تھا اور یورپ نے عرب موسیقی کے اثرات کو بڑی حد تک قبول کیا۔

سترھویں صدی میں اس صنعت نے غیر معمولی ترقی کی، چنانچہ ایک ایک وائلن میں ہزاروں پونڈ صرف کئے گئے۔

بعض استفسارات

ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا جواب صرف خط کے ذریعہ سے دیا جا سکتا ہے بنابراں ہر استفسار کے ساتھ جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

منیجر نگار

مطالعۂ لغت

اگر کہا جائے کہ کتابوں کا مطالعہ مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے تو کسی کو ماننے سے انکار نہ ہوگا، بلکہ شاید یہ بھی کہا جائے کہ اس میں بھلا بتانے کی کونسی بات تھی، سبھی جانتے ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ لغت کا مطالعہ بہت زیادہ مفید اور بہت زیادہ دلچسپ ہے تو کم سے کم اسے ایک مذاق ضرور سمجھا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قایم رہے گی کہ لغت کا مطالعہ نہایت مفید و دلچسپ مشغلہ ہے۔ اور ایک تصنیف و تالیف کا شوق رکھنے والا اپنے مقصد کے ساتھ سچا ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہے۔

سوچئے گا تو دنیا کی سب سے پہلی تصنیف لغت ہی کو قرار دینا پڑے گا۔ آدم جس طرح سب سے پہلے انسان تھے اسی طرح سب سے پہلے لغت نویس بھی تھے۔ تورات میں مذکور ہے کہ آدم جب جنت سے دنیا میں پھینکے گئے تو انھوں نے جو پہلا کام کیا وہ جانوروں کے نام رکھنے کا کام تھا۔ قرآن میں آیا ہے کہ ہم نے آدم کو اسمار کا علم دیا۔ لیکن آدم کی لغت نویسی کو اپنی تحریر پر قیاس نہ فرمایئے۔ یہ فنون کے وجود میں آچکنے کے بعد کا مفہوم ہے۔

الفاظ کا استعمال ہر شخص کرتا ہے، لیکن جو شخص الفاظ سے جتنا واقف ہوتا ہے اُن سے اتنا ہی کام لے سکتا ہے۔ ہر زبان میں ایک مفہوم کے لئے متعدد لفظ اور مختلف اسلوب بیان ہوتے ہیں، لیکن ایک موقع پر کوئی شخص اگر موقع کا لفظ نہیں بولتا تو اپنا مقصد فوت کر سکتا ہے۔ ایک وکیل مقدمہ ہار سکتا ہے، ایک دوکاندار گاہک کھو سکتا ہے، ایک لیڈر کی تجویز گر سکتی ہے، وقس علیٰ ہذا۔ چنانچہ میرا عقیدہ ہے کہ لفظوں کو صحیح طور پر جاننا ہر خاص و عام کی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔

رسکن نے کہا کہ تم الفاظ کے صحیح استعمال پر اسوقت تک قادر نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کی روح سے آشنا نہو۔ بنابریں الفاظ کو جاننا ایک چیز ہے اور اُن کی روح سے آشنا ہونا دوسری۔ اور ایک انشائی کے لئے الفاظ کی روح سے آشنا ہونا گویا اُن سے محبت کرنا ہے۔ کتاب کے مطالعہ میں لفظ سیاق و عبارت کے اندر محدود حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے، اس لئے کتاب میں ہم ایک لفظ کو اُسی محدود حیثیت میں جان سکتے ہیں۔ الفاظ کی روح سے آشنا ہونے کے لئے لغت کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ لغت کے اندر الفاظ کے جملہ معانی اور اس کے مفہوم کے

تمام پہلو ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم اس کی روح معانی کو عریاں دیکھ سکتے ہیں۔ لغت کے اندر الفاظ کتاب کی طرح پوشش و لباس میں لپٹا نہیں ہوتا۔

لغت کے اندر تمام اچھے اور برے الفاظ درج ہوتے ہیں، اور وہ سب محبت کئے جانے کے قابل ہیں۔ بالخصوص کوئی اہل قلم اور صاحب مطالعہ شخص ان الفاظ سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ذخیرۂ الفاظ سے اُسے جتنی کم محبت ہے، وہ اپنی زبان کی روح ادب سے اتنا ہی بیگانہ ہے اور اس طرح اپنے مقصد انشاء کے ساتھ اتنا ہی غیر مخلص۔

جس طرح ایک طالبعلم اسکول سے غائب ہوجاتا ہے، اگر ہم اُسی لڑکے کی طرح کبھی کبھی تھوڑا وقت نکال کر اپنی لغت کا مطالعہ کرسکیں تو اس وقفے میں ہم بڑے بڑے طلسمات کی سیر کرسکتے ہیں۔ فرہنگ کا مطالعہ طلسم ہوشربا کے مطالعہ سے زیادہ دلچسپ، تمدن عرب کے مطالعے سے زیادہ سبق آموز، اور فلسفۂ جذبات کے مطالعے سے زیادہ علم آفریں ہوسکتا ہے۔ جواہر کی یہ ردیف وار فرہنگ ایک متحرک کردینے والا رومان ہوتا اور معدنی اشیاء کی یہ فہرست کسی سفرنامے سے بہتر معلم ثابت ہوتی ہے۔

لغت کو اگر دیکھئے تو ایک ردیف وار کائنات ہے یا تمام کتابوں سے اعلیٰ اور بڑی کتاب ہے کہ پچھلی تمام کتابیں اسی کے اندر سے نکلیں اور آیندہ کی بے شمار کتابیں بھی اسی کے اندر سے نکالی جائیں گی۔ لغت میں مندرج ردیف وار الفاظ حقیقت میں قومی زندگی کے اعضاء و اعصاب کی ایک ایسی تصویر ہے جیسی ڈاکٹروں کے مطب میں انسانی بدن کی تشریح کی تصویر ٹنگی ہوتی ہے۔ لغت کے اندر الفاظ میں اُس زبان کو بولنے والی قوم، اسلاف و اخلاف، سب کی اور ایک حد تک دوسری قوموں کی بھی، ذکاوت، ذہانت اور طبیعت و فطرت، جلوہ گر نظر آتی ہے۔ لغت کی کتاب کے اندر ایک پوری قوم کی نسلوں کے عندیئے اور مشقتیں، رنج اور راحتیں، محفوظ ہوتی ہیں۔ ایک زبان کی لغت کو اس زبان کو بولنے والی قوم کی اجتماعی اور انفرادی فطانت (جینیس) کا خزانہ کہا گیا ہے۔

لغت کا مطالعہ ہم دو جہت سے کرسکتے ہیں، ایک تو اس کے اندر معنی و مفہوم پیدا ہونے کی طلسم سامانی کے پہلو سے دوسرے اس کے غیر محدود علمی و تاریخی افادے کے رخ سے۔ ایک میں ہم کھو جاسکتے ہیں اور دوسرے میں بے اندازہ فایدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

ہماری زبان کی عمر بہ حیثیت زبان زیادہ نہیں، اور اسی لئے ہماری فرہنگ بھی مختصر ہے اور جس قوم کی فرہنگ مختصر ہو وہ مسلمہ طور پر حصول علم میں پیچھے رہتی ہے، اور معاملات زندگی میں اُسی حد تک سوچ سکتی ہے جس حد تک اس کی لغت کے الفاظ ساتھ دے سکیں۔ مگر یہ بھی ایک قدرتی بات ہے کہ کم مایہ زبان کسی دوسری متمول زبان کی مدد لے کر متمول بنتی ہے۔ جس طرح آج انگریزی زبان کی مدد سے ہندوستان کی زبانیں متمول ہو رہی ہیں اور

بدل گی، اور جس طرح گزشتہ عہد میں فارسی سے مستفید ہو چکی ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسوقت ہم علمی، فنی، اور سیاسی مسایل میں منہمک ہو کر جو کچھ بھی سوچ رہے ہیں یہ ہمارا قومی ذہن و دماغ انگریزی میں سوچتا ہے۔ ہم نے اگر انگریزی حاصل نہ کی ہوتی تو غور و فکر کی اس سطح پر نہ ہو سکتے تھے جہاں ہم اسوقت ہیں۔

لیکن کم مایہ زبان کی لغت میں بھی اس زبان کو بولنے والی قوم کی زندگی زندہ ہوتی ہے، اور کہیں کہیں دوسری مرز و بوم کی زندگی بھی بولتی چالتی دکھائی دیجاتی ہے۔

جسوقت ہم اپنی زبان کی لغت کا مطالعہ کرنے بیٹھیں گے تو نظر آئے گا کہ ہر لفظ کسی جذبے یا خیال کی تصویر اور کسی احساس کا نقش ہے، ایسے احساس کا نقش جو پہلے ایک جذبہ ہی تھا اور پھر بیشمار انسانوں کا احساس بن گیا اور ابتک ہے۔ جذبات و احساس کا یہ خزانہ ہمارے اسلاف کے اور ہمارے جسم و جان، بلکہ کسی حد تک انسانیت کے جسم و جان کی مشقتوں کا ماحصل اور عطر ہے۔ اپنی لغت کے اندر ہم اُس زندگی کے پورے سلسلے کو زندہ دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے مقدس وطن کی پاک ہوا میں سانس لے چکی ہے اور لے رہی ہے۔

اب دوسری قوموں اور غیر مرز و بوم کی زندگی کا نقشہ دیکھنے کے لئے ان دو لفظوں کی حقیقت و اصلیت پر غور فرمایئے:۔

ہماری زبان میں ایک لفظ ہے "شاخسانہ"۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ صحیح "شاخشانہ" تھا مگر ایران ہی میں "شاخسانہ" بنکر ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن اس کے معنی ایران میں پہلے دھونس دیکر وصول کرنا تھے اس لفظ میں یہ مفہوم اس طرح پیدا ہوا کہ ایران میں مانگنے والوں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو ہات میں سینگ (یعنی شاخ) اور شانے کی ہڈی لئے ہوتے تھے اور بھیک لئے بغیر نہ ٹلتے تھے (اس گروہ کا نمونے ہمارے یہاں بھی ہو مرچڑے کہلاتے ہیں) اب یہ لفظ جب ہماری زبان میں داخل ہوا تو نہ معلوم کس پراسرار طریق پر اس کا مفہوم عیب، خرابی، اور تکرار وغیرہ ہو گیا۔

دوسرا لفظ کوتوال ہے۔ یہ خالصتاً ہندی لفظ ہے اور کوتہ (یعنے وہ جگہ جہاں سپاہی بندوقیں اُٹھا کر دیتے ہیں) اور وال دو لفظوں سے مرکب ہے بعض کے نزدیک کوتہ نہیں بلکہ کوٹ یعنی حصار یا قلعہ ہے۔ وال کے ہندی معنی صاحب کے معلوم ہی ہیں۔ بہرحال یہ ہندی لفظ ایران جا پہونچا۔ جس کے پہونچنے کی وجہ اور طریقہ یقیناً دلچسپ ہو گا۔

مقامات کے نام اپنے اندر ایک پوری تاریخ لئے ہوتے ہیں، جس سے بہت سے معاشری حقایق کا استنباط کیا جا سکتا ہے اور ایک اچھے لغت میں یہ خزانہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ چند ناموں کی وجہ تسمیہ پر نظر ڈالئے:۔

گیا کا نام آپ نے سنا ہو گا کہ صوبہ بہار میں ایک شہر ہے جو بودھ مت والوں کی نظر میں بہت مقدس مقام ہے اور ہندؤں کا بھی بڑا تیرتھ ہے۔ بودھ مت کی روایات سے قطع نظر کر کے صرف ہندو نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس کے متعلق دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ راج رشی گوئی نے ایک یوگ کر کے بہت سی گائیں برہمنوں کو پن میں دیں تو اُن سے دیوتا بہت خوش ہوئے اور گیا کا اُن سے منسوب ہونا مقدر کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس شہر کو گیا شر سے نسبت ہے جو وشنو بھگوان کے بہت بڑے بھگت گزرے ہیں۔ یما یعنے خدائے موت نے جب وشنو بھگوان کو گیا شر سے اس قدر خوش دیکھا تو اس خیال سے کہ گیا شر کی روح قبض کرنا دشوار ہو گا، انھوں نے وشنو جی کو توجہ دلائی اور وشنو جی نے گیا شر پر ایک چٹان پھینک کر انھیں مار ڈالا۔ مگر چونکہ گیا شر کی بھگتی زبردست تھی، اس کی وجہ سے وشنو بھگوان نے گیا کو تمام دیوتاؤں کا استھان قرار دیدیا اور اس مقام کو یہ خاص برتری بخشی کہ جو شخص وہاں تیرتھ کو آئے گا اور شرادھ یا پنڈ دان کرے گا اس کے اسلاف کو وشنو پد میں جگہ ملے گی یہی بنا تھی کہ اہلیا بائی نے گیا میں وشنو پد کا مشہور مندر تعمیر کرایا۔

آپ بمبئی جاتے ہیں تو جی آئی پی کے راستے سے خاندیس کا علاقہ بھی پڑتا ہے۔ اس لفظ کو سنکر آپ کا خیال فوراً اس طرف جائے گا کہ یہ پٹھانوں کی بستی ہوگی یا پٹھانوں نے آباد کیا ہو گا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں یہ بھیل قوم کا علاقہ ہے اور اسے بھیلوں کے ایک قبیلے کھاند سے نسبت ہے۔ اس سے اتنا تو قطعی طور پر ظاہر ہو گیا کہ یہ قبیلہ بہت با اثر تھا۔ مسلمانوں نے تلفظ کی سہولت کے قاعدے سے اُسے خاندیس بنا دیا جو آج تک بولا جاتا ہے۔

آریا نسل کے پروہت یعنے برہمن جب اس ملک میں آئے تو پہلے پنجاب میں رہے تھے اس لئے پنجاب کا پرانا نام برہما ورت ہے اور شمالی ہندوستان کا باقی حصہ آریا ورت کہلایا، کیونکہ آریا اس تمام علاقے میں پھیل گئے تھے۔ لیکن بعد میں راجہ بھرت کے نام سے سارا ملک بھارت ورش کہا جانے لگا۔

اب چند لفظ ایسے بھی دیکھ لیجئے جن کو ہماری تاریخ معاشرت سے تعلق ہے اور جن پر غور کرنے سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے باہمی ارتباط پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کتھک سے ہم رقاص یعنے مرد ناچنے والا مراد لیتے ہیں، اور فنی اعتبار سے کتھک کا ناچ کامل سمجھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے اس لفظ میں یہ مفہوم کس طرح آیا۔ ہندی میں ایک لفظ ہے کتھا جس کے معنے وعظ و بیان کے ہیں ہندی میں فعل کے ساتھ حرف کاف بڑھا دینے سے اسم فاعل بنجاتا ہے چنانچہ کتھک کے معنی ہوئے کتھا کہنے یا مدح کرنے والا۔ اب چونکہ صناعت رقص کا مقصود اظہار ہے اور ہندو مذہب میں شوالوں کی مورتیوں کے سامنے رقص کے ذریعے سے اظہار عبودیت اور جذبات بندگی کا اظہار و بیان کیا جاتا ہے اس لئے رقاص کو کتھک کہا گیا۔ لیکن اب اس لفظ میں اظہار بندگی و عبودیت کا مفہوم نہیں رہا، صرف مرد ناچنے والے کے مفہوم

میں بولا جاتا ہے، حالانکہ رقص عبودیت ترک نہیں ہوا اور کتھک اب بھی رقص کرتا ہے۔

آپ اکثر بولتے اور سنتے ہوں گے "میاں ہٹاؤ اس کھٹراگ کو" "یہ کہاں کا کھٹراگ لے آئے"۔ یہ لفظ کھٹراگ ہر اُس بات کے متعلق بولا جاتا ہے جس سے ہمیں اُلجھن ہوتی ہو، جو ہماری سمجھ میں نہ آئے، جو معاملے سے متعلق نہ ہو وغیرہ۔ اصل لفظ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کھٹ سنسکرت میں چھے کے عدد کو کہتے ہیں اور راگ کے معنی معلوم ہیں، یعنے چھے راگ۔ کھٹراگ ایک راگ کا نام ہے جو چھے راگوں یعنی بھیروں، سری، میگھ، ہنڈول، دیپک اور مالکوس کو ملا کر گایا جاتا تھا۔ پھر بعد میں سری راگ کے پانچویں پتر کا یہی نام پڑ گیا۔ اب معلوم نہیں کہ بہادر شاہ ظفر اس مخلوط راگ کے شیفتہ تھے یا سری راگ کے پانچویں پتر کے یا یہ دونوں اصل میں ایک ہیں، مگر اتنا ظاہر ہے کہ کھٹراگ بہت اعلیٰ اور پسندیدہ راگ تھا۔ ظفر کا مصرعہ ہے:۔ "ٹیک سنگ ہی ترا کھٹراگ آئے ہمتو ہیں"۔

اس لفظ میں جھنجھٹ اور جھمیلے کا مفہوم پیدا ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ علم موسیقی میں مہارت نہ رکھنے والوں کے لئے ایک ملے جلے راگ کی قدر کرنا مشکل تھا اس لئے ان کم فہموں نے مذاق یا طنز کے طور پر ہر ایسی بات کو کھٹراگ کہنا شروع کر دیا۔ پھر اُس میں بکھیڑے اور تکرار کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا اور کئی محاورے وجود میں آ گئے۔ راگ کی حیثیت سے تو اب شاید اس کا نام بھی نہیں لیا جاتا، گانا تو رہا ایک طرف، مگر یہ لفظ عام و خاص کی زبان پر ہے۔

ہم میں بہت ہوں گے جنھوں نے خاص کر دوالی کے تہوار پر صابونی نام کی ایک مٹھائی کھائی نہیں تو دیکھی ضرور ہوگی۔ اس مٹھائی کا سفید رنگ اور گول شکل دیکھ کر لامحالہ خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس کو صابن سے نسبت ہے۔ کیونکہ دیسی صابن سفید اور گول ہی بنا کرتا تھا۔ جو کپڑے دھونے کے کام میں آتا تھا۔ اگرچہ اب یورپ کی نقل میں لمبی لمبی بار بننے لگی ہیں۔ اس نام پر توجہ کیجئے گا تو یہ چیز سامنے آئے گی کہ چونکہ صابن مسلمانوں کے ساتھ آیا جو اس کے نام سے ثابت ہے اس لئے یہ مٹھائی ضرور مسلم عہد کی یادگار ہے، مگر بنتی ہندو تہوار پر ہے۔ پھر ہمارا خیال صابن کی طرف بھی ضرور متوجہ ہوگا کہ صابن کو ہم غسل میں استعمال نہ کرتے تھے۔ یہ کام ابٹن وغیرہ سے لیا جاتا تھا۔ نہانے کے لئے صابن کا استعمال ہم نے انگریزوں سے سیکھا اور سفید اور گول شکل کے برخلاف با مختلف رنگ و بو کی چکتیاں بننے کی وجہ صابن کا غسل کے لئے استعمال ہونا ہی ہے۔

لفظ کوتوال پر آپ اوپر نظر ڈال آئے ہیں۔ یہاں کوتوالی کے ساتھ لفظ چبوترہ کو بھی دیکھ لیجئے۔ چبوترہ کوتوالی کے ساتھ کیونکر شامل ہوا اور پھر صرف چبوترہ چڑھنا بھی ایک محاورہ مستعمل رہا جس کا مفہوم رپٹا پٹی تھا۔ پچھلے زمانہ میں کوتوالی کی عمارت میں چبوترہ عمارت کا خاص حصہ تھا جس پر کوتوال بیٹھ کر فرض منصبی ادا کرتا ہوگا۔ اسلئے چبوترہ اور انصاف یعنی پولس کا انتظام مترادف لفظ ہو گئے تھے۔ میز کرسی آ جانے اور نئی عمارتیں بننے سے بعض کوتوالیوں میں چبوترہ نہیں رہا۔ لیکن پرانے تھانوں اور خاصکر منصلات میں چبوترہ اب بھی کوتوالی کا خاص حصہ

ہے جس پر دیوانجی اور ان کا ڈگس علاقے کا انتظام کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

"کھرا کھیل فرخ آبادی" یہ جملہ ایسا نہیں جو کسی نے سنا نہ ہو۔ اس کی ترکیب پر نظر کرکے یہی سمجھا جائے گا کہ فرخ آباد میں کوئی کھرا کھیل کھیلا جاتا ہوگا۔ لیکن ہم اسے جس مفہوم میں بولتے سنتے ہیں اُسے اور فرخ آباد کے کھرے کھیل کو کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس کو بولتے ہیں خوش معاملگی کے معنی میں۔ اب دیکھئے کہ کس مخفی طریق سے اس جملے میں "اس ہات دے اُس ہات لے" کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ کسی زمانہ میں فرخ آباد میں ٹکسال تھی اور وہاں کا سکہ سب سے زیادہ کھرا سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اُسی طرح جیسے آج انگلستان کی ہال مارک چاندی کھری سمجھی جاتی ہو اور ہر کھری بات کے لئے ہال مارک کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

اورنگ زیب دکن پر فوج کشی کرتا ہے اور اس کی مدت غیر معمولی طویل ہو جاتی ہے، جس کے سبب سے فوج میں ایک بیماری شروع ہو جاتی اور اکثروں کے ایک پھوڑا نکلتا ہے۔ لوگ اس کا نام اورنگزیبی پھوڑا رکھ دیتے ہیں۔ یہ لفظ آپ کے سامنے ایک پورے تاریخی واقعے کو پیش کر دینے کے ساتھ اس نفسیاتی حقیقت کو بھی پیش کرتا ہے کہ گھر اور وطن سے طویل مدت تک دور رہنے کے باعث لوگ اورنگزیب سے بددل ہو گئے تھے، اور یہی نفسیاتی وجہ تھی کہ اس پھوڑے کو انھوں نے اورنگزیب کی عنایت سمجھکر اُس سے منسوب کر دیا۔

محمد شاہ کے عہد میں کوئی داؤد خاں صاحب حج کے لئے گئے اور وہاں سے مصری گیہوں کی سوغات لائے اس کی زراعت بڑھی تو لانے والے کے نام پر اُس کو داؤد خانی گیہوں کہا گیا۔

لفظ کنا گت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ صحیح لفظ کرناگت تھا اور کرن اور آگت سے مرکب ہے۔ کرن ایک راجہ کا نام تھا اور آگت کے معنی ہیں سامنے آنا۔ شرادھ کی رسم کو راجہ کرن نے کسی خصوصیت سے ادا کیا تو اُسے کرناگت کہنے لگے اور پھر رسے کو کنا گت رہ گیا۔

[illegible] دیکھئے [illegible] کی [illegible] سابقہ [illegible] ہے گی۔ اس کے عربی معنی ہیں پہلا یعنی اگلا زمانے کا۔ [illegible] وجود میں آیا [illegible] دیکھئے تو [illegible] مفہوم [illegible] کی جان پہچان [illegible] سابقہ [illegible]

[illegible] سے [illegible] ہے!

[illegible] اسے دیکھ کر [illegible] دھن [illegible]

[illegible] کی وجہ ہے [illegible]

[illegible] آپ اس جستجو پر مجبور [illegible]

[illegible] ہے وہاں کی سردی اور برف سے

[illegible] ہیں کہ عام زبان [illegible] اس کی لغت [illegible]

مقامی طور پر کچھ الفاظ، محاورے اور مثلیں استعمال ہوتی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جو الفاظ اُس زبان کے ادب یعنی کتاب میں آجاتے ہیں وہ پھیل بھی جاتے ہیں۔ ہماری زبان میں مقامی تاریخیں اور افراد کی سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئیں۔ اس لئے یہ مقامی سرمایۂ لغت بیکار ہی رہا۔ اس کی مثال کے طور پر دو لفظ پیش کرتا ہوں جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں مگر ہماری لغت میں درج نہیں۔ نہ معلوم ایسا کتنا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہو کہ ہماری لغت نویسی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی کی نظر تو سارے ذخیرۂ ادب و تاریخ پر نظر ہو سکتی ہے اور نہ ان کو اتنے ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔

حافظ رحمت خاں کی سوانح عمری میں چند سطروں میں روہیلکھنڈ کی ایک تحریک کا ذکر "مفتی تحریک" کے نام سے آیا ہے۔ جو حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی اور اُسوقت کے احول کا نتیجہ تھی۔ مگر اس کا پہلا مقصد ٹیکس کی مخالفت بن گیا۔ یہ تحریک انگریزوں کے ہاتھوں ٹھنڈی ہوئی۔ اب اگر یہ لفظ لغت میں داخل ہوا تو یہ تاریخی قصہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔

دوسرا لفظ "ولسن گردی" ہے جو ابھی تک کسی عامہ کے طور پر بھی نہیں آیا ہے۔ جس زمانہ میں صوبۂ متحدہ کا ہائیکورٹ آگرے میں تھا۔ مدراس علاقے کے ایک نواب خاندان کے فرد دلاور جنگ احمد اللہ صاحب معروف بہ ڈنکا شاہ سیاحت کرتے ہوئے گوالیار پہونچے اور محراب شاہ صاحب قادری سے بیعت کر کے خرقۂ خلافت سے ممتاز ہوئے۔ وہاں سے آگرے آئے اور مسلمان عمائد معتقد ہو گئے تو شاہ صاحب نے جہاد پر بیعت لی۔ صدر نظامت میں اُسوقت مسلمانوں کا غلبہ تھا اور وکلا میں بھی مسلمان ہی مقتدر تھے۔ ان کے علاوہ شہر کے دوسرے عمائد بھی بہت با اثر لوگ تھے۔ مسٹر ولسن جج تھے۔ حکومت بدظن ہو گئی اور یہ تمام عمائد رشوت ستانی میں ماخوذ کئے گئے۔ اس کو آگرے میں "ولسن گردی" کہا گیا۔ اگرچہ رشوت ستانی کے الزام سے یہ سب لوگ بری ہو گئے۔

مثالاً ان چند الفاظ کے مطالعے میں آپ نے اپنی زندگی کی صراحت کے بعض دلچسپ مرقعے دیکھے، اپنی تاریخ کے بعض نکتوں کو ایک ایک لفظ میں محفوظ پایا اور الفاظ کے طلسم زار معانی کی بھی خاص سیر ہو گئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مطالعۂ لغت کے سلسلے میں علم الحروف کا ایک دلچسپ پہلو بھی دیکھ لیں۔

ہائے مخلوط یا دوچشمی ھ جسے ہندی ह کہتے ہیں ہندی سے لی ہے جو اپنی ذات سے کالعدم ہے۔ مگر دوسرے حرف کے ساتھ ملکر آواز دیتی ہے۔ یہ ہائے مخلوط یعنے ह کی مفرد آواز سنسکرت میں یا تو وزن کی خاطر زائد آتی ہے یا کبھی ندا یا پکار کے معنی دیتی ہے، اور اس کے ترکیبی معنی آواز کو پرگھٹ یعنے ظاہر کرنے والا یا گانے والے کی آواز کو چھانٹنے کے ہیں۔

یہ ہائے مخلوط جب حرف گاف کے ساتھ ملتی ہے تو اُس کی آواز گھ घ ہوتی ہے جو ناگری حروف میں

چوتھا حرف صحیح ہے۔ سنسکرت لغت میں حرف گھ کا اصلی اور پہلا مفہوم اس آواز سے ہے جس سے "گھر گھر" و "گھڑ گھڑ" پیدا (مطلق آواز) جیسا ہیں۔ گھنٹے گھنٹی بجنے کی آواز کا پہلا یہی ہے، وجود میں آئے۔ اس کے دوسرے معنی گھٹ یعنی بطون کے ہیں جس سے گھڑا اور کپڑ قطرہ دور کی مناسبت سے گھاگرا وغیرہ ہے۔ گ आ اور گھ ह دو آوازیں ملکر گ آہ کی آواز دیتی ہیں۔ گ آ کے لغوی معنی ہیں گانا، جانا، اور روانی۔ پھر اسی سے اصطلاحی مفہوم گانے والا یا دیوتا کے گیت گانے والا پیدا ہوگیا۔ اسی طرح جیسے اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے اور بیسیوں مفہوم معجزے کی طرح وجود میں آگئے اور گمن، گم، گونا، جانا اور جاترا وغیرہ کی اصل بھی یہی حرف ہے کیونکہ کاف اور جیم ہر زبان میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ مصدر جانا سے گیا ماضی مطلق کا صیغہ اسی قاعدے سے بنا ہے۔ دریا کا چڑھنا اور اترنا، گانے کے اتار چڑھاؤ کا مفہوم بال اُڑ جانا اور اجڑ جانا کے معنی بھی اسی حرف کا اعجاز ہے۔ گنگا کی اصل بھی یہی حرف مانا گیا ہے، کیونکہ اس میں روانی ہے۔ گرہ یا گانٹھ سے سلسلہ جڑ جانے کے معنی کا ذمہ دار بھی یہی حرف ہے، اس لئے کہ اس میں بھی تسلسل و روانی ہے۔

بنابریں حرف گاف سے جتنے لفظ بنیں اور ان کے اندر روانی یا سر کی کیفیت کا مفہوم ہو تو وہ اسی اصل پر تصور کئے جائیں گے اور اس سے بنے ہوئے تمام الفاظ میں اس کے اصل لغوی مفہوم سے نسبت باقی رہے گی۔ مثلاً گج (ہاتھی)، گھیر، گدگدی، گھرنا، گندا سا وغیرہ میں حرکت و روانی موجود ہے، اور گیت، گنکری، گرجنا، گڑگڑاہٹ وغیرہ میں آواز کی مناسبت باقی ہے اور دریا کے بہنے میں چونکہ تری کا مفہوم ہے اس لئے گیلا، گارا وغیرہ بھی اصل سے جدا نہیں ہیں۔

گ आ اور گھ ह، مفرد و مرکب حرف کے لغوی معنی کی یہ مثالیں اور تصریح یقیناً غیر دلچسپ نہ تھی۔ اب صوتیات کے اعتبار سے اس کے مخرج پر بھی غور فرمائیے:۔

سنسکرت مخارج کے اعتبار سے یہ دونوں آوازیں کنٹھی یعنے حلقی حروف ہیں۔ لیکن جیسا دیکھئے گا تو "گ" کے مقابلے میں "گھ" گڑھے میں پڑا محسوس ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے جتنے لفظ بنے یا محاورے پیدا ہوئے ان کے اندر معناً اس حرکت کے خاتمے کا مفہوم موجود ہے۔ مثلاً گہرائی، نشیب اور ڈھلاؤ کا مفہوم جیسے گھاٹ، گھاٹی، گھاؤ، گھائل، گھالنا، گھائی وغیرہ میں، یا چکر، گولائی، اور دور کا مفہوم جیسے گھونگا، گھونگھٹ، گھیر گھنڈی، گھنگرو، گھماؤ، گھونٹنا، گھونسا وغیرہ میں۔ یا گھر گھر (خراٹوں کی آواز)، گھڑ گھڑ (مطلق آواز) کا مفہوم جیسے گھنٹا اور گھگی وغیرہ میں۔ یا رگڑ اور خراش کا مفہوم جیسے گھسنا، گھسیٹنا، گھیتلا وغیرہ میں۔ یا زیادتی اور بہتات کا مفہوم جیسے گھنا، گھمسان، گھان، گھنیگر، گھنگھور وغیرہ میں یا قلت و تنگی کا مفہوم جیسے گھاٹا، گھڑی وغیرہ میں، یا بستگی و غلاظت کا مفہوم جیسے (دل، دم) گھٹنا، گھمس، گھورا، گھن، گھونٹ وغیرہ میں۔ یا تحدید و انحصار کا مفہوم جیسے گھر، گھٹا وغیرہ میں۔ یا

اخفاء و پنہانی کا مفہوم جیسے گھٹ، گھات، گھُن، گھُنّا وغیرہ میں۔ یا پیچ اور آمیزش کا مفہوم جیسے گھولنا، گھلوا، گھچ پچ وغیرہ میں۔ یا ضرب اور چوٹ لگانے کا مفہوم جیسے گھڑانا، گھڑیا وغیرہ میں۔

مثالیں بہت لائی جا سکتی تھیں لیکن آپ اگر مطالعے کی توجہ فرمائیں گے تو اس سے بنے ہوئے ہر لفظ سے واضح ہوگا کہ کوئی حرف اپنی اصل اور مادّے اور لغوی مفہوم سے، حرکات، سکنات، اضافات، نیز مختلف صورتوں میں بدل جانے کے بعد بھی جدا نہیں ہو جاتا اور اپنی ہیئت اولیٰ کو برابر ظاہر کرتا رہتا ہے۔

اسی ایک حرف کا طلسم معانی و مفہوم کھولنے جانے کے لئے ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ اگر سوچئے کہ انسانی ذہن و خیال میں یہ حرف آیا کیونکر تو قیاس بتاتے ہیں کہ یا تو جانور کو ذبح کرتے وقت یا جنگ میں کٹے ہوئے گلے کی گھر گھر کی آواز سے آیا، یا آبشار کے پانی کو گرتا دیکھکر اس کی آواز نے سجھایا، یا نرغے میں گھر جانے کے وقت خیال نے اسے ایجاد کیا۔ کیونکہ اس کے مفہوم میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

میرا یہ دعا کہ مطالعۂ لغت نہایت دلچسپ مشغلہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان اشاروں سے روشن اور مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا۔ لیکن یہ کہ وہ کتنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ علمی افادے کے اعتبار سے ہماری لغت کی کتابیں مایوس کن ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ علم کی انتہا نہیں اور حصول علم کے لئے ایک انسانی عمر ناکافی ہے، ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ علم کی آرزو ہمیشہ جوان رہتی بلکہ جوان تر ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس زمانے میں علوم و فنون کے اندر جس تیزی سے ترقیاں اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہم اس سے بھی بے خبر نہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ علمی معلومات کو عام اور آسان کرنے کے لئے یورپ کی تیمیں کتنا عظیم الشان کام کر رہی ہیں اور یورپ کی سب زبانوں میں لغت کی کتابیں نئے نئے انداز اور جدید تر نقشوں پر برابر کثرت سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انگلستان کا سب سے بڑا ادبی مفکر ایچ، جی، ویلس اب اس پر مائل ہے کہ علوم کی ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرے۔ ان حالات کے مقابلے میں ہماری لغت نویسی کی حالت پر اظہار خیال فضول سی بات ہے۔ ہماری لغات علمی معلومات بہم پہنچانے سے قاصر ہیں۔

پچیس سال پہلے جب ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جن کو ہم بے حقیقت سمجھتے ہیں انسائیکلوپیڈیا بروڈ میں آ گئی تو ہمیں بھی توجہ ہوئی تھی، لیکن آج تک خیال ہی کی صورت میں ہے۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے انگریزی اردو ڈکشنری شائع کر کے بہت بڑا کام اور ایک اہم ضرورت ہی پوری نہیں کی بلکہ اردو زبان کو بہت آگے بڑھا دیا ہے اور اس کار عظیم و اہم کے لئے ارباب انجمن مبارکباد و تحسین کے مستحق ہیں اور اس سے بڑا کام وہ ہے جس میں انجمن آج کل مصروف ہے یعنی ایک جامع اور مستند لغت کی طیاری۔ اس موقعہ پر میں ارباب انجمن کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان کی اسکیم میں اگر علمی معلومات کو اس لغت میں شامل کر دینا بھی ہو تو ہماری زبان میں عظیم الشان اضافہ

ہوگا اور ہماری قوم کی علمی جستجو کی تسکین کا ایک سامان ہو جائے گا۔ اگر اربابِ انجمن مختلف علمی موضوعات پر اُس علم کے جاننے والوں سے، انگریزی لغات ہی کے اندر سے، غیر فنی زبان میں ترجمے کرا کر شامل کر سکے تو یہ لغت عام کتب لغت اور ایک دائرۃ المعارف کے درمیان کی کڑی ثابت ہوگی اور اسوقت ہماری قوم اور ہماری زبان کو اسی کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے چھوٹے چھوٹے اور عام فہم ایسے مضامین آجائیں جن کو پڑھکر ہم آثاریات قبل تاریخ کو پڑھے بغیر اتنا جان جائیں کہ انسان کی ابتدا کتنی حقیر تھی اور اس کو ترقی کرنے میں کتنا زمانہ لگا ہے ہم جان جائیں کہ علم زبان مکمل ہو کر کس طرح علوم فطرت سے متعلق ہو گیا اور اس کے اندر علوم فطرت کی سی قطعیت آگئی ہے۔ ہم سمجھ سکیں کہ تاریخ نویسی کے اُصول اور طریقے کس نہج سے مستحکم ہوئے ہیں۔ ہم دیکھ سکیں کہ حیوانات کی تحقیق نے فن طب کے ساتھ کیسے کیسے نتائج ہم تک پہونچا دئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہو کہ علم الاعضاء کی ترقی نے جراحی کے بیرحمانہ فن کو کس درجہ راحت آفریں بنا دیا ہے۔ ہم دیکھ سکیں کہ اعصاب کا علم معجزے کی حد تک کس نوع سے مرتب و منظم ہو گیا ہے۔ ہمیں علم ہو سکے کہ صنعت و حرفت یعنی مشین کی ترقی نے انسان کی زندگی میں کتنی اور کیسی عجیب و غریب تبدیلیاں کردی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو سکے کہ موٹر، موٹر کشتی اور ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کس حد تک پہونچ گئی اور کس نے پہونچائی ہے۔ ہم جان سکیں کہ مختلف زبانوں کے مشہور و مستند مصنف کون تھے اور کس کی کونسی کتاب اہم و اعلیٰ ترین ہے۔

دراصل کلام یہ ہے کہ عام علمی معلومات بڑھانے اور ان کی تہ اور اصل تک پہونچنے کے لئے لغت کا مطالعہ بیحد دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے۔ جو ایک اہل قلم کی اشد ترین ضرورت ہے اور ہماری کتب لغت میں جو کمی ہے ہمارا قومی و ملکی فرض ہے کہ ہم اس طرف متوجہ ہو کر علوم و معلومات کا اس میں ضرور اضافہ کر دیں تاکہ اس طرح افراد قوم میں علم کی اشاعت ممکن ہو جائے۔

ل۔ احمد

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے آخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

معراجِ تمدن

یا

اشتراکیت

ہندوستان کے بلند پایہ رسالہ نگار کی دو قریبی اشاعتوں میں اشتراکیت کے متعلق ایک مدلل مقالہ شایع ہوا ہے جس سے انتہا پسند طبقہ میں جو اس وقت ہندوستان کی بیداری میں نمایاں حصہ لے رہا ہے - سوء فہمی پیدا ہو جانے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ اس لئے میں اس مسئلہ پر نگاہ ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں -

معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے نہ اشتراکیت کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی اشتراکی سے ان کو تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے۔ ورنہ وہ نازیت و فاسسیت کو اشتراکیت کے ساتھ ملا کر نہ دیکھتے۔ موجودہ روس و جرمن معاہدہ اس وجہ سے وجود میں نہیں آیا کہ دونوں ملکوں کے طریقۂ حکومت میں ہم آہنگی ہے۔ بلکہ یہ ہٹلر کا ایک سیاسی حربہ ہے جو صرف اسٹالین ہی کے زمانہ میں روس کے اندر کامیاب ہو سکتا تھا -

معنی کے لحاظ سے جمہوریت و اشتمالیت میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی عوام کی اپنی حکومت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے جمہوریت کا مفہوم "آزادانہ حقوق برائے زندگی" کی حد تک محدود کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ جمہوریت سے مراد عوام کی منتخب حکومت ہے۔ اسی کے ساتھ ایک خاص ملک کی مثال پیش کر کے جمہوریت کو رحمت الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی دلایل تشنۂ تشریح ہیں۔ جس ملک کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہاں افراد کے مفاد ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ آزادی افراد سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی بجز امیر الامرا کا دائرۂ اثر اس قدر وسیع ہے کہ افراد کی آزادی خیال اس میں جذب ہو کر رہ گئی ہے - چنانچہ شہنشاہیت پر حسن کی سحر آفرینیوں کو ترجیح دینے والے ڈیوک آف ونڈسر کا جو حشر ہوا وہ اسی جاہ پسند طبقہ کا کارنامہ تھا -

ایک تازہ مثال سے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داروں کے دست نگر ہو جانے کی وجہ سے افراد

کی ذہنی قوت کس حد تک سلب ہو جاتی ہے۔

پنجاب کونسل میں "قانون حق آراضی مرہونہ بلامعاوضہ" زیرِ بحث تھا، جس کی رُو سے اکثر کسانوں کو ان کی مرہونہ زمین بلامعاوضہ واپس مل جانے والی تھی، لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ سرمایہ داروں کے غلام تھے سکندر منسٹری کو بُرا کہہ رہے تھے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ دولت مخصوص آدمیوں کے ہاتھ میں ہے اور بغیر دولت کی مساویانہ تقسیم کے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکتا۔ شخصی آزادی جس کی حمایت میں مقالہ نگار نے اشتمالیت پر الزام لگا کر اُسے ہوّا دکھانے کی سعی کی ہے۔ اس برائے نام جمہوریت میں ہے کہاں؟ جس کے چھن جانے یا چھین لئے جانے کا خطرہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ عوام کی دماغی سطح کو ایک کمسن بچہ کی مانند سمجھ کر اصلی موٹر کی بجائے جاپانی کھلونا موٹر، دے کر بہلانے کی کوشش کریں۔

آپ جس جمہوریت کی ثنا خوانی فرما رہے ہیں اُس کی حالت بالکل ایسی ہے، جیسے ایک گاؤں کے پنشن یافتہ سپاہی نے ہرن کا شکار کیا، جسے شکاری کتوں نے پکڑا تھا۔ اُس کی رانوں اور سینہ کا نفیس گوشت تو اُسی وقت ایک معتبر آدمی کے ہاتھ کلکٹر ضلع کو بھیج دیا گیا۔ سر چوکیدار کے حوالے کیا گیا کہ تحصیلدار کو پہونچا دے، کھال اُتروا کر علاقہ کے ذیلدار کے لئے ایک مقام پر محفوظ رکھدی گئی۔ باقی جسم کا گوشت نمبردار اور پٹواری کو دینے کے بعد شکاری کے دوستوں میں تقسیم ہوا اور کتوں کو صرف وہ ہڈیاں ملیں جو پکا ہوا گوشت کھانے کے بعد اُن کی طرف پھینکی گئی تھیں ملاحظہ فرمائیے۔ سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے؟ حالانکہ شکاری کو کسی نے ایسا کہنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔

متذکرہ تمثیل سے مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ بغیر اقتصادی مساوات کے آزادیِ آرا لغو و مہمل چیز ہے اور حکومت امراء کو جمہوریت کا طلسم خیز نام دیکر عوام کو مغالطہ میں ڈالا جا رہا ہے۔

کیا اشتراکیت، دنیائے تمدن کے لئے ناممکن العمل نظریہ ہے۔ زمانۂ حال کے جمہوریت پسند فیلسوفوں کا دماغ اس باب میں شبہات کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ کیونکہ طبقۂ امراء اشتراکیت کی ہمہ گیر مقبولیت کو دیکھ کر اپنے قارونی خزانے کی طرف سے غیر مطمئن ہے اور اُن کا یہ خوف بے وجہ بھی نہیں ہے۔

افلاس کیا ہے؟ ضروریات زندگی کی عدم فراہمی ۔۔۔ امارت کیا ہے؟ لوازم زندگی کا بافراط پایا جانا ۔۔۔ اور اشتراکیت ان دونوں میں توازن پیدا کر دینا چاہتی ہے یعنی ریاست کے تمام ذرایع آمدنی پر قابض ہو کر ہر شخص کو بلحاظ ضرورت تقسیم کر دے۔ جمہوریت میں رؤسا جائز و ناجائز ہر طرح دولت پر قابو حاصل کر لیتے ہیں اور اشتراکیت میں دولت سب کی ضرورت کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے، جمہوریت میں دونوں گروہ غیر مطمئن رہتے ہیں، لوٹنے والے

لوٹے ہوئے مال کے تحفظ کے لئے اور لوٹے جانے والے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے، برخلاف اسکے اشتراکیت کی بنیاد ہی معاشی و اقتصادی اطمینان پر قایم ہے جس میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

اشتراکیت پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی اور افراد کی ضروریات زندگی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ انسانی طبایع کا اختلاف فطری بات نہیں ہے بلکہ ماحول کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے مختلف طبایع رکھنے والے افراد کا بھی ایک مقصد کی خاطر متحدہ محاذ قایم کر لینا دشوار نہیں۔ ڈاکو اور لیٹرے ایک دوسرے کے عزیز نہیں ہوتے اور ان کی فطرتوں میں بھی فرق پایا جاتا ہے، تاہم لوٹ کھسوٹ کی خاطر ان میں بھی وقتی یا دائمی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض طبایع انسانی کا اختلاف اشتراکیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ جمہوریت پسند لوگ نظام جمہوریت کے پروپاگنڈا میں آزادی افراد کو بہت نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی جس چیز کا نام ہے وہ جمہوریت میں مفقود ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ کامیاب دھوکا مذہبی آزادی کے نام سے دیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشی الجھنوں میں پھنس کر کوئی فرد مذہبی فرایض کی بجا آوری میں کامیاب ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود اپنی ہستی کے وجود کا احساس بھی برائے نام رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی حالت میں مذہبی آزادی کا ذکر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ مذہبی آزادی سے قیام سرمایہ داری کو اور مضبوط بنانے میں کام لیا جاتا ہے۔ بانیان مذاہب نے مذہب کی بنیاد رحم انصاف۔ رواداری اور مساوات پر قایم کی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ اسلام اور اشتراکیت میں تو کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ لیکن کیا جمہوریت میں اہل مذاہب کو وہی حقیقی مساوات و آزادی حاصل ہے جو مذہب کا مقصود ہے۔ ہرگز نہیں ۔۔۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اشتراکیت جمہوریت سے کہیں زیادہ مقاصد مذہب کو پورا کر سکتی ہے۔ مذہبی آزادی کے بعد جس دوسری برکت کا ذکر جمہوریت میں کیا جاتا ہے وہ معاشرت کی آزادی ہے، حالانکہ جمہوریت میں صرف طبقۂ امرا اور سرمایہ دار گروہ نظام معاشرت کا واحد اجارہ دار ہوتا ہے اور عوام کو صرف " معاشری آزادی " کے خوبصورت الفاظ سے مطمئن کر دیا جاتا ہے، حالانکہ معاشری آزادی اور معاشری مساوات میں زمین و آسمان کا فرق ہے معاشری مساوات کے مطالبہ پر مذہب کا اثر ڈال کر عوام کو اپنی حالت پر قانع رہنے کی تلقین کی جاتی ہے تاکہ سرمایہ دار تھوڑا بہت دیکر عوام سے سجدۂ عبودیت حاصل کرتے ہیں در اصل اس مسئلہ کو قدیم بانیان مذاہب نے ضرور حل کر دیا ہوتا۔ لیکن اُس زمانہ میں انفرادی منافع نے اتنی بھیانک اور گھناؤنی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ذرایع آمد و رفت محدود تھے مشینیں اور کلیں مفقود تھیں اور بین الاقوامی تجارت کی کوئی صورت قایم نہ تھی، لیکن اب کہ انسانی تمدن اپنے انتہائی عروج پر پہونچ چکا ہے، اجتماعی تمدن کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر جمہوریت اس مسئلہ کو پس پشت ڈال کر معاشری آزادی کا راگ الاپتی ہے تو وہ لوگوں کو دھوکا دیتی ہے۔ معاشری

آزادی بغیر معاشری مساوات کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر ایک شخص کو فاقہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا معاشری آزادی کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے تو جمہوریت بیشک اس میں کامیاب ہے، لیکن اگر اقتصادی نظام کی استواری میں عوام کی مساویانہ شرکت بغیر معاشرت کا کوئی مفہوم متعین نہیں ہو سکتا، تو پھر جمہوریت کا یہ دعوےٰ کہ اس نے ہر شخص کی معاشرت کو آزاد کر رکھا ہے، جمہوریت کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

تیسری برکت جس کا ذکر جمہوریت پسند طبقہ کیا کرتا ہے "آزادیٔ رائے" ہے۔ یعنی جمہوریت میں ہر شخص آزادی سے رائے دے سکتا ہے لیکن اس کا کھوکھلا پن شروع ہی میں دکھا دیا گیا ہے۔ سرمایہ داروں کے ساتھ عوام کے مفاد اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اُن کی رائے کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ اقتصادی مجبوریاں صحیح اظہار رائے سے باز رکھتی ہیں۔ - چوتھی چیز آزادیٔ حرکت وعمل ہے۔ جمہوریت پسندوں کا اشتراکیت پر یہ اتہام ہے کہ وہ شخصی آزادی کو سلب کر لیتی ہے یعنی اس میں افراد کا کوئی شمار نہیں رہتا۔ لیکن اس میں مطلق صحت کو دخل نہیں ہے۔ یہ لوگ افراد کا لفظ بول کر صرف اپنی ذات کو مراد لیتے ہیں، پس یہ تو بالکل صحیح ہے کہ اشتراکیت میں سرمایہ دار افراد کو افرادِ قوم میں شمار نہیں کیا جاتا اور ان کی حرکت وعمل کی آزادی کو صرف اس لئے سلب کیا جاتا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی کو آزادی نصیب ہو اگر چند افراد کے ظلم کو ختم کر دینے سے لاکھوں بندگانِ خدا کو آزادی مل سکتی ہے تو اسے کون بُرا کہہ سکتا ہے۔ حامیانِ جمہوریت نادار اور محنت کش طبقہ کو افراد میں شمار نہیں کرتے۔ افراد سے اِن کا مفہوم اپنی ذات ہوتی ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ جمہوری نظام میں زیادہ سے زیادہ دس فی ہزار افراد فارغ البال کہے جا سکتے ہیں اور یہی دس فیصدی باقی نوّے فیصدی افراد کے مجلسی۔ اخلاقی اور سیاسی حقوق پر مختلف ذریعوں سے غاصبانہ قبضہ کئے رکھتے ہیں۔ ایسی آزادی کو برقرار رکھنا یا رہنے دینا انسانی خودداری کی انتہائی توہین ہے۔

جمہوریت پسند جماعت، اشتراکیت پر یہ الزام بھی قایم کرتی ہے کہ اس میں ذہنی آزادی محدود ہو جاتی ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ اعتراض ایک لمحہ اپنی جگہ نہیں ٹھہر سکتا، اسوقت سب سے کھلی ہوئی مثال ہمارے سامنے روس کی موجود ہے کہ وہاں کے دورِ اشتراکیت نے کتنی عظیم الشان ذہنی آزادی و ترقی کا ثبوت دیا ہے۔ تمدنِ انسانی کا کونسا پہلو ایسا ہے جس میں روس نے نہایت ہی قلیل مدت میں انتہائی ترقی نہ کی ہو۔

ذہنی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اقتصادی اطمینان ہے اور اشتراکیت میں سب سے پہلے یہی اطمینان کیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں اس کا امکان تو ہے کہ طبقۂ امراء کے لوگ یا سرمایہ دار افراد غیر معمولی ذہنی ترقی کر سکیں، لیکن عام ذہنی بیداری و ترقی کا اس میں امکان نہیں، برخلاف اسکے اشتراکیت میں سب کو ذہنی ترقی کا برابر موقعہ دیا جاتا ہے

الغرض اشتراکیت کے مقابلہ میں جمہوریت کو نوعِ انسانی کے لئے زیادہ مفید سمجھنا، اسقدر عجیب بات ہے کہ جب تک واقعات وحقایق کی طرف سے آنکھ نہ بند کر لی جائے اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

ر ۔ ام

عربی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ

قوت گویائی انسان کی ایک اہم ترین صفت ہے، جس کے بغیر وہ اپنی تمدنی اور معاشرتی مشکلات حل نہیں کرسکتا، معاشرت انسانی کی مختلف ضروریتوں کے اعتبار سے جب کوئی زبان عالم وجود میں آتی ہے تو جس طرح ابتدا میں معاشرت کے طریقے سیدھے سادے اور بے تکلف ہوتے ہیں اُسی طرح زبان شروع شروع نہایت سادے لباس میں جلوہ نما ہوتی ہے مبالغہ اور مضمون آفرینی کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، تشبیہات و استعارات شاذ و نادر کہیں کہیں آجاتے ہیں، جس مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے اُس کو بغیر کسی ایچ پیچ کے بے تکلف ادا کر دیا جاتا ہے، لیکن جوں جوں معاشرت کے طریقے وسیع ہوتے جاتے ہیں، سامان زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے جاتے ہیں، نفاست و لطافت بڑھتی جاتی ہے اور اُسی قدر زبان بھی تمدن کے ساتھ ساتھ عروج کرتی جاتی ہے، الفاظ میں تراش خراش پیدا ہو جاتی ہے، استعارات و تشبیہات میں نزاکت اور رنگینی آجاتی ہے، مبالغہ میں زور اور مضمون نگاری میں ترقی ہو جاتی ہے۔

عربی زبان میں جاہلیت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوہ و صحرا، دشت و بیاباں، دشوار گزار راستے اور مٹے ہوئے کھنڈر اُن کے ادبی ذوق کے جولانگاہ تھے، لیکن یہی بادیہ پیما عرب جب حکومت اور دولت کے منصب پر فائز ہوئے تو اُن کے کلام میں دقت آفرینی اور رنگیں بیانی کی کوئی حد نہیں رہی جس کا صحیح اندازہ متنبی، ابونواس، بحتری اور ابوتمام وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

چونکہ اسلام سے قبل عربوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ نہ تھا اس لئے عربی زبان کی تاریخ آفرینش کا پتہ نہیں لگتا اور نہ یہ صحیح طور پر بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کس زبان سے نکلی ہے، لیکن دنیا کی اور زبانوں کی طرح عربی زبان نے بھی بڑے بڑے پلٹے کھائے ہیں خصوصًا گزشتہ صدی کے وسط میں علوم جدیدہ کا ایسا زبردست سیلاب آیا جس کی وجہ سے صدہا جدید اصطلاحات علمیہ وضع ہوئیں اور ہزارہا انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا۔

اس زمانہ میں عربی زبان کے اندر الفاظ کا جو اضافہ ہوا وہ دو قسم کا ہے ایک تو وہ الفاظ جو غیر زبان سے عربی میں داخل ہوئے جیسے تلغرافت، بنطلون، بروجرام، وابور اور فونوغراف وغیرہ دوسرے وہ جو جدید علوم، جدید آلات

وایجادات کے لئے خود زبان عربی کے الفاظ ان معانی کے مقابلہ میں پیدا ہو گئے، جیسے جریدہ، مجلہ، مدیر، کلیہ، رسمیہ اور وسام، وغیرہ۔

تدوین عربی زبان پہ اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی کلام کی جانچ پرتال کے لئے کچھ قواعد مقرر نہ تھے بلکہ کسی کلام کے حسن و قبح کی دیکھ بھال ان طبعی اور فطری اُصول پر کی جاتی تھی جو قدرت نے ہر سخن فہم اور دقیقہ سنج طبیعت کو عنایت فرمائے ہیں۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے اہل عرب کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا اور عرب و عجم کے اختلاط و ارتباط کا اثر زبان پر بھی پڑنے لگا تو علماء کرام کو اس بات کا اندیشہ محسوس ہوا کہ عربی زبان دوسری مختلف زبانوں کی آمیزش سے بگڑ کر کوئی نئی صورت نہ اختیار کر لے، اس لئے سب سے پہلے حضرت علی نے اپنے تتبع اور استقراء سے چند قواعد لکھے اور ابوالاسود دیلی کو حکم دیا کہ وہ اسی نہج پر قواعد کی تدوین کریں، چنانچہ انھوں نے اس مہتم بالشان کام کا آغاز کیا، اور اُسی بنیاد پر پھر عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ علامۂ ابن خلدون نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اول من کتب فیہا ابوالاسود الدئلی من بنی کنانۃ ویقال باشارۃ علیٍ۔	ابوالاسود دئلی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر لکھا کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت علی کے اشارہ سے یہ کیا تھا

(مقدمۂ ابن خلدون مطبوعۂ مصر ص۴۸۲)

کتابی شکل میں اُصول و قواعد سب سے پہلے علامۂ جاحظ (المتوفی سنہ ۲۵۵ھ) نے ایک تصنیف میں پیش کئے جس کا نام "کتاب البیان والتبیین" ہے، اس کتاب کا دوسرا نام "التبیین والتبیان" بھی ہے۔

جاحظ اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل اور انشاء پرداز تھا، لوگ اُس کو ادباء عرب کا سردار اور فصاحت و بلاغت کا امام مانتے ہیں، ارباب علم و ادب میں شاید ہی کوئی اُس کے مرتبہ کو پہونچا ہو، اُس نے یوں تو مختلف فنون میں بہت سی بے نظیر کتابیں لکھی ہیں، لیکن "البیان والتبیین" سے اُن کو کوئی نسبت نہیں، یہ اپنے موضوع کی سب سے بہتر اور اچھوتی کتاب ہے اس میں خطباء اور شعراء کا کلام، دلچسپ حکایات و لطائف اور مواعظ کے نمونے بڑی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ علامۂ ابن خلدون نے علم ادب پر بحث کرتے ہوئے جن چار کتابوں کو اس فن کا ماخذ قرار دیا ہے اُن میں سے ایک "کتاب البیان والتبیین" بھی ہے۔

اسی صدی ہجری میں عبداللہ بن المعتز عباسی (المتوفی سنہ ۲۹۶ھ) بھی تھا، یہ بھی اپنے عہد کا بہت بڑا نازک خیال اور بلیغ شاعر تھا، اُس نے بھی علم و ادب پر چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے "کتاب البدیع" سب سے زیادہ مشہور ہے، یہ فن بدیع میں سب سے پہلی کتاب ہے علامۂ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیہ" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتاب البدیع کا ایک نسخہ ابتک کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں "قدامہ ابن جعفر بغدادی (المتوفی سنہ ۳۱۰ھ) نے تنقید نثر و نظم پر سب سے پہلے "نقد الشعر" اور "نقد النثر" دو مستقل کتابیں لکھیں جن میں سے "نقد الشعر" زیادہ مقبول ہوئی جو آج کل بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب میں نہایت خوبی سے شعر کی تعریف کی گئی ہے اور لفظ و معنی کی باہمی ترکیب کے اعتبار سے نثر الیط نظم مفصل بیان کئے گئے ہیں۔ قدامہ نے اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تذکرہ صاحب الفہرست نے صفحہ ۱۳۰ میں کیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ابوہلال عسکری (المتوفی سنہ ۳۹۵ھ) نے نثر و نظم کی تنقید کے سلسلہ میں ایک اور قیمتی کتاب تصنیف کی جس کا نام "کتاب الصناعتین" ہے، اس کتاب میں نثر و نظم کے بلند پایہ انتخابات، چیدہ چیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہت ہی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک ایک مسئلہ کی متعدد مثالیں پیش کر کے فصاحت و بلاغت پر خوب خوب موشگافیاں کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک خطیب یا مضمون نگار اپنے خطبہ یا مضمون میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ اُصول خطابت پر بحث کرتا ہوا بتاتا ہے کہ ایک مقرر کا فرض ہے کہ تقریر کرتے وقت اُس کا دل قوی اور مضبوط ہو، اعضاء ساکن اور مطمئن ہوں، زبان صاف اور شستہ ہو، آواز اچھی اور معتدل ہو، موقع اور محل کے مناسب مضامین کا انتخاب کر سکتا ہو، سامعین کے مذاق اور میلان طبع سے واقف ہو، امراء اور عوام کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہو تاکہ اہل مجلس کے جذبات برانگیختہ ہو سکیں۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن رشیق قیروانی (المتوفی سنہ ۴۵۶ھ) نے ایک نہایت ہی بیش بہا کتاب لکھی جس کا نام "کتاب العمدۃ فی الشعر و نقدہ" ہے، اس کتاب کا نام ہی اس کا عنوان ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے قدامہ ابن جعفر اور ابوہلال عسکری وغیرہ نے گو قابل قدر کتابیں لکھیں مگر جس خوبی اور وضاحت سے کتاب العمدہ میں اشعار کی تنقید کی گئی ہے کسی اور کتاب میں اُس کی چوتھائی بھی نہیں، تنقید اشعار کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے اُصول بلاغت منضبط کئے گئے ہیں، شعراء کی اصطلاحیں، اُن کے خاص خاص عنوانات اور باہمی مباحثے نظم و نثر کا مقابلہ، اُن پر تنقید و نکتہ چینی کے طریقے، لطائف و ظرائف، شعراء کے طبقات، اُن کے باہمی امتیازات اور وہ تمام اُصول جو صحیح طور پر علم ادب کے لئے دستور العمل بننے کے قابل ہیں تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں تنقید اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

و بالجملۃ ہذہ الصناعۃ و تعلمہا مستوفیٰ فی کتاب العمدۃ لابن رشیق۔ (مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۵۸۵)	خلاصہ یہ ہے کہ یہ فن اور اُس کا تعلم پورے طور پر کتاب العمدہ میں پایا جاتا ہے۔

اس دور کی آخری کڑی شیخ عبدالقاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) تھا، یہ شخص علم کلام، علم نحو، علم فقہ کا امام اور علم ادب کا مؤسس مانا جاتا ہے، اس نے صحیح معنوں میں عربی زبان اور عربی ادب کو جامۂ تدوین سے آراستہ کیا، اس کے منتشر اور پراگندہ شیرازہ کو یکجا کر کے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ دو بیش بہا کتابیں لکھیں، جن میں بجائے عقلی دلایل ورادبی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی ادیبانہ انداز میں مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ دیکھو اس کلام میں جو کچھ زور ہے وہ محض اس لئے کہ فلاں لفظ فلاں جگہ پر ہے یا فلاں لفظ فلاں لفظ سے مقدم یا مؤخر ہے، اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو کلام میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی جو موجودہ حالت میں ہے۔

الفاظ کا باہمی تناسب اور اُن کی نشست ہر کلمہ کی دوسرے کے ساتھ موزونیت اور کھپت فصاحت کی جان ہے، کبھی دو کلمے ہم معنے ہوتے ہیں مگر کسی عبارت یا شعر میں ایک ہی کلمہ کھپ سکتا ہے اگر اُس کے بجائے دوسرا کلمہ رکھدیا جائے تو کلام میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کلام میں ایسے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں جو باہم مناسبت رکھتے ہیں تو زبان میں خود بخود اُن کے ادا کرنے میں ایک سلاست اور روانی پیدا ہو جاتی ہے جس کو فن بدیع کی اصطلاح میں انسجام کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ایک کلام دوسرے کلام پر فضیلت محض انتخاب الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اُس میں معنے کو بڑا دخل ہے، الفاظ سے جسقدر حصہ متعلق ہے اُس کو فصاحت کہتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق معنے سے ہے اُن کو بلاغت کہتے ہیں۔

غرضکہ صناعت لفظی اور معنوی اور اُن کے تمام اقسام شیخ نے اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کسی شخص نے ابتک ان مسایل پر اتنی خوبی اور وضاحت سے خامہ فرسائی نہیں کی۔

چھٹی صدی ہجری تک متقدمین کا یہ مذاق باقی رہا، وہ علم ادب کے اصلی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ مسایل ادیبانہ انداز میں بیان کرتے رہے تاکہ متعلم کو خطابت وصحافت میں کافی دستگاہ حاصل ہو جائے اور وہ ہر موضوع پر تحریر وتقریر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر سکے۔

لیکن افسوس ہے کہ ساتویں ہجری میں جب ابو یعقوب یوسف سکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ) کا دور آیا تو دریا کا رخ دوسری طرف پھر گیا، اُس نے علم ادب کو منطقی رنگ میں رنگ دیا اور اُس میں معقولات کا ایک بڑا طومار اضافہ کر دیا۔

متاخرین نے سکاکی کی کتاب "مفتاح العلوم" کو بہت سراہا، اُس کے متعدد خلاصے اور حاشیے لکھے گئے اور فلسفیانہ رنگ میں اس کثرت سے شروح وحواشی پڑھائے جانے لگے اور اصل فن کا کہیں پتہ نہیں رہا، جن میں خصوصیت کے ساتھ علامۂ تفتازانی (المتوفی ۷۹۱ھ) کی تصنیفات مطول اور مختصر معانی سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور مدت سے درس نظامی میں داخل ہیں جو اسوقت ہندوستان کے زیادہ تر مشرقی مدارس میں رائج ہے اور جس کی

تحصیل کے بغیر کوئی شخص عالم کہے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

زمانہ کی رفتار اور جدید مذاق کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام چیزیں بدلتی جا رہی ہیں لیکن ہمارا عربی نصاب تعلیم جو آج سے صدیوں پہلے فلسفہ و منطق کے عروج کے دور میں تیار کیا گیا تھا آج بھی بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عربی زبان باوجود ہماری مذہبی زبان اور ہمارے ذوق سے قریب تر ہونے کے ہم کو مدتوں ویسی نہیں آتی، جیسی انگریزی زبان باوجود ایک اجنبی زبان ہونے کے تھوڑے عرصہ میں آجاتی ہے اسلئے کہ اس میں زمانہ کے مطابق ایک روح ہوتی جس کا ہمارے یہاں کہیں نشان تک نہیں ملتا، یہ سب کچھ در اصل اس بے نتیجہ طریقۂ تعلیم کا اثر ہے جو بد قسمتی سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروج ہے، علماء کے اس جمود اور کورانہ تقلید پر عالم اسلامی جسقدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

سید جلیل الرحمٰن اعظمی

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف:۔ اردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات و نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے پورے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد دو روپیہ۔

نغمات:۔ اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اردو کی نفاست و لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل:۔ ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ:۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت از دواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسایل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اٹلی کی غیر جانبداری اور روس کی طرفداری کا راز

اس سے قبل عام خیال تھا کہ روم و برلن کے درمیان جو رشتۂ اتحاد قایم ہوچکا ہے وہ اتنا زبردست ہے کہ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی لڑائی پر آمادہ ہوا تو دوسرا ضرور اس میں شریک سمجھا جائے گا، لیکن موجودہ جنگ میں جب اٹلی نے اعلانِ غیر جانبداری کیا تو لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کیا بات ہے۔ اس کے کئی سبب بیان کئے جاتے ہیں بعض کا خیال یہ ہے کہ خود جرمنی نے اس کو شرکتِ جنگ سے باز رکھا تاکہ اس کے سواحل کے ذریعہ سے جرمنی کو خام پیداوار اور ذخایر حرب کی فراہمی ہوتی رہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی فوجی تنظیم اچھی نہیں ہے اور اس سے قبل جب ہٹلر وہاں گیا تھا تو اس نے معلوم کر لیا تھا کہ اٹلی کی فوج بہت ناقص ہے اس لئے اس نے اٹلی کو شرکتِ جنگ سے اس لئے باز رکھا کہ کہیں خود اسی کو اٹلی کی مدد نہ کرنا پڑے اور دوسری مصیبت مول لینی پڑے تیسرا سبب ایک اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ پولینڈ یا فرانس کے محاذ میں اٹلی کی مدد جرمنی چاہتا ہی نہیں اور نہ اٹلی کوئی مدد کر سکتا ہے، جرمنی تو صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ بحیرۂ روم کو برطانیہ کے لئے خطرناک بنائے رکھے اور اپنی ساری قوت اس طرف صرف کردے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ تینوں باتیں کسی نہ کسی حد تک صحیح ہوں، لیکن جس وقت ہم اس معاملہ کا اندرونی طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور خود مسولینی کے ان بیانات کو دیکھتے ہوئے جو وقتاً فوقتاً اس سے قبل اس نے شایع کئے ہیں، تو اس کی غیر جانبداری کا ایک گہرا سبب اور بھی معلوم ہوتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ اٹلی، جرمنی اور جاپان کے درمیان روس کے خلاف ایک "اشتراکیت شکن" معاہدہ ہوچکا تھا اور یہ تینوں آمرانہ حیثیت رکھنے والی سلطنتیں اُصول حکومت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متحد الخیال بھی ہیں، لیکن چونکہ دنیا کی کوئی سامراجی حکومت خود غرضی سے خالی نہیں ہوسکتی اور وہ کبھی دوسرے کے لئے قربانیاں پیش نہیں کرسکتی، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ جرمنی اور روس کا اتحاد جاپان یا اٹلی کو خوش کرتا اور اسکا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اعلانِ جنگ ہوتے ہی ایک طرف جاپان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف اٹلی نے۔

ان تینوں میں جو اتحاد قایم تھا وہ اسی لئے تھا کہ روس کی اشتراکیت کو بڑھنے نہ دیا جائے گا لیکن جب نازی حکومت نے اپنی خود غرضی کی بنا پر خود روس ہی کے ساتھ مصالحت کا ارادہ کر لیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جاپان و اٹلی کے خود غرضانہ جذبات نہ اُبھر آتے اور وہ جرمنی کی مدد کرتے۔ پھر جاپان اور اطالیہ کی یہ برہمی جرمنی کے خلاف کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ اس کے چند اور دیرینہ اسباب بھی تھے۔ جاپان اس کو اچھی طرح جانتا تھا کہ چین، جرمنی ہی کے ہوائی جہازوں اور ہوا بازوں کی مدد سے جاپان کا مقابلہ کر رہا ہے اور یہ جرمنی کی خفیہ مدد صرف اس لئے ہے کہ چین جو جرمن مال کی بڑی منڈی ہے، جاپان کے قبضہ میں نہ چلی جائے۔ بہرحال جاپان جرمتی کی طرف سے پہلے ہی کبیدہ تھا کہ روس کے ساتھ اس نئے اتحاد نے ایک اور ضرب لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔

رہگیا اٹلی سو وہ بھی نازی حکومت کی دست درازیوں کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا تھا، چنانچہ جسوقت جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو مسولینی نے صاف صاف کہہ دیا کہ رائن لینڈ کی سرحدوں کی گارنٹی کافی نہیں ہے، برنیز کی سرحد کی بھی گارنٹی ہونا چاہئے اور غالباً سینٹ (Senate) اس خیال میں مجھ سے متفق ہوگی کہ اٹلی معاہدوں کی اس خلاف ورزی کو (جو جرمنی کے قبضۂ آسٹریا سے ظاہر ہوگی) کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ جرمنی کا یہ قبضہ اٹلی کے فتوحات کے اثر کو بالکل ختم کر دے گا اور جرمنی اپنی سلطنت کو وسیع کر کے وسطی یورپ کی سب سے زیادہ طاقتور قوم بن جائے گی۔

لیکن نازی حکومت نے مسولینی کے اس بیان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور نازیوں نے ڈولفس کو قتل کر کے آسٹریا کی آزادی پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ مسولینی بلبلا اُٹھا اور اس نے پھر اعلان کیا کہ:-

"آسٹریا کی آزادی ایسا مسئلہ ہے جس کی حمایت ہمیشہ اٹلی کی طرف سے کی جائے گی"

اس کے چند ماہ بعد مسولینی نے دوبارہ اٹلی کی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا کہ:-

"ہم آسٹریا کی آزادی کے لئے جسے چھیننے کے لئے ایک چانسلر کا خون بہایا گیا ہے پوری قوت مدافعت سے کام لیں گے"

لیکن ان اعلانات کی ہٹلر نے بالکل پرواہ نہیں کی اور مارچ ۳۸ء میں اس نے آسٹریا پر بغیر ایک آدمی کا خون بہائے قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد نازی حکومت نے زیکوسلیویکیا کو تاکا اور معاہدۂ میونخ کی رُو سے اس پر بھی ہٹلر کا قبضہ ہوگیا۔ پے در پے جرمنی کی یہ دونوں فتوحات ایسی نہ تھیں کہ اٹلی ان پر صبر کر کے بیٹھ جاتا، لیکن دشواری یہ تھی کہ ایک طرف حبشہ کی جنگ نے اس کو بہت خستہ کر دیا تھا اور دوسری طرف اسپین کے معرکہ میں تقریباً پانچ لاکھ فوج

اس کی مصروفیت تھی اس لئے وہ خون کا سا گھونٹ پیکر رہگیا۔

ہٹلر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے یہ اقدامات اٹلی کو پسند نہ آئیں گے لیکن وہ اس سے بھی واقف تھا کہ اٹلی کی عسکری قوت کچھ نہیں ہے اور وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لئے اس نے مسولینی کی برہمی کی مطلق پرواہ نہیں کی اور بعد کو اس کے قبضۂ البانیہ پر رضامندی ظاہر کرکے ایک حد تک اس کے آنسو بھی پونچھ دئے۔

ان حالات کے تحت جسوقت ہم جنگ کی موجودہ حالت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ آمرانہ حکومتوں کا وہ اتحاد جو جرمنی، اٹلی اور جاپان میں قایم کیا تھا ٹوٹ چکا ہے اور ان تینوں کی سامراجی خودغرضیوں نے آپس میں بے اعتمادی پیدا کرکے نازی حکومت کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن شاید ہٹلر اس کو بھی برداشت کرلیتا، اگر روس کی موجودہ مبہم پالیسی نے اس کے لئے اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا نہ کردئے ہوتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روس اور جرمنی میں باہم یہ طے ہوچکا تھا کہ پولینڈ کو وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے مجھے اس کے تسلیم کرلینے میں تامل ہے کیونکہ نازی حکومت اور روسی اشتراکیت میں باہمدگر بہت اصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی واقعہ ہے کہ اول اول جب فرانس و برطانیہ نے پولینڈ کے باب میں روس سے گفتگو کی تھی تو وہ نازی حکومت کے خلاف پولینڈ کی مدد کے لئے آمادہ تھا لیکن اس نے شرط یہ لگائی تھی کہ اسکی فوجوں کو پولینڈ کے اندر داخل ہوکر جرمن افواج کے مقابلہ کی اجازت دیجائے۔ مگر پولینڈ نے اسے منظور نہ کیا اور روس سے کوئی مفاہمت نہ ہوسکی، چنانچہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسٹیٹسمین کے فوجی نامہ نگار نے لکھا کہ "اگر پولینڈ دوسروں کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتا تو پھر اسے خود اپنی حفاظت کرنا چاہئے"، اور مسٹر لائیڈ جارج نے صاف صاف کہدیا کہ "پولینڈ کے تحفظ کی ضمانتیں روس کی شرکت کے بغیر بیکار ہیں اور برطانیہ نے سخت غلطی کی کہ روس کی شرکت بغیر ایسی ضمانت پیش کردی"

اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ جرمنی نے اسٹالین کو اس بات پر راضی کرلیا ہو کہ وہ پولینڈ کے مسئلہ میں غیر جانبدار رہے گا اور جنگ کھنچ جانے کی صورت میں خام پیداوار اور سامان جنگ سے بھی مدد دے گا، لیکن پولینڈ کی تقسیم پر دونوں کی سازباز سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ پولینڈ پر جرمنی کے حملہ کا مقصود ہی یہ تھا کہ ایک طرف وہ یوکرین پر قبضہ کرے جو غلہ کی پیداوار کے لحاظ سے مشہور زرخیز حصہ ہے اور دوسری طرف رومانیا میں تیل کے چشموں پر قابض ہوجائے، پھر ایسی صورت میں وہ کیونکر روس سے تقسیم پولینڈ کا سمجھوتا کرکے اپنی دونوں غرضوں کو خاک میں ملا دیتا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ روس نے جرمنی کے ساتھ سمجھوتا اگر کیا تھا تو درپردہ ایک غرض اُس کی یہ بھی تھی کہ نازی حکومت کی پیشقدمی کو حد سے آگے نہ بڑھنے دیگا اور اسی لئے جب اس نے دیکھا کہ جرمنی یوکرائن کی حدود تک پہونچنے والا ہے تو اس نے سرخ افواج بھیجکر ایک "حد ادب" قایم کردی، جس کی تصدیق روس کے وزیر خارجہ کے بیان سے

بھی ہوتی ہے جس میں صاف صاف ظاہر کیا گیا تھا کہ "سرخ افواج نے پولینڈ کی سرحد کو اس لئے عبور کیا ہو کہ جرمن افواج جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اس نے مشرقی یورپ میں نئی صورت پیدا کر دی ہے" رائٹر نے بھی اس کا اعتراف کیا تھا کہ "روس نے آخر وقت تک اپنے ارادہ سے جرمنی کو مطلع نہیں کیا" ڈیلی ٹیلگراف نے بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کھلے الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ "روس کی پیشقدمی ہٹلر کے ساتھ کسی سمجھوتہ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ روس کا جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہونا قرین قیاس ہے۔

رہا یہ امر کہ روس کی اس پیشقدمی کو جرمن افواج نے کیوں نہ روکا، سو اس کا سبب ظاہر ہے کیونکہ اول تو روس کے مقابلہ میں جرمن کی کامیابی کا امکان بہت ضعیف تھا اور دوسرے یہ کہ ڈینزگ اور کور وڈور کا علاقہ اس کے ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ اگر برطانیہ و فرانس نے اعلان جنگ نہ کر دیا ہوتا اور جرمنی کی مغربی سرحد پر جنگ نہ شروع ہوئی ہوتی تو شاید وہ روسی پیشقدمی کو روکتا، لیکن اس صورت میں تو اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا اور ہٹلر چاہتا تھا کہ جلد از جلد پولینڈ کی طرف سے فارغ ہو کر وہ مغربی سرحد کی حفاظت کی جانب متوجہ ہو۔

ان حالات کے پیش نظر میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ پولینڈ میں روس کا در خور، فی الحقیقت نازی حکومت کے زوال کی ابتداء ہے کیونکہ اب ہٹلر میں نہ یہ ہمت ہے کہ وہ قرب وجوار کی جمہوریت پسند یا کمیونسٹ جماعتوں کو تہ تیغ کر سکے اور نہ رومانیہ اور ہنگری پر قبضہ کا خواب اس کا پورا ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے وسط یورپ کی ریاستوں کے ساتھ جب روس کا تعلق بڑھے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اشتراکیت سے لوگ متاثر نہ ہوں اور جرمنی کے خلاف جو برہمی زیکوسلوکیا اور آسٹریا وغیرہ کی آبادی میں پائی جاتی ہے وہ یہاں کے لوگوں کو نازی حکومت سے انتقام لینے کے لئے اشتراکی اصول کی طرف مایل نہ کر دے۔

الغرض روس کے قبضۂ پولینڈ نے نازی حکومت کے لئے بہت سے خطرات پیدا کر دئے ہیں اور ہٹلر اچھی طرح محسوس کر رہا ہے کہ استھونیا اور فن لینڈ وغیرہ میں روس کا قدم جمانا صرف اس لئے ہے کہ بحیرۂ بالٹک سے جرمنی کے اقتدار کو چھین لے۔

روس کا جرمنی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے جنگ کرنا تو کسی طرح ممکن نہیں، لیکن اگر اسٹالین نے اس موقعہ سے فایدہ اٹھا کر اپنی مملکت کو وسیع بنانے کا خیال پیدا بھی کیا تو پھر اس کی جنگ کا رخ کچھ اور ہو گا جس کے متعلق ابھی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن نازی حکومت کو اس سے کوئی فایدہ نہیں پہونچ سکتا اور ہٹلر کی پالیسی کو جو شکست ہوئی ہے اس کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں۔

فلسفۂ مذہب اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ ر۔ رعایتی ۱۲ ر علاوہ محصول۔ منیجر نگار

فردوسِ ارضی

اگر کوئی پوچھے کہ اس وقت فردوس ارضی کہاں ہے تو آپ بلا تامل روس کا نام لے سکتے ہیں، کیونکہ فردوس کی جو تعریف بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "کسے را با کسے کارے نباشد"۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو جگہ فکر و بیماری سے خالی ہے وہی فردوس ہے، اور روس ہی ایک ایسا ملک ہے جس پر یہ تعریف صادق آتی ہے۔

ڈاکٹر جان میکائیل کے ایک ڈاکٹر دوست گزشتہ سال روس گئے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں لکڑی کے اسپتال بنائے جارہے ہیں۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ "یہ اسپتال کتنے دن کام دیں گے، زیادہ سے زیادہ بیس سال؟"۔ جواب ملا کہ "اس سے زیادہ کی ضرورت بھی کیا ہے"۔۔۔ مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کے بعد ہمارے ملک کو اسپتالوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی! یقیناً یہ جواب بہت حیرتناک تھا اور سننے والے کو حیرت ہونا چاہئے تھی، لیکن جب ڈاکٹر صاحب کو وہاں کے حالات کے مطالعہ کا موقعہ ملا اور انھوں نے لیننگراڈ، ماسکو، خارکو اور کیو وغیرہ پہونچکر ان تمام انتظامات کو دیکھا جو امراض کے مقابلہ کے لئے روسی حکومت میں جاری ہیں، تو اُن کو باور کرنا پڑا کہ لوگوں کا جواب غلط نہ تھا۔

فرض کیجئے کہ آپ روس میں بیمار پڑتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں کسی بیمار کو کسی ڈاکٹر کی فیس ادا کرنا نہیں پڑتی اور علاج و تیمارداری کا انتظام وہاں کے محکمۂ حفظانِ صحت کے متعلق ہے جو فراہمی آب و روشنی کی طرح آپ کے علاج کا بھی ذمہ دار ہے۔

وہاں کوئی ڈاکٹر پریکٹس نہیں کرسکتا، بلکہ اپنے اپنے گھروں پر وہ مریضوں کو مفت دیکھتے ہیں، اور اگر کوئی شخص ان کے پاس نہیں پہونچ سکتا تو اطلاع ملنے پر خود اُس کے گھر پہونچ جاتے ہیں ٹیلی فون سے اطلاع پہونچی نہیں اور وہ روانہ ہوئے نہیں۔

ڈاکٹر سب سے پہلے آکر یہ دیکھے گا کہ مرض کا سبب کیا ہے اور مریض کے گھر اور اس کے پیشہ کی مصروفیت پر غور کرے گا کہ کہیں مرض کا سبب معیشت و معاشرت سے تو متعلق نہیں ہے اور اس صورت میں وہ مریض کی بہتر معیشت و معاشرت کی سفارش کرے گا جس کا انتظام فوراً حکومت کی طرف سے ہوجائے گا۔

اگر ڈاکٹر دیکھے گا کہ عام شفاخانہ میں علاج نہیں ہو سکتا تو وہ مریض کو کسی مخصوص اسپتال، یا آرام گاہ میں منتقل کر دیگا ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ میں نے ماسکو کے جس اسپتال کا معاینہ کیا وہ عام شفاخانہ تھا جہاں زیادہ تر مزدور، کاریگر اور ان کے خاندانوں کے لوگ آتے تھے۔ ماسکو میں اس طرح کے نو شفاخانے ہیں جو شہر کے مختلف مقامات میں قایم ہیں اور اس لئے ہر شخص آسانی کے ساتھ وہاں پہونچ سکتا ہے۔

ان کی عمارتیں تین منزل کی ہیں اور عمدہ پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر منزل میں بالاخانے بھی ہیں جو ہلالی شکل میں طیار کئے گئے ہیں۔ یہ شفاخانے مختلف شعبے رکھتے ہیں جہاں جراحی، ایکس ریز اور بجلی وغیرہ سے علاج کیا جاتا ہے۔ ہر شعبہ میں دس دس ڈاکٹر ہیں جو روزانہ پانچ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ یہ شفاخانے صرف بیرونی مریضوں کے لئے ہیں اور اسی لئے یہاں مریضوں کے ٹھہرنے کا انتظام نہیں ہے۔ ہر مریض باری باری دیکھا جاتا ہے اور چمڑے کی آرام کرسیوں پر انتظار کا وقت کاٹا جاتا ہے اخبارات، کتابیں اور رسایل وغیرہ بھی بکثرت رکھی رہتی ہیں تاکہ مریض آسانی سے وقت کاٹ سکیں۔

بالائی منزل پر ایک رستوراں بھی ہے جہاں ذیابیطس یا دوسرے ایسے امراض کے مریضوں کو جنھیں مخصوص غذا کی ضرورت ہوتی ہے دن میں دو بار مناسب غذا فراہم کی جاتی ہے۔

ایک حصہ اسپتالوں کا بچوں کے لئے مخصوص ہے جس میں متعدد کمرے امراض متعدیہ کی دیکھ بھال کے لئے ہیں۔ یہاں ہر اسپتال میں نو بچوں کے لئے ایک نرسری (دایہ خانہ) بھی ہوتی ہے جہاں ان کا بڑی احتیاط سے علاج ہوتا ہے۔ اسپتالوں سے متعلق یہاں ایک جنگل بھی ہوتا ہے جہاں سال میں دو دفعہ چھ ہفتے کے لئے بچے بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے صحیح و توانا ہوکر واپس آتے ہیں۔

ان اسپتالوں میں ایک عجیب و غریب قاعدہ یہ ہے کہ مہینے میں دو بار کام کرنے والوں کی میٹنگ ہوتی ہے جس میں نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں گفتگو ہوتی ہے اور انتظام و ترقی کی نئی نئی تدبیریں سوچی جاتی ہیں۔ اسپتالوں میں بھی یہی طریقہ کار رائج ہے۔

جب ان اسپتالوں میں کسی مریض کا علاج ممکن نہیں ہوتا تو پھر وہ ان اسپتالوں میں بھیجا جاتا ہے، جہاں اس مرض کا خصوصیت کے ساتھ علاج ہوتا ہے اور مختلف امراض کے وہاں علحدہ علحدہ اسپتال بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک اسپتال سرطان کے لئے کھولا گیا تھا جہاں ۸۷ ڈاکٹر کام کرتے ہیں اور اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ مریضوں کا کامیاب علاج یہاں ہو چکا ہے، اس اسپتال میں مخصوص تجربہ گاہیں ہیں، جہاں ہر قسم کی تحقیق و جستجو کا کام ہوتا رہتا ہے۔

یہاں ایک اسپتال صرف ان امراض کا ہے جو مزدوروں اور کاریگروں کو ان کے مخصوص پیشوں اور فرایض کی وجہ سے لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہاں تازہ انسانی خون مریض کے جسم میں منتقل کرنے کا ایک خاص طریقہ رائج ہے جس سے

اور ممالک واقف نہیں ہیں۔

ڈاکٹری کا کورس یہاں پانچ سال کا ہے اور اس کے بعد ایک سال اسپتال میں کام کرنا پڑتا ہے، لیکن نئی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو فیس ادا کرنا نہیں پڑتی بلکہ خود ان کو وظائف دئے جاتے ہیں، گویا ڈاکٹری کی تعلیم وہاں ہر اس شخص کے لئے مفت و عام ہے جو داخلہ کے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عورتیں بھی بہ کثرت اس تعلیم کو حاصل کرتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ حفظان صحت کا معیار وہاں بلند ہوتا جا رہا ہے

ایک عجیب و غریب قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر تیسرے سال کے بعد ایک مہینے کے لئے وہاں تمام ڈاکٹروں کو پھر طبی تعلیم گاہ میں جانا پڑتا ہے تاکہ ان کی طبی تعلیم پھر تازہ ہو جائے۔

نرسوں کی حالت بھی وہاں کچھ مختلف ہے، وہاں اکثر نرسیں شادی شدہ ہوتی ہیں اور سوائے چند پرانی تجربہ کار نرسوں کے سب ہسپتال سے باہر اپنے اپنے گھروں یا کلبوں میں رہتی ہیں۔ یہ روزانہ اسپتال آتی ہیں اور سات گھنٹے کام کر کے واپس جاتی ہیں۔ جن کے بچے ہوتے ہیں وہ انھیں گھر چھوڑ آتی ہیں یا ان پبلک تربیت گاہوں میں جہاں حکومت کی طرف سے مفت یہ خدمت انجام دی جاتی ہے۔

وہاں نرسیں دو قسم کی ہیں۔ ایک معمولی، جن کا کام بستر وغیرہ کا صاف رکھنا اور مریض کو اٹھانا بٹھانا ہے ان کی تعلیم کا زمانہ ایک سال مقرر ہے، دوسری قسم سند یافتہ نرسوں کی ہے، جنھیں چار سال تک تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے اور تعلیم کے تمام مصارف حکومت کے ذمے ہوتے ہیں۔

ایک اور نئی چیز یہاں شفاخانہ صحت گاہیں ہیں، یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو بیمار تو نہیں ہو گئے ہیں لیکن اپنے کام پر جانے کے لئے ان کو کچھ دن کھانے پینے اور آرام لینے کی ضرورت ہے۔ ان صحت گاہوں میں بہتر سے بہتر غذا کا بھی انتظام ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ رات بسر کرنے کا بھی۔ یہاں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو افکار و محنت کی وجہ سے نڈھال ہو جاتے ہیں یا جن کو کمزوری سے دق وسل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان صحت گاہوں میں ہر چیز مفت ہے اور بلا فرق مراتب سب کے لئے ایک ہی سا انتظام ہے۔

زچہ خانے اور تربیت گاہیں یہاں ہر شہر میں بلکہ ہر ہر گاؤں میں ہیں۔ اور اتنا اچھا انتظام ہے کہ حیرت ہوتی ہے مختلف عمر کے بچوں کے لئے مختلف کمرے ہیں، مختلف قسم کے کھلونے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی موٹریں اور بائسکلیں بھی ہیں، جن پر بچے ادھر ادھر اڑے پھرتے ہیں، علاوہ ان کے ورزش گاہیں بھی ہیں اور تفریح و دلچسپی کے سامان بھی، الغرض روس کی نئی نسل جس انداز سے پرورش پا رہی ہے اس کا مستقبل اتنا شاندار ہے کہ یورپ کے ممالک اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے

جس وقت کوئی بچہ یہاں آتا ہے تو فوراً اس کا ٹمپریچر دیکھا جاتا ہے اور حلق وغیرہ کا معائنہ ہوتا ہے اور اگر

کسی بچہ میں کوئی خرابی پائی جاتی ہے تو فوراً اس کا تدارک کیا جاتا ہے کہ دوسرے بچے اس کی بیماری سے متاثر نہ ہوں۔

دن میں پانچ مرتبہ ہلکی غذا ان کو دیجاتی ہے اور روزانہ گرم پانی سے غسل کرایا جاتا ہے، اور جس ماں کا جی چاہے یہاں اپنے بچے کو چھوڑ کر اپنے کام پر جا سکتی ہے۔

اہل روس کی صحت کا معیار واوسط بہت بڑھ گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں علاج پر کسی کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا اور ہر شخص مطمئن ہے کہ جب تک وہ بیمار رہے گا اس کو برابر پنشن ملتی رہے گی۔ وہاں کوئی شخص بیکار نہیں ہے اور معاش کی طرف فارغ البالی سب سے بڑی چیز بقائے صحت کے لئے ہے۔ فکر جس چیز کا نام ہے وہ وہاں مفقود ہوگئی ہے اور کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اس فکر میں مبتلا ہو کہ میرے بچے کیا کھائیں گے، کیسے پلیں گے اور کیونکر انکی تعلیم و تربیت ہوگی کیونکہ ان تمام باتوں کی ذمہ دار حکومت ہے۔

وہاں تو یہ ہے کہ ہر شخص جو کام وہ کرسکتا ہے کئے جائے اور باقی تمام فکریں حکومت کے لئے چھوڑ دے۔ اُن ضعیف عورتوں اور مردوں کے لئے جو کام کے قابل نہیں ہیں پنشن مقرر ہوجاتی ہے اور وہ اپنی بقیہ عمر امن وسکون کے ساتھ بسر کردیتے ہیں

یہ ہیں وہ تمام اہتمامات جن کی بنا پر پیشین گوئی کی جاتی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب روس سے بیماریاں بالکل دفع ہوجائیں گی اور صحیح معنے میں وہ دنیا کی فردوس بن جائے گا۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھے۔ قیمت مجلد عہ

مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عا؍

میدان عمل :- ملک کے مشہور ومعروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو آپ کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد عہ

بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ؍

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

محترمی - جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا، پہلے عرض کر چکا ہوں - پھر آپ کیوں خواہ مخواہ مجھ سے بار بار وہی بات کہلواتے ہیں، جس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے اور مجھے ملال - یقیناً میرا فیصلہ سخت ہے لیکن ناگزیر، میں زمانہ سے جنگ کرتا ہوں، اس کے رحم پر اپنے آپ کو نہیں چھوڑتا اور آپ کو کیا معلوم کہ کتنا خون دل پینے کے بعد ایک انسان پتھر کا کلیجہ بنا پاتا ہے

سالہا باید کہ تا یک مردِ صاحبدل شود !

میں سمجھا کہ آپ نے اس کو کیوں خودکشی سے تعبیر کیا ہے، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جان دینے اور جان لینے میں زیادہ فرق نہیں ہے، سوال صرف "دستِ خویش" اور "دستِ غیر" کا ہوتا ہے، سو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں

میں چند دن سے اپنے احساسات میں ایک خاص تغیر محسوس کر رہا ہوں، آپ بھی سن لیجئے - یعنی ہر وہ چیز جسے دنیا زیادہ مکروہ سمجھتی ہے مجھے اپنی طرف زیادہ کھینچتی ہے اور میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ اخلاقی حقیقتیں شاید بداخلاقی ہی کے اندر چھپی ہوئی ہیں - جن باتوں پر زمانہ روتی ہے مجھے ہنسی آتی ہے اور جن باتوں پر سب ہنستے ہیں مجھے رونا آتا ہے - ہو سکتا ہے کہ یہ "ذہنی رجعت" ہو، لیکن دیوانہ بننے کے لئے اس منزل سے گزرنا ضروری ہے - لیکن آپ تو

ہر چہ بینند و بہ عنوانِ تماشا بینند

اس لئے ہنس لیجئے جتنا ہنس سکتے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ آپ ہی کو میرا سر پکڑ کر بیٹھنا پڑے گا -

---

حضرت !

شکایت نامہ پہونچا، یہ تو درست نہیں کہ میں "آئینِ سجود" سے ناواقف ہوں، لیکن "مراتبِ سجود" سے بیشک آگاہ نہیں

میرے یہاں گردن جھکا دینے کے معنے آنکھ بند کر لینے کے بھی ہیں اور آپ کے نزدیک اس میں عقل و ہوش، بصارت و بصیرت، حزم و احتیاط، پیش بینی و مصلحت اندیشی، خدا جانے کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے -

میں "رہنِ محبت" ہونے کے بعد اپنے تئیں اس سے "واگزاشت" کرنے کی تدبیر کبھی نہیں کرتا، اور دوسرے پر بھروسہ کرکے تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو بیدست و پا سمجھ لینے میں بھی مجھے بڑی راحت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی مجھے دھوکا دے، لیکن میں کیوں اس کا یقین کرکے وہ کچھ سمجھوں، جس کے سمجھنے سے میری "لذتِ عافیت" برباد ہو جائے

آپ چونکہ ان کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں اس لئے انھیں بدتر سمجھتے ہیں، میں نے ان کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، اس لئے مجھے کیا خبر وہ کیسے ہیں۔ جب میں کسی سے توقع قایم نہ کروں تو پھر بیوفائی کا مجھے کیا اندیشہ۔

آپ کو کیا معلوم کہ امیدوں سے بے نیاز ہو کر جینا کتنی بڑی نعمت ہے!

لاحول ولا قوۃ، آپ نے بھی کس کا ذکر چھیڑ دیا، کہاں کا سکون اور کیسا جذب! اگر میں ان کے "مبلغِ عرفان" سے واقف نہ ہوتا اور واقعی وہ بڑے پہونچے ہوئے ہوتے تو بھی میرے نزدیک وہ درویشی جو انسان کو دنیا کے لئے بیکار بنا دے لایعنی چیز ہے

کسی قلندر سے لوگوں نے پوچھا "معرفت چیست؟" اس نے جواب دیا "نتیجۂ بیکاری کہ اگر شغلے دیگر دست بہم میداد، ہیچکس دریں خیال نمی افتاد"

گر قابلِ کسبِ علمے می نزادیم — در ورطۂ فکرِ خود نمی افتادیم
دیدیم کہ دست ما بجائے نہ رسید — از سعیِ جنوں دادِ گریباں دادیم

جب کسی کے دامن تک ہاتھ نہ پہونچا تو خود ہی اپنا گریباں پھاڑ ڈالا!

یہ ہے فقر و معرفت کی انتہائی معراج جس پر آپ اتنا سر دھنتے ہیں، اگر آپ کے پاس فضول وقت بہت ہے تو آیئے میں آپ کو "وضعِ رندی" کے رموز سے آشنا کروں۔ اگر آپ کو خدا کا جلوہ بادہ و ساغر ہی میں نظر نہ آنے لگے تو میرا ذمہ!

مطاعی الاجل -

کتابوں کی رسید میں آپ نے جن الفاظ سے مجھے یاد کیا ہے، ان کو پڑھکر واقعی مجھے بڑی شرم آئی، یہ احسان میرا ہے یا آپ کا کہ آپ نے ان کو قبول فرما لیا

ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں!

باور کیجئے کہ میرا مقصود بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ مجھے بھلا نہ دیں۔ رہا یہ امر کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ درست تھا یا نہیں، سو شوق و نیاز کی دنیا میں اس کا محاسبہ نہیں ہوتا۔ مصر کے بازار میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک بڑھیا

سوت کی انٹی لیکر گئی تھی - اور اگر یوسف کو خبر ہو جاتی، تو شاید اسی کے ہاتھ بک بھی جاتے!
میں بحمداللہ اچھا ہوں اور اپنے حال پر بالکل قانع - پہلے جب "ہوش وحواس" کی منطق سے کام لیا کرتا تھا تو
بی دنیا کے کاروبار پر ہنسی آجایا کرتی تھی لیکن اب کسی بات پر نہیں آتی
سے زیادہ اور کیا چاہئے؟
زندہ رہئے، خوش رہئے کہ عین یہی میری زندگی و خوشی ہے

یہ آپ نے کیا کیا کہ بغیر میری تحریر یا اطلاع کے، امانت اُن کو دیدی - یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ وہ میرے ندیم و
ں ہیں اور اگر ہوں بھی تو یہ کہاں کا دستور ہے کہ چیز آپ لیں مجھ سے اور حوالہ کر دیں کسی اور کے - کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ
یں اس کی واپسی چاہتا تو تحریر ضرور دیتا
حیرت ہے کہ آپ سا ہوشمند انسان ایسی غلطی کا ارتکاب کرے - بہرحال اب ندامت و اشک ریزی سے کچھ نہیں
، آپ تو اُن کو بلائیے اور فوراً وہ چیز واپس لیکر اپنے پاس بحفاظت رکھ لیجئے - اُن سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے
لکھا ہے، بلکہ آپ تو صرف اُصولی بات ان سے کہہ دیجئے کہ جس کی چیز ہے اسی کو براہ راست واپس دی جائے گی -
میں جواب کا بے چینی کے ساتھ منتظر ہوں

جی ہاں، میرے پاس بھی شکایت کا خط آیا تھا، واقعی میں نے ان کے خطوں کا جواب نہیں دیا، لیکن اسکی
دار وہ خود ہیں - انھوں نے مجھ سے بے تکلفی پیدا کر لی اور عورت کے خط کا جواب کھُل کھیلنے کے بعد دینا کوئی معنی
ہیں رکھتا -
آپ ہی بتائیے میں ان کو لکھوں بھی تو کیا، نہ اب اشارت و کنایت میں بات کرنے کا لطف باقی رہا نہ وصل و ہجراں
کایت کا - پہلے جھوٹ بھی اظہار محبّت کرتا تو یقین آجاتا تھا، اب جان و دل دیدوں تو بھی اعتبار نہ آئے - سچ ہے
ت دوستی کے بعد عورت نہیں رہتی اور چونکہ وہ مرد بھی نہیں بنتی، اس لئے وہ ایک مہمل سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے
کی چھٹی اونگلی، اگر واقعی وہ جزو لاینفک ہو جائے!
آپ تو یہ خط ان کو بھیجدیجئے - براہ راست یہی ان کو لکھتا تو شاید اتنا بھی لطف نہ آتا -

---

صاحب قبلہ،
اگر آپ میرا مشورہ چاہتے ہیں تو آپ کی بزرگی کا پورا احترام کرتے ہوئے بھی مجھے یہی کہنا پڑیگا کہ آپ سخت غلطی میں مبتلا ہیں

یقیناً " علم شے " جہلِ شے سے بہتر ہے، لیکن جب کوئی "لاشے" ہو بھی یعنی محض وہم وگماں کو حقیقت جان کر دعوائے " انا الحق " کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

آپ جس گلستاں سے ایاغ چاہتے ہیں وہ سوائے داغ کے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔ خلا میں سر ٹکرانے سے بہتر یہ ہے کہ گھر کے در و دیوار سے قسمت آزمائی کیجئے۔ اس سے اور کچھ نہ ہوگا تو کم از کم "خونِ فرہاد برسرِ فرہاد" تو رہے گا، ورنہ یوں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ شریانوں میں خون منجمد ہو کر رہ جائے اور آپ انسان سے اچھے خاصے پتھر بن کر رہ جائیں اس کوچہ میں آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگ خراب و خستہ ہو چکے ہیں اور آخر کار جب پردہ ہٹا تو معلوم ہوا کہ

ہر چہ می دیدم غبارِ کاروانِ شوق بود

پھر آپ انھیں کے حال سے عبرت حاصل کیجئے اور اگر یہ واقعی کوئی شاہراہ معرفت ہو تو بھی میں یہی عرض کروں گا کہ

بگزر ز علم و شیوۂ جہل اختیار کن !

قبلۂ مستمنداں،

نوازش نامہ کا جواب غیر معمولی تاخیر کے ساتھ جا رہا ہے، معذرت خواہ ہوں، میں یہاں موجود نہ تھا، کل شام کو آیا اور آج صبح اول اول آپ ہی سے خطاب کی عزت حاصل کر رہا ہوں

آپ کی فکر مندیاں بالکل بجا و درست ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ناکامی اسقدر تکلیف دہ نہیں اگر تدبیر کی راہیں کھلی ہوں، لیکن جب یہ بھی بند ہوں تو پھر مرغِ پربستہ کی طرح سوائے تڑپنے اور لوٹنے کے چارہ ہی کیا ہے فی الحقیقت یہ وہ ایذا ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کی سمجھ میں آ ہی نہ سکتی تھی اور انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق اس کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھی !

آپ کہتے ہوں گے کہ میں نے تو اس لئے خط لکھا تھا کہ کوئی تسکین کا جواب آئے گا لیکن اس نے تو مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔ بالکل صحیح ہے، لیکن میں اسوقت کوئی جھوٹی توقع دلا کر آخر میں آپ کی ناکامیوں کو زیادہ تلخ و ناگوار بنانا پسند نہیں کرتا، کیوں نہ میں ابھی سے آپ کو اُسوقت کے مقابلہ کے لئے طیار کر رکھوں جس کا آنا ناگزیر ہے۔

آپ چونکہ قدرت کی طرف سے بہت زیادہ دردمند دل لیکر آئے ہیں، اس لئے آپ پر اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چند دنوں کے لئے آپ کہیں اور چلے جائیں ــــ میں یہ مشورہ تو دے رہا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ ممکن نہیں ــــ بہر حال اب تو مصیبت کا مقابلہ کرنا ہے، اور جب چارۂ کار کوئی نہیں تو کیوں نہ مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، میں تو خیر نہ سنی ہوں نہ شیعہ، لیکن آپ جس مسلک کے پیرو ہیں، وہ تو یہی بتاتا ہے کہ۔

روئے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ
آنجا کہ لطمہ ہائے یداللہ می زنند

حیرت ہے کہ حسین کی شہادت پر لوگ روتے ہیں، حالانکہ انھیں جوش میں آنا چاہئے۔ دیکھئے تعبیرات کا ادنیٰ سا فرق قوم کی قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا تا ہے

بس دو چار دن میں حاضر ہوں گا اور خود دیکھ کر رائے قایم کروں گا کہ مریض اس دور سے گزر رہا ہے۔

بندہ نواز، آپ کس کس بات پر سر دُھنیں گے۔ خدا کی طرح انسانی حماقت بھی بالکل ازلی و ابدی چیز ہے جس کا نہ اُور نہ چھور!

پرانے زمانہ میں اس کی حماقتیں بھی پرانی قسم کی تھیں اور اب ترقی یافتہ دور میں وہ بھی بہت ترقی یافتہ ہوگئی ہیں پہلے صرف ایک مذہب تھا اور اب قومیت، وطنیت، سیاست، مدنیت، صنعت و تجارت وغیرہ خدا جانے کتنی گنجایشیں اور نکل آئی ہیں، کہاں تک کوئی بچے گا!

میں نے یہاں کے بعض اکابر سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے طیار ہی نہیں — جھگڑا نہ خدا رسول کا ہے نہ ابوبکر و علی کا، بلکہ صرف اس بات کا کہ دیکھیں کون زیادہ احمق و بدتمیز ثابت ہوتا ہے پھر آپ ہی بتائیے کہ اس صورت میں مفاہمت کا کیا امکان ہے

حضرات شیعہ کا یہ مطالبہ بھی آپ نے سنا کہ وہ اپنی نمایندگی سنیوں سے علیحدہ چاہتے ہیں!

اُس طرف سوادِ اعظم کی حماقت، مسلم لیگ! اور ادھر شیعہ اقلیت کی حماقت، جداگانہ شیعی نیابت! — چلئے جھگڑا ختم ہوا

قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان میں اس قوم کو اب فنا ہو جانا ہے، لیکن جینا کہتے ہیں کہ جب تک یہاں انگریز موجود ہے وہ برابر جئے جائیں گے، خیال کیجئے کہ اس نئے زمانہ میں، زندگی کا مفہوم کتنا بدل گیا ہے!

تف ہے ایسی زندگی پر!

برخم نشست فلاطوں ز شرم آب نہ شد
بہ حیرتم کہ فلاطوں شد و شراب نہ شد

اگر نومبر کا پرچہ آپ کو نہیں پہونچا

تو بیرنگ طلب کیجئے، یا پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجئے۔ دسمبر ختم ہونے کے بعد آٹھ آنے کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب سید غضنفر علی صاحب - نگینہ)

مومن کے مشکل اشعار حل کرنے کا جو سلسلہ نگار میں قائم ہے، اس سے میں بھی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور ذیل کے اشعار کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں:-

۱- دلبر دل میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے / بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

۲- غیر کا اور آپ کا گر دل نہیں ہے ایک تو / کیوں تمہارے دل میں میرے یاد آنے کا چرچا کیا

۳- محشر میں پاس کیوں دم فریاد آگیا / رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

۴- ناکامیوں میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی / شیریں کو درد تلخی فرہاد آگیا

۵- دل کو قلق ہے ترک محبت کے بعد بھی / اب آسماں کو شیوۂ بیداد آگیا

۶- گر بہانے خون عاشق ہے وصال / انتقام زحمت جلاد کیا

۷- یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا / میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

۸- ہمارے خونبہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو / یہ بعد انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

۹- روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا / میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

۱۰- پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے / آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

۱۱- کیا کیا شکن دئے ہیں دل زار کو مگر / اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

۱۲- عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں، گو اسی پہ ہوں / شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

۱۳- وہ چشم انتظار کہاں باز بعد مرگ / دیکھا تو ہم نے آنکھ نہ لگنا بھی خواب تھا

۱۴- دیکھا نہ ہے یہ رشک و حسد وہ بلا کہ آج
سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ و تاب تھا

۱۵- کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث
ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

۱۶- خاک اٹھیں گے خاک سے جو یونہی
ترک آرام و خواب نے مارا

۱۷- نازک اندام سے لگی ہے آنکھ
حسرتِ فرشِ خواب نے مارا

۱۸- ہو کے یوسف جو دل چراتے ہو
کون ہو جائے گا غلام مرا

۱۹- خود گلا کاٹ موا جبکہ میں بسمل نہ ہوا
اُن کو آساں نہ ہوا جو مجھے مشکل نہ ہوا

۲۰- دلدہی کیسی وہ دم دیتے ہیں سوائے دشمن
کیا نہ دیتے مجھے میں آپ ہی سایل نہ ہوا

۲۱- دیتے تکلیف شب ہجر میں کیا اپنے پاس
نقدِ جاں پیشکش مرگ کے قابل نہ ہوا

۲۲- کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا
شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

اب میں سلسلہ وار اپنے شبہات پیش کرتا ہوں:-

۱- اگر بوالہوس نے راز افشا کر دیا تو دلبروں میں مومن کے وفا کی دھوم کا کیا سبب ہوا-

۲- دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا " دل میں چرچا کیا " کیا بات ہوئی -

۳- دمِ فریاد محشر میں کون پاس آگیا اور کس کے ؟

۴- کیا مومن کا اور شیریں و فرہاد کا ایک ہی زمانہ تھا جو مومن کی ناکامی کا اثر شیریں کے دل پر ہوا-

۵- آسمان کو کیا اس سے تعلق اگر ترکِ محبت کے بعد بھی تعلق باقی ہے-

۶- پہلے مصرعہ کا ربط دوسرے مصرعہ سے بالکل سمجھ میں نہیں آیا-

۷- اس شعر کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوا-

۸- انفصال کیا ہوا تھا کہ اب یہ جھگڑا نکل آیا اور خونبہا کا دعویٰ غیر سے کیوں کیا گیا-

۹- مومن کا کیا سوال تھا اور اُس سے خون کا جواب کیونکر ہو گیا-

۱۰- دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا خاصکر "آرام شکوہ" کی ترکیب !

۱۱- "شکن دینے" سے کیا مراد ہے اور "ورقِ انتخاب" کسے کہتے ہیں -

۱۲- اگر معشوق، غیر پر عاشق ہوا ہے تو اس کا حال کیوں خراب ہو-

۱۳- آنکھ لگنا کیونکر خواب ہو سکتا ہے -

۱۴- " دیکھا نہ ہے " - کیا نہیں دیکھا ہے ؟ اس کا ربط بعد کے الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا-

۱۵- "تذکرۂ یار میں عبث جی لگا" ، یعنی تذکرۂ یار میں جی نہ لگنا چاہئے تھا! اور پھر ناصح سے اجتناب ہونے کا اس سے کیا تعلق ہے

۱۶۔ "جو یونہی خاک اُٹھیں گے خاک سے" اس میں اہمال ہے۔

۱۷۔ نازک اندام کی تخصیص کیوں کی گئی۔ محبت میں آنکھ نہ لگنا عام بات ہے۔

۱۸۔ یہ شعر بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۹۔ دوسرا مصرعہ الجھا ہوا ہے۔

۲۰۔ وہ کیا نہ دیتے ؟

۲۱۔ اپنے پاس شب بھر میں کس کو تکلیف دیتے ؟

۲۲۔ اور وں پر بھی رحم آجاتا تو کس کو گلہ ہوتا ؟

(نگار) ترتیب وار اپنے شبہات کا جواب سنئے :۔

۱۔ معشوق نے بوالہوس پر مومن کی محبت کا راز ظاہر کر دیا، اس نے اوروں سے کہا، یہاں تک کہ دلبروں کو بھی خبر ہوگئی اور سب مومن کی وفا کے قایل ہوگئے۔ یقیناً یہ بات ایسی تھی جو معشوق کو بری معلوم ہوئی ہوگی، اس لئے اس سے فایدہ اُٹھا کر مومن اپنے محبوب کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ تم کیوں راز کی باتیں اس سے کہدیا کرتے ہو۔ اور مقصود یہ ہے کہ شاید اسی تدبیر سے اس کا ربط وضبط غیر سے کم ہو جائے۔

۲۔ " دل میں چرچا کیا" آپ نے کہاں سے پیدا کیا۔ تیرے دل میں میری یاد آنے کا چرچا غیر نے کیا اور اسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر کا اور محبوب کا دل ایک ہے کہ اُدھر معشوق کے دل میں مومن کی یاد آئی اور ادھر غیر کو اس کی خبر ہوگئی۔

۳۔ پاس کوئی نہیں آیا۔ یہاں پاس بہ معنی " لحاظ" مستعمل ہوا ہے، یعنی محشر میں وقتِ فریاد مجھے کیوں اس کا لحاظ آگیا، اس سے پہلے اگر کبھی رحم کیا ہوتا تو بیشک اس کی یاد مانعِ فریاد ہوتی، لیکن جب ایسا نہیں ہے تو میں نے کیوں محشر میں فریاد نہ کی۔

۴۔ مومن اور شیریں فرہاد کا زمانہ ایک تو نہ تھا، لیکن یہاں تو مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر آج شیریں ہوتی تو اسے بھی فرہاد پر رحم آجاتا اگر میری ہی سی ناکامیاں فرہاد کی بھی ہوتیں، یعنی میری ناکامیاں فرہاد سے بھی زیادہ ہیں۔

۶۔ جب تک محبت تھی دل کا قلق محبت یا محبوب کی وجہ سے تھا لیکن اب ترکِ محبت کے بعد جو قلق پیدا ہوا ہے اس کا تعلق محبوب سے تو ہو نہیں سکتا اس لئے سوائے آسمان کے اور کون ہے جس کو اس کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے۔

۷۔ مومن کا یہ شعر مشہور ہے اور واقعی پیچیدہ ہے، اس میں مومن نے بہت سے محذوفات رکھے ہیں۔ مومن نے

محبوب پر ایفاء وعدہ نہ کرنے کا الزام قائم کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میں تو قصداً نہیں آیا تاکہ تمھاری محبت کی کشش کا امتحان لوں، لیکن معلوم ہوا کہ تمھاری محبت سچی نہیں ہے ورنہ ضرور اس کی کشش مجھکو کھینچ بلاتی - اس پر مومن نے کہا کہ میں تو الزام ان پر رکھنا چاہتا تھا، لیکن "عذرِ امتحانِ جذب دل" نے الٹا مجھی کو قصوروار ثابت کر دیا۔

۸ - چونکہ محبوب نے غیر کے کہنے سے مومن کو قتل کیا تھا اس لئے اس سے خونبہا طلب کیا۔ مومن کو سخت تکلیف پہونچی کہ اس کے قتل کے بعد بھی غیر سے اتنا لگاؤ محبوب کو باقی ہے۔

۹ - روزِ جزا محبوب نے قاتل پر دعوائے خون تو کیا لیکن اُسے "قاتلِ دلجو" کہکے خطاب کیا، اور اس حالت میں جبکہ اس نے خود قاتل کو دلجو یا مہربان تسلیم کر لیا تو پھر خونبہا کا دعویٰ کیونکر کامیاب ہوسکتا تھا۔

۱۰ - "آرام شکوہ" کی ترکیب آپ نے کہاں سے پیدا کی۔ آرام کو علٰحدہ پڑھئے اور "شکوۂ ستمِ اضطراب" کو علٰحدہ یعنی تھک جانے کی وجہ سے آرام کرنا حقیقتاً ستمِ اضطراب کا شکوہ تھا جس نے چین سے بیٹھنے نہ دیا اور تھکا مارا۔

۱۱ - "ورقِ انتخاب" کتاب کے اس ورق کو کہتے ہیں جس میں کوئی خاص پسندیدہ بات درج ہوتی ہے اور قاعدہ ہے کہ ایسے ورق کو موڑ دیتے ہیں (یا شکن دیدیتے ہیں) تاکہ پھر دوبارہ اُسے آسانی سے ڈھونڈا جاسکے۔

۱۲ - رات کو غیر کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی اور پر عاشق ہوکر اس کی طرف سے بیخبر ہوگئے۔ "کو اُسی پہ ہوں" کا ٹکڑا مومن کی شوخی ہے، جس میں یہ طنز پوشیدہ ہے کہ اگر آپ اس پر عاشق ہوئے ہیں تو اور زیادہ غضب کی بات ہے۔

۱۳ - مرنے کے بعد چشمِ انتظار بند ہوگئی تو معلوم ہوا کہ عالمِ انتظار کی بیداری، خواب و خیال سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ یعنی اس سے کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوسکتا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آخر کار چشمِ انتظار بند ہو ہی گئی۔

۱۴ - پہلے مصرعہ کو یوں پڑھئے:-

دیکھا نا؟ ہے یہ رشک وحسد وہ بلا کہ آج

۱۵ - عبث کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ یعنی ناصح سے مجھ کو آج تلک عبث اجتناب تھا۔

۱۶ - اس شعر کے پڑھنے میں بھی آپ نے غلطی کی۔ جو یونہی دوسرے مصرعہ سے متعلق ہے۔

۱۷ - "نازکِ اندام" کی خصوصیت غالباً اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاسِ نزاکت ہی نے "فرشِ خواب" کی آرزو کو پورا ہونے نہیں دیا۔ غالب کا ایک شعر ہے:-

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

۱۸ - یوسف کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جس شخص پر چوری ثابت ہو جاتی تھی اسے صاحبِ مال کا غلام بن جانا پڑتا تھا۔ مومن کہتا ہے کہ یوسف ہو کے جو دل چراتے ہو، تو یہ بتاؤ کیا تم میرے غلام ہو جاؤ گے۔ یعنی ایسا کبھی ممکن نہیں۔

۱۹ - دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہے :- جو اُن کو آسان نہ ہوا، وہ میرے لئے مشکل نہ تھا، یعنی جو بات ان کے لئے مشکل تھی میرے لئے آسان نکلی۔

۲۰ - مومن اپنے رقیب سے کہہ رہے ہیں کہ تو جو محبوب کی دلدہی پر پھولا ہوا ہے تو یہ تیری غلطی ہے کیونکہ وہ تو تجھے دم دیتے ہیں۔ میں بھی اگر چاہتا تو وہ میری دلدہی بھی کرتے لیکن میں چونکہ حقیقت سے واقف ہوں اس لئے میں نے اس کا سوال ہی نہیں کیا۔

مومن کا اصل مقصود، غیر کو محبوب کی طرف سے مایوس کرنا ہے، جسے وہ اس ترکیب سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔

۲۱ - اس شعر میں اپنے پاس کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اگر شبِ ہجر میں ہمکو موت نہ آئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارا نقد جاں اس قابل ہی نہ تھا کہ موت کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اگر کوئی تحفہ موت کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس ہوتا تو ہم ضرور اس کو تکلیف دیتے۔

۲۲ - کیا گلے ہوتے، سوال نہیں ہے، بلکہ "کیا کیا گلے شکوے ہوتے" کے مفہوم میں ہے، یعنی شکر ہے کہ تیرا دل میری طرح نرم نہیں ورنہ تو اوروں پر بھی رحم کرتا اور پھر بڑے بڑے شکوے میری طرف سے ہوتے۔

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر — (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ر — (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۸ء) پورا فائل ۵ر

مینجر نگار - لکھنؤ

کیا آپ کو معلوم ہے؟

متحرک تصاویر پر کتنی دولت صرف ہوتی ہے؟

دنیا کے تمام عکاس خانوں میں ہر ہفتہ تقریباً ۲۲۶،۰۰۰،۰۰۰ آدمی جاتے ہیں اور صنعت فلم سازی پر اس وقت ساری دنیا میں ۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ سرمایہ لگا ہوا ہے جس میں ۴۰ کرور پونڈ صرف امریکہ کا ہے

اس صنعت میں ۲۸۳۰۰۰ آدمی کام سے لگے ہوئے ہیں۔ ۲۸۵۰۰ طیاری فلم میں، ۱۲۵۰۰ اشاعت میں اور ۲۴۱۰۰۰ دکھانے میں۔

ہر سال تقریباً ۵۸۵ تصویریں طیار ہوتی ہیں جن کی لاگت ۳۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہوتی ہے۔ ان میں ۶۶۵ اداکار کام کرتے ہیں، ۱۷۴۰ ڈائرکٹر ہیں اور ۳۵۷ لکھنے والے۔ علاوہ ان کے روزانہ ۹۶۳ آدمی زاید رکھے جاتے ہیں

صرف ایک فلم کی طیاری کے سلسلہ میں ۲۷۶ دوسری صنعتوں کو مدد پہونچتی ہے

دنیا میں اس وقت عکاس خانوں کی تعداد ۴۳۳۰۹ ہے جن میں ۱۸۱۸۲ صرف امریکہ میں ہیں۔ یورپ میں ان کی تعداد ۱۸۷۹۵ ہے اور اس کی تقسیم اس طرح:۔ روس = ۲۶۰۰۰ — جرمنی = ۶۱۴۷ — برطانیہ = ۵۰۰۰ — اطالیہ = ۴۹۰۰ — فرانس = ۴۵۰۰ — اسپین = ۳۵۰۰ — امریکہ میں یہ تقسیم اس طرح ہے:۔ برازیل = ۱۲۴۶ — میکزیکو = ۱۱۱۵ — ارجنٹا = ۱۰۲۱ — جاپان میں ان کی تعداد ۱۷۰۱ ہے، آسٹریلیا میں ۱۴۱۵، اور ۴۳۸۵ میں ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک شامل ہیں۔

گزشتہ جنگ میں کتنا نقصان ہوا؟

۸۵ لاکھ سے زیادہ آدمی جان سے مارے گئے، ۳ کرور ۵۰ لاکھ زخمی ہو کر بیکار ہو گئے، اور ۱۸۰ ارب پونڈ کا مالی نقصان ہوا۔ اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ ہم اس سے امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا، انگلستان، ویلس، آئرلینڈ، اسکاٹلینڈ فرانس، بلجیم، جرمن اور روس کے ہر خاندان کے لئے ایک ایک گھر ایسا طیار کر سکتے تھے جس پر (فی گھر) ۵۰۰ پونڈ لاگت آتی،

جس میں ۱۰۰۰ پونڈ کا فرنیچر ہوتا اور جس کے ساتھ ۱۰۰۰ پونڈ قیمت کی ۵ ایکڑ زمین شامل ہوتی، اور اس کے بعد بھی اتنی رقم بچ جاتی کہ ان ملکوں کے ہر اس شہر میں جس کی آبادی ۲۰ ہزار یا اس سے زیادہ ہے ایک ایک لائبریری ۱۰ لاکھ پونڈ کی لاگت سے اور ایک ایک یونیورسٹی ۲۰ لاکھ پونڈ کے صرف سے قائم ہو سکتی — یہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی اتنا بچ رہتا کہ اگر ہم چاہتے تو فرانس و بلجیم کے تمام کارخانے، کلیسا، ریلوے، بلکہ وہاں کا ایک ایک گھر خرید سکتے!

زمین کی عمر کتنی ہے؟

ایک ہیئت داں زمین کی عمر کا اندازہ اس وقت سے کرتا ہے جب اس میں انجماد شروع ہوا، طبقات الارض کا ماہر اس وقت سے ابتدا کرتا ہے جب اس میں سب سے پہلی پتھریلی تہ پیدا ہوئی۔ چنانچہ بعض ہیئت داں کہتے ہیں کہ دو ارب سال گزرے جب اس میں انجماد شروع ہوا تھا اور طبقات الارض کے ماہرین کہتے ہیں کہ ۲۵ کروڑ سال ہوئے جب سب سے پہلے اس میں پتھریلی تہ پیدا ہونا شروع ہوئی۔

زمین کی عمر معلوم کرنے کی ایک صورت یہ بھی اختیار کی گئی کہ سمندروں میں نمک کی جتنی مقدار پائی جاتی ہے اس سے یہ اندازہ کیا گیا کہ اتنا نمک کتنے زمانہ میں حاصل ہوا ہوگا اور اس طریقہ سے بھی تقریباً وہی مدت نکلی جو طبقات الارض والوں نے متعین کی ہے۔

ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ چٹانوں کی سب سے پہلی تہوں میں ان دھاتوں کا پتہ چلایا جائے جو دوسری دھاتوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ یورانیم (Uranium) وہ اصل دھات ہے جو بعد کو بہت سے تغیرات کے بعد سیسے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس لئے جب چٹانوں میں ان دونوں دھاتوں کا اندازہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کے کیمیاوی تغیرات میں کتنا زمانہ صرف ہوا ہوگا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح ۶۰ کروڑ سال کا زمانہ زمین پر گزر چکا ہے۔

زمین کی عمر معلوم کرنے کی ایک صورت اور سوچی گئی، وہ یہ کہ پہاڑوں کی ساخت اور قابل آبادی خشک حصۂ زمین پر غور کیا جائے کہ کتنے زمانہ میں انھوں نے یہ ہیئت اختیار کی ہوگی اور اس کی بنا پر ۲۵ سو سال کا زمانہ متعین کیا گیا ہے اور چونکہ یہ طبقات الارض والوں کے پہلے اندازہ سے ملتا جلتا ہے اس لئے عام طور پر اب اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔

ستارے ہم سے کتنی دور ہیں؟

ستاروں کا بُعد ظاہر کرنے کے لئے ایک خاص پیمایش وضع کی گئی ہے جسے "نوری پیمایش" کہتے ہیں، یعنی یہ کہ کس ستارے کی روشنی کتنے دنوں میں ہم تک پہونچتی ہے، اور چونکہ روشنی کی رفتار ہمیں معلوم ہے اس لئے بُعد کا اندازہ آسان ہو جاتا ہے۔

روشنی کی رفتار ۱۸۶۲۰۰ میل فی سکنڈ ہے اور آفتاب کی روشنی ہم تک آٹھ منٹ میں پہونچتی ہے، اس لئے ہم کہ سکتے ہیں کہ آفتاب ہم سے ۸ منٹ کے نوری فاصلہ پر واقع ہے۔ زمین سے قریب تر ستارہ وہ ہے جسے انگریزی میں (Alpha Centauri) کہتے ہیں جس کی روشنی ہم تک تقریباً سوا چار سال میں پہونچتی ہے گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ وہ ہم سے ۲۵٬۲۸۴٬۰۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ میل دور واقع ہے۔ اور بعید ترین ستارہ (Betelgeuse) ہے جس کی روشنی ۲۰۰ سال میں ہم تک پہونچتی ہے اور جس کا بُعد ظاہر کرنے کے لئے ریاضی کے پاس کوئی عدد موجود نہیں

اسوقت تک دنیا میں کتنی لڑائیاں لڑی گئیں؟

زمانۂ قبل تاریخ کا حال تو معلوم نہیں کہ انسان نے اُسوقت کتنی لڑائیاں لڑیں اور کس کس طرح، لیکن زمانۂ تاریخ کی لڑائیوں کا اندازہ ۵۰۰ سال قبل مسیح سے ۱۹۲۵ء تک ۹۰۲ کیا گیا ہے۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں سب سے زیادہ لڑائیاں روس نے لڑیں، چودھویں صدی میں انگلستان نے، پندرھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک آسٹریا نے اور انیسویں صدی میں فرانس نے

اسفنج جانور ہے؟

اسفنج جسے ابر مردہ بھی کہتے ہیں ایک نرم سی چیز ہے جس کے اندر پانی جذب ہو جاتا ہے اور نہانے دھونے کے کام آتا ہے۔ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ سمندر کے کسی درخت سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جانور ہے جو سمندروں اور بعض جھیلوں میں پیدا ہوتا ہے

یہ جانور زیادہ تر گرم سمندروں میں پایا جاتا ہے اور جانوروں کی طرح اس کی نسل بڑھتی ہے۔ جو اسفنج ہم استعمال کرتے ہیں حقیقتاً یہ اسی جانور کا ڈھانچہ ہے، اسفنج کے اندر جو سوراخ یا کھوکھلا پن نظر آتا ہے اسی کے اندر یہ جانور رہتا ہے اور اوپر سے ایک سخت سی کھال منڈھی رہتی ہے

اس جانور کی عجیب و غریب خصوصیت یہ ہے کہ اگر اسفنج کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں تو ہر ٹکڑا اپنی جگہ ایک مستقل جانور بن جائے گا بلکہ اگر اسفنج کے ریشے ریشے علٰحدہ کر دئے جائیں تو بھی یہ جانور فنا نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کسی زندہ اسفنج کو لیکر نچوڑ لیجئے اور اس کے اندر سے جو سفید دودھ کا سا مادہ نکلتا ہے اسے کسی برتن میں ڈالکر سمندر کے پانی سے بھر دیجئے، چند دن کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس مادہ نے پھر اسفنج کی صورت اختیار کر لی ہے

دباؤ سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں؟

چکاگو کے ایک اسلحہ سازی کے کارخانے میں ایک مربع انچ پر ۵ لاکھ پونڈ کا دباؤ ڈالکر مختلف تجربے کئے گئے ہیں اور ان کے نتائج بہت عجیب و غریب ثابت ہوئے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

اگر ایک مربع انچ پر ایک لاکھ ۸۰ ہزار پونڈ کا دباؤ ڈالا جائے تو جراثیم فنا ہو جاتے ہیں۔ گویا اب جراثیم کی ہلاکت کیلئے گرمی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ صرف دباؤ ڈالنے سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

چار لاکھ پونڈ کا دباؤ اگر ایک مربع انچ پر ڈالا جائے تو تیل تانبہ کی طرح جلکر رہجاتا ہے اور ۵ لاکھ پونڈ کے دباؤ سے اس کا حجم آدھا ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر دودھ پر اسی دباؤ سے کام لیا جائے تو وہ ایک مہینہ تک تازہ رکھا جا سکتا ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب کون ہے؟

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی مطبوعہ کتاب وہ ہے جو گیارہ سو سال قبل چھاپی گئی تھی۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۰۱ء میں ترکستان کے کسی مکان میں دیوار کے اندر چھپی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ مکان سنہ ۱۰۳۵ء میں تعمیر ہوا تھا اور یہ کتاب ایک صدی اس سے قبل چھاپی گئی تھی۔

چینی مطبوعات میں یہ کتاب سب سے پرانی اور بہت زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے اور برٹش میوزیم میں رکھی ہوئی ہے نویں دسویں صدی کا زمانہ چین کی انتہائی ذہنی ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۹۹۷ء میں ایک چینی لغت طیار کیا گیا جس میں ۲۶۴۳۰ الفاظ یا علامات موجود تھے۔ اس سے بھی پہلے سنہ ۹۷۲ء میں ایک کتاب "اخلاق بودھ" کے موضوع پر چھاپی گئی تھی جو ایک لاکھ ۳۰ ہزار صفحات کو محیط تھی۔

پولینڈ کے گداگروں کا کیا اقتدار ہے

وارسا، پولینڈ کا پایۂ تخت تھا جس پر اب جرمنی نے قبضہ کر لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پولینڈ بھر میں وارسا کے گرجا گھر سے بہتر کوئی جگہ گداگروں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں سیکڑوں مرد عورت ہر وقت پڑے رہتے ہیں جن کی عمریں گداگری میں بسر ہو گئی ہیں۔ گرجا کے احاطہ میں بعض جگہ ایسی ہیں جو خصوصیت کے ساتھ بڑے نفع کی سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ایک فقیر نے دوسرے فقیر کو ۴۰۰ معاوضہ دیکر ایسی ہی ایک جگہ حاصل کی۔

گزشتہ سال یہاں کے گداگروں کی ایک کانگرس، وارسا میں منعقد ہوئی تھی جس میں سیکڑوں نمایندوں نے

حصہ لیا تھا۔ اس جلسہ میں انھوں نے گداگروں کے حقوق حکومت کے سامنے پیش کئے اور خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ ہوٹلوں، اسپتالوں او صحت گاہوں میں گداگروں کے مخصوص حقوق گداگری کو تسلیم کیا جائے

پولینڈ میں ان مقامات پر گداگروں کا بڑا ہجوم رہتا ہے، یہاں تک کہ ہوٹلوں، اسپتالوں اور صحت گاہوں میں مسافروں کے قیام اور مریضوں کے علاج میں بھی سخت دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

ایکبار ہوٹلوں کے مالکوں نے ملکر ایک بڑی رقم گداگروں کے سامنے پیش کی تاکہ آیندہ وہ ہوٹلوں کا طواف ترک کردیں، لیکن انھوں نے اس رقم کے لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہ گداگری کی قدیم روایات کی توہین ہے اور ہم اسے کسی طرح گوارا نہیں کرسکتے، چنانچہ انھوں نے اس رقم کے لینے سے انکار کردیا اور ہوٹل والوں کو مجبوراً سپیر ڈالدینا پڑی۔

بم باری کے وقت کیا احتیاط کرنی چاہئے؟

عام لوگوں کا خیال ہے کہ ہوائی جہاز سے جب بم گرائے جاتے ہیں تو وہ سیدھے زمین کی طرف آتے ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، بم ہمیشہ ترچھے آتے ہیں اور ان کے نقصانات بھی ترچھے زاویہ سے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کبھی کھلے میدان میں بم گرنے کا اندیشہ پیدا ہوتو فوراً زمین پر لیٹ کر کوئی چیز دانتوں سے مضبوط پکڑ لینی چاہئے۔ کھلی ہوئی فضا میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں، لیکن اگر اتفاق سے کوئی مکان کے اندر موجود ہے اور بم گرائے جارہے ہیں تو دو کھلی ہوئی کھڑکیوں کے درمیان حصۂ دیوار کے پاس پناہ لینی چاہئے

اب ہوا باز تک خبریں کیونکر پہنچیں گی؟

امریکہ نے حال ہی میں ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام (Radio teleprinter) ہے یعنی "لاسلکی کی خبریں چھاپنے والا"

اسوقت یہ دستور ہے کہ ہوا باز کے کانوں سے ٹیلی فون کا سا ایک آلہ لگا رہتا ہے جس سے اس کو موسمی و فضائی حالات کا علم ہوتا رہتا ہے، لیکن اب اس جدید آلہ کی ایجاد نے یہ زحمت دور کردی ہے۔

ہوا باز کے سامنے یہ آلہ رکھا رہے گا (جس کا وزن صرف چند پونڈ ہے) اور خود ہی فضائی حالات کے متعلق خبریں چھاپتا رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاز جتنا زیادہ بلند جائے گا یہ آلہ اتنا ہی بہتر کام دے گا

تنوعات

۱۷۹۰ء سے ۱۹۱۳ء تک کی لڑائیوں میں جتنے آدمی ہلاک ہوئے، ان سے دوچند گزشتہ جنگ عظیم میں مارے گئے ——— جس وقت کلیسائے رومن کیتھولک سے اسقف اعظم کا انتخاب ہوتا ہے تو ادائے مراسم کی ابتدا اس کے منہ بند کر لینے سے ہوتی ہے اور انتہا منہ کھول دینے پر، اس سے مراد غور تامل ہے اور اس سے آزادانہ رائے ——— کرۂ ارض کا ۵۰۲۰۰۰۰۰ مربع میل رقبہ مردوں سے آباد ہے ——— سب سے بڑی مچھلی جو بنسی کے ذریعہ سے پکڑی گئی وہ ہے جسے کو ڈیل نامے ایک شخص نے جنوبی آسٹریلیا میں شکار کیا تھا اس کا وزن ۲۹۱، پونڈ تھا ——— شمالی افریقہ کی مور آبادی جب ایک دوسرے سے ملتی ہے تو شانہ کو چومتی ہے ——— لنکا میں بعض نہایت عجیب و غریب قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں، ایک کیڑا ایسا ہے جسے "جاندار پتی" کہتے ہیں، اس کا جسم بالکل پتی کی طرح ہوتا ہے اور پتی ہی کی طرح اس میں بہت سی رگیں ہوتی ہیں اور جس وقت کوئی خطرہ ہوتا ہے تو پتی ہی کی مانند اس میں جنبش پیدا ہوتی ہے ——— اٹلی میں جب لوگ قبرستان میں جاتے ہیں تو اپنے اعزہ و احباب کی قبروں پر ملاقاتی کارڈ بھی چھوڑ آتے ہیں ——— دریائے رھون جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اندر سے گزرتا ہے دنیا کا نہایت تیز رفتار دریا تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ بعض مقامات پر اس کے بہاؤ کی رفتار ۴۰ میل فی گھنٹے سے کم نہیں ہے ——— برطانیہ کی آبادی میں ہر ستترھویں آدمی کے پاس موٹر پائی جاتی ہے ——— آفتاب سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ بڑا سیارہ معلوم ہوتا ہے لیکن بغیر دوربین کی مدد کے ہم کو جتنے مستقل سیارے دن کو نظر آتے ہیں ان میں سب سے چھوٹا یہی ہے ——— تمام وہ جانور جو ہرن کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پتہ نہیں ہوتا ——— ایک انچ بارش کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک ایکڑ زمین پر سو ٹن سے زیادہ پانی برسا ——— برطانیہ کے سرکاری دفاتر میں سالانہ دس ہزار ٹن کاغذ ردی کی ٹوکریوں سے نکلتا ہے۔

قاہرہ کا ایک لطیفہ

قاہرہ میں ایک منارہ بنا ہوا ہے جس پر ایک چھوٹی سی توپ رکھی ہوئی ہے جو ٹھیک دوپہر کے وقت داغی جاتی ہے۔

ایک ڈچ جہاز جب یہاں پہونچا تو اس کے افسر کو یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی کیونکہ اس طرح ساری آبادی کو وقت کا پتہ چل جاتا تھا اور لوگ اپنی اپنی گھڑی ملا لیتے تھے۔ یہ منارہ کے محافظ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا:-

"تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوتا ہے کہ اب ٹھیک بارہ بجے ہیں" محافظ نے جیب سے ایک گھڑی نکالی اور بولا:- "اس گھڑی کی مدد سے مجھے وقت کا پتہ چلتا ہے جو یہاں کے بہترین گھڑی ساز کی بنائی ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً وہی اس کو درست کرتا رہتا ہے"۔

یہ افسر گھڑی ساز کے پاس گیا اور پوچھا: "تمھیں کیونکر پتہ چلتا ہے کہ اب ٹھیک بارہ بجے ہیں"۔
اس نے ہنسکر جواب دیا: "یہ کونسی مشکل بات ہے، جب توپ داغی جاتی ہے تو میں اپنی گھڑیوں کو اسی سے ملا لیتا ہوں"

جنگ عظیم کے بعد سے اس توپ کا داغا جانا بند ہوگیا ہے۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۳ صفحات پر ---- قیمت معہ محصول ۱۴؎/۱۱

منیجر نگار - لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

بہاراں

مجموعہ ہے خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی غزلوں کا جو نہایت خوبصورت طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔ اس سے قبل آپ کا پہلا دیوان اثرستان کے نام سے شایع ہو کر اہل نقد و نظر سے کافی داد حاصل کر چکا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مجموعہ جو یقیناً جناب اثر کے ارتقائی دور تغزل کی پیداوار ہے اور زیادہ خوبیوں کا حامل نہ ہو

اس مجموعہ بہاراں میں (جس کا نام اثرستان کے لحاظ سے بہارستان ہونا چاہئے تھا) ۲۵۰ صفحات اُس کلام کے لئے وقف ہیں جو اشاعت اثرستان کے بعد کہا گیا ہے اور ۱۰۰ صفحات انتخاب " اثرستان" کے لئے ترتیب کی اس نوعیت سے ایک ذہنی فایدہ تو یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دونوں زمانوں کے رنگ تغزل میں امتیاز کرنا آسان ہو جائے گا اور دوسرا اقتصادی فایدہ یہ کہ " بہاراں" کا خریدار " اثرستان" کے حاصل کرنے پر مجبور ہوگا

جناب اثر کی شاعری کی صحیح عمر مجھے معلوم نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ تیس سال سے کم نہ ہوگی اور اتنی دیرینہ مشق کے بعد جو خوبیاں ایک فطری خوش ذوق شاعر کے کلام میں پیدا ہونا چاہئے۔ اُن سے کہیں زیادہ ہمیں کلام اثر میں نظر آتی ہیں۔

آجکل عام طور پر یہ دستور ہو گیا ہے کہ جب کسی شاعر کے کلام پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے تو اس سے کبھی ضرور بحث کی جاتی ہے کہ اس کا پیغام کیا ہے، یہ بالکل جدید اصطلاح ہے جو مغربی لٹریچر سے لی گئی ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ شاعر کا " مقصد حقیقی" معلوم کیا جائے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے جب غزلگو شعراء کے کلام پر بھی یہی عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

ایک غزل گو شاعر، خیال کی اتنی وسیع دنیا اپنے ساتھ رکھتا ہے کہ ہم اس سے نہ تحدید مکان و زمان کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور نہ تعیین مقصد و اُصول کا۔ وہ " لانہایت " کی پیداوار ہے، اس لئے اس کے جذبات کی بھی کوئی حد و انتہا نہیں ہوتی، وہ قدرت کا تماشائی ہے اس لئے اس کے نتائج مطالعہ میں یکسانیت کی جستجو بے معنی ہے البتہ اظہار تاثر میں ضرور تنوع ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ہم کو ایک غزلگو شاعر کا مرتبہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے

جناب اثر کے اس مجموعہ کو جب ہم اس نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں "قدر اول" کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کے کلام کی یہ خصوصیت کہ اس میں کوئی چیز "پست و رکیک" نظر نہیں آتی انتقاد کے مثبت پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کا نہایت محبوب مشغلہ ہے اور جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا ہے وہ کسی خاص تاثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یوں تو ان کے کلام میں میر، مومن، غالب تینوں کا رنگ ملتا ہے لیکن خود ان کا موجودہ میلان زیادہ تر میر کی طرف ہے، جو یقیناً غزل گوئی کی معراج ہے۔ چونکہ اس مجموعہ پر ایک بسیط انتقادی مضمون پیش نظر ہے، اس لئے اقتباس کلام نہیں دیا جاتا۔

اس مجموعہ کی قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس لکھنؤ

معارفِ جمیل جناب حکیم آزاد انصاری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں جناب آزاد نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے حالات زندگی لکھے ہیں جن میں سے بعض نکات شاعری سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

آزاد انصاری، ہندوستان کے مشہور خوشگو شعراء میں ہیں اور اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے بعض ایسی خصوصیات بھی رکھتے ہیں جو انھوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اجراء نگار کے ابتدائی زمانہ میں ایک بسیط مضمون ان کی شاعری پر نکل چکا ہے اور ان کے ذوق کی میں بار ہا داد دے چکا ہوں۔

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور ۲ؔ میں کاشانۂ ناز۔ گھانسی بازار حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

کائناتِ دل یہ مجموعہ ہے جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے منظومات کا جو نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔ اس میں قومی، اخلاقی، سیاسی اور محاکاتی سبھی قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں۔ انداز بیان سلیس ہے اور الفاظ کی جستجو کامیاب و برمحل۔

جناب منور مذہباً ہندو ہیں، لیکن اپنے مشرب کے لحاظ سے بالکل آزاد۔ اُردو زبان پر ان کو اتنا ہی عبور حاصل ہے جتنا لکھنؤ کے کسی مسلمان شاعر کو ہو سکتا ہے اور ان سب باتوں نے مل کر ان کی نظموں میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔

یہ صرف نظموں کا مجموعہ ہے، غزلوں کا کلیات اس کے بعد شایع ہو گا۔ اس کی قیمت ۲ؔ ہے اور ملنے کا پتہ رگھوبیر پرشاد سکسینا، ملبلی خانہ، دہلی۔

آبِ حیات کے لطیفے مولانا آزاد نے اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں شعراء کے بہت سے لطایف و ظرایف بھی بیان کئے ہیں۔ اب انھیں کو آغا محمد اشرف ایم۔ اے نے ایک جگہ کر کے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ ان لطایف کی تاریخی حیثیت جو کچھ بھی ہو، لیکن تفریحی حیثیت یقیناً

قیمت ۲ روپے اور ملنے کا پتہ: [illegible] حیدرآباد دکن۔

ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک مسلسل فسانہ چھ قسطوں میں نشر کیا گیا تھا جسے چھ افسانہ نگاروں نے پورا کیا تھا، اس کو اب کتب خانہ علم و ادب دہلی نے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ جن چھ افسانہ نگاروں نے اس کو پورا کیا ان کے نام علے الترتیب یہ ہیں:۔ نیاز فتحپوری۔ علی عباس حسینی۔ ل۔ احمد۔ سجاد حیدر یلدرم۔ امتیاز علی تاج۔ حکیم احمد شجاع۔ قیمت ۲ روپے اور ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ

اس سلسلہ کی یہ دوسری جلد ہے جس میں مارشل چیانگ کائی شیک اور رضا شاہ پہلوی کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس سے قبل پہلی جلد پر نگار میں ریویو ہو چکا ہے۔ دائرۂ ادبیہ دہلی نے یہ سلسلہ نہایت مفید شروع کیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ لوگ اسکی قدر کریں گے۔ اس حصہ کی قیمت ۸ر ہے۔

افسانۂ پدمنی

سلطان علاؤالدین خلجی اور چتوڑ کی رانی پدمنی کی داستانِ عشق اس قدر مشہور ہے کہ اب ہر شخص اسے واقعۂ تاریخی سمجھنے لگا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جس وقت میں تاریخ ہند لکھ رہا تھا اسوقت میرے سامنے [illegible] بلکہ موقعہ نہ ملا، البتہ مختصراً میں نے ظاہر کر دیا تھا کہ۔

وہ سخت متعصب مزاج مورخ تھا اور اس نے تمام وہ باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر درج کی ہیں جن سے علاؤالدین پر کوئی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۸۰ تاریخ اسلامی ہند)

اس لئے مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جناب محمد احتشام الدین دہلوی ام۔اے نے پوری مورخانہ کاوش کے ساتھ اس کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کر دیا۔ یہ کتاب ۸ر میں کتب خانہ علم و ادب دہلی سے مل سکتی ہے۔

برگ سبز | مسئلہ میراث پر خواجہ احمد الدین مرحوم کا رسالہ ہے جس میں انھوں نے معقول و منقول سے کام لیکر پوری داد تحقیق دی ہے۔ میراث کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لئے اس باب میں موافق و مخالف جو کچھ لکھا جائے اس کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔

دو آنے میں دفتر امت مسلمہ امرتسر سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

ابوالخمر | ترجمہ ہے ٹالسٹائی کی ایک مشہور اخلاقی تمثیل کا جسے جناب مجنوں گورکھپوری نے پیش کیا ہے۔ عرصہ ہوا یہ ڈرامہ نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب کتابی صورت میں انوار بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ ٹالسٹائی کا ڈرامہ اور مجنوں کا ترجمہ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اس تمثیل کی خوبی کی ضامن ہیں۔ طباعت و کتابت کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ قیمت چھ آنے ہے۔

نغمہ ربانی | جناب ضیاء القادری بدایونی نے ولادت رسول و معراج کے حالات نظم میں پیش کئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے جو رسالہ کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ عثمانی پریس بدایوں ہے۔

نذر دکن | خواتین دکن کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جن کا تعلق صرف دکن سے ہے۔ فی الاصل یہ رسالہ سب رس کا "خواتین نمبر" ہے جسے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نظم و نثر کے تمام مضامین کی تعداد ۲۹ ہے جن میں تاریخی، ادبی و اخلاقی مسایل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے اس دور ذہنیت میں وہاں مرد و عورت دونوں برابر کا حصہ لے رہے ہیں اور دور عثمانی کی یہ وہ خصوصیت ہے جسے تاریخ دکن میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

اس کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ دفتر رسالہ سب رس حیدرآباد۔

سلطان احمد شاہ بہمنی | مولوی محمد ظہیر الدین صاحب ام۔اے کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے سلطنت بہمنیہ کے قیام و استحکام کا ذکر کرنے کے بعد سلطان احمد شاہ کے مفصل حالات اور اس عہد کے تمام اہم واقعات سے بحث کی ہے۔

کتاب نہایت محنت و کاوش سے لکھی ہے اور تاریخ دکن کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ۔

قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد۔

دلبع راشد

مولانا راشد الخیری مرحوم کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۳۶ء کے رسالۂ عصمت میں ایک مضمون شایع ہوا تھا جس میں مرحوم کی علالت کے واقعات و حالات بیان کئے گئے تھے۔ اب اسی مضمون
تابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ حالات ان کے صاحبزادہ جناب رازق الخیری نے قلمبند کئے تھے اس لئے ان میں وہی سوز و گداز پایا
اہے جو قدرتاً باپ کے اُٹھ جانے پر ایک بیٹے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالۂ عصمت دہلی۔

ممت کی کہانی

یہ بھی جناب رازق الخیری کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ رسالۂ عصمت کیونکر وجود میں آیا، مولانا راشد الخیری مرحوم نے اس کے کامیاب بنانے میں کیسی غیر معمولی محنت
وش سے کام لیا اور اس رسالہ کے ذریعہ سے ملک کی کتنی زبردست خدمت انجام دی گئی۔

قیمت ۸ر اور ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

ستانِ خیاطی

رسالہ جوہر نسواں دہلی کا نواں خاص نمبر ہے جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ خواتین کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت عمر اور ملنے کا پتہ
ممت بک ڈپو دہلی۔

رھی دُنیا

مجموعہ ہے جناب اختر انصاری کے چند مختصر افسانوں کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسائل میں شایع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔

جناب اختر نظم و نثر دونوں میں اپنا رنگ سب سے علٰحدہ رکھتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ دورِ حاضر کے
یچر میں ان کے افکار خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں ایک خاص معنویت ہوتی ہے اور زبان و
ن کے لحاظ سے بھی ایک خاص دلکش ندرت پائی جاتی ہے۔

اشتراکیت کے دورِ حاضر میں مخصوص اصطلاحی رنگ کے افسانے لکھنے کا جو میلان نوجوانوں میں پیدا ہوا ہے
س کی ایک نہایت اچھی مثال یہ مجموعہ ہے۔ اس کے بعض فسانے نگار میں بھی شایع ہو چکے ہیں اور بہت پسند
ئے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جہاں نما، اُردو بازار، دہلی۔

کسی خط کا جواب نہ دیا جائے گا

ر جواب کے لئے ٹکٹ موصول نہ ہوئے۔ اس میں اڈیٹر کے مخصوص احباب شامل نہیں ہیں۔ **مینیجر نگار**

ہٹلر کا اعلان

اور

شاعر کا جواب

زندگی کا لطف ہے شانہ بہ شانہ، رو بہ رو | درسِ امن و آشتی ہے صرف دیوانہ کی ہو
دوسروں کے لطف و رحمت پہ ہو جن کو اعتماد | میں بہا دیتا ہوں، اُن کمزور قوموں کا لہو
دعوئے اخلاق ہو، یا کہ سیاست کا فریب | جانتا ہوں سب کو میں نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو
ہڈیوں کے فرش پر ہوتی ہے سطوت کی نماز | "آمریت" خونِ انسانی سے کرتی ہے وضو
میری محفل گرم رہتی ہے لہو اور آگ سے | توڑ ڈالے میں نے اک مدت ہوئی جام و سبو
پھول کا دیتا ہوں میں دُنیا کو پتھر سے جواب | توپ کے مُنہ سے کیا کرتا ہوں، اکثر گفتگو
میرے ایوانوں کی زینت، گیس اور بارود ہے | رقص خانوں میں ملیں گے، تباہ [illegible]
تیرے سینہ میں سمو دوں گا تباہی کے شرار | اے نسیمِ[1] باغِ عشرت، دیکھ تو مجھ کو نہ چھو
آہ! یزداں نے مرے توڑا طلسمِ بحر و بر | اپنے نازک دور میں قلزم بہ قلزم جو بہ جو
نالۂ مظلوم، آہ بیوہ، فریادِ یتیم | میری محفل کے یہ ہیں مطربانِ خوش گلو
میرے مذہب میں کسی پر رحم کھانا ہے گناہ | یہ ڈھنڈورا پیٹ دو منزل بہ منزل کو بہ کو
خونِ انسانی کی ارزانی ہو اتنی دہر میں | بجھ سکے جس پر مری نخوت کا تشنہ آرزو
جانتا ہوں میں زمانہ کا مزاجِ گرم و سرد | دے نہیں سکتا مجھے کوئی فریبِ رنگ و بو
دام ہم رنگِ زمیں تھا آشیانہ کے قریب | آگیا دھوکے میں آخر ایک مرغِ قبلہ[2] رو

اہرمن کی بزم میں تھی مُردنی چھائی ہوئی
ولولوں نے میرے گرمایا ہے شیطاں کا لہو

[1] فرانس — [2] ترکی

شاعر کا جواب :-

نخوت بھرے اُٹھان سے تیرے مجھے ہے خوف ۔۔۔ تو اپنے زور ہی میں زمیں پر نہ گر پڑے
فرصت ملے تو دل پہ کبھی ہاتھ رکھ کے سوچ ۔۔۔ "برلن" کو "دارسا" کا مقدر اگر ملے،
پولینڈ کے تڑپتے ہوئے دل کی دھڑکنیں ۔۔۔ اے کاش، تو ضمیر کے کانوں سے سن سکے

شاید ترے ضمیر کو ہوگا نہ یہ پسند
تاریخ تجھ کو ظالم و جابر اگر لکھے

تعمیر دہر میں نہیں ہوتی ہے آگ سے ۔۔۔ آتش فشانیوں میں اکارت نہ کر سمے[1]
ظالم کا جبر و ظلم تو کاغذ کی ناؤ ہے ۔۔۔ انجامِ کار ہوتی ہے مظلومیت کی جے
نمرود کی خدائی باطل کا واسطہ ۔۔۔ اچھا نہیں ہے کبر کی اتنی بڑھا نہ لے
ان فتحمندیوں پہ نہ اترا، مآل سوچ ۔۔۔ قدرت کا انتظام بڑا خوفناک ہے
میں ہوں غلام ملک کا شاعر، نہ اس پہ جا ۔۔۔ ہندی ہے میرا جام، حجازی ہے اسکی مے

کم کن ز کبر و ناز کہ دیدا است روزگار
چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے (حافظ)

ماہر القادری

[1] وقت

ایجنٹوں کو معلوم ہونا چاہیئے

کہ نظیر نمبر، سابقہ خاص نمبروں کی طرح پھر کسی قیمت پر نہ مل سکے گا، اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ جتنے پرچے طلب کریں گے اتنا ہی زیادہ فایدہ ان کو ہوگا۔
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - کمیشن ۲۵ فی صدی، مصارف ڈاک ہمارے ذمے ہوں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

معصیت کدۂ فردوس

آسماں سے پار اک دنیا ہے ارمانوں بھری — ہے میسر جس جگہ عیش و شبابِ زندگی
اُس جگہ ہر طرح کا حاصل ہے روحوں کو نشاط — اُس جگہ چلتی ہے ہر ساعت نسیمِ انبساط
حسن کی رنگین کلیاں مسکراتی ہیں وہاں — ایک ایک ذرہ کو حاصل ہے سرورِ جاوداں
اُن فضاؤں میں کسی کو موت آ سکتی نہیں — آتشِ فرقت وہاں دل کو جلا سکتی نہیں
موجِ کوثر میں دمکتے ہیں ستارے نور کے — ہر گھڑی دُہرائے جاتے ہیں فسانے طور کے
نور کے سائے درخشاں ہیں نظر کے سامنے — چاند تارے رقص کرتے ہیں نظر کے سامنے
جا بجا چشمے محبت کے چھلکتے ہیں جہاں — کیفِ نظارہ سے آنکھیں مست رہتی ہیں وہاں
ذرہ ذرہ اُس جہاں کا میکدہ بردوش ہے — حسن کی رنگین دنیا جام در آغوش ہے
سُرخ ہونٹوں پر تبسم رقص کرتا ہے جہاں — رنگ و بو کا قافلہ آ کر ٹھہرتا ہے جہاں
وہ مسلسل قہقہے، وہ نغمہائے سرمدی — وہ نظارہ، وہ فروغِ حسن، وہ جلوہ گری،
آتشیں نغمے، سراپا آرزو کیفِ شباب — شرمگیں نظریں، نظر افروز، جلوے کامیاب
وہ شرابِ حسن کی پُرکیف نکہت ہائے ہائے — وہ مسرت خیز رنگینیٔ الفت ہائے ہائے
سلسبیل و کوثر و تسنیم کی نہریں رواں — ہر طرف گلگشت فرماتے، حسینانِ جواں
یہ اگر سچ ہے تو ہے فردوس معصیت کدہ — فحش و بدمستی کی دنیا اور گناہوں کی جگہ

جتنی باتیں ہیں بُری یعنی زمیں کے فرش پر
وہ سب اچھی ہیں فرازِ چرخ و بامِ عرش پر!

صابرؔ کوسگوی

غزل:

بڑھ گئی راحت سے وحشت کی تمنا اور بھی
جلوۂ مہتاب میں دل آہ تڑپا اور بھی

درد فرقت کی سوا ہو جاتا ہے دونا اور بھی
آپ کی پرسش سے دکھتا ہے کلیجا اور بھی

کون دل کا چین اس طرح ان کے اشاروں پر ہوا
بڑھ گئی افسوس جینے کی تمنا اور بھی

یا تو ساحل دامن ساحل پاس ہے پھر تیز تر
تیرے صدقے موجِ دریا ایک پلٹا اور بھی

اب ہوئی آزاد روحِ عشق اب ٹوٹا قفس
جلوۂ حسن اک نمودار ہے مجا اور بھی

نغمۂ رنسار و گل ہی میں نہیں محدود حسن
اس سے رنگیں تر ہے کچھ پردے میں جلوا اور بھی

کیوں دل افسردہ آج آتا ہے راحت کا خیال
قہر باقی ہے ابھی کچھ آسماں کا اور بھی

خونِ دل ہونے کو سمجھے ایک احساں اُن کے ہم
رنج پر ہم کو ہے راحت کا تقاضا اور بھی

پرسش آزردگانِ غم کی قدرت بھی نہیں
کچھ تو دل کے ساتھ جل جاتا خدایا اور بھی

جس نے ذوقِ معصیت سے آشنا مجھ کو کیا
ساتھ میرے داورِ محشر کوئی ہوتا اور بھی

دیکھ کر خارِ بیاباں کی فراوانی جگر
جوش پر آتا ہے پائے وحشت پیما اور بھی

جگر بریلوی

جنوری سنہ ۴۰ء کے "نگار" کی خصوصیات

(۱) اس میں نظیر اکبر آبادی کا وہی کلام دیا جائے گا جو ابتک غیر مطبوعہ ہے۔

(۲) اس کے غیر مطبوعہ دیوان غزلیات کا بھی انتخاب ہوگا اور غیر مطبوعہ نظموں کا بھی۔

(۳) اس کے غیر مطبوعہ فارسی کلام نظم و نثر پر بھی معہ انتخاب کلام تبصرہ کیا جائے گا۔

منیجر نگار

ملنے کا پتہ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فاحشی کی تمام شکلوں اور
مختلف قسموں کے حالات اس طرح
نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ
تحقیق کر کے بتایا گیا ہے کہ
فاحشی دنیا میں کب سے اور کس طرح رائج
ہوئی اور کیونکر تمام عالم نے اسکے رواج
میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو
حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔
قیمت تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں متعدد سالوں کے
استفسار و جواب
شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت
کا اظہار بیکار ہے کیونکہ جو معلومات
اس باب میں حاصل ہوتی ہیں وہ کسی اور
طرح ممکن نہیں۔ ان تینوں جلدوں میں
سینکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی
مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت
ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی سی ہے۔
قیمت مجلد تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول
خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ
تمہید کے ساتھ بہترین
ہندی شاعری کے نمونے پیش
کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ
دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو
میں یہ سب سے پہلی کتاب اس
موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی
کلام کے بے مثل نمونے نظر
آتے ہیں۔
قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲؍)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے
تین علمی مضامین شامل ہیں:-
۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ۔
۲- مادئین کا مذہب۔
۳- حرکت کے کرشمے۔
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے۔
قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا
لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق
کی تمام لطیف کیفیات اس کے
ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ
فسانہ اپنے پلاٹ اور
انشاء کے لحاظ سے اس قدر
بلند ہے کہ دوسری جگہ
اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔
قیمت دس آنے (۱۰؍)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲؍) کم

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ
سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی
شناخت اور اس کی لکیروں کو
دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے
مستقبل، سیرت، عروج و زوال،
موت و حیات، صحت و بیماری،
شہرت و گمنامی وغیرہ پر صحیح
پیشین گوئی کرسکتا ہے۔
قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

مذاکراتِ نیاز

یہ ہے حضرت نیاز کی ڈائری جو
ادبیات و تنقید عالیہ کا
عجیب و غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اسکو شروع
کردینا ختم تک پڑھ لینا
ہے۔ اس کتاب کی
بہت کم جلدیں باقی
رہ گئی ہیں۔
قیمت بارہ آنے (۱۲؍)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں
تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے
تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا
زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب
شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے
اردو میں اس موضوع پر اس سے
قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف
کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے
ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔
قیمت دو روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

